دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہ شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳ شمارہ ۲ فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

[illegible]

سعودی عرب، افریقہ برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپے پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/ ہندوستان سے ۶۰

Tel: 01336 - 22429
Fax 01336 - 2278
Tel: 01336 -24034 EDITER

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

● یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

☆ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

☆ چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

☆ پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

☆ ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ بنگلہ دیشی حضرت مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مولانا جعفر صاحب محدث شمالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

حبیب الرحمن قاسمی

مدارس دینیہ نے ماضی قریب میں اسلامی تہذیب وثقافت کے تحفظ وبقاء کے سلسلہ میں جو گرانقدر ومثالی خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری علمی وتمدنی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ یہ انھیں دینی تعلیم گاہوں کا فیض ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی دیگر اسلامی ملکوں کے مقابلے میں برصغیر (غیر منقسم ہندوستان) کے اندر اسلامی اقدار وروایات کی جڑیں زیادہ گہری، مضبوط ومستحکم ہیں، یہی اسلامی درسگاہیں ہیں جنھوں نے ملت کی علمی، فکری، روحانی، معاشرتی اور تہذیبی تعمیر کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہی مدارس ہیں جن کے ذریعہ ملت کی رگوں میں ایمان ویقین عزم وحوصلہ اور جرأت وحریت کی حرارت دوڑتی رہی ہے۔ المختصر کارگاہ حیات میں ہمارے ان مدرسوں کی حیثیت انسانی فیکٹریوں اور مردم ساز کارخانوں کی رہی ہے جن سے ایسے، ایسے، رجال کار بن سنور کر نکلے ہیں جن کے علمی رسوخ، پاکیزگی کردار، بلندی اخلاق، جہد وعمل اور ایثار واخلاص پر ملت کو بجاطور پر فخر ہے بہت دور جانے کے کی ضرورت نہیں اسی صدی کے نصف اول کے علماء پر ایک نظر ڈال لیجئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارن پوری حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا انور شاہ محدث کشمیری، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاجہاں پوری، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا شبیر احمد عثانی، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاردی، حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری وغیرہ (کثر اللہ امثالہم وقدس اسرارہم) علماء کی ایک طویل فہرست ہے جن کی علمی ودینی سرگرمیوں سے چمنستان دعوت وعزیمت تروتازہ وصد اسار تھا جن [illegible]

جرس کا کام دے رہی ہیں یہ ساری کی ساری تاریخ ساز شخصیتیں ہمارے انھیں مدرسوں کی ساختہ و پرداختہ تھیں۔

ہمارے ان تعلیمی اداروں کا شاندار کردار آفتاب نیمروز کی طرح واضح اور روشن ہے جس کا انکار کوئی شپرۂ چشم ہی کر سکتا ہے مگر ماضی کی اس طرب انگیز و مسرت افزا داستان کے ساتھ ہمیں تصویر کے دوسرے رخ کی جانب بھی اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے آج کل ہمارے انھیں ملت نواز اداروں کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ ان مردم ساز کارخانوں میں جمود و اضمحلال کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، بلکہ اس عمومی تاثر کی صحیح تعبیر بعض لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ یہ دینی درسگاہیں اپنی افادیت دن بدن کھوتی جا رہی ہیں۔ اور ماضی کی بنیاد پر ملت نے ان سے جو توقعات اور امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ آج پوری نہیں ہو رہی ہیں۔

یہ واقعہ بھی ہے جس کا پوری سیر چشمی و فراخ دلی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ہماری دینی درسگاہوں سے مؤثر علمی و دینی شخصیتوں کی تیاری تقریباً بند ہو رہی ہے۔

اس تشویشناک صورتِ حال کا تقاضہ ہے کہ پوری بالغ نظری و دلسوزی کے ساتھ حالات و واقعات کا تجزیہ کر کے طے کیا جائے کہ

(۱) وہ کیا اسباب و عوامل ہیں جن کی بنا پر ہمارے مدارس جمود و تعطل کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

(۲) نظام تعلیم و تربیت میں وہ کون سی خامیاں اور کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے ہماری محنت مفید و مؤثر نہیں ہو رہی ہے۔

(۳) کیا ہمارا متداول نصاب تعلیم عصری تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا ہے اس لئے اس کی افادیت کم ہوتی جا رہی ہے۔

(۴) کیا مدارسِ دینیہ کے تعلیم و تعلم کا جو اصل مقصد تھا وہ ہمارے دل و دماغ سے اوجھل ہو گیا ہے اس لئے یہ جمود پیدا ہو گیا ہے۔

(۵) وہ کون سے اقدامات ہیں جن کے ذریعہ پھر سے مدارس کو فعّال و متحرک اور مردم خیز

بنایا جاسکتا ہے۔

امید ہے ملت کے درد مند اصحاب فکر و نظر بالخصوص دینی درسگاہوں سے متعلق علماء وفضلاء (جو مدارس کے احوال و کوائف سے وقف نظری ہی نہیں بلکہ عملی طور پر واقفیت رکھتے ہیں اور حقیقی طور پر مدارس کے بقاء و تحفظ اور صلاح و فلاح کے براہِ راست ذمہ دار وہی ہیں) ان سوالات کو اپنے غور و فکر اور جہد و عمل کا محور بنائیں گے۔

یہ وقت کی ایک ایسی ضرورت ہے جس سے ہماری چشم پوشی اور بے اعتنائی کسی مخصوص طبقہ یا جماعت کے مفاد سے نہیں بلکہ پوری ملت کے دینی، علمی اور فکری مفاد سے بے پروائی ہوگی۔ کیونکہ ہماری سہل پسندی و غفلت کوشی ان لوگوں کے لئے ہمارے مدارس میں دخل اندازی کا موقع فراہم کردے گی جو ان مدارس کے دینی کردار اور مذہبی قدروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔ اور ایک عرصہ سے اس فکر میں لگے ہیں کہ کسی طرح ان کی اس حیثیت کو پامال کردیں۔ اگر ہماری لاپرواہی اور بے توجہی کی بناء پر یہ مذہب بیزار طاقتیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں تو یہ ملت کا ایسا عظیم خسارہ ہوگا جس کی تلافی صدیوں میں بھی ممکن نہ ہوسکے گی۔ ہمیں حالات کے رخ کو سمجھنا چاہئے اور اس وقت کے آنے سے پہلے جب کہ ہماری کوششیں بے سود اور ہماری جد و جہد لاحاصل ہو جائے، اصلاحِ حال کی فکر کرنی چاہئے۔ اگر یہ درست ہے اور یقیناً درست ہے کہ جس قوم کے پاس تابناک ماضی کا آئینہ ہوتا ہے اسے اپنے حال کی پیچیدگیوں کے سلجھانے میں دشواری نہیں ہوتی۔ تو ہمیں یہ سعادت حاصل ہے۔ اس لئے بغیر کسی مایوسی اور خوف ناکامی کے ہمیں قدم آگے بڑھانا چاہئے۔ انشاء اللہ خدائے بزرگ و برتر کی مدد ہمارے شامل حال ہوگی۔ اور کامیابی کی راہیں کھلیں گی۔

قرأت خلف الامام

اور

مولانا حبیب الرحمن قاسمی

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

قرآن حکیم

امت مسلمہ کا بغیر کسی اختلاف کے اس بات پر اتفاق واجماع ہے کہ اسلامی احکام ومسائل کا اولین سرچشمہ رب العالمین کی آخری کتاب "قرآن حکیم" ہے جس کا ایک ایک جملہ اور ایک ایک حرف منزل من اللہ ہے۔ اور جو مقام ومرتبہ، رفعت وبلندی، قوت وقطعیت کلام اللہ کو حاصل ہے وہ کسی مجموعۂ کلام اور علمی دفتر کو میسر نہیں۔

قرآن حکیم کی ان عظیم صفات کی بناء پر دینی معاملات ومسائل میں ایک مسلمان کی نظر سب سے پہلے اسی کی طرف اٹھتی ہے اور کتاب الٰہی سے ثابت حکم پر اسے جو انشراح صدر، یقین ووثوق اور اطمینان سکون حاصل ہوتا ہے کسی اور مراجع سے علم واذعان کی یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اس لئے اصولی طور پر مسئلہ زیر بحث میں سب سے پہلے قرآن حکیم ہی کی جانب رجوع کیا جانا چاہئے اور احکم الحاکمین نے ہمیں اس کا مکلف بھی کیا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے: "**فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ**" الآیۃ، پھر کتاب الٰہی سے جو حکم معلوم ہوجائے قیل وقال اور چون وچرا کے بغیر اس کے آگے سر تسلیم کردینا ہی ہماری بندگی واطاعت شعاری کا تقاضا ہے۔ لہٰذا آیئے کتاب اللہ کو دیکھیں کہ اس مسئلہ کی ہدایت کیا ہے؟ پڑھئے سورۃ الاعراف کی آیت ۲۰۴ "**وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ**" "اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔"

آیت پاک اور اس کے ترجمہ کے بعد ذیل میں تلامذۂ رسول اللہ ﷺ، ائمہ تفسیر وحدیث کو ملاحظہ کیجئے کہ مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر صحابۂ کرام اور دیگر سلف صالحین آیت مذکورہ کی تفسیر اور مراد و معنی کیابیان کرتے ہیں؟

(۱) عمدۃ المفسرین امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" ثم اختلف اهل التاويل فى الحال التى ا مرالله بالاستماع لقارئ القرآن اذا قرأ والانصات له فقال بعضهم: ذالك حال كون المصلى فى الصلوٰة خلف امام يأتم به وهو يسمع قرأة الامام عليه ان يسمع لقراته، وقالوا:في ذالك نزلت هذه الاية"۔

(جامع البیان معروف بہ تفسیر ابن جریر طبری ج۶ ص ۲۱۶)

علمائے تفسیر اس بارے میں مختلف الرائے ہیں کہ وہ کونسی حالت ہے جس میں قرآن پڑھنے والے کی قرأت کی جانب کان لگانے اور چپ رہنے کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے۔ بعض ائمۂ تفسیر کا قول ہے کہ یہ اس نمازی کا حکم ہے جو امام کی اقتداء میں نماز ادا کررہا ہے اور امام کی قرأت سن رہا ہے اس حال میں اس پر استماع وانصات یعنی قرأت کی جانب متوجہ رہنا اور خاموش رہنا واجب ہے یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول یہی ہے۔

اس کے بعد تفصیل کے ساتھ صحابہ اور ائمۂ تفسیر وحدیث میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ، رضی اللہ عنہم اور امام زہری، عبید بن عمیر، عطا بن رباح، مجاہد، سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، ضحاک، ابراہیم نخعی، قتادہ، عامر شعبی، سدی، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ کے آثار واقوال سند کے ساتھ نقل کئے ہیں جو مذکورہ بالا تفسیر وتاویل کے قائل۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"وقال آخرون:بل عنى بهذه الآية الامر بالانصات للامام فى الخطبة اذا قرئ القرآن فى خطبة" (ج۶ ص۲۱۹) اور دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں خاموش رہنے کا جو حکم ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جب خطبہ میں قرآن پڑھا جائے تو خاموش رہو (گویا اس آیت کا تعلق نماز میں امام کی قرآت سے نہیں بلکہ خطبہ میں خطیب کے قرآن پڑھنے سے ہے) اس قول کے قائلین میں سے صرف امام تفسیر مجاہد بن جبر کا نام ذکر کیا ہے۔

بعدازاں تیسری تفسیر کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

وقال اخرون عنى بذالك الانصات فى الصلوة وفى الخطبة (ج۶ ص۲۱۹)

اس قول کے تحت امام مجاہد، عطاء، حسن بصری اور سعید بن جبیر سے منقول آثار سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آیت مذکورہ کی تفسیر سے متعلق ان تینوں اقوال کو ذکر کرنے کے بعد اپنی رائے ان الفاظ میں ذکر کی ہے۔

قال ابو جعفر: واولیٰ الاقوال فی ذالكٰ بالصواب قول من قال امر وابا استماع القرآن فی الصلوة اذا قرأ الامام وكان من خلفه ممن يأتم به ويسمعه في الخطبة، وانما قلنا ذالك اولى بالصواب ، لصحة الخبر عن رسول الله ﷺ أنه قال:" اذا قرأ الامام فانصتوا" واجماع الجميع على من سمع خطبة الامام ممن عليه الجمعة الاستماع والإنصات لها مع تتابع الاخبار بذالك عن رسول الله ﷺ وانه لا وقت يجب على احد استماع القرآن والانصات لسامعه من قارئه الا في هاتين الحالتين على اختلاف في احدهما، وهي حالة ان يكون خلف امام مؤتم به وقد صحّ الخبر عن رسول الله ﷺ بما ذكرنا من قوله" اذا قرأ الامام فانصتوا" فالانصات خلفه لقرأته واجب على من كان به مؤتما سامعا قرأته بعموم ظاهر القرآن والخبر عن رسول الله ﷺ (تفسیر ابن جریر طبری ج۶ ص۲۲۰۔۲۲۱ مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

ان تینوں اقوال میں اقرب بالصواب اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے اور خطبہ بھی ہم نے اس قول کو سب سے زیادہ صحیح بایں وجہ کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی صحیح حدیث ہے "اذاقرأ الامام فانصتوا" جب امام قرأت کرے تو چپ رہو، اور سارے علماء کا اتفاق ہے کہ جن لوگوں پر جمعہ واجب ہے ان پر بوقت خطبہ استماع وانصات لازم ہے۔ اس اجماع کے ہوتے ہوئے اس بارے میں نبی کریم ﷺ کی بکثرت حدیثیں بھی ہیں بس ان دو حالتوں کے علاوہ کسی وقت بھی قرأتِ قرآن کے سننے والے پر استماع وانصات یعنی اس قرأت کی جانب ہمہ تن گوش متوجہ ہونا اور چپ رہنا واجب نہیں اگرچہ امام کے پیچھے مقتدی کے استماع وانصات کے بارے میں اختلاف ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی صحیح حدیث ہے جس کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ثابت ہے، مقتدی پر جو امام کی قرأت کو سننے والا ہے خاموش رہنا واجب ہے، کیونکہ قرآن حکیم کے ظاہری اور عمومی الفاظ اور رسول خدا ﷺ کی حدیث سے یہی ثابت ہے۔

امام ابن جریر طبریؒ کی اس عبارت سے صاف طور پر یہ بات سامنے آگئی کہ ہر قرأت کے سننے والے پر استماع وانصاب لازم نہیں ہے بلکہ یہ وجوب صرف اس شخص پر ہے جو امام کی اقتداء میں نماز ادا کر رہا ہے کیونکہ قرآن حکیم کے ظاہر اور صحیح احادیث کا تقاضہ یہی ہے

(۲) امام ابو بکر احمد بن علی رازی الجصاص متوفی ۳۷۰ھ اپنی مشہور و محققانہ کتاب احکام القرآن میں آیت مذکورہ کے تحت رقمطراز ہیں:

فقد حصل من اتفاق الجميع انه قد اريد ترك القرأة خلف الامام و الاستماع و الانصات لقرأته، ولولم يثبت عن السلف اتفاقهم علی نزولها فی وجوب ترك القرأة خلف الامام لكانت الآية كافية فی ظهور معنا ها وعموم لفظها ووضوح دلالتها علی وجوب الاستماع و الانصات لقرأة الامام وذلك لان قوله تعالی " وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له و انصتوا" يقتضی وجوب الاستماع و الانصات لقرأة القرآن فی الصلوٰة وغيرها ، فان قامت دلالة علی جواز ترك الاستماع و الانصات فی غيرها لم يبطل حكم دلالته فی ايجابه ذالك فيها و كما دلت الآية علی النهی عن القرأة خلف الامام فيما يجهر به فهی دلالة علی النهی فيما يخفی لانه اوجب الاستماع و الانصات عن القرأة و لم يشترط فيه حال جهرمن الاخفاء فاذا جهر فعلينا الاستماع و الانصات و اذا اخفیٰ فعلينا الانصات بحكم اللفظ لعلمنا به قارئ للقرآن. (ج ۳ص ۲۱۶مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی ۱۴۱۲ھ)

تمام علماء کے اتفاق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کی مراد امام کے پیچھے قرأت نہ کرنا اور اس کی قرأت کی جانب ہمہ تن گوش متوجہ ہونا اور خاموش رہنا ہے۔ اور اگر بالفرض سلف سے یہ اتفاق ثابت نہ ہوتا کہ اس آیت کا شان نزول امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے کا وجوب ہے جب بھی یہ آیت بجائے خود اپنے ظاہری معنی اور عموم لفظ کے اعتبار سے امام کی قرأت کے وقت استماع وانصات (کان لگانے و چپ رہنے) کے وجوب پر واضح اور کافی و شافی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "وإذَاقُرِئَ القُرآنُ فَاستَمِعُوْالَهٗ و اَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْن"(جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی جانب کان لگاؤ اور خاموش رہو) کا تقاضا ہے کہ نماز یا خارج نماز بہر حالت قرأت قرآن کے وقت سننے والے پر استماع وانصات واجب اور ضروری ہوگا، اور جب خارج صلوٰۃ ترک استماع وانصات کے جواز پر دلیل ثابت ہوگئی تو یہ دلیل داخل نماز قرأت کے استماع وانصات کے وجوب کو ختم نہیں کر سکتی۔ (بلکہ اس کا وجوب بحالہ باقی رہے گا)

پھر یہ آیت جہری نمازوں کی طرح سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت کرنے سے مانع ہے کیونکہ آیت میں جہر وسر کی قید کے بغیر محض قرأت قرآن کے وقت استماع وانصات کو واجب کیا گیا ہے لہٰذا امام کی جہری قرأت کے وقت بھی استماع وانصات ہم پر ضروری ہوگا اور سری قرأت کے وقت بھی استماع وانصات ہم پر لازم ہوگا کیونکہ (سری نمازوں میں بھی) ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ ہمارا امام اس وقت قرآن کی قرأت کر رہا ہے۔

امام جصاص رازیؒ کی خط کشیدہ عبارت سے واضح ہے کہ سلف صالحین کا اس پر اجماع واتفاق ہے

کہ اگر اسلاف کا یہ اتفاق اجماع نہ ہو تا پھر بھی یہ آیت اپنے ظاہری معنی اور عموم الفاظ کے اعتبار سے بجائے
اس بات کو واضح طور پر بتارہی ہے کہ امام کے قرأت قرآن کے وقت مقتدیوں کو قرأت کرنا درست
نہیں، بلکہ وہ جہری نمازوں میں ہمہ تن گوش ہو کر خاموشی کے ساتھ امام کی قرأت کو سنیں اور سری نمازوں
میں قرأت قرآن کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اس وقت کچھ پڑھنے کی بجائے ادب کے ساتھ خاموش رہیں۔

(۳) امام حافظ ابو عمر یوسف بن عمر معروف بہ ابن عبد البر النمری متوفی ۴۶۳ھ اپنی بے مثال
کتاب التمہید میں قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" قال ابو عمر: فی قول اللہ عزوجل" وَاِذا قُرِیَ القرآنُ فَاستَمِعوالہ وَاَنصِتُوا" مع اجماع اهل العلم ان مراد اللہ من ذالك فی الصلوۃ المکتوبۃ، اوضح الدلائل علی ان المأموم اذا جهر امامه فی الصلوۃ انه لا یقرأ معه بشيء وان یستمع له وینصت، وفی ذالك دلیل علی ان قول رسول اللہ ﷺ "لا صلاۃ لمن لم یقرأ فیها بفاتحۃ الکتاب مخصوص فی هذا الموضوع وحده اذا جهر امام بالقرأۃ لقول اللہ عزوجل" واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا" وما عدا هذا الموضوع وحده فعلی عموم الحدیث، وتقدیره" لا صلاۃ یعنی الرکعۃ لمن لم یقرأ فیها بفاتحۃ الکتاب الا لمن صلی خلف امام یجهر بالقرأۃ فانه یستمع وینصت،،

(التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید ج ۱۱ ص ۳۰-۳۱ مطبوعہ ۱۴۰۶ھ)

حضراتِ علماء کے اس اجماع واتفاق کے باوجود کہ آیت **"وَاِذاقُرِیَ القُرآنُ فَاستَمِعُوا لَهُ وَاَنصِتُوا لَعَلَّکُم تُرحَمُون"** کا شان نزول فرض نماز ہے، خود اللہ بزرگ و برتر کے اس فرمان میں یہ واضح دلیل موجود ہے کہ امام جب جہر اور آواز کے ساتھ قرأت کرے تو اس کے پیچھے مقتدی کچھ بھی نہ پڑھیں بلکہ ہمہ تن گوش ہو کر خاموش رہیں، اور یہ آیت اس کی بھی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد: **"لاَ صَلوٰةَ لِمَنْ لَمْ یَقرَأ فِیھَا بِفَاتِحَةِ الکِتَاب "** (اس شخص کی رکعت (معتبر) نہیں جو اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے) کا عمومی حکم امام کے جہری قرأت کی حالت کو شامل نہیں بلکہ آیت پاک **"وَاِذاقُرِیَ القُرآنُ فَاستَمِعُوا لَهُ وَاَنصِتُوا لَعَلَّکُم تُرحَمُون"** کے ذریعہ حدیث کے عموم کو خاص کردیا گیا ہے لہٰذا اس آیت کے پیش نظر حدیث مذکور کا معنی یہ ہوگا کہ جو شخص سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز یعنی رکعت (معتبر) نہیں سوائے اس شخص کے جو جہری نماز میں امام کے پیچھے نماز ادا کر رہا ہے وہ (بحکم خداوندی فاتحہ وغیرہ پڑھنے کے بجائے) کان لگائے چپ رہے گا۔

حافظ ابن عبد البر ایک دوسری جگہ بھی صاف لفظوں میں لکھتے ہیں:

" واجمع العلماء علی ان مراد اللہ عزّوجل من قوله " واذا قُرِیَ القُرآنُ فاستَمِعوا له

انصتوا" یعنی فی الصلوۃ، (التمہید ج۲۲ص۱۷)

تمام علماء کا اس بات پر اتفاق واجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان" واذا قُرِی القُرآن الخ" کی
راد (یعنی شان نزول) نماز کے بارے میں ہے۔

(۴) امام حسین بن محمود بغوی متوفی ۵۱۶ھ آیت مذکورہ کی تفسیر میں ائمہ تفسیر کے متعدد
وال ذکر کرنے کے بعد اپنی تحقیق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

والاول اولیٰ،وهوانهافی القرأة فی الصلوة لان الآیة مکیة والجمعة وجبت بالمدینة تفقوا علی انه مأمور به بالانصات حالة ما یخطب الامام،،

(معالم التنزیل علی تفسیر ابن کثیر ج۳ص۶۲۳)

ان اقوال میں صحیح ترین پہلا قول ہی ہے وہ کہ آیت واِذَا قُرِی القُرآنُ الخ کا شان نزول صرف
از ہے اس لئے کہ یہ آیت مکہ کے دور میں نازل ہوئی ہے اور جمعہ عہد مدنی میں فرض ہوا ہے (اس لئے
طبہ اس آیت کا شانِ نزول نہیں ہو سکتا) ہاں علماء کا اتفاق ہے کہ آیت کے الفاظ کی عمومیت کے تحت
طبہ کی حالت میں بھی سامع پر توجہ اور خاموشی لازم ہوگی۔

امام بغویؒ کی اس تحقیق سے یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ جن بزرگوں نے اس آیت کو خطبۂ جمعہ
یرہ پر محمول کیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ آیت اپنے الفاظ کے عموم کے اعتبار سے خطبہ کو بھی
مل ہے ورنہ اس کا نزول تو صرف نماز ہے۔

(۵) امام موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن قدامہؒ متوفی ۶۲۰ھ " **والمأموم اذا سمع قرأة امام فلا یقرأ بالحمد ولا غیرها**"مقتدی جب امام کی قرأت سن رہا ہو تو نہ سورۂ فاتحہ پڑھے اور نہ
کے علاوہ کوئی اور سورۂ آیت،، کی دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولنا قول الله : وَاِذَاقُرِئَ القُرآنُ فَاستَمِعُوْالَهُ وَاَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْن،، قال احمد ناس علی ان هذا فی الصلوة، وعن سعید بن المسیب، والحسن ، وابراهیم، ومحمد بن مب، والزهری انهما نزلت فی شأن الصلوة وقال زید بن اسلم، وابو العالیة، کانوا یقرؤن لف الامام فنزلت" واذا قری القرآنُ فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون"وقال احمد فی ایة ابی داؤد اجمع الناس علی ان هذه الآیة فی الصلوة، ولانه عام فیتناول بعمومه الصلوة"

(المغنی ج۱ص۲۲۹۔۲۳۰ مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۰۵ھ)

ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان "واِذَا قُرِئَ القرآنُ "الخ ہے۔امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ
[illegible]

بصری، ابراہیم نخعی، محمد بن کعب اور زہری (جیسے اکابر ائمہ حدیث و تفسیر) سے مروی ہے کہ آیت مذکورہ کا شانِ نزول نماز ہے۔ امام تفسیر زید بن اسلم اور ابو العالیہ سے بصراحت منقول ہے کہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو (اس کی ممانعت کے لئے) یہ آیت نازل ہوئی۔

اور امام ابو داؤد بجستانی، امام احمد بن حنبل سے روایت کرتے ہیں کہ امام احمد نے فرمایا کہ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز میں (امام کے پیچھے ترک قرأت کے بارے میں) نازل ہوئی۔

(۶) مشہور مفسر امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی متوفی ۶۷۱ھ آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں " قیل :ان هذا نزل في الصلوٰة ، روى هذا عن ابن مسعود، وابى هريرة،وجابر، والزهرى، وعبيدالله بن عمير، وعطابن رباح، وسعيد بن المسيب،..........

قيل: انهانزلت في الخطبة،قاله سعيد بن جبير، ومجاهد، وعطا،وعمروبن دينار،وزيد بن اسلم،والقاسم بن مخيمره،ومسلم بن يسار،وشهربن حوشب،وعبدالله بن المبارك وهذاضعيفٌ،لان القرآنَ فيها قليل والانصات يجب في جميعها قاله ابن العربى، النقّاش: والآية مكية ولم يكن بمكة خطبة ولا جمعة..........

قال النقاش اجمع اهل التفسير ان هذا الاستماع في الصلوٰة المكتوبة وغير المكتوبة،، (الجامع لاحکام القرآن ج ۷ ص ۳۵۳ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ۱۹۶۵ء)

۱۔ کہا گیا ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے یہ قول حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، ابو ہریرہؓ، جابرؓ اور امام زہری، عبید اللہ بن عمیر، عطا بن رباح اور سعید بن میتب رحمہم اللہ کا ہے۔

۲۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطبہ میں خاموش رہنے کے بارے میں نازل ہوئی اس بات کے کہنے والوں میں سعید بن جبیر، مجاہد، عطا، عمرو بن دینار، زید بن اسلم، قاسم بن مخیمر، مسلم بن یسار، شہر بن حوشب اور عبد اللہ بن المبارک ہیں۔ اور یہ قول ضعیف ہے اس لئے کہ خطبہ میں تو قرآن کم ہی ہوتا ہے جبکہ خاموش رہنا پورے خطبہ میں واجب ہے (آیت میں کہا گیا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف متوجہ رہو اور خاموش رہو تو اس آیت کے اعتبار سے تو خطبہ کے اسی حصہ میں خاموشی ضروری ہونی چاہئے جو آیت قرآنی پر مشتمل ہو خطبہ کے بقیہ حصے کا یہ حکم نہیں ہوگا حالانکہ پورے خطبہ میں اسکی طرف متوجہ رہنا اور خاموش رہنا ضروری ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت خطبہ کے سلسلہ میں نہیں نازل ہوئی ہے) اس قول کے ضعیف ہونے کی یہ وجہ امام ابن العربی مالکی نے بیان کی ہے۔

اور قدیم مفسر النقاش نے اس قول کے ضعیف ہونے کی یہ دلیل بیان کی ہے یہ آیت ہجرت سے قبل مکی دور میں نازل ہوئی ہے اور عہد مکی میں نہ خطبہ تھا اور نہ ہی جمعہ (اس لئے یہ آیت خطبہ کا شان

امام نقاش (محمد بن حسن متوفی ۳۵۱ھ) نے یہ بھی تصریح کی ہے مفسرین کا اس پر اجماع ہے آیت میں جس استماع و انصات کا حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق نماز فرض اور غیر فرض دونوں سے ہے۔
شیخ الاسلام حافظ احمد ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ نے بھی امام احمدؒ کے اس مذکورہ قول کو ذکر کیا ہے۔ بحالت جہر امام کے پیچھے قرأت کرنے کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فان للعلماء فیه ثلاثة اقوال! قیل: لیس له ان یقرأ حال جهر الامام اذا کان یسمع لا بالفاتحة ولا غیرها، وهذا قول الجمهور من السلف والخلف، وهذا مذهب مالك واحمد وابی حنیفة وغیرهم واحد قولی الشافعی.

وقیل: یجوز الامران، والقرأة افضل ویروی هذا عن الاوزاعی واهل الشام، ولیث بن سعد وهو اختیار طائفة من اصحاب احمد وغیرهم.

وقیل: بل القرأة واجبة وهو القول الآخر للشافعی.

وقول الجمهور هو الصحیح فانّ سبحانه تعالیٰ قال: واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون " قال: احمد اجمع الناس علی انها نزلت فی الصلوٰة (فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیه ج۲۲/ص ۲۹٤)

جہری نمازوں کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے بارے میں علماء کے تین قول ہیں:
(۱) مقتدی جب امام کی جہری قرأت کو سن رہا ہو تو اسے نہ سورۂ فاتحہ کرنی چاہئے اور نہ کسی دوسری سورۃ کی۔ یہی جمہور علمائے سلف کا قول ہے اور یہی امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے اور امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول ہے۔
(۲) اور کہا گیا ہے کہ اس مذکورہ حالت میں مقتدی کو قرأت کرنی اور قرأت نہ کرنی دونوں درست ہے البتہ قرأت کرنی افضل و بہتر ہے امام اوزاعی اور علمائے اہل شام نیز امام لیث بن سعد مصری کا یہی مذہب نقل کیا گیا ہے۔ امام احمدؒ کے مقلدین میں سے ایک جماعت نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔
(۳) اور کہا گیا ہے کہ اس مذکورہ حالت میں بھی مقتدی پر قرأت واجب ہے یہی امام شافعیؒ کا آخری قول ہے۔

(اس بارے میں) جمہور ہی کی بات صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ "الآیۃ، جب قرآن پڑھا جائے تو اس جانب کان لگائے رہو اور خاموش رہو تاکہ تم رحم کئے جاؤ۔
امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ تمام علماء کا اجماع ہے کہ نہ آیت نماز میں (قرأت قرآن...)

ائمۂ تفسیر، اکابر محدثین اور فقہائے محققین کی یہ چند عبارتیں اور اقوال آپ کے پیش نظر ہیں جن میں امام المحدثین احمد بن حنبلؒ، امام قرأت و تفسیر نقاشؒ، امام الفقہاء جصاص رازیؒ، مرجع محققین حافظ ابن عبد البرؒ واضح الفاظ میں بتارہے ہیں کہ علماء اسلام کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول نماز ہے۔ امام موفق ابن قدامہؒ اور علامہ حافظ ابن تیمیہؒ بھی اس اجماع کے قول کو نقل کر کے گویا اس کی تائید و تصویب کی ہے۔ پھر امام نقاشؒ اور امام بغوی نے علی الترتیب یہ وضاحت کر کے کہ "الآية مكية ولم يكن بمكة خطبة ولا جمعة" اور "الآية مكية والجمعة وجبت بالمدينة" یعنی آیت مذکورہ عہد مکی میں نازل ہوئی ہے اور اس عہد میں خطبہ و جمعہ کا وجوب نہیں ہوا تھا (بلکہ حسب تحقیق حافظ ابن جریر طبری جمعہ کی فرضیت ۱ھ میں ہوئی ہے) یہ بات مزید صاف کردی کہ اس آیت کے شان نزول اور موضوع سے خطبہ کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس وقت خطبہ جمعہ وغیرہ کا شرعاً وجود ہی نہیں تھا۔

رہا علماء کے اتفاق اور آیت کے عموم الفاظ سے خطبہ کا ضمنی طور پر اس حکم میں شامل ہونا تو یہ ایک الگ بات ہے شان نزول سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس لئے علم و تحقیق کی بنیاد پر یہی ثابت و محقق ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لئے قرأت کی کوئی گنجائش نہیں یہی علمائے سلف و خلف کی تحقیق ہے اور اسی پر ان کا عمل ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: "لكن الذين ينهون عن القرأة مع الامام هم جمهور السلف والخلف ومعهم الكتاب والسنة الصحيحة والذين اوجبوها على الامام في حال الجهر هكذا فحديثهم قد ضعفه الائمة (فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ج ۲۲ ص ۳۴۰)

لیکن جو امام کے ساتھ قرأت سے منع کرتے ہیں وہ جمہور سلف و خلف ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث ہیں اور جنھوں نے سکتات وغیرہ میں مقتدی پر قرأت کو واجب کیا ہے تو ان کی مستدل روایتوں کو ائمہ حدیث نے ضعیف بتایا ہے۔

آخر میں ایک اور حوالہ محقق عالم مولانا عبدالحی فرنگیؒ متوفی ۱۳۰۴ھ کے قلم سے ملاحظہ کیجئے جو علم و تحقیق کی میزان میں قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ان الآية المذكورة صريحة في الامر بالاستماع عند قرآة القرآن والخطبة وان كانت مشتملة عليها لا يطلق عليها قرآة القرآن فحملها على سماع الخطبة يابى عنه ايضاً ظاهر القرآن، فاذن ظهر حق الظهور ان ارجح تفاسير الآية وموارد نزولها هوا لقول الثاني وهو انها نزلت في القرآة خلف الامام ....

وهذا القول ترجيحهُ بوجوه احدها ،انه لا تعارضه الآثار والاخبار وليست فيه خدشة ومناقضة عند اولى الابصار، وثانيها ، انه منقول عن الائمة الثقات من غيرمعارضات، [illegible] الصحابة حتى ادعى بعضهم الاجماع على ذالك كما اخرجه

بیہقی عن احمد انه قال اجمع الناس علی ان هذة الآیة نزلت فی الصلوة وقال ابن عبد البر ی الاستذکار، هذا عند اهل العلم عند سماع القرآن فی الصلوة لا یختلقون ان هذا الخطاب زل فی هذا المعنی دون غیره.(۱)	(امام الکلام ص ۱۰۱)

آیت مذکورہ قرأۃ قرآن کے وقت استماع کے حکم وامر میں صریح ہے، رہا خطبہ تو اگرچہ اس میں بھی آیات قرآنیہ ہوتی ہیں لیکن خطبہ کو قرآن پڑھنا نہیں بولا جاتا تو خود قرآن کا ظاہر اس بات کو رد کر رہا ہے کہ اس آیت کو خطبہ کے سننے پر محمول کیا جائے۔ لہٰذا اب بات یہ محقق طور پر روشن ہو گئی کہ آیت کی راجح ترین تفسیر اور موقع نزول یہی قول ثانی ہے کہ یہ آیت قرأۃ خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس قول کے راجح ہونے کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ قول دیگر آثار واخبار کے معارض نہیں ہے نیز اس میں کسی قسم کا کوئی خدشہ اور باہمی مخالفت بھی نہیں ہے۔

(۲) یہ قول بغیر کسی تعارض کے ائمہ ثقات سے مروی ہے۔

(۳) یہی جمہور صحابہ کا قول ہے حتی کہ امام بیہقی نے امام احمد بن حنبلؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا تمام لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور امام عبد البرؒ نے الاستذکار میں لکھا ہے کہ اہل علم کے نزدیک یہ آیت نماز میں سماع قرآن کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اگلے صفحات میں یہ بات گذر چکی ہے کہ اجماع کا یہ قول امام احمد بن حنبلؒ کے علاوہ امام قرائت وتفسیر محمد بن الحسن النقاشؒ، امام جصاص رازیؒ، حافظ ابن عبد البرؒ وغیرہ ائمہ تفسیر وحدیث اور فقہ سے بھی منقول ہے، اس لئے اس کے راجح بلکہ متعین ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

رہا یہ مسئلہ کہ بعض اکابر نے استماع وانصات کے حکم کو جہری نمازوں کے ساتھ خاص کیا ہے تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ ان بزرگوں کا خیال ہے کہ بغیر جہر کے اسماع بے معنی ہے یعنی ان حضرات کے نزدیک استماع وہیں ہوگا جہاں آواز بلند ہو اور سنائی دیئے بغیر اس کے استماع کا عمل بے فائدہ اور رائگاں ہے۔

جبکہ دوسرے اکابر یہ کہتے ہیں کہ کلام الٰہی کی عظمت اور ادب واحترام کا تقاضا یہی ہے کہ اسکی تلاوت کے وقت آدمی ہمہ تن گوش بن جائے اور بالکل چپ وخاموش رہے، چنانچہ ابتدائے وحی کے زمانہ میں جب جبریل امین کلام اللہ لیکر آتے اور آپ کے حضور اس کی تلاوت کرتے تو آنحضرت ﷺ بھی ان کی تلاوت کے ساتھ چپکے پڑھتے جاتے تھے تو حکم خداوندی ہو۔ " لاتحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه وقرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه "	(قیامہ پ۲۹)

ترجمہ: نہ حرکت دیجئے قرآن کے پڑھنے میں اپنے کو تاکہ آپ اسے جلدی سے سیکھ لیں اس کا (آپ کے دل میں) جمع کرنا اور (آپکی زبان سے پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، پس جب ہم (بواسطہ فرشتہ) قرآن کو پڑھیں تو آپ ان کے پڑھنے کی اتباع کریں۔

اس آیت پاک سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ رب العزت نے اپنے کلام کی تعظیم اور اتباع کا یہی طریقہ بتایا ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت آدمی ہمہ تن گوش اور بالکل خاموش رہے خواہ تلاوت کی آواز کانوں تک پہنچے، یا نہ پہنچے، چنانچہ امام شوکانیؒ "**باب ما جاء فی قرأة المأموم وانصاته اذا سمع امامه**" کی احادیث پر بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں (**ان قوله صلی الله علیه وسلم ؛ فلا تقروا بشئی من القرآن اذا جهرت " یدل علی النهی عن القرأة عند مجرد وقوع الجهر من الامام ولیس فیه ولا فی غیره ما یشعر باعتبار السماع**" (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۴۷)

آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد کہ جب میں جہر سے قرآت کروں تو تم لوگ مطلق قرآن نہ پڑھو اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب امام جہر سے قرآت کرے تو اس حالت میں مقتدی کو قرات کرنا منع ہے، یہ حدیث اور اس کے علاوہ کوئی اور حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ مقتدی کو قرأت سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ قرأت سن رہا ہے۔

امام شوکانی صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ ترک قرأت خلف الامام یا بالفاظ دیگر استماع وانصات کی علت امام کی قرأت کا سننا نہیں بلکہ جہر بالقرأت (امام کا بلند آواز سے قرأت کرنا) ہے لہٰذا اس حالت میں مقتدی پر استماع وانصات ضروری ہو گا خواہ امام کی قرأت سن رہا ہو یا نہ سن رہا ہو۔

جمہور کہتے ہیں یہ علت جہر نہیں بلکہ خود قرأت امام ہے آیت مذکورہ کا اطلاق اسی کا مؤید ہے امام ابو بکر جصاص لکھتے ہیں: **قد بینا دلالة الآیة علی وجوب الانصات عند قرآة الامام فی حال الجهر والاخفاء وقال اهل اللغة ؛ الانصات ، الامساك عن الکلام والسکوت لاستماع القرآة ولا یکون القاری منصتا ولا ساکتا بحال ، وذالك لان السکوت ضد الکلام الخ**

(احکام القرآن ج ۳ ص ۲۱۷)

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ آیت مقتدی کے سکوت کے وجوب پر دلالت کر رہی ہے جبکہ امام قرات کر رہا ہو جہر سے یا آہستہ، علماء لغت کہتے ہیں کہ انصات کے معنی کلام سے رک جانا اور قرأت کی جانب متوجہ ہونے کے لئے خاموش رہنا ہے اور قرأت کرنے والا بہر صورت منصت وساکت نہیں ہو سکتا کیونکہ سکوت، کلام کی ضد ہے (اور دو ضد ساتھ اکٹھا نہیں ہوتیں) اور احادیث صحیحہ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے یہ احادیث آگے آرہی ہیں نیز اہل لغت کی تصریحات سے بھی یہی ثابت ہے کہ استماع کے لئے سماع ضروری نہیں ہے اس سلسلے میں کتب لغت کی مراجعت کی جائے بغرض اختصار صرف

انہیں اشارات پر یہ بحث ختم کی جارہی ہے۔

بعض حضرات نے اس مسئلہ کو یوں حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ امام کی قرأت کے وق
مقتدی متوجہ اور خاموش رہے تاکہ نص قرآنی پر عمل ہو جائے اور امام کے ساتھ منازعت بھی نہ
جسکی ممانعت صحیح احادیث سے ثابت ہے، البتہ امام جب قرأت سے توقف اور سکتہ کرے تو اس وق
مقتدی قرأت کرلیں تاکہ لَا صَلٰوۃَ لِمَن لَمْ یَقرَأْ الخ پر بھی عمل ہو جائے، لیکن ان بزرگوں کی سعی
چہ بظاہر کتاب اللہ "وَاِذَاقُرِیَٔ القُرآنُ فَاستَمِعُوْالَهُ وَانْصِتُوا" اور سنت رسول اللہ "لاصلاۃ لمن
یقرأفیھابفاتحۃ الکتاب" کے درمیان تطبیق اور دونوں پر عمل کی بہترین صورت ہے۔ لیکن کیا کیجئے
روایت و درایت دونوں کا فیصلہ اس کے خلاف ہے اس لئے کہ صحیح احادیث سے آنحضرت ﷺ
عمل منقول ہے وہ صرف دو سکتوں کا ہے۔ ایک تکبیر تحریمہ کے بعد جس میں آپ دعائے استفتاح پڑھ
تھے جیساکہ صحیحین میں مروی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ظاہر ہے۔ اور دوسرا نہایت مختصر و
قرأت ختم ہو جانے کے بعد ہوتا تھا جس کی وجہ امام ابوداؤد یہ بیان کرتے ہیں "لئلا یصل التکبیر بالقر
" یہ وقفہ اس لئے ہوتا تھا کہ قرأت قرآن سے تکبیر مل نہ جائے، ظاہر ہے اتنے قلیل وقفہ میں سورہ فا
کی قرأت کیسے کی جاسکتی ہے ان دو سکتوں کے علاوہ تیسرے سکتہ کے ثبوت کا حافظ ابن تیمیہؒ انکار کر
ہیں اور کہتے ہیں کہ حدیث پاک اور جمہور کے اقوال سے تیسرے سکتہ کا ثبوت محقق نہیں۔

چنانچہ نماز میں دوران قیام سکتہ کے مسئلہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و ایضاًفللناس فی الصلوۃ اقوال: احدھا :انه لاسکوت فیھا کقول مالك، و لایستحـ عنده استفتاح و الااستعاذۃ و لاسکوت لقرأۃ الماموم،

والثانی : انه لیس فیھا الاسکوت واحد للاستفتاح! کقول ابی حنیفة ، لان ھـ الحدیث یدل علی مدۃ السکتة ،

و الثالث: ان فیھا سکتتین کما فی حدیث السنن لکن ر وی فیه انه یسکت اذا فر من القرأۃ و ھو الصحیح ، وروی اذا فرغ من الفاتحة ، فقال طائفة من اصحاب الشافعی احمد یستحب ثلاث سکتا ت بوسکتة الفاتحة جعلھا اصحاب الشافعی و طائفة من اصحاب احمد لیقرأ الماموم الفاتحة ، و الصحیح انه لا یستحب الا سکتتان فلیس فی الحدیث ! ذالك واحدی الرواتین غلط و الا کانت ثلاثاً و ھذاھو المنصوص عن احمد. وانه لا یستحـ الاسکتتان ، و الثانیة عند الفراغ من القرأۃ للاستراحة و الفصل بینھا و بین الرکوع.

و [illegible] احمد کما لایستحب ، مالك و

عندهم اذا جهر الامام ليست بواجبة و لا مستحبة بل هي منهي عنها و هل تبطل الصلوٰة اذا قرأ مع الامام ؟ فيه وجهان في مذهب احمد فهو اذا كان يسمع قرأة الامام فاستماعهُ افضل من قرأته كاستماعه لمازاد على الفاتحة فيحصل له مقصود القرأة ، و الاستماع بدل عن قرائته فجمعه بين الاستماع و القرأة جمع بين البدل و المبدل"

(مجموعہ فتاوی شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ ج ۲۲ ر ص ۳۳۸ ر ۳۳۹)

دوران قیام نماز میں سکوت کے بارے میں لوگوں کے چند اقوال ہیں۔

۱۔ نماز میں کوئی سکتہ نہیں۔ جیسا کہ امام مالک کا قول ہے کہ ان کے یہاں (تکبیر تحریمہ کے بعد) دعائے استفتاح اور اعوذ باللہ پڑھنا بہتر نہیں اور نہ ہی مقتدیوں کی قرأت کے لئے توقف کرنا ان کے یہاں افضل ہے۔

۲۔ نماز میں صرف ایک سکتہ دعائے استفتاح (ثنا) کے لئے ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے اس لئے کہ حدیث ابوہریرہ سے یہ ثابت ہے۔

۳۔ نماز میں دو سکوت ہیں جیسا کہ سنن کی حدیث میں ہے۔ لیکن اس میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ قرأت سے فارغ ہونے پر سکوت فرماتے تھے، اور یہی صحیح ہے۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ سورۂ فاتحہ سے فراغت پر سکتہ کرتے تھے اس روایت کے پیش نظر امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے مقلدین کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ تین سکتے مستحب ہیں۔ سورۂ فاتحہ کے بعد والے سکتہ کو امام شافعیؒ کی پیروی کرنے والے اور امام احمدؒ کے پیروکاروں میں سے ایک طبقہ نے مقتدی کی قرأت کے لئے مقرر کیا ہے۔

اور صحیح بات یہی ہے کہ صرف دو ہی سکتے مستحب ہیں اور حدیث میں بس انہیں دو کا ذکر ہے اور دونوں روایتوں (یعنی ایک جس میں فاتحہ کے بعد سکتہ کا ذکر ہے اور دوسری جس میں قرأت سے فارغ ہو جانے پر سکتہ مذکور ہے) میں سے ایک غلط ہے ورنہ تین سکتے ہو جائیں گے اسی کی صراحت امام احمد نے بھی کی ہے کہ صرف دو سکتے مستحب ہیں (ایک تحریمہ کے بعد) اور دوسرا قرأت سے فارغ ہو کر دم لینے اور قرأت و تکبیر کے درمیان فصل کرنے کے لئے۔ اور قرأت فاتحہ کے بعد کا سکتہ تو یہ امام احمد اور اسی طرح امام مالک و امام ابو حنیفہ کے نزدیک بہتر نہیں ہے۔ اور جمہور اس کو پسند نہیں کرتے کہ مقتدی کی قرأت کے لئے امام سکوت کرے۔ کیونکہ ان کے نزدیک امام کی جہری قرأت کے وقت مقتدی کے لئے قرأت نہ ضروری ہے اور نہ بہتر بلکہ ممنوع ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ امام کی جہری قرأت کی حالت میں مقتدی کے قرأت کرنے سے اس کی نماز باطل ہو جائے گی تو امام احمد کے یہاں اس بارے میں دو قول ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ امام کی قرأت سننے کی حالت میں مقتدی کا امام کی قرأت کی جانب

کے نزدیک افضل ہے۔ اور اس استماع سے قرأت کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو یہ استماع قرأت کا بدل ٹھہرا، لہٰذا استماع اور قرأت دونوں جمع کرنے سے بدل و مبدل کا اکٹھا کرنا لازم آئے گا (جو صحیح نہیں ہے)

علامہ ابن تیمیہ ایک دوسرے موقع پر اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

ومعلوم ان النبیﷺ لو کان یسکت سکتة تتسع لقرأة الفاتحة لکان هذا مما تتوفر الهمم و الدواعی علی نقله فلما لم ینقل احد علم انه لم یکن .

و السکتة الثانیة فی حدیث سمرةؓ قد نفاها عمران بن حصینؓ و ذالك انها سکتة یسیرة قد لا ینضبط مثلها و قدروی انها بعد الفاتحة و معلوم انه لم یسکت الا سکتتین فعلم ان احدها طویلة و الاخریٰ بکل حال لم تکن طویلة متسعة لقرأة الفاتحة وایضاً فلوکان الصحابة کلهم یقرأون الفاتحة خلفه،إما فی السکتة الاولی وإمّا فی السکتة الثانیة لکان هذا مما تتوفر الهمم و الدواعی علی نقله فکیف و لم ینقل هذا احد عن احد الصحابة انهم کانوا فی السکتة الثانیة خلفه یقرأون الفاتحة مع ان ذالك لو کان مشروعاً لکان الصحابة احق الناس بعلمه و عمله فعلم انه بدعة (مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ ج ۲۳ ص ۲۷۸، ۲۷۹)

یہ بات معلوم ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ کا معمول اس قدر طویل سکوت کا ہوتا جس میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش ہوتی تو آپ کا یہ عمل ان امور میں سے ہوتا جس کے نقل و بیان کے عزائم و اسباب کثیر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جب کوئی آپ ﷺ کے اس عمل کو بیان نہیں کرتا تو معلوم ہو گیا کہ اس دراز سکوت کا وجود ہی نہیں۔

اور حضرت سمرہؓ کی حدیث میں مذکور دوسرے سکوت کا حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے انکار کیا جس کی (بظاہر) یہی وجہ ہے کہ یہ وقفہ و سکوت اس قدر مختصر تھا کہ ایسے مختصر وقفوں کو بسا اوقات ضبط و شمار میں لایا ہی نہیں جاتا۔

یہ بھی مروی ہے کہ یہ سکوت سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہوتا تھا۔ اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ صرف دو سکوت کرتے تھے اس روایت سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ ان دو سکوت میں سے ایک قدرے دراز اور دوسرا بہر حال مختصر ہوتا تھا جس میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر حضرات صحابہؓ آپ ﷺ کے پیچھے پہلے یا دوسرے سکتہ میں سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے تو ان کا یہ عمل ان امور میں سے ہوتا جس کے نقل و بیان کے عزائم و اسباب کثیر ہیں۔ اس کے ہوتے ہوئے آخر کیا بات ہے کہ کوئی کسی صحابی کا یہ عمل ذکر نہیں کرتا۔

علاوہ ازیں اگر ان سکتوں میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا شریعت کی جانب سے ہوتا تو اس حکم شرعی کے جاننے اور اس پر عمل کرنے کے اوروں کے مقابلے میں حضرات صحابہ زیادہ حقدار تھے۔ (مگر ان سے

منقول نہیں) تو معلوم ہوا کہ یہ عمل بعد کا ساختہ پرداختہ ہے۔

علامہ ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کی بیان کردہ ان تفصیلات کا حاصل یہی ہے آنحضرت ﷺ سے دوران قیام صرف دو سکتوں کا ثبوت ہے اور یہ دونوں سکتے اس قدر مختصر ہوتے تھے کہ اس میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی بالکل گنجائش نہیں نیز حضرات صحابہ سے بھی منقول نہیں ہے کہ وہ امام کے پیچھے سکتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے اس لئے سکتوں کے دوران سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اس تجویز کا روایت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔

اس موقعہ پر ہم نے بطور خاص علامہ ابن تیمیہ ہی کی تحقیق پیش کی ہے تاکہ ہمارے ان کرم فرماؤں کو بھی اطمینان ہو جائے جو اپنے آپ کو سلفی کہلانے کے باوجود سلف صالحین وائمہ مجتہدین کے مقابلے میں علامہ ابن تیمیہ کی رائے و تحقیق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ورنہ اس مسئلہ پر دیگر اکابر محدثین و فقہائے مجتہدین کی تحقیقات بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

ان کے مزید اطمنان کے واسطے خود ان کے ہی گھر کی ایک تحقیق اور پیش کی جارہی ہے۔ علامہ یمن، محدث کامل محمد ابن اسماعیل امیر یمانی متوفی ۱۱۸۲ھ تحریر کرتے ہیں۔

" ثم اختلف القائلون بو جوب القرأة فقیل : فی محل سکتات الامام ، وقیل : فی سکوته بعد تمام القرأة و لادلیل لهذین القولین فی الحدیث " (سبیل السلام ج ۱ ص ۱۰۶)

پھر امام کے پیچھے قرأت کو واجب کہنے والے باہم مختلف ہو گئے بعض یہ کہتے ہیں کہ امام کے سکتوں میں (قرأت کرنی چاہئے) اور بعض اس کے قائل ہیں کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے (تو اس وقت مقتدی قرأت کرے) لیکن ان دونوں باتوں کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں۔

آخر میں علامۃ العلماء امام جلیل فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ کی درج ذیل عبارت پڑھئے اور فیصلہ کیجئے از روئے درایت اس تجویز پر عمل کہاں تک ممکن ہے۔

و لقائل ان یقول : سکوت الامام إما ان نقول : انه من الواجبات ، او لیس من الواجبات , و الاول باطل بالاجماع ، و الثانی یقتضی ان یجوز له ان لایسکت ، فبتقدیر ان لا یسکت یلزم ان تحصل قرأة المأموم مع قرأة الامام ، و ذالك یفضی الی ترك الاستماع و الی ترك السکوت عند قرأة الامام و ذالك علی خلاف النص ،

و ایضا فهذا السکوت لیس له حد محدود و مقدار مخصوص و السکتة للمامومین مختلفة با لثقل و الخفة فربما لا یتمکن المأموم من اتمام قرأة الفاتحة فی مقدار سکوت الامام ، و حینئذ یلزم المحذور المذکور ، و ایضاً فالامام انما یبقی ساکتاً لیتمکن المأموم من اتمام القرأة و حینئذ ینقلب الامام ماموماً و المأموم اماماً لان الامام فی هذه

السکوت یصیر کالتابع للماموم و ذالك غیر جائز.

(التفسیر الکبیر ج ۱۵ / ص ۱۰۳ / المطبعۃ مکتب الاعلام الاسلامی ۱۴۱۳ھ)

کہنے والا کہہ سکتا ہے، امام کا سکوت یا تو واجبات سے ہے یا غیر واجبات سے پہلی صورت (یعنی واجب ہونے کی) بالاجماع باطل ہے اور دوسری صورت (یعنی واجب نہ ہونے کی) کا مقتضایہ ہے کہ (سکوت کرے اور) سکوت نہ بھی کرے، اور امام کے سکوت نہ کرنے کی صورت میں لازم ہے کہ مقتدی کی قرأت امام کی قرأت کے ساتھ ساتھ ہوگی جس سے استماع اور انصات (یعنی متوجہ رہنے اور خاموش رہنے) کا ترک ہوگا اور یہ نص قرآنی کے خلاف ہے۔

نیز سکوت کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی مخصوص مقدار ہے۔ اور مقتدیوں کے واسطے یہ سکتہ دراز اور خفیف ہونے میں مختلف ہوگا تو بسااوقات مقتدی امام کے اس سکتہ کی مقدار میں قرأت فاتحہ پوری نہ کر سکے گا ایسی صورت میں وہی ممنوع صورت (یعنی امام کی قرأت کے وقت متوجہ ہونے اور چپ رہنے کا ترک) پیش آئے گا۔

نیز یا تو یہ صورت اختیار کی جائے کہ امام خاموش کھڑا رہے تاکہ مقتدی اپنی قرأت پوری کرلیں اس وقت امام، مقتدی اور مقتدی امام ہو جائے گا اس لئے کہ امام اس سکوت میں گویا کہ مقتدیوں کا تابع ہو گیا ہے اور یہ صورت بھی جائز نہیں ہے۔

اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کا صاف ارشاد ہے " انما جعل الامام لیؤتم به فاذا قرأ فانصتوا " یعنی امام اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء و پیروی کی جائے لہذا جب وہ قرأت کرے تو تم چپ رہو اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں اول یہ کہ مقتدی امام کی اقتداء اور اتباع کریں گے نہ کہ امام مقتدی کی پیروی کرے گا دوسری یہ کہ امام کی اقتداء میں یہ بات شامل ہے کہ جب وہ قرأت کرے تو مقتدی اس کی قرأت کے لئے خاموشی اختیار کریں۔ جس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ امام مقتدی کی قرأت کے لئے سکوت کرے کیونکہ اگر وہ اس سکوت کا مامور ہوتا تو لازمی طور پر اس بات کا بھی مامور ہوتا کہ وہ مقتدیوں کی اقتداء کرے۔ تو اس صورت میں وہ ایک ہی حالت میں امام اور مقتدی دونوں ہو جائے گا اور شخص واحد کا ایک ہی حالت میں امام اور مقتدی دونوں ہونا نہ عقلاً درست ہے اور نہ شرعاً صحیح ہے۔

ان تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ سکتات میں قرأت کی تجویز روایت و درایت دونوں لحاظ سے قابل عمل نہیں اس لئے انسب و احوط راہ یہی ہے کہ امام کی قرأت کے وقت مقتدی حکم خداوندی " و اذا قرئ القرآن فاستمعوا له و انصتوا " پر عمل کرتے ہوئے

محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے انقلابی اثرات

اعجاز ارشد قاسمی مدھوبنی

آفتاب ہدایت کی ارغوانی شعاعوں کو اللہ کے بے شمار بندوں نے قوم و ملت کی وادیوں میں پھیلایا اور حتی المقدور کامیاب بھی ہوئے مگر رشد وہدایت کے نقوش آفتاب ہدایت کے غروب ہوتے ہی دھندلے پڑ جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے نجوم ہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ اخیر میں ایک مہر تاباں عرب کی سنگلاخ زمین پر ایک غیر مہذب وحشی قوم کے در و بام پر طلوع ہوتا ہے اور بہت ہی تھوڑی مدت میں حیوانیت کی حدود میں داخل ہو جانے والی قوم کو انسانیت کے اعلیٰ معیار پر فائز کر دیتا ہے۔ آخر وہ کون ساگر تھا جس نے قعر مذلت میں گری ہوئی قوم کو پوری دنیا میں انسانیت اور اقدار و اخلاق کی شمع روشن کرنے والا بنادیا؟ تہذیب و تمدن سے ناآشنا انسان کو قلیل وقت میں ایسا مہذب اور متمدن بنادیا کہ دنیا کی آنکھوں نے کلچر و تمدن اور تہذیب و ثقافت کا ایسا نمونہ کبھی نہیں دیکھا تھا، ایک دوسرے کے خون کی پیاسی قوم دنیا کو اخوت و محبت اور ایثار و صلہ رحمی کا درس دینے لگی گویا خزاں رسیدہ چمن میں ایسی بہار آئی کہ جس کی خوشبو سے عالم کا چپہ چپہ معطر ہوگیا۔ یہی تو وجہ تھی کہ اس وقت کے وہ دشمن بھی اس حیرت انگیز انقلاب اور ہمہ گیر اثرات پر انگشت بدنداں تھے جو اس مشن کے سخت مخالف تھے کیونکہ وہ سوچنے پر مجبور تھے کہ قتل و غارت گری کی اس گرم بازاری میں امن و آشتی کا یہ گل کیسے کھل رہا ہے؟ ظلم و بربریت کی آندھیوں میں عدل و انصاف کی شمع کیسے روشن ہو رہی ہے؟ کفر و شرک کے ہنگامہ میں توحید کا پرچم کیسے لہرا رہا ہے؟ دراصل اس حیرت و استعجاب کے عالم میں اسے ان انقلابی اثرات کے اسباب و عوامل نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ دشمنی کوئی اصولی نہیں تھی بلکہ اندھی تھی جس کی وجہ سے آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ بہت دبیز پردہ۔

صرف ۲۳/ سال کی قلیل مدت میں اگر اس تعجب خیز انقلابات کا تجزیہ کیا جائے اور ان کے اسباب و عوامل پر غور کیا جائے تو ایک وجہ بہت ہی اہم اور ان ہمہ گیر اثرات کا خلاصہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ ہے

آپ ﷺ کی بے داغ زندگی کا عملی پہلو: بلاشبہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کا ہر گوشہ خواہ سیاسی واقتصادی لائن سے متعلق ہو یا سماجی و معاشرتی قبیل سے، بے داغ اور آئینہ کی طرح صاف ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا فرد جس کا دامن ہر قسم کے عیوب سے پاک و منزہ ہو وہ اپنے قول و عمل کی شیرینی سے حالات کی زہرناکیوں کو میٹھا کر سکتا ہے۔ اور خزاں رسیدہ چمن کو ایمان کی بہار سے سبز و شاداب کر سکتا ہے آج اگر کوئی مربی اپنی تربیت میں یا کوئی معلم اپنی تعلیم میں ناکام ہے تو اس ناکامی کا سبب خود اس کی ذات ہے اگر کوئی مربی اپنی عملی زندگی کو درست کر لے اور اپنے عمل سے تربیت دے تو بلاشبہ مؤثر ہو گی۔

آپ ﷺ کی تربیت کا یہی انداز تھا آپ ﷺ نے اپنے متبعین کو جن چیزوں کی تربیت دی اولاً خود ان پر عمل کر کے دکھایا، آپ ﷺ کے وعظ وارشاد اور پند و نصائح صرف دوسروں کے لیے نہیں تھے بلکہ پہلے خود آپ ﷺ کی ذات کے لیے تھے اللہ رب قدیر نے آپ ﷺ کو بہت ساری چیزوں میں رخصت اور سہولت عطا فرمائی تھی مگر اس کے باوجود آپ ﷺ ایک عام مسلمان کی صف میں رہنا چاہتے تھے۔

آپ ﷺ اگر صحابہؓ کو پانچ وقت کی نماز کا حکم دیتے ہیں تو خود بڑھ کر آٹھ وقت کی نماز ادا فرماتے ہیں۔ جس میں چاشت، اشراق اور تہجد شامل ہوا کرتا تھا۔ تہجد کی نماز تو عام مسلمانوں کے لیے نفل کا درجہ رکھتی ہے لیکن آپ ﷺ کے لیے فرض تھی اور صرف فرضیت ہی کی حد تک ادا نہیں فرماتے تھے بلکہ تہجد کی نماز میں کھڑے کھڑے آپ ﷺ کے مبارک قدم میں ورم ہو جایا کرتے تھے روتے روتے اشکوں سے داڑھی تر ہو جاتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ "یارسول اللہ! جب اللہ رب ذوالجلال نے آپؐ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں تو اتنی عبادت و ریاضت اور مجاہدہ کی کیا ضرورت ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا عائشہ! "کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں"

آپ ﷺ نے اپنے جاں نثاروں کو جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم دیا تو آپ ﷺ کا اس سلسلے میں یہ حال تھا کہ پوری زندگی میں ایک بھی جماعت فوت نہیں ہوئی یہاں تک کہ مرض الوفات میں بھی دوسروں کے کاندھوں کا سہارا لے کر جماعت میں شریک ہوا کرتے تھے۔

آپ ﷺ نے رمضان المبارک کا فرض روزہ رکھنے کا حکم دیا تو اپنا معمول یہ رکھا کہ رمضان کے علاوہ عام دنوں میں بھی روزہ رکھا کرتے تھے، کوئی مہینہ ایسا نہیں گذرتا تھا کہ جس کے چند ایام روزہ کی حالت میں نہ گذرتے ہوں۔

اگر آپ ﷺ نے زکوٰۃ کا حکم دیا تو اپنا یہ حال تھا کہ گھر میں وقتی ضرورت کے علاوہ ایک درہم بھی نہیں رہنے دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مال کا چالیسواں حصہ راہ خدا میں خرچ کرنے کا حکم دیا اور اس سے زیادہ صدقہ کرنے کا حسب توفیق اختیار دیا تو خود آپ ﷺ نے لوگوں کو اس کا عادی بنانے کے لیے بے مثال عملی نمونہ پیش کیا کہ وقتی ضرورت کے علاوہ گھر میں ایک درہم بھی آئندہ وقت کے لئے رکھنا گوارہ نہیں کیا ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد فوراً گھر تشریف لے گئے اور جلد ہی واپس آ گئے صحابہ کرامؓ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ "نماز میں مجھے

خیال آیا کہ گھر میں سونے کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہے یہ بات ذہن میں آئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات آجائے اور سونے کا یہ ٹکڑا گھر میں پڑا رہ جائے"

حضرت امہ سلمہؓ بیان کرتی ہے کہ ایک مرتبہ رسول ﷺ گھر میں اس حال میں تشریف لائے کہ چہرہ مبارک پر رنجیدگی کے آثار نمایاں تھے میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا"ام سلمہؓ! رات سات دینار گھر میں پڑے رہ گئے تھے" یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ ﷺ مرض وفات میں مبتلا تھے، اس کس مپرسی کی حالت میں بھی آپ ﷺ یہ حکم دیتے ہیں کہ "اسے خیرات کردو کہیں ایسا نہ ہو کہ محمد (ﷺ) کی وفات ہو جائے اور اس کے گھر میں یہ دینار پڑا رہ جائے" آپ ﷺ عام مسلمانوں کو گھر والوں کی رعایت کرنے کا حکم دیا، آپ ﷺ کی تعلیم یہ تھی کہ جوش میں آکر گھر کا سارا مال خرچ نہ کردو بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق بچاکر باقی اللہ کی راہ میں خرچ کردو لیکن خود آپؐ نے اس پر عمل اس طرح کیا کہ گھر میں ایک درہم بھی کبھی باقی رہنے نہیں دیا۔ تاکہ عام مسلمان بھی اس کے عادی بن جائیں جو اسلام میں مطلوب ہے آپ ﷺ کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی" **لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون** "(تم نیکی کا مقام ہرگز اس وقت تک حاصل نہ کرسکو گے جب تک اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ نہ کرو) تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنی ان تمام چیزوں کو جن کو برسوں سے حرزجان بنائے ہوئے تھے بہت ہی فراخ دلی کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور پسندیدہ ترین چیزوں کو خرچ کر کے مسابقت کا انمول نمونہ پیش کیا۔

آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو زہد و قناعت کا درس دیا تو اولاً اس پر خود تاریخ ساز طریقے سے عمل کیا غزوۂ احزاب کے موقع پر صحابہ کرامؓ نے بھوک کی شکایت کی اور بھوک کی شدت کے احساس کو کم کرنے کے لیے پیٹ پر جو پتھر باندھے ہوئے تھے اسے کھول کر دکھایا تو آپ ﷺ نے اپنا بطن مبارک کھول دیا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

آپ نے اپنے متبعین کو مساوات و بھائی چارگی کی تعلیم دی تو خود اس پر عمل کر کے بے مثال نمونہ پیش کیا۔ غزوۂ خندق کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک عام سپاہی کی طرح اپنے لیے بھی خندق کی کھدائی کا اتنا ہی حصہ متعین کیا جتنا دوسروں کے لیے تھا اور بہ نفس نفیس کدال لے کر مدینہ کے دفاع کے لیے خندق کی کھدائی کا کام انجام دیا یہ نہیں کہ امیر ہیں اور صرف حکم دے رہے ہیں بلکہ عام سپاہی کی طرح بھوک و پیاس کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے خندق کی کھدائی میں مصروف ہیں آپ کے اسی عمل کی نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ نے خندق کی کھدائی میں جس مجاہدہ کا ثبوت دیا دنیا کی کسی تاریخ میں ایسے عظیم مجاہدہ کا نمونہ نہیں ملے گا۔

ایثار و قربانی کی تقریباً دنیا کے ہر معلم نے تعلیم دی ہے جو صرف الفاظ ہی تک محدود ہے لیکن انسانیت کے معلم اعظم نے ایثار کی صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ اسے عملی جامہ پہنا کر امت کے سامنے پیش کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا صرف عربی عورتوں کی ہی سردار نہیں بلکہ دونوں جہاں کی عورتوں کی سردار اور آپ کی چہیتی

چھوٹی بیٹی ہیں چکی میں آٹا پیستے پیستے ہاتھ گھس جاتے ہیں ایک مرتبہ اپنے والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں اور ایک خادمہ کی فرمائش کرتی ہیں تو مشفق باپ کی جانب سے یہ جواب ملتا ہے کہ "فاطمہ! ابھی صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے اس لیے تمہاری درخواست پر عمل مشکل ہے۔

آپ ﷺ نے صبر و تحمل اور عفو و درگذر کا درس دیا تو خود اس پر عمل کا خاص اہتمام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ صبر و تحمل اور حلم و بردباری آپ ﷺ کی عملی زندگی کا خاص گوشہ ہے۔ لین دین کا معاملہ آپ کا بالکل صاف ہوتا تھا قرض داروں کی بروقت ادائیگی آپ ﷺ کا شیوہ تھا مگر اس کے باوجود ایک قرض دار آپ کے پاس آتا ہے اور بہت ہی سخت الفاظ میں اپنے قرض کا مطالبہ کرتا ہے۔ صحابہ کرامؓ اس شخص کی اس اشتعال انگیزی کو دیکھ کر برہم ہو جاتے ہیں اور بدلہ لینے اور گستاخی کا مزہ چکھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر آپ ﷺ (جو کہ صبر و تحمل اور عفو و درگذر کے پیکر مجسم تھے) یہ فرماتے ہیں کہ "**دعوہ فان لصاحب الحق مقالاً**" یعنی اسے چھوڑ دو اس لیے کہ صاحب حق کو بات کہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کے موقع سے عفو درگذر کی جو نظیر آپ ﷺ نے قائم کی اسے ساری دنیا بخوبی جانتی ہے۔ اہل مکہ نے آپ ﷺ کو جتنی تکلیفیں دی تھیں اور عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ ﷺ اس کا بدلہ لیتے لیکن آپؐ نے معافی کا ایسا حسین جملہ ارشاد فرمایا جو رہتی دنیا تک تاریخ میں سنہرے حرف سے لکھا جائے گا۔

"**لا تثریب علیکم الیوم فاذھبوا انتم الطلقاء**" (آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں ہے جاؤ تم سے آزاد ہو)

آپ ﷺ کے اسی عملی کردار کا یہ انمول ثمرہ نکلا کہ عرب کی وحشی قوم جو تہذیب و ثقافت سے یکسر عاری تھی مہذب و متمدن بن کر پوری دنیا میں علم و تہذیب اور کلچر و ثقافت کی شمع روشن کرنے لگی اس حیرت انگیز انقلابات اور انسانی دنیا پر ہمہ گیر اثرات کا بنیادی سبب آپ ﷺ کی زندگی کا عملی پہلو تھا، آپ ﷺ کی تعلیم محض الفاظ کے اس فلسفہ تک محدود نہیں تھی جس پر حسین خول چڑھا دیا گیا ہو بلکہ تعلیم کے ساتھ عملی کردار تھا۔ احادیث کے ذخائر کا استقرار کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ عالم انسانیت پر انقلاب برپا کرنے اور ہمہ گیر اثرات ڈالنے میں آپ ﷺ کی تعلیم کا جس قدر رول ہے اس سے کہیں زیادہ بنیادی سبب آپ ﷺ کا عملی کردار ہے احادیث کی جن کتابوں میں احادیث کا سب سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے ان میں "کنز العمال" کا نام سر فہرست آتا ہے۔ فعلی حدیثیں کنز العمال میں زیادہ ہیں اور قولی احادیث کم ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیم صرف الفاظ کی خوشنمائی تک محدود نہیں ہے بلکہ تعلیم پر تعمیل کا حسین خول چڑھا ہوا ہے اور جس مربی کا انداز تربیت ایسا ہو تو بلاشبہ ایک انقلابی تربیت ہوگی جس کا مشاہدہ پوری دنیا عرب کی بدوی قوم کی صورت میں چودہ صدی پہلے سے کر رہی ہے۔ آج مربی و معلم کی تعلیم و تربیت صرف شعلہ بیانی تک محدود ہے جو وقتی طور پر سامعین کو اپنی طرف تو متوجہ کر لیتی ہے مگر اثر انداز نہیں ہوتی اس کی وجہ صرف اور صرف خلوص کا فقدان اور

خالق کائنات کی کبریائی پر پھول اور پتوں کی گواہی

محمد خالد بیگوسرائے — معین مدرس دار العلوم دیوبند

گیا ہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لاشریک لہ گوید

یوں تو کائنات اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے وجود پر شاہد عدل ہے اور ایک ادنی سے ادنی ذرہ سے لے کر کہکشاں تک اس کائنات میں پائی جانے والی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی دے رہی ہیں اور اس کی لازوال قدرت اور عظمت و کبریائی کے نغمے گنگنا رہی ہیں۔

فِی کُلِّ شَیْئٍ لَہٗ آیۃ ☆ تدل علی انّہٗ واحد

(یعنی دنیا کی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں، جو اللہ کے ایک ہونے پر غماز ہیں)

ان ظاہر اور واضح علامتوں میں اگر کوئی عقل سلیم رکھنے والا انسان اپنے گرد و پیش سے الگ ہو کر یکسوئی کے ساتھ غور و فکر کرتا ہے اور اس سلسلے میں اپنے قوائے فکریہ کو بروئے کار لاتا ہے تو بے ساختہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی عظیم قدرت کا اقرار کرنے لگتا ہے۔

اسی لیے خداوند قدوس نے اپنی کتاب مقدس میں جگہ جگہ کائنات کی وسعتوں اور اس کے ہشت پہل نظاروں میں غور و فکر کی دعوت دی ہے ارشاد باری ہے:

ان فیخلق السمواتو الارضو اختلاف اللیل والنھارلآیات لاولی الالباب(آلعمران ۱۹۰)

(ترجمہ) بیشک آسمان اور زمین کا بنانا اور رات اور دن کا آنا جانا، اس میں (بڑی) نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔(ترجمہ شیخ الہند)

دوسر جگہ ارشاد ہے جو اس سے بھی واضح انداز میں ہے:

ان فی السموات والارض لآیت للمومنین وفی خلقکم وما یبث من دابّة آیت لقوم یوقنون واختلاف اللیل والنھار وماا نزل اللہ من السماء من رزق فأحیا به الأرض بعد موتھا وتصریف الریاح آیت لقوم یعقلون(جاثیہ ۳تا۵)

بیشک آسمان میں اور زمین میں بہت نشانیاں ہیں ماننے والوں کے واسطے اور خود تمہاری اور ان حیوانات کی آفرینش میں جن کو اس نے پھیلا رکھا ہے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں، اور (اسی طرح) رات اور دن کے بدلنے میں اور اس رزق میں جسکو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا پھر اسی زمین کو تر و تازہ کر دیا اس کے خشک ہونے کے بعد اور ہواؤں کے بدلنے میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ سے کام لیتے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمام چیزیں انہیں لوگوں کے لیے نشانی ہیں جو عقل دانار کھتے ہیں اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔

لیکن گمراہی میں پھنسے کور مغزوں اور کم عقلوں کے لیے اس وسیع کائنات میں پائی جانے والی نشانیاں اور دلائل ہدایت کا سبب اور حق کے لیے راہنما نہیں بن پاتیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے لیے عام مظاہر قدرت سے ہٹ کر ایسی ایسی روشن نشانیوں کو ظاہر فرماتا ہے جس کے بعد انسانوں کے لیے مفر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور وہ مجبور ہو کر اللہ کی وحدانیت اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی رسالت اقرار کر لیتا ہے یا بصورت انکار اپنا ٹھکانا جہنم بنالیتا ہے اگر یہ حیران کن نشانیاں کسی نبی کے واسطے سے ظاہر ہوتی ہیں تو انہیں "معجزہ" کا نام دیا جاتا ہے اور کسی ولی اللہ کے واسطے سے ظاہر ہوتی ہیں تو انہیں "کرامت" کہتے ہیں۔

مگر معجزہ اور کرامت کے علاوہ بھی قدرت کے عام نظاروں مثلاً پھول، پتے، پھل اور درخت وغیرہ میں بھی قدرتی طور پر ایسی خاص نشانیاں اور علامتیں ظاہر ہوتی ہیں، جنہیں دیکھ کر انسان مبہوت و ششدر رہ جاتا ہے، اور اگر ذرا بھی غور کرے تو خالق کائنات کی عظمت و کبریائی اور اس کی بے مثل صناعی پر یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ذیل میں اسی نوعیت کے چند ایسے دلچسپ واقعات

کی صنم آشنا سرزمین پر رونما ہوتے رہے اور جنہوں نے یہاں کی غیر مسلم عوام میں غیر معمولی اثرات چھوڑے۔

کالے گلاب کی گواہی:

پہلے مشاہد: حضرت ابوالحسن علی بن عبد اللہ الہاشمی الرقی اپنے ہندستان جانے کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "میں ہندستان گیا، وہاں میں نے ایک شہر میں (سرخی مائل) ایک کالے گلاب کا درخت دیکھا، جس پر سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا پھول کھلا ہوا تھا، خوشبو بہت عمدہ، اس پھول پر سفید رنگ میں لکھا ہوا تھا لا الہ الا اللہ، محمد الرسول اللہ، ابوبکر الصدیق، عمر الفاروق، اس پھول کو دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ پھول بناوٹی ہو (اس لیے میں آزمانا ضروری خیال کیا) پھر میں نے آزمائش کے لیے ایک کلی توڑی جو ابھی کھلی بھی نہ تھی، میں نے اس کی پتیوں کو توڑا تو اس میں بھی وہی لکھا ہوا دیکھا جو دوسرے شگفتہ پھولوں میں لکھا ہوا تھا اس اہم واقعہ کا پورے شہر میں چرچا تھا" (۱)

(اخرجہ ابن عساکر و ابن النجار)

ایک خوشنما پھول کی گواہی:

دوسرے مشاہد: ..... علامہ ابن قتیبہؒ "عیون الاخبار" میں کلیب ابو وائل سے روایت کرتے ہیں کہ کلیب ابو وائل نے فرمایا کہ "میں ملک ہندستان گیا وہاں میں نے ایک درخت دیکھا، اس پر ایک سرخ رنگ کا خوشنما پھول کھلا ہوا تھا، جس پر سفید رنگ میں لکھا ہوا تھا "محمد رسول اللہ" یہ درخت گلاب کے پودے کے مشابہ تھا (۲)

حافظ ابن حجرؒ "لسان المیزان" میں انہیں کلیب ابو وائل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ملک ہندستان میں ایک گلاب کا پودا دیکھا تھا، اس پر کھلے ہوئے گلاب میں سفید رنگ سے لکھا ہوا تھا محمد رسول اللہ کلیب کے بارے میں روایت یہ بھی ہے وہ صحابی رسول تھے (لسان ص ۴۹۰ ج ۴)

تیسرے مشاہد: ..... مشہور ہندستان تاریخ نویس بزرک بن شہریار "عجائب الہند" میں رقمطراز ہیں کہ مجھ سے ہندستان جانے والے ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے مانکیر قصبہ کے نواحی علاقے میں ناریل کی طرح کا ایک درخت دیکھا، اس درخت پر گلاب سے مشابہ سرخ پھول کھلا کرتا تھا اور اس پر سفید رنگ میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوتا تھا۔

(عجائب الہند بحوالہ العقد الثمین ص ۸ ے)

(۱) ازالۃ الخفاء ص ۳۴۳ بحوالہ عبد زریں ص ۶۸ (۲) عیون الاخبار ج ۲ ص ۱۰۵ بحوالہ العقد الثمین ص ۸ ے

درخت شہادت:

چوتھے مشاہد:...... مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ عجائب الاسفار میں تحریر فرماتے ہیں کہ مجھ سے فقیہ حسین نے مالابار کے بادشاہ کوئل کے راجا (جو کہ مسلمان ہوگئے تھے اور جنہوں نے اپنے علاقے میں مسجدیں تعمیر کروائیں) کے اسلام لانے اور اس کے عوامل کے حوالے سے ایک عجیب وغریب اور دلچسپ واقعہ سنایا، شیخ حسین نے کہا کہ میں مالا بار شہر کی جامع مسجد گیا، وہاں مسجد سے متصل ایک ہرا ابھرا درخت دیکھا جس کے پتے انجیر کے پتوں کے مشابہ تھے، مگر انجیر کے مقابلے میں بہت ہی نرم، اس کے ارد گرد چاروں طرف طویل وعریض دیواریں تھیں اور اس کے قریب ہی ایک محراب واقع تھا جس میں میں نے دو رکعت نفل نماز پڑھی اس انوکھے قسم کے درخت کو وہاں کے لوگ "درخت شہادت" کہا کرتے تھے، اسی وقت لوگوں نے مجھ سے اس درخت کو "درخت شہادت" کہے جانے کے متعلق بتایا کہ جب پت جھڑ کا موسم آتا ہے تو اس درخت کے پتوں میں سے ایک نہایت ہی مختلف قسم کا پتہ گرتا ہے جس کا رنگ اولاً ہرا ہوتا ہے پھر گرتے وقت پیلا ہوتا اور پھر سرخ ہوجاتا ہے، اور اس پتے پر (سفید رنگ میں) قدرت کے قلم سے یہ تحریر لکھی ہوئی ہوتی ہے:

"لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ"

ابن بطوطہ مزید کہتے ہیں کہ فقیہ حسین کے علاوہ بھی شہر کے معتمد لوگوں کی ایک بڑی جماعت نے مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے درخت کے اس متبرک پتے کا مشاہدہ کیا اور اس پر لکھی ہوئی تحریر بھی پڑھی۔

ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ جب اس پتہ کے گرنے کے ایام آتے ہیں تو اس درخت کے نیچے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سے کچھ قابل اعتماد لوگ بیٹھ جاتے ہیں، جب یہ پتہ درخت سے گرتا ہے تو اس میں کا ایک آدھا مسلمان لے لیتے ہیں، اور آدھے پتے کو بادشاہ کے خزانے میں رکھ دیا جاتا ہے اس پتے سے لوگ مریضوں کے لئے شفا بھی طلب کرتے ہیں اور یہی درخت راجہ کوئل کے دادا کے اسلام لانے کا سبب بنا تھا اس لیے کہ وہ عربی خط پڑھ لیا کرتے تھے، چنانچہ جب انہوں نے اس پتے میں لکھی ہوئی تحریر پڑھی اور اس کا مطلب سمجھ لیا تو انہوں نے اپنے اسلام کا اعلان کردیا، اور بلند ہمتی کے ساتھ اسلام پر قائم رہے" (عجائب الاسفار ص ۱۱۴ ج ۲)

لمحۂ فکریہ:

یہ چند مضبوط تاریخی شہادتیں تھیں جو یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مختلف زمانے میں

س صنم آشنا سر زمین (ہند) کے سینے سے ایسے پھول و پودے بھی اگتے رہے ہیں، جو اپنی بے نطق زبانوں سے مدتوں توحید و رسالت کی نغمہ سرائی کرتے رہے اور اللہ جل جلالہ کی عظیم قدرت و طاقت اور اس کے فرستادہ نبی کی نبوت پر مہر تصدیق ثبت کرتے رہے۔

ان چشم کشا واقعات سے جہاں ایک طرف اسلام کے حوالے سے ملک ہندستان تئیں قدرت کے فیصلے کا اشارہ ملتا ہے، وہیں دوسری طرف یہ واقعات گم کردہ راہ انسانیت کو سیدھا راستہ دکھانے، کور چشموں کی آنکھیں، کھولنے اور بھٹکے ہوئے مخلوق کا رشتہ خالق سے جوڑنے کے لیے تازیانہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس طرح کی روشن کرشمہ قدرت کو دیکھ کر اللہ کے بہت سارے بندوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور عقلوں پر پڑا کفر و شرک کا دبیز پردہ تار تار ہو جاتا ہے، اور انسان اپنا رشتہ اپنے حقیقی خالق و مالک سے جوڑ لیتا ہے (جیسا کہ اوپر مالابار کے راجہ کے بارے میں بیان کیا گیا)

گذشتہ زمانے کی طرح آج کل بھی ایسے واقعات اور قدرت کے کرشمے رونما اور ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور قانون فطرت کے مطابق آئندہ بھی رونما ہوتے رہیں گے۔ لیکن آج کم لوگ اس سے بیدار ہوتے ہیں اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرتے ہیں، اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو لیت و لعل، بال کی کھال نکالنے، بات کا بتنگڑ بنانے کہ یوں بنا، ایسے بنایا گیا، ایسے بھی بنایا جا سکتا ہے وغیرہ خرافات میں الجھ کر اصل واقعہ کی اہمیت فراموش کر بیٹھتے ہیں، کاش! انسان غور کرتا اور دیدۂ عبرت سے دیکھتا تو یہ بات عیاں ہو جاتی کہ یہ اسی ذات کے مظاہر قدرت کے اعلیٰ ترین کرشمے ہیں جس نے ذرّوں کو آفتاب کی تابانی عطاء کی، اور یہ بے مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا۔

نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ و ماہی

بقیه صفحه (۵۲) کا

امام بخاریؒ نے امام احمدؒ کی بات نقل کی ہے، اس سے بھی کام نہیں بنتا، کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوا کہ سفیانؒ کی روایت میں "لم یعد" کا اضافہ ہے جو عبداللہ بن ادریسؒ کی کتاب میں نہیں ہے، دونوں راوی ثقہ ہیں اور ان دونوں میں سفیانؒ کو اوثق قرار دیا گیا ہے، عبداللہ بن ادریسؒ کو صرف ثقہ فقیہ عابد وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے جبکہ سفیانؒ کو ثقة حافظ فقيه عابد امام حجة کے القاب عالیہ کا مستحق سمجھا گیا ہے، اس لئے سفیان کی روایت میں کوئی اضافہ ہے تو اس کو ثقہ کے مقابلہ پر اوثق کا اضافہ ہونے کے سبب مقبول قرار دینا چاہئے۔

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمزوری امام بخاری کے پیش نظر بھی ہے، اس لئے وہ ثقہ کو اوثق کے برابر لانے کے لئے یہ فرمارہے ہیں کہ کتاب، اہل علم کے یہاں زیادہ محفوظ چیز ہے لیکن ہم مضمون کی اس تصدیق سے قاصر ہیں، کیا کہیں یہ اصول دکھایا جاسکتا ہے کہ ثقہ کا ضبط کتاب، اوثق کے ضبط صدر کے مقابلہ پر قابل ترجیح ہے؟ ہم نے تو محدثین کا یہی ذوق دیکھا ہے کہ ان کے یہاں ضبط صدر کی اہمیت ضبط کتاب سے زیادہ ہے اور اسی لئے محدثین کے یہاں ایسے واقعات بکثرت پیش آئے ہیں جس میں انہوں نے اپنے بے مثال حافظہ کی مدد سے کتابت کے اوہام واغلاط کی تصحیح کی ہے تو امام بخاری کی اس بات کو کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟

نیز امام بخاری کا اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تطبیق والی روایت کو پیش کر کے یہ کہنا کہ یہ محفوظ ہے اور اس میں "لم یعد" نہیں ہے اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ یہاں دو روایتیں ہیں اور دونوں کا الگ الگ ہونا سیاق سے واضح ہے، ایک روایت تو وہ ہے کہ جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ کہا کہ کیا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں، پھر عبداللہ بن مسعودؓ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور "رفع یدیہ اول مرۃ ثم لم یعد" اور دوسری روایت وہ ہے جسے امام بخاری نے جزء رفع الیدین میں اور امام احمد نے (مسند ص ۴۱۸ ج ۱) میں نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نماز سکھائی، پھر آپ کھڑے ہوئے، تکبیر تحریمہ کہی اور رفع یدین کیا پھر رکوع میں گئے اور دونوں ہاتھوں کی تطبیق کی وغیرہ الخ، بالکل صاف بات ہے کہ پہلی روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ عملی تعلیم دے رہے ہیں، اور قام، رفع یدیہ وغیرہ میں فاعل کی ضمیر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف راجع ہے اور دوسری روایت میں وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کو نقل فرمارہے ہیں اور اس میں قام، کبّر اور رفع کی ضمیر فاعل حضور ﷺ کی طرف راجع ہے، امام بخاری یہ چاہتے ہیں کہ دونوں روایتوں کو ایک قرار دے کر اضطراب دکھلائیں، پھر تطبیق والی اس روایت کو محفوظ قرار دیں جس میں "لم یعد" نہیں ہے، لیکن یہ زبردستی کی بات ہے، دونوں روایتیں بالکل الگ الگ ہیں، اور ان میں ایک کو محفوظ قرار دے کر دوسری روایت کو کمزور کرنے کی کوشش ناقابل فہم ہے۔

اور اگر بخاری کے احترام میں دونوں روایتوں کو ایک فرض کر لیا جائے تب بھی "لم یعد" کے اضافہ پر اشکال نہیں ہو سکتا، کیونکہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اضافہ کرنے والے راوی سفیان ہیں جو اضافہ بیان نہ کرنے والے راوی عبداللہ بن ادریسؒ سے کہیں بلند مرتبہ ہیں اور انکے اضافہ کو قبول کرنا محدثین کے اصول کے مطابق ضروری ہے۔

(بقیہ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

ایک رمضان میں

چاند اور سورج کو گرہن لگنا

از:۔ جناب مولانا منظور احمد چنیوٹی

الحمد لله وحده والصلوة والسلام علی من لانبی بعده. اما بعد

ظہور مہدی کا ایک آسمانی نشان:۔ ہفت روزہ,,الفضل،، انٹر نیشنل

لندن جلد نمبر ۲ شمارہ (۳۰) ۳۱ جمعہ ۹/ جولائی ۱۹۹۴ء صفحہ ۹ پر،، خدائے قادر کی گواہی کا درجہ رکھنے والی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مہتم بالشان پیشگوئی،، کے عنوان سے ایک صاحب جن کا نام درج نہیں ان کا چار صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے جس میں رمضان المبارک کے مہینہ میں چاند اور سورج کے گرہن لگنے کو مرزا قادیانی کی صداقت پر خدا تعالی کی گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے اس گرہن کو حضور ﷺ کی ایک مہتم بالشان پیشگوئی قرار دیتے ہوئے مضمون نگار نے اس پیشگوئی کی نسبت بار بار رسول اکرم ﷺ کی طرف کی ہے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی ناکام کوشش کی ہے حضور صلی اللہ علہ وسلم کے ارشاد کے مطابق آپ پر دانستہ جھوٹ بولنے والے کا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔ قادیانی اکثر اس پیشگوئی کا ذکر کر کے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مذکور مضمون نگار نے بھی اس مضمون میں کئی ایک مغالطے دیئے ہیں درج ذیل سطور میں ان مغالطوں کی نشاندہی کی جاتی ہے تاکہ قارئین کرام خود فیصلہ کر سکیں کہ اصل پیشگوئی کیا تھی؟ اور مرزا قادیانی اس پیشگوئی کے مطابق بھی کیا سچا مہدی مانا جاسکتا ہے؟

پہلا مغالطہ:۔

سب سے بڑا مغالطہ تو یہ ہے کہ اسے حضور اکرم ﷺ کی ایک مہتم بالشان پیشگوئی بتایا گیا ہے

اور مضمون نگار نے بار بار اس نسبت کا تکرار کیا ہے حالانکہ اس روایت کے ظاہر الفاظ کے مطابق بھی یہ حضور ﷺ کی حدیث قطعاً نہیں بلکہ اسے امام محمد باقر کا ایک قول بتایا گیا ہے احادیث کے ذخیرہ میں یہ حدیث حضور ﷺ سے کہیں بھی مذکور نہیں ہے اور نہ ہی امام محمد باقر نے اسے ”قال رسول اللہ،، کہہ کر حضور کی طرف منسوب کیا ہے لہذا اس قول کو حدیث رسول بنا کر پیش کرنا سرکار دوعالم ﷺ پر بہتان عظیم اور کذب وافترا ہے اور حسب حدیث ایسا کرنے والے کا ٹھکانہ جہنم میں ہے ہم بلاخوف تردید قادیانی امت کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اسے حضور سرکار دوعالم ﷺ کی مرفوع حدیث ثابت کریں اور دس ہزار روپے کا نقد انعام پائیں۔ ہے کوئی قادیانی مرد میدان جو اپنے بنائے ہوئے نبی کو سچا ثابت کر سکے اور یہ انعام حاصل کرے؟

دوسرا (۲) مغالطہ

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق حضور اکرم ﷺ کی صریح اور صحیح احادیث میں امام مہدی کی تفصیلی علامات مذکور ہیں جن میں امام مہدی کا نام ”محمد“ ان کے باپ کا نام عبد اللہ“ ان کا خاندان اور نسب حضرت فاطمۃ الزہراء سے بتایا یعنی وہ فاطمی سید ہوگا مکہ مکرمہ میں بیت اللہ شریف کے پاس بیٹھا ہوگا اور لوگ اسکی بیعت کریں گے امام مہدی حج کریں گے عیسی علیہ السلام کے نزول کے وقت دمشق کی جامع مسجد میں نماز کے وقت موجود ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نماز پڑھانے کی پیش کش کریں گے پھر عیسی علیہ السلام سے مل کر یہودیوں سے جنگ کریں گے یہودیوں کا دنیا میں نام ونشان مٹ جائے گا۔ امام مہدی اور عیسی علیہ السلام کے زمانہ میں پوری دنیا پر اسلام کو غلبہ نصیب ہوگا شرک وکفر کا نام ونشان نہ رہے گا ظلم مٹ کر عدل وانصاف قائم ہوگا۔ جنگیں اور جھگڑے ختم ہو جائیں گے شیر اور بکری ایک گھاٹ سے پانی پئیں گے اور اسی قسم کی دیگر واضح اور صریح علامات ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی مرزا قادیانی میں نہیں پائی گئی ان تمام واضح علامات کو چھوڑ کر ایک ایسے قول کا سہارا لینے کی کوشش کی جو سنداً بالکل غلط انتہائی ساقط اور ناقابل اعتبار ہے ذرا اس کی سند کا حال ملاحظہ فرمادیں اس روایت کا پہلا راوی ,,عمرو بن شمر،، ہے اس کے متعلق فن رجال کے مشہور امام علامہ شمس الدین ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب ”میزان الاعتدال“ جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۶۲ پر لکھتے

ہیں۔ لیس بشیئی کذاب ،رافضی ، یشتم الصحابة، یروی الموضوعات عن الثقات منکر الحدیث ، لایکتب حدیثه متروك الحدیث۔ان نوعنوانوں سے راوی کی "جلالت شان" واضح ہو رہی ہے کہ یہ کذاب رافضی تھا صحابہ کرام کو گالیاں دیتا تھا، من گھڑت اور جھوٹی روایات بنا کر ثقہ لوگوں کی طرف منسوب کرتا تھا۔ منکرالحدیث اور متروک الحدیث تھا اسکی حدیث نہ لکھی جائے ،دوسرا راوی ,,جابر،، ہے اس نام کے بہت سے راوی ہیں یہاں کونسا "جابر" مراد ہے کسی کو کچھ پتہ نہیں ایک مجہول آدمی ہے شاید یہ "جابر جعفی ہو" جسکے متعلق امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس قدر مجھے جھوٹے لوگ ملے ہیں ,,جابر جعفی،، سے زیادہ جھوٹا میں نے کسی کو نہیں پایا۔

تیسرا راوی ,,محمد بن علی،، ہے اس نام کے بہت سے راوی ہیں اس کی کوئی دلیل نہیں کہ اس "محمد سے محمد باقر" ہی مراد ہوں۔ کیونکہ "عمرو بن شمر" مذکور کی عادت تھی کہ وہ ثقہ راویوں کی جانب من گھڑت "موضوع" روایت منسوب کرکے نقل کیا کرتا تھا۔ اب از راہ انصاف غور فرمالیں کہ صحیح روایات میں دی گئی واضح علامات کو چھوڑ کر کس بات پر استدلال کی بنیاد رکھی جارہی ہے جب اسکی سند کا یہ حال ہے تو وہ کیسے قابل حجت ہو سکتی ہے اور پھر عقائد جیسے اہم معاملہ میں جس میں قطعیات کے سوا کوئی دلیل قابل قبول نہیں ہوتی۔

تیسرا (۳) مغالطہ :۔

بفرض محال اسے امام محمد باقر کا قول مان بھی لیا جائے اور اس کی نا قابل اعتبار سند سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو بھی اس سے مرزا قادیانی اپنے دعوے میں سچا ثابت نہیں ہوتا۔ اور وہ اس قول کا ہرگز مصداق نہیں بنتا۔ کیونکہ امام محمد باقر فرماتے ہیں ان لمھدینا آیتین لم تکونا منذ خلق الله السموات والارض ینکسف القمر لاول لیلة من رمضان وتنکسف الشمس فی النصف منه ولم تکونا منذ خلق الله السموات والارض (دارقطنی جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۸۸)

ترجمہ: یعنی ہمارے مہدی کی دو علامتیں ایسی ہوں گی کہ جب سے اللہ تعالی نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے ایسی علامتیں کبھی ظہور میں نہیں آئی ہوں گی ایک تو چاند گرہن لگے گا رمضان کی پہلی

رات میں اور دوسرا سورج گرہن لگے گا رمضان کے نصف میں اور جب سے اللہ تعالی نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے ایسے گرہن (ان تاریخوں میں) کبھی نہیں لگے ہوں گے۔

مرزا قادیانی کے زمانہ میں رمضان کی جن تاریخوں میں یہ گرہن لگا تھا وہ اس قول کے مطابق نہیں ہے بلکہ مرزا قادیانی کے زمانہ میں رمضان کی ۱۳ر کو چاند گرہن اور ۲۸ر کو سورج گرہن لگا اور قانون قدرت کے مطابق ان تاریخوں میں اس سے قبل ہزاروں مرتبہ ایسے گرہن لگ چکے ہیں امام باقر کے قول کے مطابق امام مہدی کی علامت یہ ہوگی کہ خلاف معمول چاند گرہن رمضان کی پہلی تاریخ میں لگے گا اور سورج گرہن بھی خلاف معمول رمضان کے نصف میں لگے گا جبکہ اس سے پہلے ان تاریخوں میں جب سے آسمان اور زمین بنے ہیں کبھی بھی ایسا گرہن نہیں لگا ہوگا۔ قارئین کرام خدارا انصاف کریں کیا مرزا قادیانی اس قول کے مطابق سچا مہدی ثابت ہوا؟ جبکہ اسکے زمانہ میں چاند اور سورج دونوں گرہن امام محمد باقر کی بیان کردہ تاریخوں میں نہیں لگے بلکہ اس قسم کے گرہن ہزاروں مرتبہ اس سے پہلے بھی لگ چکے ہیں۔

چوتھا (۴) مغالطہ:۔

مرزا قادیانی نے اس قول کی تاویل کرتے ہوئے اسے اپنے اوپر یوں چسپاں کیا ہے کہ قانون قدرت ہے کہ چاند گرہن ۱۳، ۱۴، ۱۵، ان تین تاریخوں میں کسی ایک تاریخ میں لگتا ہے جب چاند اپنے شباب پر ہوتا ہے اور سورج گرہن چاند کی ۲۷، ۲۸، ۲۹ تین تاریخوں میں سے کسی ایک تاریخ میں لگتا ہے لہذا رمضان کی پہلی رات سے مراد چاند گرہن کی تین راتوں میں سے پہلی رات یعنی ۱۳ر رمضان کی رات مراد ہے اور نصف رمضان سے مراد سورج گرہن کے تین دنوں میں سے درمیانہ دن یعنی ۲۸ر رمضان مراد ہے لہذا مرزا قادیانی کے زمانہ میں ۱۳ر کو چاند اور ۲۸ر کو سورج گرہن جو لگا وہ امام محمد باقر کے قول کے عین مطابق ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ روایت کے الفاظ پر دوبارہ غور فرمالیں روایت کے الفاظ قادیانی کی اس بیہودہ اور لچر تاویل کے ہرگز متحمل نہیں۔ امام باقر نے اول لیلۃ من رمضان فرمایا جس سے واضح طور پر رمضان کی پہلی رات مراد ہے آپ نے اول لیلۃ من لیالی الکسوف نہیں فرمایا

کہ جس سے ۱۳؍رمضان کی رات مرادلی جائے۔دنیامیں کوئی کم عقل ہی ہوگاجو۱۳؍رمضان کواول رمضان کہتا ہو۔اسی طرح فی النصف منه سے مرادرمضان کی نصف یعنی پندرہ تاریخ مراد ہوگی اٹھائیس تاریخ جوکہ رمضان کی آخری تاریخ کہلاتی ہے کونصف رمضان قراردیناکسی عقل کے اندھے ہی کاکام ہوسکتا ہے۔کوئی عقل مند ۲۸؍رمضان کونصف رمضان نہیں کہہ سکتا۔نیز ۲۸؍تاریخ کو ۲۷؍اور۲۹؍کی درمیانی تاریخ کہا جائے گانصف نہیں کہا جاسکتانصف اوروسط کافرق بڑاواضح ہے درمیانی تاریخ کوکبھی مہینے کانصف نہیں کہتے جس طرح تین چیزوں میں دوسری کانصف نہیں بلکہ درمیانی کہاجاسکتاہے۔

پانچواں (۵)مغالطہ:۔

مرزاقادیانی کایہ مغالطہ اورتاویل اس لئے بھی باطل ہے کہ اس قول میں امام محمد باقرنے دو مرتبہ یہ جملہ دہرایاہے”لم تكونا منذ خلق الله السموات والارض“ یعنی ہمارے مہدی کے دو نشان ایسے ہوں گے کہ جب سے آسمان زمین بنے ہیں تب سے ایسے نشان ظاہر نہیں ہوئے ہوں گے یہ قول اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ جب اسے ظاہرالفاظ کے مطابق رکھا جائے یعنی رمضان کی پہلی اورپندرھویں تاریخیں ہی مرادلی جائیں کیونکہ جب سے آسمان زمین بنے ہیں ان تاریخوں میں کبھی چاند اورسورج گرہن نہیں لگا۔ یہ گرہن لگنا بطور خرق عادت ہو گا ان گرہنوں کو ۱۳؍اور۲۸؍میں لانا انہیں گرہنوں کی عادت کے دائرہ میں کھینچنا ہے حالانکہ الفاظ روایت میں اسے پیش ہی خرق عادت کے طورپرکیاگیاہے فرمایالم تكونا منذ خلق الله السموت والارض۔

۱۳؍رمضان کو چاند گرہن اور۲۸؍رمضان کو سورج گرہن مرزا قادیانی سے پہلے بھی ہزاروں مرتبہ لگ چکاہے چنانچہ ماہرنجوم مسٹرکیتھ کی کتاب،،یوز آف دی گلوبز،، اوراسی طرح ،،حدائق النجوم،،دونوں کتابوں میں ۱۸۰۱ء تا۱۹۰۱ءایک صدی کے گرہنوں کی فہرست دی گئی ہے اس میں سے صرف پینتالیس سالوں میں تین مرتبہ انہی تاریخوں میں چانداورسورج گرہن لگا۔

پہلی مرتبہ ۳؍جولائی۱۸۵۱ءمطابق ۱۳؍رمضان۱۲۶۷ھ۔

دوسری مرتبہ ۲۱؍مارچ ۱۸۹۴ءمطابق ۱۳؍رمضان۱۳۱۱ھ۔

تیسری مرتبہ ۲۶ر مارچ ۱۸۹۵ء مطابق ۱۳ار رمضان ۱۳۱۳ھ

مسٹر کیتھ کی کتاب "یوز آف دی گلوبز" اور "حدائق النجوم" ان دونوں کی فہرست کے مطابق پینتالیس (۴۵) سال کے قلیل عرصہ میں تین مرتبہ گرہن لگنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل انہیں تاریخوں میں کئی مرتبہ اور لگ چکا ہوگا۔

گرھن کے متعلق ایك اھم قاعدہ :۔

انسائکلو پیڈیا آف برٹینکا کی ۷ ۲ویں جلد میں گرہن کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سات سو تیرسٹھ برس پہلے سے ۱۹۱۱ء کا تجربہ لکھا ہے۔ جس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ہر ثابت شدہ یا مانا ہوا گرہن ۲۲۳ برس قبل اور بعد میں اسی قسم کا گرہن ہوتا ہے یعنی وہ مانا ہوا گرہن جس مہینہ میں جس طور اور جس وقت کا ہوگا ۲۲۳ برس قبل اور بعد بھی انہیں خصوصیات کے ساتھ ویسا ہی دوسرا گرہن ہوگا۔ اب اس حساب کی روشنی میں غور کرلیں جب ۱۲۶۷ ہجری سے ۱۳۱۳ھ تک چھیالیس برس میں تین مرتبہ گرہنوں کا اجتماع رمضان المبارک کی ۱۳ار اور ۲۸ر تاریخ کو ہوا ہے تو حسب قاعدہ دیکھا جائے کہ کس کس وقت گرہنوں کا اجتماع ۱۳ار اور ۲۸ر رمضان میں ہوا۔

چھٹا (۶) مغالطہ :۔

مرزا قادیانی نے حقیقت الوحی میں دبے لفظوں میں یہ اقرار کیا ہے اس سے پہلے بھی ان تاریخوں میں کئی بار رمضان میں گرہن لگ چکے ہیں۔

اور اسے یوں بدلا ہے کہ رمضان کی ۱۳ار کو چاند گرہن اور ۲۸ر کو سورج گرہن اگر پہلے کہیں لگا بھی ہے تو اس زمانہ میں کوئی مدعی موجود نہ تھا۔ مرزا قادیانی کا یہ بھی ایک مغالطہ ہے جو اسکی دروغ گوئی یا جہالت کی بین دلیل ہے۔ اول تو امام باقر کے قول میں یہ کہیں موجود نہیں کہ اس زمانہ میں کوئی مدعی موجود ہوگا بلکہ سچے مہدی کے یہ دو نشان ہیں جو اس کے زمانہ میں پائے جائیں گے۔ علاوہ ازیں ذیل میں چند مدعیوں کے نام پیش کئے جاتے ہیں جنہوں نے گرہن کی انہی تاریخوں میں دعویٰ کیا ہے یہ چند نام جو ہمارے علم میں ہیں ذکر کئے جارہے ہیں واقع میں کتنے ہوئے

انہیں ماہرین تاریخ ہی جان سکتے ہیں۔

(۱)۔ ۱۱۷ھ مطابق ۷۳۶ء رمضان کی ۱۳ اور ۲۸ تاریخوں میں گرہن لگا تو اس وقت "ظریف" نامی ایک بادشاہ موجود تھا جو صاحب شریعت نبی ہونے کا مدعی تھا۔

(۲) ۱۶۱ھ مطابق ۷۷۹ء رمضان کی انہیں تاریخوں میں گرہن لگا جبکہ اس وقت "صالح" نامی مدعی موجود تھا پھر اسی کے دور میں ۱۶۲ھ مطابق ۷۸۰ء کو بھی رمضان کی مذکورہ تاریخوں میں گرہن لگا۔

(۳)۔ ۳۴۶ھ مطابق ۹۵۹ء رمضان کی انہیں تاریخوں میں گرہن لگا اور اس وقت ابو منصور عیسیٰ مدعی نبوت موجود تھا۔

(۴)۔ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۸۴۔ میں انہی تاریخوں میں گرہن لگا جبکہ امریکہ میں مسٹر ڈوئی اس وقت مسیح موعود ہونے کا جھوٹا مدعی موجود تھا اور اس وقت بہاؤ اللہ ایرانی بھی مدعی موجود تھا

۔(۵)۔ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں انہی تاریخوں میں گرہن لگا جبکہ مرزا غلام احمد قادیانی کے علاوہ بہاؤ اللہ ایرانی ایران میں، مسز فروٹی اور مسٹر ڈوئی امریکہ میں موجود تھے جبکہ مرزا قادیانی یہ صریح جھوٹ بولتا ہے کہ اس گرہن کے وقت میں مہدی موعود ہونے کا مدعی کوئی زمین پر بجز میرے نہ تھا۔

اب غور فرمائیں کہ جب رمضان کی انہی تاریخوں میں پہلے بھی کئی مرتبہ گرہن لگ چکا ہے اور اس زمانہ میں مدعی بھی موجود ہیں تو پھر یہ گرہن مرزا کی صداقت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے

فاعتبروا یا اولی الابصار

ساتواں مغالطہ:۔

مرزا قادیانی لفظ "قمر" سے ایک اور بڑا مغالطہ دیتا ہے۔ چنانچہ مرزا قادیانی اپنی کتاب (انجام آتھم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۳۳۱) پر تحریر کرتا ہے کہ حدیث میں چاند گرہن کے بارے میں قمر کا لفظ آیا ہے بس اگر یہ مقصود ہوتا کہ پہلی رات میں چاند گرہن ہوگا تو حدیث میں "قمر" کا لفظ نہ آتا بلکہ ہلال کا لفظ آتا کیونکہ کوئی شخص اہل لغت اور اہل زبان میں سے پہلی رات کے چاند پر لفظ "قمر" کا اطلاق نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تین رات تک ہلال کے نام سے موسوم ہوتا ہے گویہ لوگ اس علیمت کے ساتھ مولوی کہلاتے ہیں ابتک یہ خبر نہیں کہ پہلی رات کے چاند کو عربی میں کیا کہتے ہیں" پھر علماء پر مزید غصہ نکالتے ہوئے اپنی کتاب تحفہ گولڑویہ روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹ میں لکھتے ہیں۔ اے حضرات خدا سے ڈرو جبکہ حدیث میں "قمر" کا لفظ موجود ہے اور بالاتفاق "قمر" اسکو کہتے ہیں جو تین دن کے بعد یا سات دن کے بعد کا چاند ہوتا ہے۔ تو اب "ہلال" کو کیونکر "قمر" کہا جائے ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے"۔

اب اسے مرزا قادیانی کی بے خبری اور جہالت کہا جائے یا اس کا مغالطہ اور صریحاً دھوکہ! فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑا جاتا ہے۔ مرزا اس زور سے دعویٰ کررہا ہے کہ "قمر" کا اطلاق پہلی تاریخوں پر نہیں ہوتا! اس کا اطلاق تین یا سات راتوں کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "قمر" جس طرح تیسری یا چوتھی یا ساتویں تاریخ کے چاند کو کہتے ہیں۔ اسی طرح مہینہ کی اول کی شب سے لیکر آخر تک کے چاند کو بھی عربی میں "قمر" کہتے ہیں۔ اس کو اس طرح سمجھ لیں کہ چاند کے مختلف اوقات اور مختلف صفات کے لحاظ سے مختلف نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً ہلال، بدر وغیرہ۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی اصلی نام بھی ہو۔ جس پر یہ مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں اور وہ سب میں مشترک ہو اور وہ لفظ "قمر" ہے۔ اس کی مختلف حالتوں کی وجہ سے اس کے مختلف نام ہوتے ہیں۔ یعنی اصلی نام کے سوا اکثر دوسرے نام لئے جاتے ہیں اور جب وہ حالت نہیں رہتی تو صرف اصلی نام لیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو لغت کی مشہور کتاب قاموس اور اس کی شرح تاج العروس" **الهلال غرة القمر وهي اول ليلة**" یعنی ہلال قمر کی پہلی رات کو کہتے ہیں۔ دیکھئے مسئلہ کیسا صاف روشن ہو گیا کہ

"قمر" ایسا لفظ ہے کہ پہلی رات کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور اسے "ہلال" بھی کہتے ہیں۔

صاحب تاج العروس لکھتے ہیں۔" **یسمی القمر لليلتن من اول الشهر هلالا**" یعنی مہینہ کی پہلی دو راتوں میں "قمر" کا نام ہلال رکھا جاتا ہے۔ اس سے بخوبی ظاہر ہو رہا ہے کہ پہلی اور دوسری رات کے چاند کو "قمر" تو کہتے ہی ہیں۔ مگر ہلال بھی اس کا نام ہے۔ "لسان العرب" میں بھی یہی عبارت ہے اور یہ لغت کی ایسی مشہور اور مستند کتاب ہے کہ مرزا قادیانی بھی اسے مستند مانتا ہے۔

یہ کتب کے چند حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ جن سے ثابت ہو گیا کہ پہلی رات کے چاند کو "قمر" کہتے ہیں۔ مگر اس کی حالت خاص کیوجہ سے ہلال اور بدر بھی کہا جاتا ہے نہ یہ کہ اس رات کے چاند کو "قمر" کہنا غلط ہے۔ ان شاہدوں کے علاوہ عظیم الشان شاہد قرآن مجید کا محاورہ ہے۔ ملاحظہ کیا جائے۔ سورت یٰسین میں ہے۔ **والقمر قدرنا منازل حتی عاد کا العرجون القديم(الآیۃ)** یعنی "قمر" کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کی ہیں۔ اس کے بموجب ترقی کرتا ہے۔ پھر اس کی حالت کو تنزل ہوتا ہے۔ یہاں تک سوکھی ٹہنی خمیدہ کے مثل ہو جاتا ہے۔

دوسری آیت سورت یونس کی ہے۔ **هو الذی جعل الشمس ضياء القمرنورا وقدره منازل لتعلموا عددا لسنين والحساب۔(الآیۃ)** یعنی اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے "شمس" (سورج) چمکدار اور "قمر" (چاند) کو نور بنایا اور اس کے لئے منزلیں مقرر کیں۔ تاکہ تم برسوں کی گنتی کر سکو اور حساب جان سکو۔ اہل علم اور عقل ودانش پر سورج کی طرح روشن ہو رہا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں پورے مہینے کے چاند کو "قمر" کہا ہے۔ خواہ وہ پہلی رات کا چاند ہو یا کسی دوسری تاریخ کا اور قرآن کریم میں یہ صرف دو جگہوں پر نہیں۔ بہت جگہوں پر پورے مہینے کے چاند کو "قمر" کہا گیا ہے۔ قرآن کریم کے استعمال اور اہل لغت کی صراحت کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ جس طرح چاند اردو زبان میں ہر رات کے چاند کو کہتے ہیں۔ اسی طرح عربی میں ہر رات کے چاند کو قمر کہتے ہیں خواہ وہ پہلی رات کا چاند ہو یا کسی دوسری رات کا۔ چونکہ عربی زبان، اردو زبان سے بڑی وسیع ہے۔ اس لئے عربی میں بعض خاص حالت کی نظر سے اسے ہلال اور بعض حالت میں اسے بدر کہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان خاص حالتوں میں چاند پر لفظ قمر کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ یہ مطلب ہے

کہ اس خاص حالت کے وقت چاند کے لئے دو لغت ہو گئے۔ایک وہی اصل لفظ "قمر" اور دوسرا "ہلال یا بدر"۔ فصحاء عرب حسب موقع اور ضرورت ہر ایک لفظ کا استعمال کر سکتے ہیں۔اب اس تفصیل کے بعد ہر ذی علم پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مرزا قادیانی نہ تو لغت سے کوئی واقفیت رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن جانتا ہے۔اپنی اس جہالت کے باوجود الٹا چور کو توال کو ڈانٹے کے مصداق علماء کو کہہ رہا ہے۔

اے نادانو! آنکھوں کے اندھو، مولویت کو بدنام کرنے والو۔سوچو کہ حدیث چاند گرہن میں " قمر" کا لفظ نیا ہے اب قارئین خود فیصلہ فرمادیں کہ نادان، عقل کا اندھا اور مولویت بلکہ مہدیت کو بدنام کرنے والا کون ہے؟ امام محمد باقر نے لفظ "قمر" کا اطلاق لغت اور قرآن وحدیث کی تصریح کے مطابق بالکل درست کیا ہے۔کیونکہ "قمر" کا اطلاق لغت اور قرآن وحدیث کی تصریح کے مطابق بالکل درست کیا ہے۔کیونکہ "قمر" پورے مہینے کے چاند کو ہی کہتے ہیں۔اور اس چاند کی پہلی تاریخ کو گرہن خرق عادت کے طور پر ہوگا۔کہ جب سے آسمان وزمین بنے ہیں چاند کی پہلی تاریخ کو کبھی گرہن نہیں لگا۔ تبھی تو مہدی کے لیے نشان بنے گا۔بصورت دیگر تو ۱۳، ۱۴، ۱۵، ان تاریخوں میں تو ہمیشہ سے لگتا آیا ہے یہ نشان نہیں بن سکتا۔

آٹھواں مغالطہ:۔

مرزا غلام احمد نے دار قطنی کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے کتاب سنن دار قطنی کا مرتبہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے برابر کرنے کیلئے اسے صحیح دار قطنی کے نام سے پیش کیا ہے سنن دار قطنی کا ان کتابوں کے درجہ میں ہونا تو درکنار یہ صحاح ستہ میں سے ہی نہیں چہ جائیکہ اس صحیح دار قطنی کے نام سے پیش کیا جائے ہم قادیانیوں کو کئی دفعہ چیلنج دے چکے ہیں کہ قدمائے محدثین میں سے کسی ایک محدث کا قول دکھائیں جس نے سنن دار قطنی کو صحیح دار قطنی قرار دیا ہو، دار قطنی کو صحیح دار قطنی لکھنا اجماع امت کے خلاف ہے۔کسی محدث کسی مجدد نے اس کتاب کو صحاح میں داخل نہیں کیا اور نہ کسی نے اسے صحیح دار قطنی کہا نہ اسکا مولف اسکا دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے اس میں صحیح حدیثوں کا التزام کیا ہے۔ہم اسکے خلاف علامہ عینی کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں جس سے جلی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسے صحیح دار قطنی کہنا کسی پڑھے لکھے آدمی کا کام نہیں ہاں مغالطہ دینے کیلئے مرزا غلام احمد قادیانی کچھ کا

کچھ لکھ سکتا ہے اس پر علم ودیانت اور صداق وشرافت کی کوئی گرفت نہیں۔ حضرت علامہ حافظ بدرالدین العینی سنن دارقطنی کے بارے میں لکھتے ہیں: **وقد روی فی سننه سقیمة ومحلولة ومنکرة وغریبة وموضوعة .ولقد روی احادیث ضعیفة فی کتابه الجهربالبسملة واحتج بها مع علمه فی ذلك فی ان بعضهم استحلفه علی ذلك فقال لیس فیه حدیث صحیح**۔ (عمدۃالقاری جلد ۶ صفحہ ۱۲)

(ترجمہ) دارقطنی نے اپنی سنن میں سقم (کمزوری) رکھنے والی احادیث وہ روایات جنکی سند میں علت پائی جائے۔ دوسرے رواۃ جن کا انکار کردیں غریب اور من گھڑت قسم کی روایات نقل کی ہیں نماز میں بسم اللہ اونچی پڑھنے کے بارے میں دارقطنی نے کئی ضعیف روایات نقل کی ہیں اور انکا ضعف جانتے ہوئے انہیں روایت کیا ہے یہاں تک کہ بعض حضرات نے انہیں اس پر حلف دیا کہ ان میں کوئی بچی روایت ہو تو بتادو دارقطنی نے کہا کہ اس باب میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ملتی۔

سورج گرہن اور چاند گرہن کی اس پیش افتادہ روایت کے سلسلہ میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام ذخیرہ احادیث میں کیا مرزا غلام احمد کے نصیب میں یہی ایک روایت رہ گئی تھی جسے کسی تاویل سے بھی حدیث نہیں کہا جاسکتا یہ صرف امام محمد باقر کا قول ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس سے نچلے ضعیف راویوں کے ضعف کو یکسر ایک طرف رکھا جائے مرزا غلام احمد نے اپنی اس پیش کردہ روایت کو سنن دارقطنی کی بجائے صحیح کہ کر پیش کیا ہے کہ شاید علماء لفظ "صحیح" کے چکر میں آجائیں کیا مرزا صاحب کے اس حیلہ سے یہ انتہائی قسم کی معلول راویت صحیح سمجھی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں، کیا یہی وہ راہ انصاف ہے جس سے کسی روایت کی پرکھ ہوتی ہے جو قادیانی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مرزا صاحب کا مجددانہ کارنامہ ہے کہ جس کتاب کو صدیوں سے کسی نے صحیح دارقطنی نہ کہا تھا مرزا صاحب نے اسے صحیح کہ دیا ہمیں ان کے علم وفہم پر بہت افسوس ہوتا ہے کیا یہی وہ کارنامہ ہے جس کے لئے مجدد مبعوث ہوتے ہیں۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**۔

آخر میں قادیانی احباب کی خدمت میں مرزا قادیانی کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں مرزا قادیانی نے احادیث کی روشنی میں امام مہدی کی چند نشانیاں بیان کیں ہیں۔

یعنی وہ وقت امن کا ہوگا نہ جنگ کا
بھولیں گے لوگ مشغلہ تیر و تفنگ کا
پیویں گے ایک گھاٹ پہ شیر اور گوسپند
کھیلیں گے بچے سانپوں سے بے خوف بے گزند

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۴۲)

ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھا کر کہیں اب دنیا میں کیا یہی حالات ہیں جن کا ذکر مرزا قادیانی نے احادیث کی روشنی میں اپنے اشعار میں کیا ہے یا معاملہ سراسر اس کے برعکس ہے عیاں را چہ بیان اب تو مرزا قادیانی کو گزرے ہوئے بھی ایک صدی ہونے والی ہے اور حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں عیسائی بڑھتے جارہے ہیں یہودی طاقتور ہوتے جارہے ہیں مسجد اقصیٰ ان کے ہاتھ میں چلی گئی ہے جگہ جگہ لڑائیاں اور جنگیں ہیں بلکہ اس "مہدی" کے بعد دنیا میں دو عظیم عالمی جنگیں ہوئیں اور آج تک دنیا کے مختلف حصوں میں جنگیں جاری ہیں۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ جان، مال، عزت و آبرو کی کوئی حفاظت نہیں ہر آدمی خوف زدہ اور پریشان ہے حتی کہ خود قادیانی جماعت کا سربراہ مرزا طاہر بھی بغیر باڈی گارڈوں اور محافظوں کے کہیں چل پھر نہیں سکتا اور خوف کے مارے اپنے ملک پاکستان اور اپنے ہیڈ کوارٹر ربوہ میں بھی نہیں جاسکتا۔ اور یہیں لندن میں پناہ گزینی کی عبرتناک زندگی بسر کررہا ہے اگر مرزا سچا مہدی ہوتا تو "قادیان" جو اس کا مولد و مدفن ہے اور جسے مرزا قادیانی نے مکہ مکرمہ کے مقابلہ میں "دارالامان" قرار دیا تھا اس میں اسکی اولاد اور خاندان کو تو امن حاصل ہوتا اور وہ بھاگ کر پاکستان نہ جاتے۔ اور پھر جب پاکستان میں بھی امن حاصل نہ ہوا تو وہاں سے بھاگے اور انگلستان میں آکر پناہ لی۔ یہاں بھی ڈر کے مارے کہیں نکل نہیں سکتا۔ مرزا طاہر تو اس "مہدی" کا حقیقی پوتا ہے اسے اور اس کی جماعت کو تو کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہیے تھا کم از کم انہیں تو دنیا میں امن حاصل ہوتا۔ خدارا سوچئے اور بار بار غور کیجئے۔ کیا مرزا قادیانی اس پیشگوئی کا مصداق بن سکتا ہے؟ اور کیا یہی وہ مہدی کا زمانہ ہے جس کا احادیث نبویہ کی روشنی میں خود مرزا قادیانی نے ذکر کیا ہے؟

الراقم۔ منظور احمد چنیوٹی عفا اللہ عنہ
حال وارد برمنگھم ۲۳۔ اگست ۱۹۹۴ء

دین وشریعت کی

دو چیزیں

مولانا ابو اسحاق (یو کے)

﴿پہلی قسط﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے فرمایا:

دو چیزیں: میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے، ہر گز گمراہ نہ ہو گے۔ وہ (دو چیزیں) کتاب اللہ (یعنی قرآن مجید) اور سنت رسول ہیں۔

(مؤطا، مظاہر حق ص ۳ر ج ۴)

☆ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم (دین میں) نئی بات نکالتی ہے (یعنی بدعات) تو اس کے مثل ایک سنت اُٹھالی جاتی ہے لہٰذا سنت کو مضبوط پکڑنا نئی بات نکالنے سے بہتر ہے۔

(احمد عن خفیفؓ)

☆ (ایک روایت میں ہے کہ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے مثل سنت دنیا سے اُٹھالی جاتی ہے اور پھر وہ سنت قیامت تک اس کی طرف واپس نہیں کیجاتی۔

(داری عن حسانؓ)

☆ (ایک روایت میں ہے کہ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہودیوں کے ۷۱ر ۷۲ فرقے ہوگئے اور نصرانی بھی اس طرح لیکن میری امت ۷۳ر فرقوں میں بٹ جائے گی۔

(ترمذی عن ابی ہریرہؓ از شریعت، یا جہالت)

☆ ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرئیل کے ۷۲ر مذہب ہوگئے لیکن میری اُمت ۷۳ر فرقوں میں بٹ جائے گی، ان میں سے ایک فرقہ کے سوا باقی تمام فرقوں والے دوزخ میں ہوں گے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ (نجات پانے والا) ایک فرقہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہی جس پر میں ہوں اور میرے

ساتھی (یعنی صحابہ) ہیں۔

(ترمذی عن ابن عمرؓ)

☆ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو (شخص) زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا، پس نئی باتوں سے بچتے رہنا کیونکہ یہ گمراہی ہے تو تم میں سے جو شخص یہ زمانہ پائے تو میری سنت اور میری ہدایت یافتہ مہدی (ہدایت دینے والا) خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کی سنتوں کو مضبوط پکڑ لینا۔ اے لوگو! اس سنت کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔

(مفہوم ترمذی عن عرباضؓ)

دو کلمے :

آپ نے فرمایا کہ دو کلمے ایسے ہیں کہ زبان پر بہت ہلکے اور ترازو میں بہت وزنی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت محبوب ہیں وہ "سُبحان الله و بحمده اور سبحان الله العظيم ہیں۔

(بخاری، فضائل ذکر ص ۱۳۵)

☆ ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص اِن کلمات کو سات بار پڑھے (اللہ تعالیٰ) اس کے لئے جنت میں ایک گنبد تعمیر فرما دیتا ہے۔

(ایضاً ص ۵۵) ۱۲

مسلمانو!

اِن مبارک کلمات کو ۷/۷ بار پڑھنے کیلئے صرف دس سیکنڈ چاہئے کیا ہم اللہ تعالیٰ کی محبوبیت حاصل کرنے کیلئے اور جنت میں ہمیں گنبد نصیب ہو، اتنا وقت بھی نہیں فارغ کر سکتے؟

نوٹ:

حضرت باوا صاحب مدظلہ نے اللہ تعالیٰ کے تعریف کے بے شمار کلمات کو اپنی مشہور و معروف کتاب "فضائل دعا" جلد اول کے باب چہارم اور پنجم میں جمع کر دئے ہیں یہ مقبول کتاب بہ مثل بہشتی زیور اور تبلیغی نصاب ہر گھر میں ہونی چاہئے۔

دو چیزوں کا دیکھنا، دو چیزوں کا نہ دیکھنا:

آپ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ تماری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔

(فضائل تبلیغ ص ۲۳)

ف:
یعنی اللہ تعالیٰ انسان کی صورتوں، حسب نسب اور مالداری وغیرہ کو نہیں دیکھتے جیسے دنیا والوں کی نظر میں عزت کا معیار ہوتا ہے بلکہ انسانوں کے قلوب، اخلاص، للّٰہیت اور اعمال کو دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں کہ نہیں!

دو افضل چیزیں:

آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام اذکار میں افضل "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" ہے اور تمام دعاؤں میں افضل الحمد للہ ہے۔

(فضائل ذکر ص ۶۷)

☆ (ایک روایت میں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام دعاؤں میں افضل استغفار ہے۔

(ایضاً ص ۸۶)

دو خصلتیں:

آپ نے فرمایا کہ دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو مسلمان ان کا اہتمام کرلے، جنت میں داخل ہو اور وہ دونوں بہت معمولی چیزیں ہیں مگر ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہیں (۱) ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ (اور) اللہ اکبر پڑھ لیا کرے اور (۲) سوتے وقت ۳۴ر بار اللہ اکبر ۳۳ر بار الحمد للہ اور ۳۳ر بار سبحان اللہ پڑھ لیا کرے۔

(ایضاً ص ۱۳۳)

دو دعائیں:

آپ نے فرمایا کہ اے میرے اللہ! میرے باطن کو میرے ظاہر سے زیادہ بہتر بنا اور میرے ظاہر کو صالح اور نیک بنا"

(ایضاً ص ۱۰۱)

دو آنکھیں:

آپ نے فرمایا کہ دو آنکھوں پر جہنم کی آگ حرام ہے (۱) وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئی ہو اور (۲) وہ آنکھ جو اسلام اور مسلمانوں کی کفار سے حفاظت کرنے میں جاگی ہو۔

(ایضاً ص ۴۱)

(بقیہ آئندہ)

قسط ۲

مسئلہ رفع یدین

حضرت مولانا فخرالدین صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

ماخوذ از ایضاح البخاری

مرتبہ مولانا ریاست علی بجنوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

تشریح حدیث:

امام بخاری نے اپنا مقصد ثابت کرنے کے لئے دوسری روایت حضرت مالکؓ ابن حویرثؓ سے ذکر فرمائی ہے، کہ حضرت مالکؓ نے تین مقامات پر رفع یدین کیا اور پھر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا، اس روایت میں بظاہر کوئی نئی بات نہیں ہے، امام بخاری کے پاس اس عمل کے دوام واستمرار اور تا آخر حیات بر قرار رہنے کی کوئی بھی دلیل نہیں ہے ورنہ وہ ضرور ذکر فرماتے اس لئے وہ ان روایتوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں جن میں اس فعل کا محض ثبوت ہے مگر اس سے مقصد ثابت ہونا دشوار ہے البتہ حضرت مالکؓ بن حویرثؓ کی روایت ذکر کر کے وہ اپنے ذوق کے مطابق ایک استدلال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

حضرت مالکؓ بن الحویرثؓ وہی صحابی ہیں جو اپنے چند ہم عمر رفقاء کے ساتھ حضور پاک ﷺ کی خدمت میں ۱۹ / یا ۲۰ / دن مقیم رہے، جب رخصت ہونے لگے تو آپ ﷺ نے ضروری ہدایات دیں اور ان کو سفر کی اجازت دیدی، ان ہدایات میں ایک بات یہ بھی تھی "صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي" (بخاری ج ۱ ص ۸۸) جس طرح تم مجھے دیکھ کر جا رہے ہو اسی طرح نماز پڑھتے رہنا، امام بخاری کا مدار استدلال یہی بات معلوم ہوتی ہے جس کی انھوں نے صراحت نہیں کی، استدلال یہ ہے کہ مالکؓ بن حویرث نے رسول اکرم ﷺ کے پاس قیام کے دوران نماز کا جو طریقہ سیکھا اس میں رفع یدین بھی تھا، اور حضور ﷺ نے انھیں اسی طریقہ پر نماز پڑھتے رہنے کی ہدایت دی، چنانچہ

حضرت مالکؓ بن حویرث زندگی بھر اسی کے مطابق عمل کرتے رہے ہوں گے، اس طرح سے رفع یدین کا دوام واستمرار اور تا آخر حیات بقا معلوم ہو گیا۔

اس طرح کے اشارات سے بخاری کام اس لئے نکالنا چاہتے ہیں کہ دوام واستمرار اور تا آخر حیات اس عمل کے بقاء کی صراحت پر مشتمل کوئی روایت ان کے پاس نہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو قلابہؓ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مالکؓ بن حویرث کو رفع یدین کرتے دیکھا، کیا ضروری ہے کہ ابو قلابہؓ ہمیشہ مالک بنؓ حویرث کے ساتھ ہی رہے ہوں اور ان کا یہ عمل دوامی ہو، یہ بھی تو ممکن ہے کہ انہوں نے یہ عمل کبھی کبھی دیکھا ہو، سب احتمالات ہیں اور اگر مان بھی لیں کہ حضرت مالکؓ کا یہ عمل دوامی تھا تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوئی کہ حضور ﷺ کا عمل دوامی تھا، ہاں یہ ضرور معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے حضرت مالکؓ کو "صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي" کہہ کر دیگر ہدایات کے درمیان بطور خاص نماز، جماعت، اور اس کے متعلقات کی طرف توجہ دلائی تھی اس لئے حضرت مالکؓ بن حویرث سنن و آداب کی بھی رعایت فرماتے رہے ہوں گے اور اگر انہوں نے دوامی طور پر رفع یدین اختیار فرمایا تو انہیں ایسا ہی کرنا چاہئے تھا جیسا کہ متعدد صحابہ کرامؓ سے خصوصی ہدایت کی صورت میں ایک ہی عمل کو اختیار کئے رہنے کے واقعات موجود ہیں، وہ رسول اکرم ﷺ کی ہدایت کے بعد اپنے مشاہدات سے کیسے ہٹ سکتے تھے؟ مگر اس سے زیادہ سے زیادہ احتمال کے درجہ میں چند روز قیام کرنے والے صحابیؓ کا رفع یدین پر دوام معلوم ہوا، جبکہ خلفاء راشدین، عبداللہ بن مسعودؓ اور کتنے ہی دیگر صحابہ کرام کا عمل اس کے برخلاف رہا، اب موازنہ کر کے انصاف کے ساتھ دیکھنا ہوگا کہ ان دونوں ثابت شدہ جہتوں میں کون سی جہت کو ترجیح حاصل ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

ترک رفع کے بعض مستدلات:

یہ تھی رفع یدین کے ثبوت میں امام بخاریؒ کی پیش کردہ دونوں روایات پر گفتگو لیکن دوسروں کی روایات پر نقد کرنے سے مسلک تو ثابت نہیں ہوتا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترک رفع کے چند دلائل بھی پیش کر دیے جائیں، چاہئے تو یہ تھا کہ ترک رفع کے ان دلائل کو بھی اس باب میں یا دوسرے باب میں امام بخاری خود پیش فرماتے، جیسا کہ ترمذی ابوداؤد، اور نسائی وغیرہ کا طریقہ ہے لیکن امام بخاری کی عادت یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو اختیار کرتے ہیں تو دوسری جانب سے بالکل صرف نظر کر لیتے ہیں اور دوسری جانب کی روایات کا پتہ ہی نہیں دیتے، "جزء رفع الیدین اور جزء قرأت خلف الامام" میں ان کا یہ طرز عمل بالکل نمایاں ہے اور صرف امام بخاریؒ کا کیا شکوہ اور بھی

بعض محدثینؒ ایسے گذرے ہیں جو اپنے مسلک مختار کی تائید کے لئے کمزوریوں کی بھی تاویل و توجیہ کرتے ہیں اور جانب مخالف کی روایات کو نظر انداز کر جاتے ہیں، بلکہ بعض تو معلول قرار دے کر ساقط الاعتبار قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

رفع یدین کے مسئلے میں بھی یہی ہوا ہے کہ کتنے ہی اکابر محدثین نے اپنی عادت کے مطابق رفع یدین کو مسلک مختار قرار دے کر ترک رفع کی روایات کو نظر انداز کردیا اور کتنے ہی ائمہ حدیث نے محدثین کے اصول کے مطابق جب رفع یدین کی روایات کو سنداً صحیح پایا تو ترک رفع کی روایات کو شاذ قرار دے دیا۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ جب ترک رفع کی روایات مضبوط سند سے آرہی ہیں اور صحابہ و تابعین کی غالب اکثریت کا عمل روایت کی توثیق کررہا ہے، ائمہ فقہاء نے اس کو قابل قبول ہی نہیں راجح قرار دیا ہے تو پھر روایت کو صحیح قرار دینے کے لئے مزید کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے؟

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت:

ترک رفع کے مستدلات میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت کو اصل قرار دیا گیا ہے، اس روایت کو ارباب سنن، اصحاب مسانید و جوامع نے اپنی کتابوں میں مختلف طرق سے ذکر کیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں "الا اصلی بکم صلوة رسول الله ﷺ فلم یرفع یدیه الا فی اوّل مرة" ابن مسعودؓ عملی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کیا میں تمہیں نبی اکرم ﷺ کی نماز پڑھ کرنہ دکھلا دوں، ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ جو عمل پیش کیا جائے گا وہ اتفاقاً یا احیاناً کیا جانے والا عمل نہیں ہوسکتا، وہ عمل ہمیشہ کیا جانے والا یا کم از کم کثرت کے ساتھ کیا جانے والا ہونا چاہئے چنانچہ اس کے بعد جو عمل کرکے آپ نے دکھلایا وہ یہ تھا کہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت آپ نے ہاتھ اٹھائے، اور پھر رفع نہیں کیا۔

ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے، اور ابن حزم نے صحیح قرار دیا ہے، تصحیح کرنے والوں میں ابن قطانؒ، دار قطنیؒ اور بعض محدثین کے نام ہیں، تمام راوی نہایت ثقہ ہیں، صرف عاصم بن کلیبؒ پر انگلی رکھی گئی ہے مگر اس کا جواب دیدیا گیا ہے کہ عاصمؒ مسلم کے رجال میں سے ہیں امام بخاریؒ نے بھی کتاب اللباس میں ایک جگہ تعلیق میں ان کا ذکر کیا ہے، ابن معینؒ، ابو حاتم، نسائی وغیرہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، احمد بن صالحؒ نے ان کے بارے میں "یعد من وجوہ الکوفیین الثقات" کہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ روایت ترک رفع کے سلسلے میں صاف اور صریح ہے، حضرت ابن عمرؓ کی رفع والی روایت کی طرح اس میں وقف اور رفع کا اختلاف نہیں، اس کے الفاظ میں اضطراب نہیں، راوی کا عمل روایت کے

خلاف نہیں اور الفاظ میں یہ نہیں ہے کہ ترک رفع کا صرف ثبوت ہو، بلکہ راوی ایسے الفاظ میں بات کہہ رہا ہے جس سے ترک رفع پر اتفاقاً عمل کرنے کے بجائے کثرت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونے کی بات واضح ہوتی ہے، پھر یہ کہ صحابہ و تابعین کا تعامل اس کی تائید میں ہے۔

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود مسئلہ پر مناظرانہ انداز میں گفتگو کرنے والوں نے یہ کیا کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود کی روایت پر کوئی معقول اور قاعدہ کا اعتراض نہ ہو سکا تو خواہ مخواہ کے اعتراضات شروع کردیئے گفتگو کی تکمیل کے لئے ان اعتراضات کا بھی منصفانہ جائزہ لینا ضروری ہے

عبد اللہؒ بن مبارک کا تبصرہ:

عبد اللہ بن مبارکؒ، امام اعظمؒ کے تلامذہ میں ہیں مگر ان کا شمار رفع کرنے والوں میں ہوتا ہے، پھر یہ کہ ان کی بات کو امام ترمذیؒ نے نقل فرمایا ہے، اس لئے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے، فرماتے ہیں: **"قد ثبت حدیث من یرفع و ذکر حدیث الزهر ی عن سالم عن ابیه ، ولم یثبت حدیث ابن مسعود ان النبی ﷺ لم یرفع الا فی اول مرة"** یعنی رفع کی روایت ثابت ہے اور انہوں نے **"زهری عن سالم عن ابیه"** والی روایت ذکر کی اور ابن مسعود کی یہ روایت "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ کہیں رفع نہیں کیا" ثابت نہیں ہے۔

اس بات کا ایک جواب تو الزامی ہے جسے علامہ تقی الدین بن دقیق العیدؒ نے اپنی کتاب **"الامام"** میں ذکر فرمایا ہے کہ عبد اللہ بن مبارکؒ کے یہاں ثابت نہ ہونے سے، یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ کسی اور کے یہاں ثابت نہ ہو، گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مبارکؒ کی بات شہادت علی النفی کی قسم میں سے ہے، جس کا مدار منکر کا اپنا مبلغ علم ہوتا ہے اور جو لوگ ثبوت کی شہادت دے رہے ہیں وہ اپنے علم کے مطابق کہہ رہے ہیں، اس لئے کسی بھی انسان کا اپنے علم کے مطابق نفی کی شہادت دینا، ثبوت کی شہادت دینے والوں کے حق میں نقصان کا سبب نہیں ہو سکتا، اور تحقیقی بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ عبد اللہ بن مبارکؒ کے تبصرہ کو سمجھنے میں زبردست مغالطہ ہو رہا ہے اور معترضین کے یہاں یہ سمجھا رہا ہے کہ ترمذی حضرت ابن مسعودؓ کی جس روایت کی تحسین کر رہے ہیں، اسی کے بارے میں ابن مبارک عدم ثبوت کی بات کہہ رہے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے اترمذی کے الفاظ پر غور کرلیا جائے تو یہ مغالطہ دور ہو جاتا ہے، انہوں نے پہلے تعلیقاً یہ فرمایا **"لم یثبت حدیث ابن مسعودؓ ان النبی ﷺ لم یرفع الا فی اول مرة"** پھر انہوں نے ابن مبارکؒ تک اس کی سند ذکر کی، پھر حضرت عبد اللہؓ بن مسعودؓ کی روایت ذکر کر کے اس کی تحسین کی جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جس روایت میں ترک رفع کے فعل کو حضور ﷺ کی طرف

براہ راست منسوب کیا گیا ہے، ابن مبارکؒ اس کے بارے میں "لم یثبت" کہہ رہے ہیں اور جس روایت میں حضرت ابن مسعودؓ نے اپنا عمل کر کے دکھلایا اور اس کو "الا اصلی بکم صلوة رسول الله ﷺ" کہ کر حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا، اس کے بارے میں وہ یہ نہیں کہہ رہے ہیں، اور اس کی مضبوط دلیل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے فعل کی یہ روایت نسائی شریف میں حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ ہی کے طریق سے منقول ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں، الفاظ یہ ہیں "قال الا اخبرکم بصلوة رسول الله ﷺ قال فقام فرفع یدیه اول مرة ثم لم یعد" (نسائی ص۱۶۸ج۱) پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسی روایت کا انکار کر دیں جسے وہ خود ثقہ راویوں سے نقل کر رہے ہیں۔

نیز اس کی واضح علامت یہ ہے کہ گو ترمذی شریف کے متداول نسخے سے بھی یہ چیز سمجھی جا سکتی ہے مگر عبد اللہ بن سالم البصریؒ والے نسخہ سے تو یہ بات بالکل منقح ہو گئی جو بعض کتب خانوں میں محفوظ ہے، اور اس میں امام ترمذیؒ نے اہل حجاز اور اہل عراق کے اختلافی مسائل کے بیان میں اپنی عادت کے مطابق الگ الگ دو باب منعقد کئے ہیں، پہلا باب "رفع الیدین عند الرکوع" ہے جو عبد اللہ بن مبارکؒ کے اس تبصرہ پر ختم ہو گیا اور اس کے بعد انہوں نے دوسرا مستقل باب من ,, لم یرفع یدیه الا فی اول مرة" منعقد کیا اور اس کے تحت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ذکر کر کے اس کی تحسین کی اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ عبد اللہ بن مبارکؒ کا تبصرہ اس روایت کے بارے میں ہے جسے ترمذی نے پہلے باب میں تعلیقاً ذکر کیا ہے، اس روایت کے بارے میں نہیں ہے جسے وہ دوسرے باب میں مرفوعاً ذکر کر رہے ہیں۔ واللہ اعلم

"لم یعد" کے غیر محفوظ ہونے کی حقیقت:

اسی طرح کا دوسرا کمزور اعتراض حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت میں "لم یعد" کے الفاظ پر ہے، یہ روایت مختلف الفاظ کیساتھ منقول کسی روایت میں "لم یرفع یدیه الا فی اول مرة" ہے، اور کسی میں "رفع یدیه اول مرة ثم لم یعد" ہے کسی روایت میں "ثم لا یعود" ہے، وغیرہ۔

بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس روایت میں "ثم لم یعد" کے الفاظ غیر محفوظ ہیں، ابوالحسن بن القطانؒ (المتوفی ۶۲۸ھ) نے اپنی کتاب "بیان الوهم والایهام" میں کہا ہے کہ حدیث اگرچہ صحیح ہے لیکن وکیعؒ نے جو "لا یعود" کا لفظ نقل کیا ہے وہ عبد اللہ بن مبارکؒ کے نزدیک قابل اعتراض ہے، امام بخاریؒ نے جزء رفع الیدین میں پہلے عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت "الا اصلی لکم صلوة رسول الله ﷺ فصلی ولم یرفع یدیه الا مرة" نقل کی، پھر امام احمدؒ کی یہ بات نقل کی کہ یحییٰ بن آدم نے کہا کہ میں نے عاصم بن کلیب کے تلمیذ عبد اللہ بن ادریس کی کتاب دیکھی تو اس میں

ہے، پھر امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تطبیق والی روایت کو نقل کر کے فرمایا "قال البخاری هذا المحفوظ عند اهل النظر من حديث عبد الله بن مسعودؓ" (جزء رفع الیدین ص ۱۵) امام بخاری کی بحث کا حاصل بھی یہی ہے کہ وہ لفظ "لم یعد" کو غیر محفوظ قرار دینا چاہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس لفظ کے نقل کرنے میں سفیانؒ کو وہم ہو گیا، غیر محفوظ ہونے کی بات دار قطنیؒ، ابو حاتمؒ اور بعض دیگر محدثین سے بھی منقول ہے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ محدثین کرام روایت کو معلول قرار دینے میں الفاظ کی پابندی کے عادی ہیں "لم یعد" کو معلول یا غیر محفوظ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ ثابت نہیں، انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ مفہوم روایات میں موجود ہے یا نہیں؟ یہ ایک ایسی عادت ہے کہ جس سے نقصان واقع ہو جاتا ہے کیونکہ الفاظ تو معانی تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں، مگر محدثین الفاظ پر بہت زیادہ جم جاتے ہیں، زیر بحث مسئلہ میں حقیقت یہ ہے کہ "رفع يديه اول مرة ثم لم يعد" اور "لم يرفع يديه الا في اول مرة" میں معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، اگر پہلی روایت کے الفاظ پر کوئی اشکال ہے تو دوسری روایت کے الفاظ تو ثابت ہیں اور ان الفاظ میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے کہ رفع یدین تکبیر تحریمہ کے علاوہ نہیں کیا گیا تو "لم یعد" کے غیر محفوظ قرار دینے سے مسئلہ پر کیا فرق پڑا؟

دوسری بات یہ ہے کہ "لم یعد" کے لفظ پر اعتراض ہے تو یہ بتلایئے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے متعلق کیا تحقیق ہے؟ اس لفظ کے انکار سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ رافعین کی فہرست میں آجائیں وہ تو یقیناً تارکین رفع میں سے ہیں اور ان کا ترک تواتر سے ثابت ہے، یہی ان کا عمل ہے اور یہی ان کی تعلیم ہے اور یہی ان کے تمام شاگردوں کا مسلک ہے، پھر آپ "لم یعد" کو غیر محفوظ کہہ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ غیر محفوظ کہنے والوں کے دلائل کا تحقیقی جائزہ لیا جائے، ابن قطانؒ نے کہا کہ روایت تو صحیح ہے لیکن ابن مبارکؒ و وکیعؒ کے "لم یعد" نقل کرنے پر معترض ہیں لیکن ان کی بات یوں بے وزن ہو جاتی ہے کہ ابن مبارکؒ خود "لم یعد" نقل کر رہے ہیں جیسا کہ نسائی کی روایت میں موجود ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں، اس لئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ ابن مبارکؒ کے "لم يثبت" کہنے کی جو وجہ ابن قطانؒ نے بیان کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

بقیہ صفحہ (۳۱) پر

جدید کتابیں

۱

تعارف وتبصرہ

حبیب الرحمٰن قاسمی

(۱) نام کتاب: ایضاح البخاری جلد چہارم

افادات وترتیب: حضرت فخر المحدثین مولانا سید فخر الدین احمد سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

تدوین وترتیب: حضرت مولانا ریاست علی بجنوری صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

کتابت: بہترین وخوبصورت

طباعت: آفسیٹ

کاغذ صاف روشن

صفحات: پانچ سوچوراسی (۵۸۴)

قیمت مجلد: ایک سوساٹھ روپے (۱۶۰)

ناشر: مجلس قاسم المعارف دیوبند سہارنپور یوپی

استاذ محترم حضرت مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی قدس سرہ کا درس بخاری اپنے عہد میں ایک بے مثال درس تھا۔ حضرات اساتذہ اور دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلاء سے نہ جانے کتنی بار یہ بات سنی کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کا درس ترمذی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا درس ابوداؤد اور حضرت مولانا فخرالدینؒ مراد آبادی کا درس بخاری اپنے زمانہ میں پورے برصغیر میں منفرد وممتاز مانا جاتا تھا۔

یہی یگانہ وقت درس بخاری اس وقت "ایضاح البخاری،، کے نام وعنوان سے ہمارے پیش نظر ہے جسے دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا ریاست علی زید مجدہ نے نہایت سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

جس کی حسب ذیل خصوصیات ہر پڑھنے والا پہلی نظر میں محسوس کرے گا۔

(۱) بخاری کے ترجمۃ الباب پر محققانہ گفتگو اور دیگر شراح حدیث کے سمجھے اور بیان کئے ہوئے مقاصد وتراجم پر مبصرانہ نظر اوران پر جچا تلا محاکمہ۔

(۲) اصول محدثین بالخصوص اصول فقہ حنفی کی روشنی میں متعارض احادیث کے درمیان تطبیق یا ترجیح

(۳) باب عقائد میں اہل سنت والجماعت کے مذہب حق کا مدلل اثبات اور فرق باطلہ کی مدلل تردید۔

(۴) مسائل فقہیہ میں ائمہ اربعہ کے مذاہب کی تفصیل وتشریح اور مسلک حنفی کی وجوہ ترجیح۔

(۵) امام بخاریؒ کے تفرادات کی نشاندہی پھر مسلک حق کی ترجمانی۔

(۶) اکابر دیوبند بالخصوص حضرت نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کی تحقیقات کے بیان کا التزام، ان واضح خصوصیات کے علاوہ اس کتاب میں ایک طالب حق اور جویائے علم ویقین کو وہ سب کچھ ملے گا جس کی مطالعہ حدیث کے وقت تلاش وجستجو ہوا کرتی ہے۔ پھر اس املائی شرح کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ صاحب امالی یعنی حضرت فخر المحدثین نے اس کے اکثر مباحث کو فاضل مرتب سے پڑھوا کر سنا ہے اور جہاں جہاں حذف واضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اسے درست کرادیا ہے اس لحاظ سے یہ دیگر امالی کے مقابلہ میں زیادہ مستند اور لائق اعتماد ہوگئی ہے۔

مزید براں اس کتاب کے جامع ومرتب ایک صاحب نظر عالم ہیں اور ایک عرصہ سے حدیث کی تدریس وتعلیم سے متعلق ہیں نیز اردو زباں کے ایک بہتر ادیب ہونے کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی عملی تجربہ رکھتے ہیں اور موصوف نے اس مجموعہ کو خوب سے خوب تر بنانے میں ان ساری صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال کیا ہے اس لئے پورے اعتماد اور ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ املائی تالیفات میں ایضاح البخاری ایک گرانقدر اضافہ ہے اور بجاطور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ علمی حلقوں میں اسے بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا۔

(۴) نام کتاب: مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینہ میں
مؤلف: مولانا مفتی محمد ڈینڈرولوی فاضل دارالعلوم دیوبند
طباعت: کمپیوٹر کمپوزنگ پرنٹ آرٹ دہلی
ضخامت: چارسو صفحات (۴۰۰)
ناشر: نظامی بک ڈپو اسٹیشن روڈ پالن پور گجرات
قیمت: درج نہیں

شمالی گجرات میں مومن قوم کے نام سے مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے جو اپنے عادت و خصائل اور زندگی کے طور وطریقوں کے اعتبار سے اپنا ایک خاص طرز رکھتی ہے جس میں اچھے اچھے علماء، صوفیاء اور مصلح وداعی پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اس قوم کی اصلاح و تربیت کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں عصر حاضر کے مشہور داعی اور مبلغ حضرت مولانا محمد عمر پالنؒ پور کا تعلق بھی اسی قوم سے ہے۔
لیکن نہ جانے کن اسباب سے وعلل کے تحت مورخین نے عام طور پر اس قوم سے بے اعتنائی برتی ہے اسی وجہ سے اس کا تذکرہ عام تاریخی کتابوں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

اب اس قوم کے ایک ہونہار فرزند مولانا مفتی محمد صاحب زید مجدہ نے اس کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور شب و روز کی جہد مسلسل سےقوم مومن کے منتشر اور بکھرے ہوئے حالات کو سلک تحریر میں پرونے کی کامیاب کوشش کی ہے اس سلسلے میں مؤلف کو کیسی کیسی سنگلاخ وادیوں اور کیسے کیسے دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو اس راہ کے رہرو ہیں۔

ایک ایسی قوم کی تاریخ جو ابتک مورخین کی بے اعتنائیوں کی شکار رہی ہے خا ہر ہے کہ مواد کی فراہمی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے جناب مولانا مفتی محمد صاحب بجا طور پر اہل علم بالخصوص اپنی پوری قوم کی جانب سے مستحق شکریہ ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب مرتب کر کے نہ صرف یہ کہ رجال واقوام کی تذکرہ نگاری میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے بلکہ اپنی قوم اور بزرگوں کے نام وکام کو علمی دنیا میں روشناس کر کے اسے زندہ وپائندہ بنادیا ہے۔ امید ہے کہ ان کی اس کاوش کو بنظر استحسان دیکھا جائے گا۔

نام کتاب	راہ اعتدال
تالیف	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
کتابت وطباعت	بہتر
ضخامت	دو سو چالیس صفحات (۲۴۰)
قیمت	درج نہیں
ناشر	جامعہ اشرف العلوم اکبر باغ حیدر آباد

آج کے دور میں جبکہ اسلام اور مسلمان خارجی وداخلی ہر اعتبار سے فتنوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں اور ان کی اجتماعی قوت وطاقت کو منتشر کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے جارہے ہیں حتی کہ قرآن وسنت اور دین واسلام کے نام پر اہل اسلام کو اسلام سے برگشتہ کردینے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔ انہی سازشوں میں سے ایک سازش عدم تقلید کے نام سے برپا کی گئی ہے جس نے مسلم معاشرہ بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں میں ایسا ذہنی وفکری انتشار پیدا کردیا ہے جس کے اثرات بد سے بہت سے مسلم گھرانے خود دینی زندگی سے بیزار ہوتے جارہے ہیں عدم تقلید کا نعرہ بلند کرنے والوں کا یہ خاص حربہ ہے کہ وہ اسلام کے غیر اہم اور فروعی مسائل کو ایمان واعتقاد کا درجہ دیکر اکابر اسلام بالخصوص امام ابو حنیفہ اور ان کے متبعین فقہاء ومحدثین پر رکیک تبصرے اور بازاری قسم کی تنقیدیں کرتے رہتے ہیں جس سے عام مسلمانوں کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔

زیر نظر کتاب اسی انتہائی خطرناک فتنے سے عام مسلمانوں کو بچانے کے لئے مرتب کی گئی ہے۔ جس میں تقلید، قرأت خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر، رکعات تراویح، ایک مجلس کی تین طلاقیں وغیرہ جیسے مسائل پر کتاب وسنت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کیونکہ یہ لوگ انہیں مسائل کی بنیاد پر عام مسلمانوں کو ان کے دین ومذہب سے ورغلانے کی ناروا کوشش کرتے ہیں۔

فاضل مؤلف نے پوری کتاب میں اس بات کا خاص اہتمام والتزام کیا ہے کہ کوئی بات بے سند نہ کہی جائے اور جو کچھ بھی کہا جائے علمی انداز میں حق وانصاف اور اعتدال وتوسط کی حدوں میں رہتے ہوئے کہا جائے۔

اور اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس اسلوب میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔ یہی اہل حق اور ارباب علم کا شیوہ ہے کہ فریق مخالف پر طعن وتشنیع اور بیجا تعریض کے بجائے اپنے موقف کو دلائل وبراہین کی قوت سے ثابت کیا جائے بالخصوص اکابر دیوبند کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے مولانا موصوف نے اپنے اکابر کی اس علمی ودینی روش کی کامیاب پیروی کی ہے جس پر وہ مستحق مبارکباد ہیں الحاصل موصوف کی یہ سعی وکاوش ہر اعتبار سے سعی محمود مشکور ہے۔ اور انشاء اللہ ان کی اس مخلصانہ وناصحانہ محنت کی علمی ودینی حلقوں میں قدر کی جائے گی۔
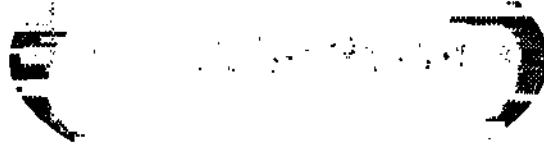
ماہ ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ مطابق مارچ ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳ شمارہ ۳ فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب — مہتمم دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب — استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپے پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/ ہندوستان سے ۶۰

Tel: 01336 - 22429
Fax 01336 - 22768
Tel: 01336 -24034 EDITER

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

یہاں پر اگر سرخ نشان لگاہواہے تواس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

☆ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپناچندہ دفتر کوروانہ کریں۔

☆ چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیاہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

☆ پاکستانی حضرات مولانانورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کواپناچندہ روانہ کریں۔

☆ ہندوستان وپاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کاحوالہ دیناضروری ہے۔

☆ بنگلہ دیشی حضرت مولانامحمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مولاناجعفر صاحب

حرف آغاز

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

عدل وانصاف کا حصول، جان ومال کا تحفظ، دین ومذہب کی آزادی، اور حق شہریت میں مساوات یہ وہ بنیادی حقوق ہیں جو انسان کے اپنے فطری شرف ومجد کا خاصہ ہیں، جنھیں تاریخ کے ہر دور میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے، اور ان حقوق میں دست اندازی کبھی بھی پسند نہیں کی گئی ہے، آج کے جمہوری دور میں تو ہر حکومت آئینی طور پر اپنے ملک کے باشندوں کو ان حقوق کی حفاظت کی مکمل ضمانت دیتی ہے اور سربراہان حکومت موقع بہ موقع اس کا اعلان بھی کرتے رہتے ہیں، شخصی حکمرانی کے زمانہ میں بھی بادشاہان مملکت عام حالات میں ان امور کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ "بھارت میں انگریزی راج" کے مصنف "پنڈت سندرلال" "سلطنتِ مغلیہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "اکبر جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو مسلم یکساں رہتے تھے دونوں مذہب کی یکساں توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لیے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی تھی، ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں"

(روشن مستقبل ص ۲۴)

اکبر، ہمایوں، جہانگیر، شاہجہاں کو چھوڑئے، خود اورنگ زیب عالمگیرؒ نے (جنھیں بعض انگریز پرست مؤرخین کی غلط بیانیوں کی بناء پر باور کرلیا گیا ہے کہ وہ ہندو کش، ستم گر، جفاپیشہ اور دین ودھرم کے نام پر قتل وغارت کے عادی تھے) اپنے دورِ حکومت میں بہت سے مندروں اور مندروں کے پجاریوں کو جاگیریں دی ہیں چنانچہ جمہوریہ ہند کے سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی مشہور کتاب ,,INDIADIVIDED,, میں لکھتے ہیں۔

الہ آباد میں اس طرح کے دو فرامین ہیں ایک مشہور مندر مہیشورناتھ کے نام ہے جس کو اورنگ زیب نے عطا کیا تھا۔

اورنگ زیب نے جنگجون کے لڑکے گردھر ساکن موضع بستی ضلع بنارس جدو مسر

ساکن مہیش پور پرگنہ حویلی اور پنڈت بلھدرا مصرا کو بھی جاگیریں دیں یہ سب کے سب مندروں کے پجاری تھے اورنگ زیب نے ملتان کے مندر توت لامائی کے لیے مشرا چکیان داس کو بھی سو روپے کا وظیفہ عطا کیا تھا یہ مندر اب تک موجود ہے۔

اورنگ زیب نے اس قسم کے متعدد فرامین پنڈتوں اور گوسائیوں کے نام جاری کئے تھے بنارس ہی کے مشہور مندر واقع محلہ جنگم باڑی کے پجاری کے نام ایک فرمان کی نقل یہ ہے۔

> ”پرگنہ حویلی بنارس صوبہ الہ آباد کے موجود اور آئندہ حکام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ شہنشاہ کے حکم کے بموجب پرگنہ بنارس کے ۱۷۸یگھے جنگم کو مدد معاش کے لیے دیئے جاتے ہیں...... یہ زمین مفتی زمین سمجھی جائے جیسا کہ ذیل میں تفصیل ہے تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں“۔

بمبئی کے مشہور مقالہ نگار ”جگن چندر“ نے بڑی محنت و تلاش سے اورنگ زیب کے اس قسم کے فرامین اور پروانوں کو ایک مضمون میں جمع کردیا ہے، جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے شائع ہوچکا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگزیب نے اپنے ہندو رعایا کے مذہب کے تحفظ میں پوری رواداری کا ثبوت دیا ہے، مندروں اور پجاریوں کو جاگیریں دینے کے ساتھ انھوں نے ۵۰ سے زائد ہندؤں کو اہم منصب بھی دے رکھے تھے جس کی تفصیل ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری جلد ۳ میں دیکھی جاسکتی ہے مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریبا ساڑھے چھ سو سال حکومت کی اس طویل دور میں صرف کے ”فرخ سیر“ عہد میں احمد آباد میں ہولی کے موقع پر ہندو مسلمان کا ایک جھگڑا ہوا جو سختی سے دبادیا گیا (سیر المتاخرین ج ۲ ص ۲۹۸) اس ایک ہنگامہ کے علاوہ پورے مسلم دور حکومت میں فرقہ وارانہ ہنگاموں کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، بلکہ اس کے برعکس ”ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند“ ایک پرتگالی مؤرخ ”فاری سوزا“ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

”ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے، مسلمان بادشاہ ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کرتے اور ان کو اعلیٰ منصب پر سر فراز کرتے رہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی، ہندو اپنے مذہبی فرائض اور مراسم ادا کرنے میں بالکل آزاد تھے، مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا بڑا احترام کرتے تھے“

یہی تھیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
کہ جن سے بوستان ہند صدیوں تک معطر تھا

کیا آج کے قومی و جمہوری دور میں جمہوریت اور سیکولرزم کے نعروں کے سہارے اقتدار کی کرسیوں پر براجمان کچھ دیر کے لیے عہد گزشتہ کے شخصی حکمرانوں اور اپنے کردار و عمل کا محاسبہ کرنے کے لیے آپ کو آمادہ کر سکتے ہیں؟ جب کہ خود جمہوریت اور قومی یکجہتی کے نام نہاد محافظین مذہب و ذات کی بنیاد پر اقلیتوں اور پچھڑی ذاتوں کی زندگی تک کا حق دینے کو سب سے بڑا پاپ سمجھتے ہیں۔ ارض ہند کا چپہ چپہ گواہ ہے کی دھرتی کو ماتا اور دیوی کا درجہ دینے والوں نے خود اسکو مظلوموں کے خون سے کس طرح داغدار کیا ہے۔ بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، گجرات، مہاراشٹر، اتر پردیش وغیرہ صوبوں میں کس بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اسے کون نہیں جانتا اور آج گجرات، اڑیسہ وغیرہ میں یہی سفاکانہ رویہ عیسائی اقلیت کے ساتھ برتا جا رہا ہے۔

آج کے دن قومی حکمرانوں سے کون امید کر سکتا ہے کہ وہ دیگر مذاہب کے عبادت خانوں کو جاگیر دیں گے جب کہ انھیں یہ بھی برداشت نہیں ہے کہ سرزمین ہند پر ان کے مندروں اور منڈیوں کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کا عبادت خانہ موجود رہے، بابری مسجد کا سانحہ اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا اور آج گجرات واڑیسہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے بھی اسی ذہنی رجحان کی کارفرمائی ہے۔ چوں کہ ہندوستان ہمارا ملک ہے ہمیں اس سے پیار ہے۔ اسکی نیک نامی کو ہم اپنی نیک نامی سمجھتے ہیں اور ہم دل سے اس ملک کی ترقی و بقا کے خواہش مند ہیں۔ اسی لیے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ آج جو لوگ حصول اقتدار کے لیے یہ غیر انسانی حرکتیں کر رہے ہیں ان سے صاف صاف کہدیں کہ اے قوم اور ملک کے دشمنو! تمہاری یہ قومی رہزنی نہ خود تمہیں بلکہ اس مہان ملک کو بھی تباہ و برباد کر کے چھوڑ گی۔ تاریخ سے سبق لو، ظالم کا ظلم پہلے مظلوموں کو اور پھر خود ظالموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے اور رسی کے ساتھ اس خطہ اور ملک کو بھی تباہی و بربادی کے غار میں پہنچا دیتا ہے جہاں یہ برتا جاتا ہے۔ اس لیے ہوش میں آکر اور آنکھ کھول کر دنیا کا جائزہ لو کہ آج تمہارے اس گندے کردار سے اس ملک کا وقار کس طرح مجروح ہو رہا ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھو

یہ آگ بھڑکتی ہے جتنی، اتنا ہی دھواں کم دیتی ہے
احساس ستم بڑھ جاتا ہے تو شور فغاں کم ہوتا ہے

امام ابو حنیفہ کا اصول اجتہاد

حبیب الرحمن قاسمی

علمی دنیا میں یہ بات معروف ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ان کے متبعین علماء وفقہاشرعی امور میں قرآن وحدیث کی جس قوت وشدت اور ہمہ گیری کے ساتھ پیروی کرتے ہیں وہ مذاھب فقہاء ومحدثین میں ان کا ایک خاص امتیازی وصف ہے۔ کیوں کہ دیگر بہت سارے مجتہدین کی طرح امام ابو حنیفہؒ صرف مرفوع حدیث ہی کو حجت نہیں مانتے بلکہ وہ مرفوع احادیث کے ساتھ موقوف ومرسل کو بھی فقہی احکام ومسائل میں لائق استدلال مانتے ہیں، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے اصول اجتہاد کو خود ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

انی آخذ بکتا ب الله اذا وجد ته،فمالم اجده فیه اخذت بسنة رسو ل الله والآثار الصحاح عنه التی فشت في ایدی الثقات عن الثقات،فاذا لم اجد فی کتا ب الله ولاسنة رسو ل الله اخذت بقول اصحابه من شئت وادع قول من شئت،ثم لااخرج عن قولهم الی قول غیرهم

واذ انتهی الامر الی ابراهیم،والشعبی،والحسن،وعطاء،وابن سیر ین، وسعید بن المسیب،وعد رجالا فقوم قد اجتهدوا فلی ان اجتهد کما اجتهدوا (۱)

ترجمہ میں (شرعی احکام میں) اللہ کی کتاب پر عمل کرتا ہوں جب وہ احکام مجھے کتاب الٰہی میں مل جائیں، اور جو احکام مجھے قرآن میں نہیں ملتے ہیں تو پھر سنت رسول اللہ ﷺ اور ان صحیح آثار پر عمل کرتا ہوں جو ثقہ راویوں سے منقول ہو کر ثقہ راویوں میں پھیل چکے ہیں، اور اگر کتاب الٰہی اور حدیث نبوی (دونوں) میں نہیں پاتا تو آپ ﷺ کے صحابہ کے اقوال میں سے جسے چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں (البتہ حضرات صحابہ کے قول سے باہر نہیں جاتا کہ) سارے صحابہ کے قول کو چھوڑ کر دوسرے کے قول کو اختیار کرلوں،

---

(۱) وروی هذا الخبر الامام الصیمری المتوفی ٤٣٦ه فی کتاب اخبار ابی حنیفة واصحابه ص ۱۰،والامام الموفق المکی فی "مناقب ابی حنیفة(ج۱ص۷۹)"الحافظ الذهبی ف "مناقب الامام ابی حنیفة

اور جب نوبت ابراہیم نخعی، عامر شعبی، محمد بن سیرین، حسن بصری، عطاء بن رباح اور سعید بن مسیّب (رحمہم اللہ) وغیرہ متعدد حضرات تابعین کے نام شمار کئے) تک پہنچتی ہے تو ان حضرات نے اجتہاد کیا لہذا مجھے بھی حق ہے کہ ان حضرات کی طرح اجتہاد کروں۔ یعنی ان حضرات کے اقوال پر عمل کرنے کی پابندی نہیں کرتا بلکہ ان ائمہ مجتہدین کی طرح خدائے ذوالمنن کی بخشی ہوئی اجتہادی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہوں اور اپنے فکر و اجتہاد سے پیش آمدہ مسائل کو حل کرتا ہوں۔

امام ابن حجر ہیتمی مکی امام ابو حنیفہ کا ایک قول نقل یوں کرتے ہیں:

"لیس لاحد ان یقول برائه مع کتاب الله تعالی ولامع سنة رسول الله ﷺ ولاما اجمع علیه اصحابه" (خیرات الحسان ص ۲۷)

کسی شخص کو کتاب الٰہی، وسنت نبوی اور حضرات صحابہ کے اجماع کے مقابلے میں رائے زنی کا کوئی حق نہیں ہے۔

امام صاحب نے ان اقوال میں اپنے اصول اجتہاد کو واضح اور صاف لفظوں میں بیان کر دیا ہے کہ وہ رائے واجتہاد سے اسی وقت کام لیتے ہیں جب انھیں کسی مسئلہ میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، اور حضرات صحابہ کے اقوال میں کوئی حکم نہیں ملتا۔

پھر ان اجتہادی مسائل میں بھی وہ اس درجہ احتیاط برتتے ہیں کہ حدیث ضعیف کے مقابلے میں بھی اپنے فکر واجتہاد کو چھوڑ دیتے ہیں چنانچہ علامہ ابن القیم اپنی مشہور وگرانقدر کتاب اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں:

واصحاب ابی حنیفةؒ مجمعون علی ان مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث عنده اولی من القیاس والراء وعلی ذالك بنی مذهبه" (ج ۱ ص ۷۷)

امام ابو حنیفہ کے تلامذہ و متبعین کا اس بات پر اتفاق واجماع ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذھب یہ ہے کہ ضعیف حدیث بھی ان کے نزدیک قیاس ورائے سے اولیٰ اور بہتر ہے اسی نظریہ پر انھوں نے اپنے مذھب کی بنیاد رکھی ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ اجتہادی مسائل میں امام صاحب

[illegible]

کرتے تھے کہ شرعی احکام میں جو رائے بھی قائم کریں وہ سنت واثر کے تابع ہو۔ بس یوں سمجھنا چاہئے کہ ظاہر میں تو وہ امام صاحب کا قول ہوتا تھا لیکن حقیقت میں وہ حدیث کی تفسیر وتوضیح ہوتا ہے، اسی لئے سرتاج محدثین امام عبداللہ بن مبارک فرمایا کرتے تھے:

لاتقولوا رأی ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ ولکن قولوا انه تفسیر الحدیث

(ذیل الجواہر المضیۃ ج۲ ص۴۶۰)

لوگوں یہ نہ کہا کرو کہ یہ ابو حنیفہؒ کی رائے ہے بلکہ یوں کہو کہ یہ حدیث کی تفسیر وبیان ہے

ایک دوسرے موقع پر انہی امام المحدثین عبد اللہ بن مبارکؒ نے امام صاحب کی احادیث رائے اور اس کی ضرورت واہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

ان کان الاثر قد عرف واحتیج الی الرأی ،فرأی مالك ،وسفیان ،وابی حنیفة ،وابو حنیفة احسنهم وادقهم فطنة واغوصهم علی الفقه ،وهوا فقه الثلاثة

(تاریخ بغداد للخطیب ج۱۳ ص۳۴۳)

اگر حدیث معلوم ومعروف ہو اور (اس کی مراد کی تطبیق میں) رائے کی ضرورت ہو تو امام مالک، امام سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ کی رائے (ملحوظ رکھنی چاہئے) اور امام ابو حنیفہ ان تینوں میں فہم وادراک میں زیادہ بہتر اور فقہ کی تہ تک زیادہ پہنچنے والے تھے۔

اور امام حدیث سفیان بن عیینہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے کوئی بات حدیث سے ہٹ کر نہیں کہی ہے بلکہ انھوں نے جو بھی کہا ہے اس کی تائید میں ایک دو حدیث موجود ہے۔ چنانچہ مشہور ثقہ محدث علی بن خشرم کا بیان ہے کہ:

کنافی مجلس سفیان بن عیینة فقال : یا اصحاب الحدیث تعلموا فقه الحدیث لا یقهر کم اصحاب الرأی ماقال ابو حنیفة شیئاً الا ونحن نروی فیه حدیثاً او حدیثین

(معرفة علوم الحدیث للحاکم ص۶۶)

ہم سفیان بن عیینہ کی مجلس میں تھے تو انھوں نے کہا اے حدیث سے اشتغال رکھنے والو، حدیث میں تفقہ حاصل کرو ایسا نہ ہو کہ تم پر اصحاب فقہ غالب ہو جائیں، امام ابو حنیفہ نے کوئی بات ایسی نہیں بیان کی ہے کہ ہم اس سے متعلق ایک، دو حدیثیں روایت نہ کرتے ہوں۔

امام سفیان بن عیینہ نے اپنے اس ارشاد میں حاضرین مجلس کو دو باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے ایک یہ کہ وہ الفاظ وحدیث کی تحصیل و تصحیح کے ساتھ حدیث کے معنی وفقہ کے حاصل کرنے کی بھی سعی کریں

دوسرے امام صاحب کی اصابت رائے اور بصیرت فقہ کی تعریف میں فرمایا کہ ان کی رائے وفقہ حدیث کے مطابق ہے کیونکہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں میں اسکی تائید و توثیق کسی نہ کسی حدیث سے ہو جاتی ہے۔

اس کمال اصابت رائے اور بے نظیر فقہی بصیرت کے باوصف تواضع و بے نفسی اور وسعت نظری و کشادہ ذہنی کا یہ عالم تھا کہ برملا فرماتے تھے

هذاالذی نحن فیه رای لانجبر لحدا علیه ولانقول یجب علی لحد قبوله بکراهة فمن کان عنده شئ لحسن منه فلیات به (الانتقاء مع تعلیق شیخ عبد الفتاح ابو غدہ ص ۲۵۸)

یہ بات جس کے درپے ہم ہیں یہ (ہماری) رائے ہے کسی کو اس پر ہم مجبور نہیں کرتے ،اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ناپسندیدگی کے باوجود کسی پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔اور اگر کسی کے پاس اس سے بہتر رائے ہو تو وہ اسے پیش کرے (یعنی ہم اسے بسر و چشم قبول کرلیں گے)

امام خطیب بغدادی نے اپنی سند سے امام صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

هذارأی وهو لحسن ما قدرنا علیه فمن جاءنا با حسن من قولنا فهوا ولی بالصواب منا

(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۵۲)

یہ ہماری رائے ہے اور ہماری وسعت وقدرت کے مطابق یہ بہترین رائے ہے ،اگر کوئی شخص ہمارے سامنے ہماری امام صاحب کی اسی اصابت رائے پیش کرے گا تو وہ ہمارے مقابلہ میں درستگی سے زیادہ قریب ہو گا۔

امام صاحب کی اسی اصابت رائے بے مثال فقہی بصیرت اور احادیث و آثار کی حد درجہ اتباع و پیروی پھر اس پر مستزاد کشادہ نظری اور تواضع وانکساری کا ثمرہ ہے کہ آج بھی جبکہ اعجاب کل ذی رای برایہ کا ظہور اپنے شباب پر ہے اور خود پسندی وخود رائی رای کا عام شیوع ہے پھر بھی عالم اسلام کی غالب اکثریت انھیں کی فقہ اور تفسیر نصوص کو حرز جان بنائے ہوئے ہے ۔

ذالك فضل الله یوتیه من یشاء .

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ۔ ہر اک کا یہ نصیب یہ بخت رسا کہاں

فروعی مسائل کو بنیادی احکام کا درجہ دینا تفرقہ انگیز بدعت ہے

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

دین کے احکام مجموعی طور پر تین طرح کے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق عقیدہ اور ضمیر سے ہے، جنکو ماننے، تسلیم کرنے اور یقین کرنے پر ایمان کا مدار ہے۔ انہیں کو "اعتقادات" یا ایمانیات، کہا جاتا ہے۔ توحید و رسالت، قرآن کی صداقت اور آخرت وغیرہ مسائل اسی قسم کے ہیں، جن میں "مصالحت" اور "لو اور دو" کی ادنی گنجائش نہیں ہے، دوسرے وہ جن کا تعلق قلبی کیفیت، عادات اور برتاؤ سے ہے ان کو "اخلاقیات" کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً سچ بولنے، حسن سلوک کرنے، انفاق، اتحاد اور عجز و انکساری اختیار کرنے اور جھوٹ بولنے، غیبت کرنے، کبر و تعلّی وغیرہ سے اجتناب کرنے کا حکم۔ تیسرے انسانی زندگی کے وہ عملی احکام جن کا تعلق اللہ تعالی کے یا اس کے بندوں کے حقوق سے ہیں، اور ان کو دین میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً روزہ نماز، حج و زکوۃ کی فرضیت، قریبی رشتہ داروں سے نکاح کی ممانعت، طلاق کے ذریعہ رشتۂ نکاح کا خاتمہ، والدین کی حقوق اور زوجین کے اہم حقوق وغیرہ۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنی بیعت میں خاص طور پر اس قسم کی باتوں کا عہد لیا ہے اور ان سے بے پروائی برتنے پر سخت وعیدیں بیان کی ہیں۔ دین و شریعت کے یہ تمام حصے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور دین کے حدود و اربعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید نے صریح الفاظ میں ان کو واضح کر دیا ہے، متواتر حدیثیں بے غبار کر کے ان کو بیان کرتی ہیں اور اسلام کے عہد اول سے آج تک مسلمانوں کے تعامل نے ان کی حقانیت، صداقت، اسلام میں ان کے ثبوت اور دین میں ان کی اہمیت کو اس قدر روشن کر دیا ہے کہ اس میں کسی کے لئے شک و شبہ کی ادنی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین کے درمیان ان مسائل میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔ کون ہے جس کو خدا کی توحید اور محمد عربی فداہ روحی وابی کی رسالت سے اختلاف ہو؟ (العیاذ باللہ) سچائی کے قابل اجر ہونے اور جھوٹ کے نادرست ہونے پر کیا کبھی اتفاق رائے

نہیں رہا ہے۔ اور کیا کسی نے نماز روزہ کی فرضیت سے بھی انکار کیا ہے؟

چوتھے قسم کے احکام وہ ہیں جو ان عملی احکام کی جزوی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً نماز کے اوقات اور ان کے جائز و مستحب حصے، وضو کی سنتیں اور اس کے نواقض، نماز کے فرائض و سنن کا تعین، طلاق کی مختلف صورتیں اور اس کے اثرات و نتائج، دعاء کے آداب وغیرہ۔ اس قسم کے احکام میں قرآنی آیات بہت کم ہیں، قرآن مجید نے عام طور پر اعتقادات، اخلاقیات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اصولی احکام ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ متواتر حدیثیں جن کو ہر زمانہ میں امت کی ایک بہت بڑی جماعت نقل کرتی آئی ہے، بھی اس باب میں بہت کم ہیں اور اہل علم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان مسائل میں اکثر و بیشتر دلائل ایسے ہیں جن میں ہمیں اپنے قصور فہم کی وجہ سے "بظاہر" اختلاف سا محسوس ہوتا ہے اور کتاب و سنت کی تصریحات اس باب میں اس قدر واضح نہیں ہیں کہ ان میں قطعی طور پر ایک ہی رائے قائم کر کے اس پر اصرار اور دوسروں کی کررائے سے اختلاف اور اس سے مکمل انکار کو درست کہا جا سکے، دلائل میں اختلاف مختلف وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی "لفظ" ایک ہی ہوتا ہے مگر خود اس ایک لفظ کے اندر ایک سے زیادہ مفہوم کی گنجائش رہتی ہے، مثلاً و امسحو برؤ سکم (المائدہ :۶-) اس میں عربی قواعد کے لحاظ سے پورے سر کا مفہوم بھی اخذ کیا جا سکتا ہے اور سر کے کچھ حصہ کے مسح کا بھی، کہیں ایک حکم کی صراحت موجود ہوتی ہے اور اس پر اتفاق بھی ہوتا ہے لیکن اس حکم کا سبب متعین کرنے اور دوسرے مواقع پر ان کی روشنی میں مسائل حل کرنے میں رائے اور نقطۂ نظر کا اختلاف ہو جاتا ہے، کبھی حضور اکرم ﷺ نے ایک ہی کام دو طریقوں سے انجام دیا ہوتا ہے۔ جس راوی نے آپؐ کا جو طریقہ دیکھا اسے نقل کرتا ہے اور جن لوگوں تک حدیث ان کے ذریعہ پہونچتی ہے وہ اس کو اختیار کرتے ہیں، حالانکہ منشائے رسالت یہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں توسع سے کام لیا جائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک عمل ابتداء میں کیا، بعد کو اس حکم میں تبدیلی کی گئی، اب چوں کہ مجتہد تک قطعی طور پر یہ بات نہیں پہونچ پاتی کہ ان میں سے کون سا عمل آپ کا پہلا عمل ہے اور منسوخ ہے اور کون سا عمل بعد کا ہے اور ناسخ ہے؟ اس کے تعین میں اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی روایات میں ترجیح کے لئے الگ الگ معیار ہوتے ہیں۔ ایک فقیہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ایک روایت کو راجح سمجھتا ہے اور دوسرا اس کو مرجوح۔

اس لئے ان مسائل میں اختلاف بالکل فطری امر ہے اور چوں کہ یہ اختلاف اجتہاد اخلاص، حق کی تلاش و جستجو اور سنت نبویؐ کی اتباع و پیروی کی بنیاد پر ہے اور دین کے حدود اربعہ اور کتاب و سنت کے چوکھٹے میں رہتے ہوئے ہے، اس لئے قطعاً مذموم نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے آنحضورؐ کی مختلف سنتیں اور مختلف طریقے زندہ ہوتے ہیں۔ اور وہ عملی زندگی میں جگہ پاتے ہیں، وہ تنگی کے وقت یسر و سہولت کا سامان بنتے ہیں، اگر دین میں یہ بات مطلوب ہوتی کہ ان مسائل میں امت مسلمہ کے درمیان سر مو اختلاف نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے لئے کیا دشوار تھا کہ وہ توحید و رسالت اور اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ کے متعلق صریح واضح ہدایات کی طرح امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے اور نہ پڑھنے اور رفع یدین کرنے اور نہ کرنے اور آمین کے بالجہر یا بالسر کہنے کی بابت بھی اپنی کتاب میں "قول فیصل" نازل فرمادیتا، یا اسکی قدرت ان مسائل کو بھی ہم تک اسی تواتر سے پہنچادیتی جس تواتر کے ساتھ ہم کو نماز کی رکعات کا علم ہے اس قسم کے مسائل کو دین کے بنیادی احکام کا درجہ دیدینا، ان کو بحث و مناظرہ اور فتنہ و جدال کا موضوع بنادینا اور ان میں حق و باطل کی طرح جوش و خروش کا مظاہرہ، دین میں نسبتاً کم اہم بات کو زیادہ اہمیت دینے کے مترادف اور ایک فتنہ خیز اور تفرقہ انگیز بدعت اور احداث فی الدین ہے اور وہ لوگ جو اپنے آپ کو نہ صرف توحید کا داعی سنت رسولؐ کا محافظ اور بدعت کا ماحی و قامع قرار دیتے ہیں بلکہ کسی اور جماعت کو ان امور میں اپنا شریک و سہیم تسلیم کرنا بھی جن کو گراں خاطر ہے، ان سے ایسی باتوں کا ارتکاب کسی عجوبہ سے کم نہیں ہے۔

مہبط وحی رسول اللہ ﷺ کے بعد دین و شریعت کے منشاء و روح سے سب سے زیادہ واقف صحابہ کرام تھے، خود حضورؐ نے صحابہ کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم فرمایا، ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل میں خود صحابہؓ کے درمیان اختلاف موجود تھا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ آگ میں پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، عام صحابہ اس کے قائل نہ تھے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ عیدین میں ہر رکعت میں نو نو دفعہ تکبیر زوائد کے قائل تھے، بعض صحابہ تین تین دفعہ کے اور بعض اس سے زیادہ کے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس بات کو ضروری نہیں سمجھتی تھیں کہ عورتیں غسل میں اپنی چوٹیاں کھولیں، جب کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس کو ضروری جانتے تھے حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ ابن عمرؓ کا خیال تھا عرفات سے واپسی میں آپؐ کا مقام ابطح پر اترنا از راہ عبادت تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کو صرف ایک اتفاقی بات کہتے تھے، کسی کا شوہر غائب اور لاپتہ ہوجائے تو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کی رائے تھی کہ چار سال انتظار کے بعد اس کا نکاح توڑ دیا جائے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ جب تک مرد کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے عورت اسی حال میں رہے اور دوسرا نکاح نہ کرے، لیکن اس کے باوجود یہ تمام صحابہؓ ایک دوسرے کو مخلص بھی سمجھتے تھے، باہم ایک دوسرے کا احترام واکرام بھی کرتے تھے اور یہ اختلاف کبھی ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کا سبب بھی نہ بن پاتا تھا، وہ ایک دوسرے کے پیچھے بلا تامل نماز بھی ادا کرتے تھے اور مسائل میں ایک دوسرے کی طرف رجوع بھی فرماتے تھے۔

یہی حال تابعین اور سلف کا رہا ہے، انہوں نے اس اختلاف کو کبھی نزاع وجدال کا سبب بننے نہیں دیا ہے امام سفیان ثوری ایسے اختلافی مسائل کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ یہ نہ کہو کہ علماء نے ان مسائل میں اختلاف کیا ہے بلکہ یہ کہو کہ امت کے لئے توسع اور فراخی پیدا کی ہے۔ لا تقولوا اختلف العلماء في كذا و قولوا قد وسع العلماء على الامة بكذا۔(۱) وہ سمجھتے تھے کہ ان مسائل میں اختلاف امت کے لئے چنداں مضر نہیں اسی لئے امام مالکؒ نے خلیفہ ہارون الرشید کو اس بات سے منع کر دیا کہ ان کے مجموعہ حدیث "موطا امام مالک" پر جبراً تمام مسلمانوں سے عمل کر لیا جائے دین کی روح اور اس کے مزاج ومذاق سے واقفیت نے ان کے اندر رواداری اور فراخ دلی پیدا کر دی تھی، امام احمدؒ پچھنا لگانے کو ناقض وضو سمجھتے تھے۔ امام مالکؒ اور سعید بن مسیبؒ کا خیال تھا کہ اس سے وضو کئے بغیر نماز کو کھڑا ہو جائے تو کیا آپؒ اس کی اقتداء کریں گے؟ امام احمدؒ نے کہا کیوں نہیں؟ کیا میں امام مالکؒ کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا؟ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، خلیفہ ہارون نے امام مالکؒ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے پچھنا لگوانے کے بعد امامت کی اور وضو نہیں کیا، امام ابو یوسفؒ نے ان کی اقتداء میں نماز ادا کی اور کہا کہ آج میں نے اپنے بھائی "اہل مدینہ" کی رائے پر عمل کیا ہے۔ امام شافعی بغداد آئے جہاں امام ابو حنیفہؒ کی قبر ہے تو نماز فجر اس طرح ادا کی کہ دعاء قنوت نہیں پڑھی، حالاں کہ وہ نماز فجر میں دعاء قنوت کے قائل ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس قبر والے سے شرم آتی ہے کہ یہاں آکر بھی میں ان کی مخالفت کروں؟

(۱) حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ سنجیدہ اور اہل علم ہوں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے فہم کا کوئی حصہ عطا کیا ہو وہ اس قسم کے مسائل میں سلف صالحین پر طعن و تشنیع اور ان کے اثبات یا رد میں تشدد و غلو کر ہی نہیں سکتے، حافظ ابن تیمیہؒ (ہمارے غیر مقلد بھائی عملاً جن کی تقلید کرتے ہیں) خود ان کی اس وضاحت میں کس قدر اعتدال ہے۔

فان السلف فعلوا هذا و هذا كانوا يصلون تارة بالجهر بالبسملة وتارة بغيرجهر و تارةً باستفتاح و تارةً بغير استفتاح و تارةً برفع اليدين في المواطن الثلاثة وتارةً بغير رفع و تارةً يسلمون تسليمتين و تارةً تسليمة واحدة و تارةً يقرؤن خلف الامام بالسر و تارةً لايقرؤن وتارةً يكبرون على الجنازة سبعاً وتارةً اربعاً كان فيهم من يفعل هذا وفيهم من يفعل هذا كل هذا ثابت عن الصحابة و كلاهما ثابت عن النبي صلى الله عليه وسلم.

سلف صالحین نے ایسا بھی کیا ہے اور ایسا بھی......وہ کبھی نماز میں زور سے بسم اللہ کہتے ہیں اور کبھی آہستہ، کبھی ثناء پڑھتے اور کبھی نہیں پڑھتے، کبھی تین مواقع پر رفع یدین کرتے کبھی نہیں، کبھی دو سلام پھیرتے کبھی ایک ہی پر اکتفاء کرتے، کبھی امام کے پیچھے قرأت کرتے، کبھی نہیں کرتے، کبھی جنازے پر سات تکبیرات کہتے، کبھی پانچ اور کبھی چار، ان میں بعض لوگ اس طرح عمل کرتے اور بعض اس طرح یہ تمام باتیں صحابہؓ سے ثابت ہیں، اور یہ مختلف طریقے رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں۔

اس طرح غیر اہم بحثوں میں خود الجھنا یا دوسروں کو الجھانا قوم وملت کے لئے زبردست نقصان اور خسارہ ہے، اس سے فرقہ بندی بڑھتی ہے، اس سے اختلاف وانتشار کو ہوا ملتی ہے، جو یقیناً گناہ ہے اور اس سے واقعی اور ضروری مسائل کی طرف سے بے توجہی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے تجربہ ہے کہ اس قسم کا مذاق رکھنے والے لوگ مسلمانوں کی دینی حالت کی اصلاح، عبادات کی طرف دعوت، معاشرہ اور معاملہ کی اصلاح، قوم کی ٹھوس تعمیری خدمت، غیر مسلموں میں دعوت اسلام وغیرہ کے کام بالکل نہیں کرپاتے اور ان کا جوش جنوں اور جذبہ اصلاح "قرأت فاتحہ" اور رفع یدین" وغیرہ کے مسائل سے آگے گذر کر برف کی طرح جم کر رہ جاتا ہے ہم جب حضور اکرم ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہاں دین کے بنیادی ارکان توحید، نماز، روزہ اور حج وزکوٰۃ کی دعوت ہوتی

ہے اور انہیں کی بیعت لی جاتی ہے مگر اس طرح کے غلو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان ارکان خمسہ کے بجائے ہماری مسائی کا نقطۂ آغاز امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت، رفع یدین، آمین بالجہر، ایک ہاتھ سے مصافحہ اور اس طرح کے مسائل سے ہوتی ہے۔ **فیاعجباہ ویا اسفاہ**

اس غلو کا سب سے افسوسناک بلکہ خطرناک پہلو صحابہؓ کے اسوۂ و آثار اور ان کے طریق زندگی اور تعامل سے بے نیازی بلکہ ایک درجہ میں اتباع سنت کے نام پر اس کا انکار اور اس سے بے نیازی و بے اعتنائی ہے، یہ عاشقان توحید، حامیان سنت اور ماحیان بدعت حضرت عمرؓ و عثمانؓ کی طرف بدعت کی نسبت کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کرتے، تراویح کی ۲۰ رکعتیں "بدعت عمری" ہیں اور جمعہ کی اذان ثانی "بدعت عثمانی" ہے اور عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت چوں کہ فقہ حنفی کے لئے اساس کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے اس کا احتساب تو گویا ان کا خاص کار ثواب ہے کہ آخر اس کے بغیر فقہ حنفی کو مجروح کس طرح کیا جاسکے گا؟

کاش! وہ اس حقیقت کو سمجھتے کہ خلفاء راشدین اور اصحاب رسول ﷺ کی سنتوں کی پیروی اور ان کے اسوہ کو مشعل راہ بنانے کا حکم بھی اسی حدیث سے ثابت ہے جس کا متبع وہ اپنے آپ کو قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان صحابہؓ میں ہیں جن کو حضور ﷺ کی بارگاہ میں خاص مقام حاصل تھا، جو ابتداء اُسلام قبول کرنے والوں میں ہیں، جن کو دوبار حبش اور ایک بار مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہے جو غزوۂ بدر میں شریک رہے ہیں۔ خود آپ ﷺ نے لوگوں کو ان سے قرآن سیکھنے کا حکم دیا۔ صحابہؓ ان کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ان کو کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کو لکھا کہ ابن مسعودؓ کو بھیج کر میں ایثار سے کام لے رہا ہوں۔ جن کو آپ ﷺ سے اس قدر قرب تھا کہ وہ آپ ﷺ کے بستر تکئے، وضو کا پانی اور نعلین وغیرہ کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابن مسعودؓ کے اصحاب اس امت کے چراغ ہیں، **(اصحاب ابن مسعود سرج هذه الامة)**

بحیثیت مجموعی صحابہ یا کسی خاص صحابی کی ادنی ہتک شان ایک خطرناک بات ہے اور آخرت

کے لئے سخت خسارہ کا باعث ہے، ہم نے اپنے بزرگوں (علماء دیوبند) کو دیکھا ہے کہ تقلید اور ایک صحابی کے قول کو دوسرے صحابی کی رائے پر ترجیح دینے کے باوجود نہ صرف صحابہ بلکہ بعد کے بزرگوں کے احترام اور ان کی عظمت کا بھی اس قدر خیال رکھا جاتا ہے جس طرح کہ خود اس امام کا جس کے وہ مقلد ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے سوانح نگار نے نقل کیا ہے کہ ان کی درس میں اگر کوئی طالب علم کسی محدث پر اعتراض کرتا تو خفگی کا اظہار کرتے اور دلائل کی اس طرح تشریح فرماتے کہ ان کا مسلک ہی قوی محسوس ہوتا۔ ایک دفعہ احناف کسی رائے کی توجیہ میں حضرات شوافعؒ کی کسی دلیل کا ایسا دلپذیر جواب دیا کہ ایک صاحب کہہ اٹھے اگر امام شافعیؒ زندہ ہوتے تو وہ بھی آج رجوع کر لیتے۔ مولانا گنگوہی کو ان کی یہ بات ناگوار گذری اور فرمایا کہ اگر امام شافعیؒ زندہ ہوتے تو میرا یہ اعتراض محض ایک طالب علمانہ اعتراض ہوتا، صحابہ اور خیر القرون کے اختلاف کے بارے میں تمام ہی سلف صالحین کا یہی طریق رہا ہے خود امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

"لایجوز لاحد أن یظن بالصحابة أنهم بعد رسول الله اجمعوا علی خلاف شریعة بل هذا من اقوال اهل الإلحاد

کسی کے لئے صحابہؓ کے متعلق یہ گمان رکھنا جائز نہیں کہ وہ آپؐ کے بعد شریعت کی خلاف ورزی پر متفق ہوگئے تھے، بلکہ اس طرح کی بات ملحدین ہی کہہ سکتے ہیں۔

فجر کی سنتوں کے مسائل

احادیث نبویہ اور صحابۂ کرام وتابعین کے عمل کی روشنی میں، جن کو بعض نادان دوستوں نے حق وباطل کا معرکہ بنادیا۔

ابوجندل قاسمی دارالعلوم ٹانڈہ ضلع رام پور

فجر کی سنتوں کی تاکید:۔

احادیث مبارکہ میں فجر کی سنتوں کی بڑی تاکید آئی ہے:۔ چنانچہ:

حدیث (۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

لم یکن النبی ﷺ علیٰ شیٍٔ من النوافل اشدّ تعاھداً منه علی رکعتی الفجر.

(بخاری ج۱ ص ۱۵۶ مسلم ج۱ ص ۲۵۱ نصب الرایہ ج۲ ص ۱۶۱)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نوافل میں سے جتنی پابندی فجر کی دو رکعتوں (سنتوں) کی فرماتے تھے اتنی پابندی کسی اور نفل نماز کی نہیں فرماتے تھے۔

حدیث (۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ:۔

أن النبی ﷺ کان لا یدع اربعا قبل الظهر ورکعتین قبل الغداة

(بخاری ج۱ ص ۱۵۷ نسائی ج۱ ص ۲۵۳ نصب الرایہ ج۲ ص ۱۶۱)

ترجمہ: نبی کریم ﷺ ظہر سے پہلی چار رکعت اور فجر سے پہلی دو رکعت نہیں چھوڑتے تھے۔

حدیث (۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تدعوهما وإن طردتکم الخیل (ابوداؤد ج۱ ص۱۷۹ نصب الرایہ ج۲ ص ۱۶۰)

ترجمہ: فجر کی سنتوں کو نہ چھوڑو اگرچہ تم کو گھوڑے روند ڈالیں۔

فجر کی سنتوں کی فضیلت:

حدیث (۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول معظم ﷺ نے فرمایا:

رکعتا الفجر خیر من الدنیا وما فیها، وفی روایة: لهما احبّ الی من

الدنيا جميعا.(مسلم ج۱ ص۲۵۱ نصب الرایہ ج۲ ص۱۶۱)

ترجمہ:۔ فجر کی دو رکعتیں دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے افضل ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مجھے یہ دو رکعتیں تمام دنیا سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔

اگر فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو؟

حدیث(۵):۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من لم يصل ركعتي الفجر فليصلهما بعد ما تطلع الشمس

(ترمذی مع العرف الشذی ج۱ ص۹۶ جمع الفوائد ج۱ ص۳۱۰)

ترجمہ:۔ جس شخص نے فجر کی دو رکعتیں (نماز سے قبل) نہ پڑھی ہوں تو وہ ان کو طلوع شمس کے بعد پڑھے۔

حدیث(۶):۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کا قصہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پیچھے رہ گئے، پھر پورا قصہ نقل کیا اور بیان کیا کہ:

فاتينا الناس وعبد الرحمن بن عوف يصلي بهم الصبح، فلما رأى النبي ﷺ اراد ان يتأخر، فاوما اليه ان يمضي، قال فصليت انا والنبي ﷺ خلفه ركعة فلما سلم قام النبي ﷺ فصلى الركعة التي سبق بها ولم يزد عليها شيئاً. (ابوداؤد ج۱ ص۲۰)

ترجمہ:۔ ہم لوگوں کے پاس آئے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ لوگوں کو نماز فجر پڑھا رہے تھے۔ انھوں نے آپ ﷺ کو دیکھ کر پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے منع فرمادیا کہ نماز پڑھاتے رہو، مغیرہ ابن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے پیچھے ایک رکعت پڑھی جب عبدالرحمٰنؓ نے سلام پھیرا تو نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر چھوٹی ہوئی رکعت پڑھی اور اس سے زیادہ آپؐ نے کچھ نہیں پڑھا۔ (حالانکہ ظاہر ہے کہ آپؐ کی سنتیں چھوٹ گئی ہونگی، مگر آپ نے نماز کے فوراً بعد نہیں پڑھیں۔)

اگر فجر کی نماز قضا ہوجائے تو؟

حدیث(۷):۔ **ثم امر بلالاً فاذن ثم توضئوا وصلوا ركعتي الفجر ثم امر بلالاً فاقام الصلوة فصلى بهم صلوة الصبح**

مسلم ص۲۳۲ ج۱ ابوداؤد ص۶۲/۶۳/۶۴ طحاوی ص۲۳۲ ج۱ نصب الرایہ ص۱۸۱ ج۱ ص۳ ج۲

حضرت ابو ہریرہؓ ابو قتادہ انصاریؓ، حضرت بلالؓ، عمران بن حصینؓ، عمرو بن امیۃ الضمریؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ذی مخبرؓ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے "لیلۃ التعریس" کے واقعہ میں مروی ہے کہ:۔

پھر آپ نے حضرت بلال کو اذان پڑھنے کا حکم دیا پس انھوں نے اذان پڑھی، پھر صحابہؓ نے وضوء کیا اور فجر کی دو رکعت (سنتیں) پڑھیں، پھر آپنے بلالؓ کو اقامت کا حکم دیا ،اقامت ہوگئی، پھر آپ نے صحابہؓ کو فجر کی نماز (جماعت سے) پڑھائی

فجر کی نماز کی ممانعت

احادیث شریفہ میں فجر کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک ہر طرح کی نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ:۔

حدیث (۸):۔ عمر بن الخطابؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ ابوھریرہؓ ابو سعید خدریؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ عائشہؓ (تقریباً سترہ صحابہ کرامؓ) سے مروی ہیکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

لاصلوۃ بعد صلاۃ الصبح حتی تطلع الشمس

(بخاری ص۸۲ ج۱ مسلم ص۲۷۵ ج۱ ترمذی مع العرف ص۴۵ ج۱ ابوداؤد ص۱۸۱ ج۱ ابن ماجه ص۸۸ نصب الرایه ص۲۵۳ ج۱)

فجر کی نماز کے کے بعد سورج نکلنے تک کسی طرح کی کوئی نماز نہیں

حدیث (۹):۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ:۔

کان رسول اللہ ﷺ یصلی فی إثر کل صلوۃ مکتوبۃ رکعتین الاّ الفجر والعصر۔ (ابوداؤد ج۱ ص ۱۸۱)۔

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد دو رکعت پڑھا کرتے تھے، لیکن فجر وعصر کے بعد کچھ نہیں پڑھتے تھے۔

جماعت کی فضیلت و تاکید۔

احادیث طیبہ میں جماعت کی بھی بڑی تاکید و فضیلت وارد ہے۔ چنانچہ:۔

حدیث (۱۰) حضرت ابن عمرؓ ابو سعید خدریؓ سے مروی ہیکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

صلاۃ الجماعۃ تفضل صلاۃ الفذ بسبع وعشرین۔

جماعت کی نماز تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ بے افضل ہے۔(بخاری ج ا
ص ۸۹ مسلم ج ا ص ۲۳۱) ہے:۔

حدیث (۱۱):۔ حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

والذی نفسی بیده لقد هممت أن امر بحطب ليحطب ثم امر بالصلوۃ فيوذن لها ثم امر رجلا فيؤم الناس ثم اخالف إلى رجال فاحرق عليهم بيوتهم.

اس ذات کی قسم جسکے قبضہ میں میری جان ہے میرا ارادہ ہوتا ہے کہ میں لکڑیاں جمع کرنیکا حکم دوں اور لکڑیاں جمع کرلی جائیں پھر نماز کے لئے اذان کا حکم دوں پھر ایک شخص کو لوگوں کی امامت کا حکم دوں اور پھر جو لوگ مسجدوں میں (جماعت کی نماز کیلئے) نہیں آتے انکے گھروں میں آگ لگادوں (بخاری ص ۸۹ ج ا مسلم ص ۲۳۲ ج ا)

صحابۂ کرام کا عمل۔

خادم الرسول عبد اللہ بن مسعودؓ کا عمل:۔ عبد اللہ بن ابی موسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعید ابن العاصؓ نے ابوموسیٰ، حذیفہؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ کو فجر کی نماز سے پہلے بلایا یہ حضرات بات چیت کرنے کے بعد نماز فجر کیلئے نکلے تو عبد اللہ بن مسعودؓ نے مسجد کے ایک ستون کی آڑ میں سنتیں پڑھیں، اور ابوموسیٰؓ و حذیفہؓ نے اس سلسلہ میں ان پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، معلوم ہوا کہ وہ دونوں حضرات بھی اس سلسلہ میں ابن مسعودؓ کے موافق تھے۔
(شرح معانی الآثار ص ۲۱۹ ج ا)

مفسر قرآن عبد الله بن عباسؓ کا عمل:۔

ابو مجلزؒ اور ابو عثمانؒ انصاریؒ سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عباسؓ مسجد آئے، دیکھا کہ امام نے فجر کی نماز شروع کردی تو آپ نے پہلے دو رکعت سنت پڑھیں۔(ایضاً ص ۲۱۹ ج ۲)

محب السنة عبد الله بن عباسؓ کا عمل:۔

محمد بن کعبؒ اور زید بن اسلمؒ بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرؓ مسجد آئے اور امام فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، تو پہلے آپ نے دو سنت ادا فرمائی۔(ایضاً ص ۲۲۰ ج ا)

عبد الله بن عمرؓ کا دوسرا عمل:۔

نافعؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کو جگایا جبکہ فجر کی نماز کھڑی ہو گئی تھی، تو آپنے پہلے

ام المؤمنین حفصہؓ کے حجرہ میں (جو مسجد سے بالکل متصل تھا) دو رکعت پڑھیں۔ (ایضا)

عبد اللہ بن عمرؓ کا تیسرا عمل :۔

ابو مجلزؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن عمرؓ مسجد تشریف لائے اور امام فجر کی نماز پڑھا رہے تھے تو آپ امام کے ساتھ شامل ہوگئے۔ (ہو سکتا ہے کہ دوسری رکعت بھی یا قاعدہ اخیرہ ملنے کی امید نہ ہو) سلام پھیرنے کے بعد آپ اپنی جگہ بیٹھے رہے، جب سورج اچھی طرح نکل آیا تو آپ کھڑے ہوئے اور دو رکعت پڑھیں (ایضا ۲۱۹ ج ۱۔ ترمذی مع العرف الشذی ص ۹۶ ج ۱)

صحابیٔ رسول ابو الدرداءؓ کا عمل :۔

ابو عبد اللہؒ بیان کرتے ہیں کہ ابو الدرداءؓ جب مسجد میں داخل ہوئے اور لوگ فجر کی نماز میں صفوں میں ہوتے تو آپ مسجد کے ایک کونہ میں پہلے دو رکعت پڑھتے، پھر لوگوں کے ساتھ نماز میں شامل ہوتے۔ (ایضا ص ۲۲۰ ج ۱)

تابعین عظام کا عمل.

حضرت مسروقؒ کا عمل :۔ شعبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مسروقؒ تشریف لائے اور آپنے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوتیں تو پہلے آپ مسجد ہی میں سنتیں پڑھتے پھر لوگوں کے ساتھ نماز میں شامل ہوتے۔ (ایضا)

ابو عثمان نہدیؒ کا عمل :۔

ابو عثمان نہدیؒ فرماتے ہیں کہ (بعض مرتبہ) ہم مسجد آتے، دیکھتے کہ عمر بن الخطابؓ نماز میں ہیں تو ہم دو رکعت سنت پڑھتے پھر عمر بن الخطابؓ کے ساتھ شامل ہوتے۔ (ایضا)

حسن بصریؒ کا قول :

یزید بن ابراہیمؒ اور یونسؒ بیان کرتے ہیں کہ حسن بصریؒ فرماتے تھے کہ جب تم مسجد میں آؤ اور تم نے فجر کی دو رکعت نہ پڑھی ہوں تو تم پہلے ان کو پڑھ لو، اگر چہ امام نماز میں ہو، اسکے بعد امام کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ (ایضا ص ۲۲۰ ج ۱)

اخذ کردہ چند مسائل.

الحاصل فجر کی سنتوں اور جماعت وغیرہ کے سلسلہ کی مندرجہ بالا احادیث مرفوعہ اور صحابہؓ کرام و تابعین عظام کے عمل سے مندرجہ ذیل مسائل ثابت ہوئے:

کوشش کرے کہ دونوں فضلیتیں حاصل ہو جائیں۔ لھذا جماعت کھڑی ہو جانے کے بعد فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھنے کی بھی گنجائش ہے بشرطیکہ کم از کم قعدہ ملنے کی امید ہو۔ جیسا کہ صحابہ وتابعین کے عمل سے معلوم ہوا۔

مسئلہ (۲) لیکن سنتیں مسجد کے ایک کونہ میں جتنی دور ہو سکے پڑھے، جہاں جماعت ہو رہی ہو ان صفوں کے قریب نہ پڑھے۔ جیسا کہ خصوصاً ابوالدرداءؓ کے عمل سے معلوم ہوا۔

مسئلہ (۳) اگر قعدۂ اخیرہ نکلنے کا خوف ہو تو سنتیں چھوڑدے اور جماعت میں شامل ہو جائے جیسا کہ حدیث نمبر ٦ سے معلوم ہوا۔

مسئلہ نمبر (۴) اگر چاہے تو سورج نکلنے کے بعد اشراق کے وقت بطور نفل ان سنتوں کو پڑھ لے کوئی ضروری نہیں، صرف نفل اور ثواب کی بات ہے۔ جیسا کہ حدیث (۵) اور عبد اللہ بن عمرؓ کے تیسرے عمل سے معلوم ہوا۔

مسئلہ نمبر (۵) اگر نماز فجر سے پہلے سنتیں نہ پڑھ سکے تو اب ان کو فرض نماز کے فوراً بعد سورج نکلنے سے پہلے پڑھنا جائز نہیں۔ جیسا کہ حدیث نمبر (۵، ٦، اور ۸ اور ۹) سے معلوم ہوا۔

مسئلہ نمبر (٦) اگر فجر کی نماز اور سنتیں دونوں چھوٹ جائیں تو چاہے سورج نکلنے سے پہلے پڑھے یا بعد میں (زوال سے پہلے پہلے تک) ہر حال میں فرض نماز اور سنت دونوں پڑھی جائیں گی، پہلے سنت پھر فرض نماز۔ جیسا کہ حدیث نمبر ۷ میں بیان کردہ "لیلۃ التعریس" کے واقعہ سے معلوم ہوا۔

مسئلہ نمبر (۷) اگر کوئی مسجد میں ایسے وقت آیا یا نیند سے ایسے وقت بیدار ہوا کہ اس کو اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر فرض اور سنت دونوں پڑھی جائیں گی تو سورج نکل آیگا، تو ایسی صورت میں صرف دو فرض پڑھ لے اور سورج نکلنے کے بعد بطور نفل ان سنتون کو پڑھ لے۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا مسائل جس طرح احادیث مبارکہ اور صحابہؓ وتابعینؒ کے عمل سے معلوم ہوئے وہیں فقہ کی مندرجہ ذیل مشہور و معروف کتابوں میں بھی منقول ہیں۔

در مختار و شامی زکریا جلد دوم ص ۱۲، ۱۱، ۵۱۰ البحر الرائق ص ۷۴ و ۸۴ جلد دوم۔ فتاوی تاتارخانیہ ص ۶۴۷۔ فتاوی رشیدیہ ص ۲ و ۳۰۱ جلد اول۔ امداد الفتاوی ج ۱ ص ۲۶۴ فتاوی دار لعلوم ص ۲، ۱، ۲۰۰ جلد چہارم فتاوی محمودیہ ص ۷٦ جلد ۱۵۔ فتاوی رحیمیہ ص ۱۴۱، ۲۴۰ جلد اول۔ بہشتی زیور ص ۳٦ حصہ دوم۔

مذکورہ بالا مسائل کے سلسلہ میں جو لوگ اپنے موقف پر اصرار کرتے ہیں اور شرکت جماعت کی وجہ سے ان سنتوں کو چھوڑدیتے ہیں یا فرض نماز کے فوراً بعد پڑھنے کو کہتے ہیں وہ لوگ

مندرجہ بالا احادیث مرفوعہ اور صحابہ و تابعین کے عمل کے خلاف کرتے ہیں اب وہ روایت ذکر کی جاتی ہیں جن سے مخالفین استدلال کرتے ہیں کہ ان کی کیا حقیقت ہے۔ کیا واقعی وہ روایات اس درجہ میں ہیں کہ ان سے استدلال کیا جائے؟۔ نیز ان کے کیا جوابات ہیں۔

مخالفین کے مستدلات اور انکے جوابات.

مخالفین جن روایات سے استدلال کرتے ہیں تتبع اور تلاش کے بعد ایسی روایتیں کل چار ہیں۔ چنانچہ :۔

حدیث (۱)۔ :حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اذااقیمت الصلاۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ"

جب جماعت کھڑی ہو جائے تو اب فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں

(مسلم ج۱ص ۲۴۷ ابوداؤد ج۱ص ۱۸۰ ترمذی ص ۹۶ ج۱) ابن ماجہ ص ۸۰ نسائی ص ۱۳۹ ج۱)

مخالفین اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب فجر کی جماعت کھڑی ہو جائے تو اب فوراً سنتیں بند کر دی جائیں۔ اب سنتیں نہیں پڑھی جائیں گی۔ لیکن چار وجوہ سے اس حدیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔

وجہ (۱):۔ یہ حدیث موقوف ہے۔ اس حدیث کے ایک مرکزی راوی حضرت عمرو بن دینارؒ ہیں، آپ کے شاگرد حماد بن زید جو پہلے اس روایت کو ایوب بحوالہ عمر بن دینار مرفوعاً سن چکے تھے جب عمرو بن دینار سے خود ملے تو انھوں نے اسے موقوف بتلایا۔ آپ خود فرماتے ہیں:

"ثم لقیت عمروا فحدثنی بہ ولم یرفعہ (مسلم ص ۲۴۷ ج۱)

اسی وجہ سے امام طحاویؒ نے "شرح معانی الآثار" میں فرمایا ہے "فصار اصل ھذا الحدیث عن ابی ھریرۃ لاعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم. یہ حدیث اصلاً ابوھریرہؓ سے منقول ہے نہ کہ نبی کریم ﷺ سے (شرح معانی الآثار ص ۲۱۸ ج۱)

امام ابو حاتمؒ نے اور محمد بن طاہر مقدسیؒ نے "تذکرۃ الموضوعات" میں فرمایا ہے کہ "والصواب انہ موقوف"۔ صحیح بات یہ ہیکہ یہ حدیث موقوف ہے۔

امام شافعیؒ نے اس حدیث کو "کتاب الام" میں دو جگہ نقل کیا ہے اور دونوں جگہ موقوفاً ہی نقل کیا ہے۔ حالانکہ یہ حدیث انکے مذہب کے موافق بھی ہے۔ (العرف الشذی علی الترمذی ص ۹۷ ج۱)

امام بخاریؒ کا اس حدیث کو ترجمۃ الباب میں جگہ دینا بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ روایت موقوف ہی ہے۔ (دیکھیے بخاری ص ۹۱ ج۱)

اگر چہ بعض حضرات نے اسکو مرفوع بھی کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ موقوف یا مختلف فیہ

روایت مرفوع روایات کامقابلہ نہیں کر سکتی۔

وجہ (۲):۔امام بیہقیؒ نے بھی "السنن الکبری "میں اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس میں " إلاّ ركعتي الفجر "کی زیادتی بھی ہے۔ لھذا یہ حدیث ہمارا مستدل ہے۔ اگرچہ اس زیادتی پر بعض حضرات نے کلام بھی کیا ہے لیکن صحابہؓ و تابعین کا عمل اسکی تائید کرتا ہے۔

(حاشیہ بخاری ص۹۱ج۱العرف الشذی علی الترمذی ص۹۹ج۱)

وجہ (۳)اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ صف کے متصل جہاں جماعت ہو رہی ہے وہاں سنتیں نہ پڑھی جائیں،اور حنفیہ بھی یہی کہتے ہیں، جیسا کہ مسئلہ (۲) گذر چکا۔دلیل اسکی دو ہیں:۔

دلیل (۱):۔ شعبہؒ سے مروی ہے کہ ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ اے لوگو اللہ تعالی سے ڈرو اور اپنی نمازوں یعنی فرض و سنت کے درمیان فصل کیا کرو۔(طحاوی ج۱ص۲۱۹)

دلیل (۲):۔ عمرو بن عطاء بیان کرتے ہیں کہ نافع بن جبیرؒ نے مجھے سائب بن یزید کے پاس بھیجا، یہ پوچھنے کیلئے کہ انھوں نے امیر معاویہؓ سے کیا سنا؟۔ فرماتے ہیں کہ سائب بن یزیدؓ نے بتایا کہ میں نے امیر معاویہؓ کے ساتھ مقصورہ میں جمعہ پڑھا، فارغ ہونے کے بعد میں نوافل کیلئے کھڑا ہو گیا۔ تو آپنے میرا دامن پکڑ لیا اور فرمایا کہ "لاتفعل حتى تقدم أو تكلم فان رسول الله ﷺ يأ مر بذلك"۔یعنی ایسا مت کرو (کہ فوراً نوافل شروع کر دیئے) یہاں تک کہ یا تو آگے پیچھے ہو جاؤ یا بات کرلو۔ (تو اسطرح فصل ہو جائے گا) کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکا (فصل کا) حکم فرماتے تھے۔ (ایضاص۲۱۸ج۱)

وجہ نمبر ۴: اس حدیث کے الفاظ میں عموم ہے، جگہ کی کوئی قید مذکور نہیں، لہذا جب فرض نماز کھڑی ہو جائے تو اب کہیں بھی کوئی نماز نہ ہونی چاہئے، گھر میں بھی نہ ہونی چاہئے۔ اس حدیث کے ظاہر کا مقتضی یہی ہے اور یہ بات خود مخالفین کے نزدیک بھی باطل ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر نہیں ہے۔

حدیث (۲): حضرت قیس ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ ﷺ نکلے تو فجر کی جماعت کھڑی ہوگئی، تو میں نے آپکے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ (اسکے بعد مین نے پہلی چھوٹی ہوئی سنتیں پڑھنی شروع کر دی) تو آپنے مجھے دیکھ کر فرمایا:

مهلايا قيس أصلاتان معاً، قلت : يا رسول الله إني لم أكن ركعت ركعتي الفجر قال: فلا اذاً وفي رواية ابي داؤد وابن ماجه:فسكت رسول الله ﷺ

(ترمذي مع العرف الشذي ج۱ ص۹۶ ابوداؤد ج۱ ص۱۸۰ ابن ماجه ص ۸۰)

ترجمہ: ٹھہرو اے قیس، کیا ایک ساتھ دو نمازیں؟ تو میں نے کہا کہ فجر کی سنتیں میں نے نہیں پڑھی تھیں، تو آپ نے فرمایا تب تو کوئی حرج نہیں۔ اور ابو داؤد ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ ان کا جواب سنکر خاموش ہو گئے۔

مخالفین اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ فجر کی سنتیں فرض نماز کے فوراً بعد طلوع شمس سے پہلے پڑھ سکتے ہیں۔ اسکے چار جواب ہیں:

جواب (۱) یہ حدیث مرسل ہے۔ خود امام ترمذیؒ فرماتے ہیں،، و اسنا دھذاالحدیث لیس بمتصل،، کہ اس حدیث کی سند متصل نہیں۔ (ترمذی مع العرف ج ۱ ص ۹۶)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ان الحد یث لم یثبت فلا یکو ن حجة علی ابی حنیفة (مرقات ج ۳ ص ۷ ۴) لھذا یہ حدیث ان متواتر احادیث کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ جن میں فجر کے بعد نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

جواب (۲):۔ ہم کو یہ تسلیم نہیں کہ اس حدیث میں،، فلا اذاً،، کا مطلب اجازت کے ہیں۔ بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ،، تب بھی نہیں،، یعنی اگر تم نے سنتیں پہلے نہیں پڑھیں تب بھی اسوقت نہیں پڑھنی تھیں کیونکہ اسوقت نماز کی ممانعت ہے۔ اسکی دلیل مسلم شریف کی وہ روایت ہے جسمیں ہے حضرت نعمان بن بشیرؓ نے اپنی دوسری بیوی کے لڑکے کو کچھ مال ہبہ کیا۔ بیوی نے کہا کہ میں اسوقت تک نہیں مانوں گی جب تک کہ ﷺ کو اس ہبہ پر گواہ نہ بنالو۔ وہ آپکی خدمت میں گئے اور واقعہ سنایا۔ آپ نے پوچھا کیا تم نے اپنی تمام اولاد کو برابر برابر ہبہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ نہیں یا رسول ﷺ آپنے فرمایا،، فلااذن،، اور بعض روایات میں ہے "فلا تشھدنی اذاً "کہ پھر مجھکو بالکل گواہ مت بناؤ۔ (مسلم جلد دوم،، باب کرا ھة تفضیل بعض الاولاد فی الھبة،،) دیکھئے اس روایت میں،، فلا اذا،، کا لفظ انکار کیلئے ہے اجازت کیلئے نہیں۔

(العرف الشذی علی الترمذی ج ۱ ص ۹۹ تقریری ترمذی شیخ الہندؒ ص ۷

لہٰذا یہ حدیث تو حنفیہ کا مستدل ہے۔ نیز اذا جا ء الا حتمال بطل الا ستد لا ل،، لہذا اس حدیث سے استدلال کا کوئی موقع اور گنجائش نہیں رہی۔

جواب (۳):۔ علی سبیل التنزل اگر اجازت کیلئے بھی مان لیا جائے تو یہ ان صحابی کی خصوصیت ہوگی، ورنہ اتنے صحابہ کرام کا عمل اسکے خلاف نہ ہوتا یہاں تک کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی۔

جواب:۔ (۴) ہو سکتا ہے کہ کوئی،، سکوت،، والی روایت پیش کرے۔ اسکا جواب یہ

ہے کہ ﷺ نے ان صحابی کے مسئلہ سے عدم واقفیت کی وجہ سے چشم پوشی فرمائی۔ اسکی مثال سائی شریف کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ عنہا حضور ﷺ کے ساتھ مدینہ سے مکہ معظمہ کی جانب عمرہ کیلئے چلیں۔ مکہ معظمہ جاکر عرض کیا کہ یارسول اللہ آپنے قصر فرمایا اور میں نے اتمام کیا اور آپنے افطار کیا میں نے روزہ رکھا۔ تو آپنے ارشاد فرمایا "لقداحسنت یا عائشة" اے عائشہ تو نے اچھا کیا۔ (نسائی شریف ج ا ص ۱۳۹) ظاہر ہے کہ اتمام سفر میں جائز نہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے سفر میں اتمام کو ناجائز کہا ہے۔ تو پھر اتمام کو حضور ﷺ نے حسن کیسے فرمادیا؟ اسکا جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے مسئلہ سے عدم علم کی بناء پر حضور ﷺ نے چشم پوشی فرمائی (العرف الشذی علی الترمذی ج ا، ص ۹۹) بعد میں کسی وقت سب کو مسئلہ بتلا دیا ہوگا جب کہ بعض روایات میں "ضحك" کالفظ ہے سکت،، کے بجائے۔ پھر تو یہ احتمال اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ ورنہ ایسی صورت میں ہنسنے کا کیا موقع؟۔ فتدبر؟

(۳)۔ عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیکہ ایک آدمی آیا اور نبی کریم ﷺ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، چنانچہ اس آدمی نے آکر دو رکعت نماز پڑھی، پھر آپکے ساتھ شامل ہوا، تو آپنے فارغ ہونے کے بعد فرمایا:۔

یا فلان أيتهما صلاتك التي صليت وحدك أو التي صليت معنا

(ابو داؤد ج ا ص ۱۸۰، مسلم ج ا ص ۲۴۷، نسائی ج ا ص ۱۳۹، ابن ماجہ ص ۸۰)

ترجمہ اے فلاں: تمہاری (فرض) نماز کونسی ہے جو تنہا پڑھی ہے وہ یا وہ جو ہمارے ساتھ پڑھی ہے۔

حدیث (۴) عبداللہ بن مالک ابن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک شخص کے پاس سے گزرے اور فجر کی نماز کی اقامت ہو چکی تھی دیکھا کہ وہ شخص نماز پڑھ رہا ہے، تو آپنے اس سے کچھ فرمایا، مجھے معلوم نہیں کہ کیا فرمایا۔ پس جب وہ آدمی نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے انکو گھیر لیا اور پوچھنے لگے کہ تم سے حضور ﷺ نے کیا فرمایا تھا؟ انھوں نے کہا کہ یوں فرمایا تھا:۔

يوشك أن تصلي احد كم الصبح اربعا. وفي رواية: الصلي الصبح اربعا. وفي رواية البخاري ء آلصبح اربعاً:

(بخاری ج ا ص ۹۱، مسلم ص ۲۴۷، ج ا نسائی ج ا ص ۱۳۹، ابن ماجہ ص ۸۰)

ترجمہ قریب ہے کہ تم میں سے کوئی صبح کی نماز چار رکعت پڑھیگا اور ایک روایت میں ہے کہ آپنے یوں فرمایا: کیا تم فجر کی نماز چار رکعت پڑھ رہے ہو۔ اور بخاری کی روایت میں

سطرح ہے کہ کیا صبح کی نماز چار رکعت ہیں (سب کا مطلب ایک ہی ہے)

مخالفین ان دونوں حدیثوں سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور علیہ نے ان کو اقامت کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا۔ لہٰذا جب اقامت ہو جائے تو اب سنتیں پڑھنا درست نہیں۔ مگر حدیث کا مطلب اور مقصد نہ جاننے کی وجہ سے ایسی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ تمام احادیث اور آثار صحابہ سامنے ہوں تو پھر اسطرح کی غلط فہمی پیدا نہیں ہوگی۔ ان حدیثوں کا جواب یہ ہے کہ:

جواب: اس حدیث کا مدلول حقیقی جمع بین الصلوٰتین سے اور اسکی مشابہت سے منع کرنا ہے اور جہاں جماعت ہو رہی ہو وہاں صف کے قریب سنتیں پڑھنے کو حنفیہ اس وجہ سے بھی منع کرتے ہیں تاکہ جمع بین الصلوٰتین کے مشابہ نہ ہو جائے۔

نیز امام طحاویؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان صحابی کو اس لئے ایسا فرمایا کہ وہ ان صفوں کے قریب سنتیں پڑھ رہے ہونگے جہاں جماعت ہو رہی تھی۔ دلیل اس کی یہ ھیکہ حضرت عبداللہ بن مالک ابن بحینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں کھڑا ہوا صبح کی اذان کے بعد نماز پڑھ رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نماز کو ظہر سے پہلے اور بعد والی نماز کی طرح مت بناؤ، بلکہ انکے درمیان فصل کرو۔ (طحاوی ص۲۱۸ ج۱) اس طرح کی دو حدیثیں حدیث (۱) کی وجہ (۳) کے ذیل میں بھی گزر چکیں۔ پہلی شعبہؒ سے دوسری عمرو بن عطا سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کراہت کا سبب وصل مع الصف تھا۔ جبکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ مسجد کے ایک کونہ میں جتنی دور ہو سکے سنتیں پڑھے۔ معلوم ہوا کہ یہ حدیث حنفیہ کے مخالف نہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ حنفیہ کا مذہب کس قدر جامع اور مؤید بالا حادیث والآثار ہے۔ اور مخالفین کے مستدلات کی کیا حقیقت ہے۔ اب ظاہر ہیکہ اس حقیقت کی روشنی میں اپنے کو "عامل بالحدیث" کے لمبے چوڑے اور پُر فریب لقب سے یاد کرنا اور دوسروں کو مخالفت حدیث کا طعنہ دینا صداقت سے کتنا دور ہے "فتفکروا یا اولی الالباب"۔

الھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه . آمین.

احقر ابو جندل قاسمی خادم الافتاء والحدیث رئیس

دارالعلوم ٹانڈہ ضلع رام پور یوپی

۲۳ر شوال المکرم ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۹۹۹ء

چہار شنبہ قبل العصر

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو

محمد بدیع الزماں ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہارون نگر فرسٹ سیکٹر پھلواری شریف پٹنہ شریف پٹنہ 801505

اس مضمون کا عنوان "بانگ درا" میں حضرت بلالؓ پر اقبال کی نظم "بلالؓ" کا ایک مصرعہ ہے جس مصرعہ میں اقبال نے حضرت بلالؓ کی عشقِ رسول میں گرویدگی کو مثالی بنا کر پیش کیا ہے۔ رسول اللہؐ سے عقیدگی کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے عقیدگی' قرآن کی رو سے ایمان کا حصہ ہے۔ اس لئے کہ ارشاد ہے:۔

"وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی' نیز وہ جو بعد میں راستبازی کے ساتھ اُن کے پیچھے آئے' اللہ اُن سے راضی ہوا' اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ (رضی الله عنهم ورضوا عنه) ' اللہ نے اُن کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے' یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ (سورۃ التوبہ ۹ آیت ۱۰۰)

اور پھر ان کی صداقتِ ایمانی پر قرآن کی فیصلہ کن شہادت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:۔

"جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھربار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ اُن کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے' اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے (نبیؐ) کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں مگر اللہ کی کتاب میں خون کا رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے"۔ (سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۷۴ اور ۷۵)

اقبال نے صحابہ کرامؓ اجمعین میں صرف دو پر خصوصی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک حضرت ابو بکر صدیقؓ پر نظم "صدیق" اور دوسرے حضرت بلالؓ کی منقبت میں ایک نہیں بلکہ دو نظمیں

رقم کی ہیں یہ تینوں نظمیں اقبال کے مجموعہ کلام "بانگ درا" میں شامل ہیں۔ گرچہ دیگر صحابہ کرامؓ پر بہت سارے منفرد اشعار ہیں جن میں سب سے زیادہ حضرت علی کرم اللہ وجہ پر ہیں۔ ظاہر ہے اسلام کے ابتدائی عہد دعوت میں ایک کی مالی قربانیاں اور دوسرے کی جسمانی مشقتیں ایسی بے نظیر مثالیں ہیں کہ اقبال جیسے عاشق رسول ﷺ کا ان کو نذرانہ عقیدت پیش کرنا ان کے ایمان کا جزو تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ شروع میں جن لوگوں نے اسلام ظاہر کیا وہ یہ سات حضرات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، اور ان کی والدہ سمیہؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت مقدادؓ یہ سات وہ تھے جو اپنی ساری قوتیں اور اپنا تمام سرمایۂ زندگی کھپا دینے اور نبی کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے لئے تیار تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مزید فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ کو اللہ کے راستے میں اپنے نفس کی قطعی پرواہ نہ تھی اور یہ اپنی قوم کے نزدیک بہت بے قدرے تھے لوگوں نے انہیں پکڑا اور لڑکوں کے حوالہ کر دیا لڑکے انہیں مکہ کی گلیوں میں چکر دیتے پھرتے تھے مگر ان کی زبان پر احد احد کا کلمہ جاری رہتا کہ اللہ ایک ہے۔

حضرت بلالؓ بن رباح ملک حبش (موجودہ ایتھوپیا) سے ہجرت کر کے مکہ تشریف لائے تھے اور حضور اقدس ﷺ کے حضور مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ حضرت مجاہدؒ کی حدیث میں ہے کہ حضرت بلالؓ کو لوہے کی زرہیں پہنا کر ریت پر لٹا کر بھری دوپہر میں تپایا جاتا تھا کہ یہ شرک کی طرف لوٹ آئیں۔ حضرت بلالؓ کو تکلیف پہچانے میں امیہ بن خلف سب سے پیش پیش تھا۔ مشرکین آپ کے گلے میں رسی ڈال کر مکہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان آپ کو کھینچتے پھرتے تھے۔ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ بنی جمحہ کی ایک عورت کے غلام تھے۔ ابو جہل لعنۃ اللہ آتا تو اپنے ساتھ نیزہ لئے ہوئے آتا اور آپ کو گالیاں دیتا اور ڈراتا دھمکاتا۔

ابن اسحاق سے منقول ہے کہ جب دوپہر انتہائی گرم ہو جاتی تو امیہ حضرت بلالؓ کو لے کر نکلتا اور مکہ کی پتھریلی زمین پر ان کو پیٹھ کے بل لٹا دیتا۔ پھر حکم دیتا کہ ایک بہت بڑا پتھر جلتا ہوا آپکے سینہ پر رکھ دیا جائے۔ پھر آپ سے کہتا کہ تم اسی طرح پڑے رہو گے یا مر جاؤ اور نہیں تو محمد ﷺ کا انکار کرو اور لات و عزیٰ کی پرستش اختیار کرو حضرت بلالؓ اس مصیبت میں بھی احد احد کہتے۔ حضرت عروہؓ کی روایت ہے کہ ایک روز حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ان پر سے

گزر ہوا اور لوگ انھیں سزائیں دے رہے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے امیہ سے کہا کہ تو اس مسکین کے بارے میں خدا سے نہیں ڈرتا کب تک تو یہ تکلیفیں اور ایذا رسانی کرتا رہے گا؟ امیہ بولا کہ اس کو تم ہی نے بگاڑا ہے، اب تم ہی اسے سزا سے چھڑاؤ۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا ہاں! میں یہ بھی کروں گا میرے پاس ایک حبشی غلام بہت ہی پھرتیلا اور ان سے زیادہ کاروبار کرنے والا ہے اور تیرے دین پر پکا ہے۔ ان کے بدلہ تجھے میں وہ دے دوں گا۔ امیہ نے کہا مجھے وہ منظور ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: جا وہ میں نے تجھے دیدیا حضرت ابو بکرؓ نے اس غلام کو امیہ کے حوالہ کیا اور حضرت بلالؓ کو لے کر آزاد کر دیا۔ اس سے قبل کہ حضرت ابو بکرؓ مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائیں چھ اور غلاموں کو جنھیں اسلام لائے جانے کی وجہ سے تکلیفیں دی جارہی تھیں خرید کر آزاد کیا اور حضرت بلالؓ ان میں ساتویں تھے۔ اقبال جیسے عاشق رسول ﷺ کا حضرت بلالؓ کی سیرت و کردار سے متاثر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ سورۃ آل عمران کی آیات ۳۱ اور ۳۲ کے بموجب انکا یہ ایمان تھا جس کی وہ پوری امت کو تلقین کرتے تھے کہ ؎

کی محمد سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں

حضرت بلالؓ پر اقبال کی پہلی نظم ”بلالؓ“ ان کی لاہور کالج کی طالب علمی کے زمانہ یعنی ۱۹۰۵ء کے قبل کی ہے۔ حضرت بلالؓ رسول اللہ ﷺ کے ایسے سچے عاشق تھے اور حضور ﷺ سے اس درجہ محبت رکھتے تھے کہ مسلسل دیکھتے رہنے کے باوجود انکے دل کو سیری نہ ہوتی تھی۔ اقبال نے سیدنا حضرت بلالؓ کی شخصیت کے اسی پہلو کو اس پہلی نظم میں قلم بند کیا ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لئے	کسی کے شوق میں تونے مزے ستم کے لئے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں	ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
نظر تھی صورت سلمانؓ اداشناس تری	شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارہ کا مثل کلیمؑ سودا تھا	اویسؓ طاقت دیدار کو ترستا تھا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید	خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری	کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی	نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

حضرت بلالؓ پر اقبال کی دوسری نظم ،،بلالؓ،، ۱۹۰۸ء کے بعد کی ہے جس میں دو بند ہیں پہلے بند میں اقبال نے سکندر رومی کا ذکر کیا ہے اور سکندر اعظم کو "شہنشہ انجم سپاہ" کے لقب سے نوازا ہے مگر اس بند کے آخر میں اس پر یہ شعر رکھا ہے ۔

آج ایشیا میں اسکو کوئی جانتا نہیں

تاریخ داں بھی اسے پہچانتا نہیں

دوسرے بند میں حضرت بلالؓ کا ذکر لا کر اقبال نے یہ بات ذہن نشیں کرائی ہے کہ سکندر رومی کا نام تو صرف تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے لیکن حضرت بلالؓ کا نام آج بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔ دوسرا بند یہ ہے:۔

لیکن بلالؓ ، وہ حبشی زادۂ فقیر ۔ فطرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر

جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلالؓ ۔ محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر

ہوتا ہے جس سے اسود واحمر میں اختلاط ۔ کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر

ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز ۔ صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے

رومی فنا ہوا ، حبشی کو دوام ہے

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت بلالؓ مدینہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے ۔چند سال بعد آپ نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا جس میں آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ سے شکایت کی کہ تم مجھ سے ملنے مدینہ کیوں نہیں آتے۔ چنانچہ حضرت بلالؓ کا جذبۂ شوق انہیں فوراً مدینہ لے آیا اور جب آپ نے آنے کے بعد فجر کی پہلی اذان دی تو مدینہ کے سارے لوگ آپ کی آواز سن کر سڑکوں پر چلے آئے اور زار زار آنسوں رونے لگے۔ حضرت بلالؓ نے پھر مدینہ منورہ چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر حضرت امام حسینؓ کے اصرار پر آپ نے مدینہ ہی میں قیام کرنا مناسب سمجھا۔

اقبال نے حضرت بلالؓ کے نام سے ایک اصطلاح ،بلالی بھی وضع کی ہے اور اسے اپنے کلام میں صرف دوبار "بانگ درا" کی نظم "جواب شکوہ" کے دو الگ الگ بندوں میں لائے ہیں۔

"بلالی" کی اصطلاح سے پہلا بند اس نظم کا درج ذیل سولہواں بند۔

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

اس اصطلاح سے دوسرا بند اس نظم کا درج ذیل پینتیسواں بند ہے

مردم چشم زمیں، یعنی وہ کالی دنیا وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیٔ مہر کی پروردہ، ھلالی دنیا عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

اس بند میں مردم چشم زمیں سے مراد زمین کی آنکھ کی پتلی جو سیاہ ہوتی ہے کالی دنیا سے مراد ملک حبشہ ہے۔ شہدا پالنے والے سے اشارہ ابتدائی دور کے مسلمانون کی ہجرت ملک حبشہ کی طرف ہے جبکہ قریش مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمانوں نے نجاشی کے دربار میں پہنچ کر پناہ مانگی تھی اور اس نے ان مسلمانوں کو اپنی سلطنت میں پناہ دی تھی۔ گرمیٔ مہر کی پروردہ سے مطلب یہ ہے کہ وہاں بہت گرمی پڑتی ہے اس لئے لوگ کالے ہوتے ہیں اور اقبال نے اسی لئے اس ملک کو پہلے شعر میں "کالی دنیا" کہا ہے اور اسے آنکھ کی پتلی سے تشبیہ دی ہے جو سیاہ ہوتی ہے "بلالی دنیا" سے اشارہ اس طرف ہے کہ حضرت بلالؓ کا اصلی وطن حبشہ تھا۔

حج: اسلام کے اجتماعی نظام کا آئینہ دار

از:- اعجاز ارشد قاسمی

یوں تو دنیا میں بے شمار مذاہب وادیان ہیں لیکن اسلام ہی ایک ایسا ہمہ گیر آفاقی مذہب ہے جس کے تمام فرائض واحکامات دینی وروحانی فوائد پر مبنی ہونے کے علاوہ مادی وجسمانی اور تمدنی مصالح سے بھی ہم آہنگ ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج یہ سب فرائض جو اسلام نے مقرر کئے ہیں ان کی آدائیگی سے آخرت کی فلاح کے ساتھ امت کو اجتماعی ومعاشی اور سماجی وسیاسی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

اسلامی احکامات کی یہ امتیازی اور اہم خوبی ہے اور اسلام کا یہ کمال ہے کہ وہ ایک حکم سے ہزار کام نکال لے جاتا ہے، نماز علیحدہ علیحدہ پڑھنے میں وہ فائدے نہ تھے جو جماعت کے ساتھ پڑھنے میں چنانچہ اسلام نے جماعت کے ساتھ نماز پنجگانہ ادا کرنے کا حکم دے کر اور جمعہ وعیدین کے لئے جماعت کو شرط قرار دے کر اس کے فائدوں کو بے حد حساب بڑھادیا۔ روزہ فرداًفرداًرکھنا بھی اصلاح وتربیت کا بڑاذریعہ تھا مگر پورے عالم کے مسلمانوں کے لئے رمضان کا یہی مہینہ مقرر کرکے روزہ کی افادیت میں بے انتہا اضافہ کردیا گیا۔ زکوٰۃ الگ الگ دینے سے بھی اس کا مقصد حل ہوسکتا تھا لیکن اس کے لئے بیت المال یا نظام مقرر کرکے اس کی منفعت میں اس قدر اضافہ کردیا گیا کہ اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اسلامی حکومت اور بیت المال کا نظام دیکھنے کو ملے، بعینہ یہی معاملہ حج کا بھی ہے، تنہا آدمی حج کرے پھر بھی اس کے اندر تقویٰ وپرہیزگاری کی افزائش ہوسکتی ہے اور اس کی زندگی میں عظیم انقلاب آسکتا ہے لیکن اسی حج کو اجتماعی طور پر ادا کرنے میں جو روحانی کیفیت لوگوں پر طاری ہوتی ہے اور اجتماعی طور پر ایک ہی لباس میں ملبوس ہوکر اپنے مالک حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جو لطف آتا ہے اور بیک زبان ہوکر ایک ہی نعرہ جب فضا میں گونجتا ہے اور اس سے جو پرکیف سماں پیدا ہوتا ہے وہ تنہا حج کرنے میں کہاں حاصل ہوسکتا تھا چنانچہ اسلام کا یہ اجتماعیت کا نظام بے انتہا فوائد ومصالح پر مبنی

ہے جس کا ایک اہم فائدہ دنیا کو "امت واحدہ" کا کیف آگیں نظارہ بھی کرانا ہے۔

اسلام کے مقرر کردہ فرائض میں ایک اہم فریضہ "حج" ہے جس کی ادائیگی سے جہاں انسان کے تقویٰ و تقدس کی افزائش ہوتی ہے، اس پر خوف خدا، توبہ واستغفار اخلاق کی پاکیزگی و بلند کرداری کے اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں وہ اپنے احباب و متعلقین اور معاملہ داروں سے معاملات صاف رکھنے شروع کردیتے ہیں پھر اس کے اعمال و کردار کی تاثیر کتنے لوگوں کے اخلاق تک جاپہونچتی ہے جس سے نہ جانے کتنوں کے دل گرماجاتے ہیں اور کتنوں کے قلوب اللہ اور اس کے گھر کی طرف پھر جاتے ہیں اور ان کی خوابیدہ روح میں حج کے شوق سے بیداری پیدا ہوجاتی ہے اور ان حاجیوں کی زبان سے اللہ کے گھر کا ذکر سن کر حقیقی محبت اجاگر ہوجاتی ہے۔ اور بے شمار حلقوں میں دینی جذبات ابھر آتے ہیں یعنی جس طرح رمضان کا مہینہ اسلامی دنیا میں تقویٰ کی بہاریں لیکر آتا ہے اسی طرح "اشہر حج" یعنی شوال، ذوالقعدہ، اور ۱۰ر ذوالحجہ تقویٰ و تقدس کی افزائش کا ضامن بن کر آتے ہیں لیکن کیا یہ فریضہ حج اہل اسلام کے لئے صرف روحانی فوائد ہی کے لئے ہے؟ کیا اس سے صرف تقویٰ و پرہیزگاری ہی میں اضافہ ہوتا ہے؟ نہیں، بلکہ جہاں حج سے مذکورہ فوائد حاصل ہوتے ہیں وہیں حج کازمانہ تمام روئے زمین میں اسلام کی زندگی اور بیداری کا زمانہ ہوتا ہے جس سے سیاسی وسماجی اور اجتماعی ومعاشی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

دنیا میں کوئی بھی اجتماع ہوتا ہے تو اس کے کچھ نہ کچھ فائدے ہوا کرتے ہیں، حج کے اس عالمگیر اجتماع کا مقصد دینی وروحانی فوائد کے علاوہ "امت واحدہ" کا کیف آگیں نظارہ پیش کرنا بھی ایک بڑا فائدہ نظر آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے چپے چپے سے بلا تفریق ملک وقوم لوگ ان گنت راستوں سے ایک ہی مرکز پر جسم وروح کی سرمستیوں کے ساتھ اس طرح آتے ہیں جس طرح لوہے کے ذرات مقناطیس کی کشش سے کھینچ کر چلے آتے ہیں اس مرکز کے اردگرد جمع ہونے والوں کی شکلیں مختلف ہیں، رنگ اور زبانیں جداگانہ ہیں سبھوں کی علاقائی تہذیبیں الگ الگ ہیں لیکن سب ایک خاص حد یعنی میقات پر پہونچ کر اپنے قومی لباس اتار کر ایک ہی طرز کے سادہ ڈریس میں ملبوس ہوجاتے ہیں، جس سے بغیر کسی اعلان کے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ دنیا کے مختلف کونوں سے آنے والے یہ ایک ہی بادشاہ عالم کی فوج ہیں جو اپنی قومی شناخت ختم کرکے ایک ہی رب العالمین کی اطاعت وبندگی کا نشان اپنے اوپر لگائے ہوئے ہیں اور مستحکم امت کا پرکیف نظارہ پیش کرتے ہوئے اپنے اپنے میقات سے ایک

ہی مرکز کی طرف اپنے آقا کے حضور پیش ہونے جارہے ہیں، سبھوں کے جسم وروح اطاعت وفرمانبرداری کی سرمستیوں سے سرشار ہیں اور ایک ہی نعرہ سبھوں کی زبان زد ہے۔ **لبیك اللّٰھم لبیك لا شریك لك لبیك.**

سبھوں کی زبانیں، قومیتیں، وطنیں، اور نسلیں مختلف ہیں لیکن یہاں آکر سارا اختلاف ٹوٹ جاتا ہے مختلف ملکوں کے قافلے سمٹ کر ایک دائرے میں آجاتے ہیں اور سبھوں کے شب وروز کے معمولات ایک ہی ہو جاتے ہیں، ایک ہی صف میں مالک وغلام کا بے مثال نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے جو اپنی دنیاوی تفوق وبرتری کو بھول کر ایک ہی ساتھ ایک ہی امام کے پیچھے ایک ہی نعرہ "اللہ اکبر" پر اٹھتے بیٹھتے اور رکوع وسجدہ کرتے ہیں جس سے ایسی عجیب فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان اس میں سرشار ہو کر اپنی خودی کو بھول جاتا ہے اور ایک ہی نعرہ کی کیفیت میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف کونوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کا ایک ہی نعرہ کے ساتھ ایک ہی مرکز کے ارد گرد گھومنا پھر سب کا ایک ہی ساتھ صفا ومردہ کے درمیان سعی کرنا، عرفات کی طرف مارچ کرکے ایک ہی کمانڈر کی یکسوئی اور ہمہ تن توجہی کے ساتھ دلوں کو گرمادینے والی تقریریں سننا، سبھوں کا متفق ہو کر شیطان کو کنکریاں مارنا اور اپنے رب کے لئے قربانیاں دینا، پھر ایک ساتھ پلٹ کر محمود وایاز کی تفریق کے بغیر کعبہ شریف کا طواف کرنا اپنے اندر وہ کیفیت رکھتا ہے اور وحدت ملت کا وہ پرکیف نظارہ پیش کرتا ہے جس کی ہلکی سی بھی جھلک دنیا کے کسی بھی مذہب وملت میں بمشکل نظر آئیگی۔

یوں تو دنیا میں مختلف اقوام وملل کے بے شمار اجتماعات ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کے شرکاء کا جذبات وخیالات میں متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے شرکاء مقاصد واعمال کی پاکیزگی سے سرشار ہوتے ہیں اور نہ ہی آپس میں ایک دوسرے کو یک جہتی نصیب ہوتی ہے، پاک جذبات وخیالات اور نیک اعمال وافکار کے ساتھ حج کے اجتماعات میں شرکت درحقیقت اتنی بڑی نعمت ہے جو ابن آدم کو اسلام کے سوا کسی نے نہیں دی ہے۔

حج کے مذکورہ فوائد کے علاوہ اس کے اجتماعات کا ایک اہم فائدہ عالم اسلام کا باہمی تعارف وتعاون اور جملہ سیاسی وسماجی اور اقتصادی وحربی امور میں مشورہ کرنا اور مسلم ممالک کو درپیش مشکلات کا حل نکالنا بھی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلفائے اسلام کے زمانے میں مختلف صوبوں کے گورنر اور باشندے حج کے زمانے میں اپنی اپنی پریشانیاں خلیفۂ وقت کے سامنے رکھتے تھے اور خلیفۂ وقت ان کے درپیش مسائل کا ممکنہ حل نکالنے کی سعی کرتے تھے، عوام اپنے

گورنروں کے برتاؤ کو ان کے سامنے رکھتے تھے۔ اگر گورنر نیک، صالح اور خداترس ہوتا تو ان کی تعریفیں کی جاتیں اور اگر وہ عیاش، رعایا کی صورت حال سے بے پرواہ ہوتا تو ان کی شکایتیں خلیفہ کے پاس درج کرائی جاتیں، خلیفۂ وقت جملہ امور پر غور و خوض کرنے کے بعد احکام صادر فرماتا اور آئندہ سال کے لئے مستحکم لائحہ عمل تیار کیا جاتا، تاکہ اسلامی ممالک کی صحیح تعمیر و ترقی اور ان کے باشندوں کی خوش گوار زندگی میسر ہوسکے آج بھی حج اسلامی ممالک کی تعارف و تعاون کا حسین مظہر اور جملہ دینی و دنیوی امور میں تبادلۂ خیال کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ مسلم ممالک کے پاسبان اس طرف توجہ دیں، لیکن آج رب قدیر کی عطا کردہ اس عظیم نعمت سے فائدہ نہیں اٹھایا جارہا ہے اور ہماری مثال ان بچوں جیسی ہوگئی ہے جو ہیرے کی کان میں پیدا ہوکر ہیرے کی قدر سے ناآشنا ہوتے ہیں اور کنکر کی طرح کھیلنے لگتے ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یہ سب وہ نایاب نسخۂ کیمیا ہے کہ جس سے فرائض کی ادائیگی کے علاوہ سیاسی و سماجی اجتماعی و اقتصادی مسائل بھی بخوبی حل ہوجاتے ہیں۔

حضرت مولانا نور عالم خلیل الامینی استاذ ادب عربی و رئیس تحریر مجلہ "الداعی" دار العلوم دیوبند

منشی محمد عزیز صدیقی دیوبندیؒ

لذیذ یادیں اور عزیز باتیں

ترجمہ از عربی: ثناء اللہ مظفرپوری شعبۂ افتاء دار العلوم دیوبند

راقم الحروف کو علم و فضل، صلاح و تقوی اور شہرت و ناموری رکھنے والے بہت سے مشاہیر پر لکھنے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ مشاہیر پر لکھنا نہایت آسان بھی ہے اور ان پر لکھنے کی ہر ایسے شخص کو خواہش ہوتی ہے جو تحریری صلاحیت، انشاپردازی کا ملکہ اور حسن بیان اور تصنیف و تالیف پر قدرت رکھتا ہو۔ بلکہ مشاہیر پر قلم اٹھانے کے لیے بعض دفعہ ہر کس و ناکس کے دل میں شوق پیدا ہوتا ہے، خواہ اس کے پاس تحریری صلاحیت یا خوبی بیان نام کی کوئی چیز نہ ہو، اس لیے کہ مشاہیر کا تذکرہ بسا اوقات تذکرہ کنندہ کی شہرت یابی کا باعث اور معاشرے میں اس کی عمدہ ساکھ کا سبب بن جاتا ہے، تو بھلا کون ہے جو پاکیزہ شہرت اور نیک نامی کا خواہاں نہ ہو؟ مزید برآں ان مشاہیر پر لکھنے اور بولنے کے لیے اکثر و بیشتر مواد کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ان کے حوالے سے گفتگو کا میدان اس قدر کشادہ ہوتا ہے کہ کسی مقرر یا مضمون نگار کے لیے کسی تنگی کا کوئی شکوہ تبھی ہو سکتا ہے جب خود اس کے قدم جواب دے جائیں۔

لیکن میں آج کی صحبت میں ایک ایسے آدمی کے سلسلے میں گفتگو کرنی چاہتا ہوں جو صاحب علم و فضل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے نہ کوئی گریجویٹ، نہ روایتی معنی میں کوئی "شیخ" تھے اور نہ ہی آج کے انسانی معاشرے میں متعارف اصطلاح میں "بزرگ ہستی"۔

علم کی عظمت و برتری، بحث و تحقیق کی اہمیت، آگہی و معرفت کے سمندر میں غوطہ زنی کی قدر و قیمت، انکشافات اور دریافت معلومات کے حصول اور اس راہ میں بھوک و پیاس سے بے نیاز رہ کر آفتاب کے برف کو پگھلا دینے کی مانند ارادے کو گھلا دینے والی مشقتوں اور تکلیفوں کو سہ کر پیہم سفر کرتے رہنے کے مقام و مرتبے کے مکمل اعتراف کے ساتھ، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محض علم، علمی بڑائی و کمال آگہی کوئی چیز نہیں، جب تک کہ ایک اہل علم کو اپنے علم کے ساتھ علم کے کردار کو مکمل کرنے اور اس کے مشن

کو انجام تک پہچانے والی چیز میسر نہ ہو، یعنی جب تک صداقت وامانت، زندگی کے فرائض کے حوالے سے سعی پیہم، حقوق وواجبات کی ادائیگی، عہد وپیمان پر کاربندی اور اپنے بھائیوں یعنی معاشرہ انسانی کے افراد سے خندہ روئی ونرم خوئی، دل جوئی وکشادہ نظری اور فراخ دلی، مختصر یہ کہ انسانی خصائل اور ربانی اخلاق کے ساتھ برتاؤ کرنے کا عادی نہ بنے۔

آج مجھے ایک ایسے آدمی کے سلسلے میں گفتگو کرنی ہے جو نسبتاً گم نام رہے، لیکن ہندوستان کی اس مشہور اور عظیم وقدیم جامعہ اسلامیہ "دارالعلوم دیوبند" کے ۶۳ر سالہ طویل عرصے میں (از شوال ۱۳۵۵ھ مطابق نومبر۔دسمبر ۱۹۳۶ء تا شوال ۱۴۱۸ھ مطابق جنوری ۱۹۹۸ء) دفتر تعلیمات کے محرر پھر منشی اور پیش کار کی حیثیت سے اپنے کام کے دوران یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ اسلامی اخلاق کے پابند مسلمان اپنے رب کے شکر گزار نیک بندے، خادم خلق خدا اور بہت سے علماء وتعلیم یافتہ حضرات سے فائق اور تحقیق ومطالعہ میں مشغول رہنے والے بے شمار لوگوں کے لیے قابل رشک تھے۔ نیز امانت دار، محنتی مخلص، ثواب کی نیت سے کام کرنے والے اور صبر ورضا کی خوبیوں سے متصف اپنی ذمہ داریوں کا مکمل احساس رکھنے والے ملازم کا قابل تقلید نمونہ تھے، خدائے ذوالجلال نے سچ فرمایا ہے۔

إنّ خير من استاجرت القوى الأمين". (۲٦سورة القصص) ترجمہ: کیوں کہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط ہو اور امانت دار بھی ہو (تھانویؒ)

منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ ۲۴ر سال ہی کی عمر میں یعنی ۷ر شوال ۱۳۵۵ مطابق ۲۳ر نومبر ۱۹۳۶ء سے اس دفتر میں محرر اجیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ٦ ذی الحجہ ۱۳۵۵ مطابق ۱۹ر جنوری ۱۹۳۷ء کو باضابطہ ملازم کی حیثیت سے محرر منتخب ہوئے۔ ۷ار جمادی الثانی ۱۳۵٦ھ مطابق ۲۴ر جولائی ۱۹۳۷ء کو دارالعلوم کی مجلس شوری نے محرر کے عہدے پر ان کو مستقل کر دیا اور مجلس شوری ہی نے ۵ر ربیع الاوّل ۱۳۸۵ مطابق ۵ر جون ۱۹۶۵ء کو انھیں ترقی دے کر اسی دفتر کا منشی (پیش کار) بنادیا تاآں کہ مجلس عاملہ نے ۲۹۔۳۰ر شوال ۱۴۱۸ھ کے اپنے اجلاس میں ان کے فالج کا شکار ہوجانے اور نقل وحرکت سے معذور ہو جانے کے بعد آغاز ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ر فروری ۱۹۹۸ء سے انھیں پینشن دے دی۔

اس طرح دارالعلوم میں ان کی خدمت کے طویل زمانہ کا دور ختم ہو گیا، جیسا کہ عمریں ختم ہو جا

ہیں خواہ کتنی ہی لمبی ہوں اور دنیا کو بھی ایک دن ختم ہو جاتا ہے خواہ جتنے بھی دن آباد رہے۔

موصوف صرف اسکول کے سکنڈری پاس تھے، کسی مدرسے میں علماء سے تعلیم حاصل کیا نہ کسی شیخ مربی سے تربیت پائی اور نہ ہی علماء کے ان خصوصی آداب سے واقف ہو سکے تھے جن سے مدرسہ کے ماحول میں زندگی گزارنے والوں کو آشنا ہونے اور ایک خاص ذوق ورنگ میں ڈھل جانے کا موقع ملتا ہے۔

لیکن آپ حیرت زدہ ہوں گے جب میں آپ سے یہ کہوں کہ ان کی ملازمت کے اس طویل عرصے میں جو اکثر وبیشتر بہت سے افراد کی عمروں کا عرصہ ہوتا ہے، کسی شخص کو نہ ان سے تکلیف پہنچی، نہ کسی چھوٹے بڑے کو ان سے پریشانی کا احساس ہوا نہ کسی ذمہ دار کو کبھی ان سے شکایت کا موقع ملا، نہ ان سے اعلا یا ادنی کارندوں کو اکتاہٹ محسوس ہوئی اور نہ کسی نے انھیں کسی خیانت کے مسئلے میں یا فریب دہی کے عمل میں یا کسی ایسے معاملے میں جو قریب یا دور سے مروت کے خلاف ہو تہمت دی۔

حالاں کہ وہ ایسی جگہ پہ کام کرتے تھے کہ کام کے پورے اوقات بلکہ ان کی خدمت کے طویل عرصے میں انھیں سینکڑوں آدمیوں سے ملتے رہنا ہوتا تھا، یعنی ایسے طلبہ سے جن میں اگر شریف، شائستہ، نیک باعزت اور پاکیزہ خاندان سے آئے ہوئے ہوتے ہیں تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو غیر شائستہ ہوتے ہیں، جنھیں تعلیم وتربیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بلکہ بعض دفعہ انھیں اتنی بھی شدبد نہیں ہوتی کہ وہ انسان اور بے زبان جانور میں امتیاز کر سکیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ابھی تحصیل علم اور نشو ونما کی منزل میں ہوتے ہیں، مزید بر آں یہ کہ ان میں جوانی کا جوش، بچپنے کی نا سمجھی، نوعمری کی تیزی اور بچوں کی وہ جلد بازی ہوتی ہے جس کی بنیاد نہ کسی باشعور سوچ، حس سلیم اور روشن ضمیری پہ ہوتی ہے نہ کسی پختہ تجربے پر کہ وہ اپنے لیے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کے لیے محض مفید ثابت ہوں اور ہلاکت خیز یا تکلیف دہ منفی پہلوؤں سے اپنے کو اور دوسروں کو بچا سکیں۔

نیز ایسے علماء واساتذہ سے سابقہ پڑتا ہے جن میں ایک طرف متقی وپرہیزگار، بردبار مخلص، اسوۂ رسول علیہ کے پیرو، متواضع اور خدا سے ڈرنے والے ہوتے ہیں، لوگوں کی خدمت کے دل دادہ، اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کو یاد کرنے والے، بھائیوں اور دوستوں کے عیوب سے چشم پوشی کرنے والے، اپنے کسی بھائی کو تنقید کا نشانہ بنانے یا اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر سرزنش کرنے سے پہلے اپنی اصلاح ودرستگی پر توجہ دینے والے بھی ہوتے ہیں، نرم دل، مانوس کر لینے اور مانوس ہو جانے والے بھی ہوتے

ہیں، سمندر کی طرح کشادہ نفس، مہکتے پھول کی طرح کھلے ہوئے دل والے، کسی جاہل کا سامنا ہو تو اسے سلام کہہ کر گزر جانے والے بھی ہوتے ہیں اور ان کا برا چاہنے والوں سے خوب صورت اور عجیب انداز میں درگزر کرنے والے بھی، بعض ایسے خندہ رو اور نرم خو ہوتے ہیں کہ سنگ دلی اور سخت گیری سے آشنا بھی نہیں ہوتے نہ اپنے بھائی کو رسوا کرنے والے نہ بے سود باتوں میں پڑنے والے اور نہ ہی ظلم و زیادتی کا تعاون کرنے والے ہوتے ہیں، بلکہ صرف بر و تقویٰ کی معاونت کرنے والے ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ان میں دوسری طرف بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں اپنی عقل و فکر اور علم و فہم پر ناز ہوا کرتا ہے، انھیں اپنی رائے و شخصیت پر بے جا اعتماد کا ضرورت سے زیادہ احساس ہوتا ہے، ان میں جلد غصہ ہونے والے، بڑے حساس بھی ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو بے جا اہمیت دینے والے بھی ہر وقت ناک وبھنو چڑھانے والے، ہر عمل سے پیشانی پر بل لانے والے، اپنا حق پورا پورا وصول کرنے والے اور دوسروں کا حق کم دینے والے، بلکہ دوسروں کے حق کا سرے سے انکار ہی کر دینے والے بھی ہوتے ہیں جو صرف لینا تو جانتے ہیں، لیکن دینا نہیں جانتے، اپنے مفادات کے سلسلے میں بڑے زیرک، ہوتے ہیں اور اپنے بھائیوں اور معاشرے کے مفادات کے تئیں نہایت غافل، خود کو اچھا سمجھنے والے اور دوسروں کو نہایت برا سمجھنے والے ہوتے ہیں۔

انسانی تاریخ کا تجربہ شاہد ہے کہ علم و ثقافت اور رسمی سند سے مسلح جہالت بڑی سرکش اور خود سر ہوتی ہے جو کسی بھی اصلاح کو قبول نہیں کرتی بلکہ ہر قابو میں لانے والی چیز کو ناپسند کرتی اور ہر حکمت عملی سے ابا کرتی ہے۔

بہر حال طلبہ و اساتذہ، پڑھنے اور پڑھانے والے سب کے سب انسان ہی ہوتے ہیں اور کون ابن آدم ہے جس سے غلطی سرزد نہ ہو؟ انسان خواہ کتنی ہی رفعت و بلندی کو پہونچ جائے فرشتہ نہیں بن سکتا کہ اس سے خطا و نسیان کا صدور نہ ہو، یہی اللہ کی حکمت و مشیت ہے۔ ایک انسان محض علم کا لبادہ اوڑھ لینے سے فرشتہ معصوم نہیں ہو جاتا، بلکہ حسب عادت وہ نقائص و فضائل سے مرکب، خیر و شر اور صلاح و فساد کا مجموعہ ہی رہے گا۔ بسا اوقات بعض انسان اللہ تعالیٰ کی حکمت و توفیق سے اتنی ترقی کر جاتے ہیں کہ فرشتوں کے لیے بھی قابل رشک ہو جاتے ہیں اور بعض اتنی پستی میں چلے جاتے ہیں کہ شیطان بھی ان سے پناہ مانگنے لگتا ہے۔

دارالعلوم کے اس معاشرے اور طلبہ و اساتذہ سے کھچا کھچ بھری اس جگہ میں مفتی محمد عزیز

صدیقی، دیوبندی، رحمۃ اللہ علیہ۔ نے (جو مرض فالج میں ایک سال نو ماہ از ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ تا رمضان ۱۴۱۹ھ گزا کر ۱۹؍ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹۹۹ء جمعہ کی صبح چار بجے رب حقیقی سے جا ملے ۶۳؍ سال ملازمت کی اور ایسے تمام اوصاف کا نمونہ چھوڑ گئے جن سے ہر مسلمان ملازم اور مومن کا رگزار کو آراستہ ہونا چاہئیے یعنی پختہ کاری، محنت، اوقات کی پابندی، نظام و قوانین پر کاربندی اور کام کو انجام تک پہچانا خواہ وقت مقررہ کے علاوہ گھنٹوں مزید کام کرنا پڑے۔ یہ طریقہ انھوں نے ایک دن، دو دن، چند ہفتے، چند مہینے یا چند سالوں ہی کے لیے نہیں اختیار کیا، بلکہ اپنی ملازمت کے پورے عرصے میں اس طریقے پر کاربند رہے۔

ہم میں سے ہر شخص کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ایسے منصب پر کام کرنا جہاں مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہو، پھر اتنے لمبے عرصے تک انتہائی نازک کام ہے، طبعی طور پر اس طرح کے ملازم سے اگر کچھ لوگ خوش ہوتے ہیں تو کچھ لوگ ناراض، اس لئے کہ معاشرے کے ہر فرد کی رضامندی ایک ناقابل حصول مقصد ہے۔ طلبہ کے معاشرے سے خصوصاً دفتر تعلیمات کی پیچیدگیوں سے واقف کار کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ ایک ایسا ملازم جس کے ہاتھ میں طلبہ و اساتذہ سب کے انتظامی امور کی باگ ڈور ہو، اگر ایک شخص کو خوش کرنا چاہے گا تو یقینی طور پر دوسرے کو ناراض کرنا پڑے گا، اس لیے کہ بسا اوقات ایسے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں کہ بعض مراجعت کنندگان کو ذمہ داران یا منشی کی طرف سے کئے گئے فیصلے سے ضرور شکایت ہوتی ہے۔

لیکن منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ۔ جنھیں اللہ تعالی نے خوش اسلوبی و تواضع اور نرم خوئی سے نوازا تھا، ہر شخص کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ کسی کو خفگی کا موقع نہیں ملا، بلکہ سبھوں کے دل ان سے اتنے شاداں و فرحاں رہے کہ ان کے دلوں اور زبانوں سے ان کے لئے دعائیں نکلیں۔

اللہ تعالی نے اتنی ساری مخلوق کی دعاؤں کو انکے حق میں واقعی قبولیت سے نوازا کہ اپنے جوارِ رحمت میں انھیں بلانے کے لئے مبارک دن یعنی روز جمعہ کا اور اس مبارک مہینے کا انتخاب کیا، جس میں قرآن کا نزول ہوا، دار العلوم کے احاطہ مولسری،، میں بعد نماز جمعہ دسیوں ہزار لوگوں نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی، دار العلوم کے کبار مشائخ کے علاوہ کس کی نماز جنازہ میں اتنی بڑی تعداد نے شرکت نہیں کی ہوگی، کیونکہ دیوبند کی دسیوں مساجد میں جمعہ ادا کرنے والوں نے اس جنازے کے بارے میں شرکت کی

اور ان کی آخری آرام گاہ مزار قاسمی تک انہیں رخصت کیا۔

یاد بخیر کہ ۹؍شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۶؍دسمبر ۱۹۶۷ء کو دارالعلوم کے احاطے میں "باب قاسم" نامی صدر گیٹ سے داخل ہوا جب کہ فجر کی اذان اس کے میناروں سے گونج رہی تھی، میرے ہمراہ میرے تعلیمی سفر کی بیشتر منزلوں کے ہم سفر برادرم مولانا مجیب الرحمان رائے پوری قاسمی اور برادر معظم جناب مولانا اویس القاسمی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۳؍۶؍۱۴۱۹ھ ۲۵؍۹؍۱۹۹۸ء) کے برادر اصغر مولانا عمیس اختر رائے پوری تھے میں احاطہ دفتر سے گزر کر دفتر اہتمام کے نیچے والے دروازے سے داخل ہو کر احاطہ مولسری میں جانکلا، پھر دائیں جانب یعنی شمال مغرب کا رخ کیا، دارالحدیث اور درس گاہوں کے درمیانی راستے سے گزرا، پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کشادہ پارک ہے جس سے مختلف راستے پھوٹ رہے ہیں یہ پارک دار جدید (یعنی دارالعلوم کا مشہور دارالاقامہ) کا صحن ہے بعد ازاں شمال کی جانب مدنی گیٹ کی طرف گیا اور اس گیٹ کے پچھم والے زینے سے پہلے منزل پر چڑھ گیا، مغرب کا رخ کئے کمروں سے گزر رہا تھا تا آں کہ جنوب کی طرف کو ایک دو قدم مڑا اور سہ پایہ زینے سے ایک کمرے میں داخل ہوا جس کا نمبر اس وقت ۳۰/۳ تھا اور یہیں میں نے رخت سفر کھول دیا، اس سفر میں ہمارے بھائی عمیس اختر کی رہ نمائی رہی جو دارالعلوم کے قدیم طالب علم تھے اور وہی رات کے وقت "سہارنپور" اسٹیشن آئے تھے تاکہ ہمارا استقبال کریں اور دیوبند لے جا کر ہمیں اپنے کمرے میں اتار سکیں۔

دارالعلوم کی بھاری بھرکم دیواروں والی عمارت کافی دور تک بہت سے عمارتوں کے پھیلاؤ اور پہاڑ کی سی اونچائی و بلندی اور پرشکوہ قلعے کی شان و شوکت نے مجھے مرعوب کر دیا تھا، کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں اس جیسے مدرسے کو کیوں دیکھا ہوگا جو غریب مسلمانوں کے چندے سے دین کی خدمت کے حوالے، نیز کتاب و سنت کو زندہ کرنے میں شہرت کے حوالے سے اور اس دشوار گزار زمانے میں اتنی وسیع و عریض عمارت کے تعلق سے اس کا کسی بھی طرح ہم پلہ ہو۔

ہم نے فجر کی نماز دارالعلوم کی قدیم مسجد میں ادا کی، آنے جانے میں ایک دوسرے راستے سے گزرے، جو دوسری پرشکوہ عمارتوں سے گزر رہا تھا، اب میری وہ مرعوبیت اور دوچند ہو گئی جو دوستوں، اساتذۂ کرام اور آنے جانے والے بے شمار لوگوں کی زبانی اس کے متعلق سن کر میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

تقریباً ساڑھے سات بجے صبح دفتر کھلنے کا وقت ہوا، ہم امتحان داخلہ کی ابتدائی کاروائیاں انجام دینے کی خاطر بھائی شمیس اختر صاحب کے ہم راہ دفتر گئے، اس زمانے میں تقریری امتحان ہوا کرتا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دفتر میں سامنے میانہ قد، وجیہ الشکل اور حلیم و کریم ایک بزرگ ہیں جو ہر آنے جانے والے سے زمین کی سی خاکساری سے ملتے ہیں ان سے ملتے ہی قلب پر چھائی دہشت و ہیبت اور امتحان داخلہ اور اس کے حوالے سے پیش آنے والی مشکل صورت حال کا خوف جاتا رہا۔ یہ بزرگ سنجیدگی و بشاشت کے جامع، متواضع، ہر ملنے والے کی طرف مکمل توجہ دینے والے تھے دفتر تعلیمات سے نکلتے ہوئے ہم نے بھائی شمیس سے پوچھا۔ یہ بزرگ کون ہیں؟ انھوں نے بتایا: اس دفتر کے منشی محمد عزیز ہیں۔

اس پہلی ملاقات میں منشی محمد عزیزؒ نے میرے دل میں ایک ایسا شیریں خوش گوار اور راسخ نقشہ جمادیا اور میرے دماغ میں ایسا پاکیزہ دائمی چھاپ چھوڑ دیا، جو اس پل بھر کی ملاقات کے وقت سے ہنوز مٹا نہیں ہے اور ان شاء اللہ کبھی نہیں مٹ سکتا: ایسا تاثر جس کی برکت سے غیر شعوری طور پر مجھے یقین سا ہو گیا کہ آئندہ چند دنوں کے دوران ہونے والے امتحان داخلہ میں کامیاب ہو جاؤنگا اور میرا امدادی داخلہ بھی ہو جائے گا چنانچہ واقعی وہی کچھ ہوا جو میرے جی میں اس خوش گوار اور بشارت آمیز تاثر کی وجہ سے آرہا تھا کہ میرا اور میرے رفیق برادر مجیب الرحمان کا تمام سہولتوں کے ساتھ داخلہ ہو گیا۔

۱۶/۱۰/۷ ۱۳۸ھ مطابق ۱۶/ ۱۲/ ۱۹۶۷ء کو دارالعلوم میں داخلے کی کاروائیاں مکمل ہو گئیں، خوف و ہراس کا احساس جاتا رہا، ناامیدی آمیز رعب ختم ہو گیا کیونکہ تابناک یقین حاصل ہو چکا تھا اور پر کیف سرور سے قلب و جگر منور ہو گیا تھا جس کا اثر چہرے پر نمایاں تھا پھر دہاں دو سال تعلیم کے گزارنے کے بعد ۱۰/ ۵/ ۱۳۸۹ھ مطابق ۲۶/ ۱۹۶۹ء کو میں باچشم نم اور بادل پر غم دارالعلوم سے واپس آ گیا، جس کی جدائی کا غم ہمیشہ سینے کا داغ بنا رہا۔

وصال و ہجر کے ان لمحوں کے مابین منشی محمد عزیزؒ سے سینکڑوں بار ملنے کا اتفاق ہوا، ہر دفعہ میرے دل میں انکی محبت و قدر افزائی کے جذبات مزید پروان چڑھتے گئے، اس لئے کہ میں نے انھیں ایک سچے مسلمان کے اوصاف و اخلاق کا نمونہ دیکھا اور برتا۔ یعنی حسن کارکردگی، ہر آدمی کا احترام، حسن عمل، فرض شناسی اور معاشرہ انسانی کے سارے افراد کو سمو لینے والی خوش طبعی، جسکی وجہ سے سبھی لوگ انکے لیے دل اور آنکھیں بچھانے لگتے اور انکی شہرت معاملگی [illegible]

مندی اور اپنے سے اوپر ذمہ داروں کی خوشنودی حاصل کرلی تھی، ساتھ ہی ایسی اعلا ظرفی کہ حسب موقع اپنے سے نیچے کے ملازمین اور رفقائے کار کی ذمہ داری کو انجام دینے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

تقریباً ۱۳ر سال تک (از ۱۰ر۵ر۱۳۸۹ھ تا ۵ر۱۰ر۱۴۰۲ھ تک یہ راقم الحروف دارالعلوم کے حوالے سے ہجر گاہ میں رہا، ہمیشہ دارالعلوم کے لیے وارفتہ رہا ہر وقت حتی کہ اپنے مادر وطن میں بھی دارالعلوم کی یاد ستاتی رہی اور ہمہ وقت خیالوں میں دارالعلوم ہی سمایا رہتا اسکی درودیوار اسکی عمارتوں، میدانوں، اسکے راستوں پارکوں اور اسکے دفاتر و کتب خانے کی یاد آتی رہتی دارالعلوم کے اساتذہ، وہاں کے ملازمین جن میں سر فہرست منشی محمد عزیزؒ تھے، کی یادوں میں گزرتا رہا۔

رمضان ۱۴۰۲ھ جون ۱۹۸۲ء کو ہمارے اور ہماری ہم عصر نسل کے استاذ و مربی جلیل عربی زبان کے معلم مثالی واستاذ لاثانی حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۵ مطابق ۱۹۹۵ء) کا خط ملا جس میں انھوں نے دارالعلوم کی خدمت کے ناچیز کے انتخاب کی خوش خبری دی تھی، جس دارلعلوم کا میں ہمیشہ مشتاق رہا تھا۔

نصف شوال ۱۴۰۲ھ مطابق نصف جولائی ۱۹۸۲ء کو شوق کے پروں سے اور یوں کہنا چاہیے کہ گویا محبت و اعتقاد کے اگلے اور پچھلے بازوؤں کے ذریعے اڑتا ہوا میں دارالعلوم آیا اور مجلس شوری کے فیصلے کے مطابق استاذ اور ,,الداعی،، کے مدیر کی حیثیت سے خدمت انجام دینے لگا۔

حسن اتفاق کہ طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم سے جانے کے بعد جب میں استاذ کی حیثیت سے یہاں واپس آیا تو منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ کو اسی منصب پر کام کرتے ہوئے پایا، جس پر وہ میری طالب علمی کے زمانے میں فائز تھے، میں نے دیکھا کہ وہ اسی طرح نیک نام اور حسن شہرت کے حامل ہیں، عوام بلکہ علماء اور راہ خدا میں لگے ہوئے طلبہ کی حسب سابق دعائیں لے رہے ہیں، وہی جاں فشانی، وہی تن دہی اور وہی رات و دن ایک کر دینے والی محنت جس میں وقت مقررہ اور خارج وقت میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا، حالاں کہ اب عمر زیادہ ہو چکی تھی، قوی کمزور ہو چکے تھے، اعصاب جواب دے رہے تھے، سن رسیدگی نے انگ انگ کو کمزور کر دیا تھا مجھے بڑی حیرت ہوئی اور پورے وجود سے ان کے لئے دعائیں کیں۔

دارالعلوم میں آنے کے بعد سے ہوا یہ کہ اول احساس ذمہ داری کے اپنی افتاد کی وجہ سے۔ دوم [illegible] کے ساتھ بھرپور صحافتی عمل کے مزاج کے تقاضے کی بنا پر۔

سوم: بد قسمتی سے مختلف بیماریوں کا شکار ہو جانے کی وجہ سے راقم کو مجبور ہونا پڑا کہ صرف اپنی ذمہ داریوں کی ادائے گی کے دائرے میں اپنے کو محصور کر لے۔ برادران سے بڑی حد تک قطع تعلق کر لے اور مدرسوں کے ماحول میں کام کرنے والے اکثر بھائیوں کے طرز عمل کے برخلاف کہ وہ تعلقات پیدا کرنے اور ان تعلقات کی پختہ کاری میں خاصا وقت صرف کرتے رہتے ہیں کہ (بعض دفعہ یہ تعلقات اس مادی اور وسائل کی دنیا میں مفید بھی ہوتے ہیں) یہ ناچیز بالکلیہ پرہیز کرنے پر مجبور ہوا۔

چناں چہ اس طرح میرا دفتر تعلیمات میں بھی آنا جانا کم ہو گیا اور یہ صورت ہو گئی کہ بغیر سخت ضرورت کے دفتر میں آنے جانے کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے منشی محمد عزیزؒ کو جو ہمیشہ میرے احوال دریافت کرتے رہتے، اگر میں ایک دو ماہ تک ان کی نظر سے اوجھل رہتا تو بسا اوقات دریافت حال کے لیے اپنے دفتر کے کسی ذمہ دار کو میرے پاس ضرور بھیجتے، جب بھی اپنی ضرورت کے لیے ان کے پاس کسی کو بھیجتا تو تو فوراً خوش خلقی کے ساتھ ضرورت پوری کر دیتے، وہ خدائے بزرگ و برتر خوب جانتا ہے جس نے میرے دل میں ان کی بے پناہ محبت پیدا کر دی ہے کہ میرے دل کے تمام گوشے بلکہ میرا وجود ان کی زندگی میں بھی ان کے لئے دعاؤں اور ثناخوانی رطب اللسان رہا کرتا تھا۔ دفتر تعلیمات میں منشی محمد عزیزؒ کی موجودگی ہر اس ضرورت کی تکمیل کے حوالے سے جو مجھے یا کسی استاذ یا کسی عزیز طالب علم کو پیش آتی، ضمانت ہوتی تھی اور ان کی موجودگی ہمیشہ کامیابی اور بھلائی کی بشارت ہوا کرتی تھی۔

ان کی یہ صفت بہت ساری صفات کو جامع تھی، کتنی بار مجھے آرزو ہوئی کہ کاش میں ان کی اس صفت پر بہت سی نام نہاد نیکی، روایتی تقویٰ، مصنوعی "بزرگی" "فخر گزیدہ علم و فضل اور غرور آمیز عبادت گزاری کو قربان کر سکتا۔

حالاں کہ وہ خود اس پہلو سے بھی اپنے رب کریم کی طرف سے باتوفیق تھے، چناں چہ نماز باجماعت کی پابندی کے ساتھ وہ تہجد گزار اور شب بیدار بھی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جن اخلاق و صفات کے حامل تھے ان کا سرچشمہ درحقیقت ان کی گہری دین داری، سچا تقویٰ اور دین و شریعت کی کماحقہ پابندی تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ دار العلوم کو اللہ تعالیٰ نے جو عظمت دی ہے (جس کی نظیر اس دیار کے تمام اداروں اور یونیورسٹیوں میں نہیں ملتی) اور جو عوامی مقبولیت دی ہے جس کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی، ان دونوں

باتوں کی بنیاد در حقیقت منشی محمد عزیزؒ جیسے مخلصین ہی ہیں، ان مخلصین میں سر فہرست خود دارالعلوم کے بانیان ومشائخ اور یہاں کے اہل دل فضلاء ہیں، خدائے بزرگ و برتر کی یہ حکمت رہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کسی زمانے میں بھی مخلصین سے خالی نہیں رہا۔ ہر چند کہ آج عصر حاضر میں ان کا تناسب قابل افسوس حد تک کم ہو گیا ہے، دارالعلوم پر ماضی میں ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جب یہاں کے دربان تک فرض نماز تو کنار تہجد ونوافل کے بھی پابند رہے ہیں۔

یہی وہ بنیادی قدر وقیمت ہے جس کی وجہ سے دارالعلوم کو لازوال و بے مثال وقار واعتبار ملا ہے اور اس ملک کی اسلامی تاریخ کے محراب میں کھڑے ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔

ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹۹۷ء اپریل میں دارالعلوم کی طرف سے رسمی چھٹی کے موقع سے منشی محمد عزیزؒ پر فالج کا حملہ ہوا، جس کی وجہ سے وہ نقل وحرکت سے محروم ہو گئے، بالآخر گھر بیٹھنا پڑا اس بیماری اور اس سے رونما ہونے والی تکالیف میں بھی اپنے پروردگار سے خوش، صابر وشاکر اور اس کے فیصلے کو ذریعہ ثواب سمجھتے رہے، لیکن ہمیشہ دارالعلوم کے مشتاق رہے، جہاں انھوں نے ایسی محبت واخلاص کے ساتھ اپنی عمر بتادی، جس کی مثال کبار مشائخ کے علاوہ شاید وباید ہی ملتی ہے۔ ان کے بڑے صاحب زادے جناب محمد حسیب صدیقی (منیجر مسلم فنڈ دیوبند) اور چھوٹے صاحب زادے محمد لیاز صدیقی نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ آپ ایام مرض میں بھی ہم لوگوں سے اصرار کرتے رہے کہ میرے لیے کام فراہم کرو، اس لیے کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر تم لوگ مجھے کسی طرح دفتر تعلیمات پہنچادو تو میں وہاں بیٹھ کر کام انجام دے سکتا ہوں۔ جب ایک روز ان کا اصرار طول پکڑ گیا تو انھیں **(wheelchair)** "وہیل چیئر" پر بٹھا کر دارالعلوم کے احاطے میں لے گیا اور احاطہ مولسری سے ان کے دفتر کو جانے والے زینے کے پاس رکا کر ان سے پوچھا: ابو جان! آپ اس زینے پر کس طرح چڑھ سکتے ہیں جب کہ آپ میں نقل وحرکت کی بھی طاقت نہیں؟ ہم لوگ انھیں چند منٹ وہاں رکائے رہے، انھوں نے دارالعلوم کے وسیع وعریض احاطے اور در ودیوار پر حسرت بھری نگاہ ڈالی، پھر ہم لوگ انھیں واپس لے آئے۔

جب منشی محمد عزیزؒ کو فالج کے مرض نے رہین خانہ بنادیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ بیماری ان سے اسی وقت جدا ہو گی جب وہ خود ہی اس دنیا سے جدا ہو جائیں گے۔ تو میرے دل نے پوری طاقت سے کہ

طرح اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے جب تک خدا کو منظور ہوگا اس کی گاڑی اسی طرح چلتی رہے گی، اس کا دفتر تعلیمات بھی باقی رہے گا جہاں منشی جیؒ کام کیا کرتے تھے اور ان کی جگہ کوئی دوسرا بھی آجائے گا اور زندگی کا پہیا اسی طرح گھومتا رہے گا، لیکن اس دفتر میں منشی محمد عزیزؒ جیسے منشی کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی، دوسرے سینکڑوں منشی ان کی قائم مقامی نہیں کرسکیں گے۔

میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں (خدا گواہ) اس سے میرا مقصد کسی برادر کی قدر و منزلت گھٹانا نہیں ہے ،اللہ تعالی ہرایک کو ہر خیر کی توفیق دے اور اچھے پیش رو کا سچا جانشیں بنائے۔ منشی محمد عزیزؒ کی حیات ہی میں ان کے دفتر تعلیمات چھوڑ دینے کے بعد اسی طرح ان کی وفات کے بعد مجھے دفتر تعلیمات میں کئی متعلقہ ضرورتیں پیش آئیں، جن کے حوالے سے وہ بہت شدت سے یاد آئے اور ان کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ میں یہ تب کہہ رہا ہوں جب کہ وہ اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں جاچکے ہیں، خدا ہی ان کے چھپے اور کھلے کو بہتر جانتا ہے یقیناً وہ انھیں پورا پورا بدلہ دے گا اور میں یہ بات تب کہہ رہا ہوں کہ جب ان سے میں کسی بدلے کی توقع نہیں کرسکتا، بلکہ یہ محض ضمیر کی آواز کا اظہار ہے۔

منشی محمد عزیزؒ کو دوسروں سے جو چیز ممتاز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ کام کو خصوصاً اس درالعلوم میں کام کرنے کو جس کی بنیاد روز اول سے ہی تقوی پر ہے، کسب معاش کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک جذبے اور شوق کی تسکین نیز خوش نودیٔ الٰہی کے حصول کا محبوب مشغلہ سمجھتے تھے۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ملازمت ایک ایسی عبادت ہے جس کے ذریعے اپنی نیت و محنت اور کوشش کے بقدر بندہ اپنے پروردگار سے قریب ہوتا رہتا ہے، وہ اپنے تمام تصرفات و معاملات میں اسی اصول پر چلتے تھے اور اسی نظریے کو بنیاد بنایا کرتے تھے۔ اصول کی صحت، نظریے کی سچائی ہمیشہ کام کی صورت حال، کردار کے طرز، کارکردگی کی کیفیت اور معاملے کے طریقے کو یکسر بدل دیا کرتی ہے، اسی لیے منشی جیؒ فرائض منصبی کی تمام اخلاقیات میں اپنے تمام ہم عصروں سے بالکل مختلف تھے۔

منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ کی وفات کے بعد ان کے سلسلے میں جب یہ چند سطریں لکھنی چاہیں تو میں نے سوچا کہ دارالعلوم کے محافظ خانے میں ان کی خاص فائل پر ایک نظر ڈال لوں، ہوسکتا ہے کہ کوئی کام کی بات مل جائے اور یہ سطریں اس مطالعے کے نتیجے میں گراں قدر بن جائیں، مذکورہ فائل پر نظر ڈالنے سے ان کی متعدد درخواستوں پر کبار اولیاء اللہ کے قلم سے لکھی ہوئی طویل سفارشوں پر مجھے چنداں تعجب نہیں ہوا،

جن میں شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۴ء) سابق ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند؛ عالم باعمل، مجاہد اسلام؛ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء) سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند؛ شیخ التفسیر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، دیوبندی، پاکستانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۴۹ء) سابق صدر مہتمم دار العلوم دیوبند، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء) سابق مہتمم دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء) سابق ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند جیسے اساطین علم و فضل اور علماء ربانیین بھی ہیں۔

جہاں تک شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ہے تو جیسا کہ سبھوں کو معلوم ہے کہ بلاضرورت کی مدح سرائی سے بالکلیہ اجتناب کے حوالے سے مشہور رہے ہیں؛ اس کے باوجود انھوں نے اپنی متعدد سفارشات میں منشی جی کی حسن کارکردگی، محنت اور جاں فشانی سے اپنے فرائض انجام دینے کی بھرپور تعریف کی ہے، چناں چہ ایک سفارش میں فرماتے ہیں:

لیکن مجھ کو اسکا اعتراف ہے کہ منشی محمد عزیز صاحب نے ناتجربہ[1] کار ہونے کے باوجود تمام فرائض کو سمجھا اور جہاں تک مجھ کو علم ہے اپنی ضروریات کو بھی فرائض متعلقہ کے مقابلے میں بالائے طاق رکھا اور حیرت انگیز محنت کے ساتھ تمام کاموں کو سنبھالا، تعلیمات کے کسی کام سے کسی وقت انکار تو کیا چہرے پر شکن بھی نہ ڈالی (۲)

---

(۱) پیش نظر رہے کہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب نے منشی محمد عزیز صاحب کے متعلق اپنے ان تاثرات کا اظہار دفتر تعلیمات میں [illegible] کی حیثیت سے ان کے صرف تقریباً ایک ماہ کے عرصے تک کام کرنے کے بعد ہی فرمارہے ہیں اور ابھی وہ باقاعدہ محرر کی حیثیت سے یہاں ملازم نہیں ہوئے ہیں۔

(۲) یہ سفارش ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو تحریر ہوئی ہے۔

حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے استاذ اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے ۴۴ سال مادر علمی دار العلوم دیوبند میں خدمت کی یعنی ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۷۴ھ تک۔ نظام الاوقات واوقات کی پابندی اور درس گاہوں میں بروقت تشریف لانے کے سلسلے میں ضرب المثل کا درجہ رکھتے تھے۔ دار العلوم کی تاریخ میں طلبہ کے سلسلے میں شفقت، فرائض منصبی میں انہماک اور پیدائشی طور پر مدرس ہونے کے حوالے سے وہ بے نظیر تھے۔ دار العلوم اور برصغیر کے مدارس اسلامیہ میں داخل اکثر کتب فقہ وادب وشعر پر ان کے گراں قدر حواشی ہیں جن کا ہر طالب علم اور مدرس، کتب فہمی میں احسان مند ہے۔ انھوں نے ۲۴ گھنٹے کے اوقات کو اپنے خدا اس کے بندوں اور خود اپنے اہل خانہ کے درمیان بڑی دقت نظری سے تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ کم خوردن وکم خفتن وکم گفتن کے صحیح مصداق تھے، ان کا شاید ہی کوئی لمحہ مرضی

• اس وقت کے ضروری حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد مزید فرماتے ہیں:

”چوں کہ مذکورہ بالا قسم کے طلبہ کے متعلق اہتمام یا صدارت اہتمام سے تاکیدی احکام آتے تھے میں فوراً ہی منشی محمد عزیز صاحب سے کہتا تھا اور وہ فوراً کام چھوڑ کر کھڑے ہوجاتے تھے اور شعبہ جات متعلقہ میں ڈھونڈ کر فارم کا پتہ لگا لیتے تھے؛ اس وجہ سے ان کا اکثر حصہ اسی دوڑ دھوپ میں گزرتا تھا اور فرائض متعلقہ کے لیے رات کا وقت رہ جاتا تھا، اس کے علاوہ جس روز سے انھوں نے کام شروع کیا ہے جہاں تک مجھ کو معلوم ہے کسی جمعہ کی تعطیل ان کو نصیب نہ ہوئی، اس سے ایک اور بات یہ ہے کہ اس گڑبڑ میں بھی منشی صاحب موصوف نے طلبۂ دارالعلوم سے جن میں ہر قسم اور ہر مزاج کے طالب علم ہیں درشتی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی جس کی عام شکایت رہی ہے۔(۱)

۸/۱۰/۵۸ ۱۳ھ کو منشی جیؒ نے ناظم تعلیمات کے ذریعے حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں درخواست پیش کی، جس میں انھوں نے اس حوالے سے اپنی تنخواہ میں اضافے کی مانگ کی تھی کہ وہ چار

---

(۱) اس سفارش پر ۲۴ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں اسوقت کے صدر مہتمم حضرت علامہ شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس وقت ڈابھیل میں مدرس تھے منظوری دیدی۔

”میرے نزدیک مولانا اعزاز علی صاحب کی رائے کے موافق منشی محمد عزیز کا تقرر مناسب ہے۔“ علامہ شبیر احمد عثانی دیوبندی نے ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۴۶ھ کے عرصے میں درالعلوم تدریسی خدمت انجام دی اور ۱۳۵۴ھ سے ۱۳۶۲ھ کے عرصے میں صدر مہتمم کے عہدے پر فائز رہے۔ اللہ تعالی نے انھیں علم عمیق، وسیع مطالعہ اور گہری فکر کے ساتھ قلم و زبان کی دولت بے پناہ سے نوازا تھا۔ تقسیم ہند سے قبل ہی وہ پاکستان منتقل ہوگئے تھے۔ ۲۱ صفر ۶۹ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ کو کراچی میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔

(۲) قرآن پاک میں آیت نمبر ۸۲ سورۂ کہف میں اس گرتی ہوئی دیوار کے حوالے سے جسے حضرت خضر علیہ السلام نے کھڑی کردی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ جب اس گاؤں والوں نے ہم بھوکوں کو کھانا تک نہیں کھلایا تو آپ نے بلا اجرت یہ کام کیوں کیا؟ جواباً حضرت خضر کی زبانی میں اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: ”واما الجدار فکان لغلمین یتیمین فی المدینة وکان تحته کنز لهما وکان ابوهما صالحا فاراد ربك أن یبلغا اشدهما ویستخرجا کنزهما رحمة من ربك“

ترجمہ: اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں رہتے ہیں اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال مدفون تھا (جو ان کے باپ سے میراث میں پہنچا ہے) اور ان کا باپ (جو مرگیا ہے) ایک نیک آدمی تھا سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچ جاویں اور اپنا دفینہ نکال لیں اور (یہ سارے کام بہ الہام الٰہی ہیں)“

یہ آیت صراحتاً بتاتی ہے کہ باپ کی نکوکاری اپنی اولاد کے لئے باعث منفعت اور رحمت الٰہی کے متوجہ ہونے کا محرک ہوا کرتی ہے۔

یہاں مجھے کہنے دیجئے کہ منشی محمد عزیزؒ کی نیکی، قناعت اور دارالعلوم کی مخلصانہ خدمت نے انھیں اور ان کی اولاد کو مادی نفع بھی پہنچایا، چنانچہ ان کے دونوں لڑکے محمد حسیب صدیقی اور محمد لیاز صدیقی ماشاءاللہ سے اقتصادی طور پر خوش حال ہیں۔ اول الذکر کو تو خدا نے [illegible]

سالوں سے کام کرتے چلے آرہے ہیں اور کافی تنگ دست اور کثیر العیال ہیں۔ (۲) یہ اضافہ ان کے دلی اطمینان کا موجب بن کر ذمہ داریوں میں پورے طور پر مشغول رہنے میں معاون ثابت ہوگا! چنانچہ شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ نے ۱۰؍۱۰؍۱۳۵۸ھ کو اس درخواست پر پرزور سفارش لکھی جس میں انہوں نے منشی جیؒ کے امانت دار، بااعتماد اور محنتی ہونے کی ان لفظوں میں شہادت دی:

"احقر طبعی طور پر سفارش کرنے سے بچتا رہتا ہے اور حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ دخل در معقولات نہ کرے۔ اس وقت درخواست دہندہ کے حالات عرض کرتے ہیں تاکہ ان کو سن کر صحیح نتیجہ حاصل ہوسکے، منشی محمد عزیز صاحب نے دفتر تعلیمات کا بار بالکل اٹھالیا ہے، وہ اپنی ذاتی ضرورتوں پر تعلیمات کی ضرورتوں کو مقدم کرتے ہیں، تعلیمات کے کام میں نہ رات کا خیال ہے نہ دن کا، اس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت امین اور معتمد علیہ ہیں۔ سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات ذمہ داری کے کام ہیں اور دائرۂ اہتمام سے مخفی نہیں کہ اس سے پہلے کارکن رشوت ستانی میں بدنام ہوتے رہے، لیکن بحمد اللہ اس وقت تک درخواست دہندہ پر اس قسم کا کوئی حرف نہیں آیا، مجھ کو تمام ذمہ داری کے کاموں میں ان پر پورا اعتماد ہے، کام کی تعداد سے قطع نظر کی جائے تب بھی تعلیمات کا بہت سا کام انکے ذمے ہے۔ تو اگر کسی کی خدمت قابل قدر دانی ہے تو منشی محمد عزیز صاحب اسکے اور بھی مستحق ہیں۔

دستخط محمد اعزاز علی غفر لہ ۱۰؍ شوال ۱۳۵۸ھ

---

(۱) عالم ربانی، مجاہد، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ۱۳۱۵ھ میں دار العلوم سے فارغ ہوئے۔ سالہا سال مسجد نبوی میں حدیث شریف کا درس دیا۔ ۱۳۴۶ھ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث منتخب ہوئے اس عہدے پر اپنی وفات مؤرخہ ۱۲؍ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ مطابق ۵؍ دسمبر ۱۹۵۷ء تک فائز رہے۔ اس سے قبل وہ اپنے عظیم استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء) کے ساتھ مالٹا کے جزیرے میں سالوں قید رہے اس کے علاوہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے اہم ستون کی حیثیت سے تاریخ میں آپ کا نام ثبت ہے۔ آپ ہی کے برادر حقیقی مولانا سید احمد فیض آبادی (متوفی ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء) نے جو آپ ہی کے ساتھ ۱۳۱۵ھ میں دار العلوم سے فارغ ہوئے تھے، محرم ۱۳۴۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۱ء میں مدینے منورہ میں مسجد نبوی شریف کے باب جبریل سے متصل مدرسہ علوم شرعیہ قائم فرمایا۔ جس نے دیار رسول ﷺ میں اس تنگ دستی کے زمانے میں علم و آگہی کی روشنی پھیلائی اور وہاں سے بڑے بڑے علماء، فقہا اور ادبا پیدا ہوئے۔ جن میں سعودی عرب کے ادباء کے قائد و نقیب اور یاد تازہ گرانمایہ ادبی رسالے "المنہل" کے بانی و مدیر شیخ عبد القدوس انصاری قابل ذکر ہیں، جنھوں نے مولانا سید احمد فیض آبادی پر اپنے بیش بہا گوہر بار ادبی قلم سے باقاعدہ کتاب "بناۃ العلم فی الحجاز السید احمد الفیض آبادی" کے عنوان سے سپرد قلم کی۔

یہ مدرسہ شاہ فہد کے زمانے میں مسجد نبوی کی وسعت کاری کے حالیہ عمل کے دوران قباء کے راستے پر منتقل ہوگیا ہے اب اس کا رنگ و آہنگ بھی بدل گیا ہے۔ رحمہ اللہ

حضرت مدنی(۱) رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس سفارش کی اس طرح تائید و تصدیق فرمائی:

"میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں"

دستخط ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے صدر مہتمم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ۵ محرم ۱۳۵۹ھ کو اپنے حکم نامے کے ذریعے جو انھوں نے درخواست کے حاشیے پر تحریر فرمائی تھی (۱)

اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب[2] صاحبؒ (متوفی ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء) نے بھی اسی حاشیے پر تحریر کردہ اپنے فیصلے میں تین ماہ بعد دوبارہ درخواست دینے کا اشارہ فرمایا، (۳) چنانچہ منشی محمد عزیزؒ نے ۳/۴/۵۹ ۱۳ھ کو حسب الحکم دوسری دوخواست دی۔

اس درخواست کو بھی حضرت شیخ الادبؒ نے ایک مؤثر تصدیق کے ذریعے تقویت بخشی، جس میں آپ نے سابقہ تصدیق کی باتیں دہرائیں اور منشی جیؒ کے دیگر باریک خصائل کا بھی تذکرہ فرمایا: میں ذاتی تعلقات کی بنا پر سفارش کرنیکو ہمیشہ برا سمجھتا رہا ہوں اور طبعی خواہش ہے کہ کارکنوں کی ہمت افزائی اس صورت میں ہو کہ وہ کام کریں:

---

(۱) جسکے الفاظ یہ تھے:

سردست گریڈ کے سلسلے میں جملہ ملازمین کو ترقی دی جارہی ہے اسی پر اکتفا کیا جائے، خصوصی ترقی کے متعلق تین ماہ بعد یاددہانی کی جائے۔

شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند ۵/محرم ۵۹ ۱۳ھ

(۲) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بن حافظ مولانا محمد احمد بن امام محمد قاسم نانوتویؒ، بانیان دارالعلوم کے سرخیل حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے تھے۔ ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، ۱۳۳۷ھ تا ۱۳۴۳ھ کے عرصے میں دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۴۳ میں نائب مہتمم ہوئے اور ۱۳۴۸ھ میں عہدۂ اہتمام کو رونق بخشی اور ۱۴۰۱ھ تک اس عہد جلیلہ کے لئے باعث عزت وافتخار رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے نظیر تقریری صلاحیت اور حسن بیان سے نوازا تھا جس کے ذریعے، صحیح عقیدے کے اشاعت، باطل فرقوں اور مذاہب کی تردید اور دنیا کے گوشے گوشے میں دارالعلوم کے نام، کام اور تام کو عام کرنے کا کام لیا۔ عالم اسلام کے مختلف اطراف واکناف کے علاوہ برصغیر کا شاید ہی کوئی قابل ذکر شہر اور قصبہ ہوگا جو ان کی شیریں بیانی، قادر الکلامی، حاضر جوابی اور بلبل نوائی سے محظوظ نہ ہوا ہوگا۔ ۸۸/سال کی عمر میں ۶/شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء بروز یکشنبہ کو انتقال فرمایا اور مزار قاسمی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

(۳) جسکے الفاظ حسب ذیل تھے

"عالباً گریڈ کی ترقیات جاری نہ ہونے کی وجہ سے یہ درخواست خصوصی طور پر کی گئی ہے۔ اجرائے گریڈ کے مواقع اگر ان کی خصوصی ترقی میں مانع نہ ہوں تو میرے نزدیک منشی محمد عزیز واقعی طور پر مستحق ہیں۔"

منشی محمد عزیز صاحب محرر تعلیمات کے متعلق میں ایک دفعہ "نہیں" کئی بار عرض کر چکا ہوں، مجھ کو ان کا تجربہ کئی سال سے ہے، یہ ہر کام میں جفاکش، شب وروز کام کرنے والے کسی کام میں حیلے بہانہ نہ کرنے والے کارکن ہیں اس کے ساتھ ہی یہ کہ پورے معتمد علیہ ہیں۔ فرائض متعلقہ ہی نہیں بلکہ تعلیمات کے زوائد امور میں بھی انھوں نے ہمیشہ پوری سعی سے کام لیا اور یہ بھی قابل عرض ہے کہ منشی محمد عزیز صاحب اس جگہ پر مامور ہیں جس جگہ پر انکے سابقین سے طلبہ کے ہمیشہ جھگڑے قضیے رہا کرتے تھے، روزانہ نہیں تو ہفتے دو ہفتہ میں ضرور کوئی قابل مداخلت جھگڑا پیش آجاتا تھا، لیکن کئی سال کی ملازمت میں ایک دفعہ بھی طلبہ سے انکی کوئی خلش پیدا نہیں ہوئی۔

مجھ کو یقین ہے کہ میں نے اس گذارش میں ایک لفظ بھی واقعیت سے زائد نہیں کہا ہے۔"

محمد اعزاز علی غفرلہ

۴ر ربیع الثانی ۱۳۵۹ء

اس تاریخ کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اس سفارش کی ان الفاظ میں تائید کی کہ:

مجھکو مولانا اعزاز علی صاحب کی تحریر سے اتفاق ہے نیز یہ بھی خیال کرنا ضروری ہے کہ مجلس علمی کے تمام کاموں کو ان کے ذمے کیا گیا ہے۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ،

۴ر بیع الثانی ۱۳۵۹ھ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۷ار۵ر۱۳۵۹ھ کو ان کے حسن کارکردگی کو سراہتے ہوئے تنخواہ میں ایک روپے کے اضافے کی منظوری دی (۱)

۷ار محرم ۱۳۶۱ھ کو منشی محمد عزیزؒ نے حضرت مہتمم صاحب کی خدمت عالیہ میں درخواست پیش کی کہ طویل خدمتوں اور بہت سی ضرورتوں کے پیش نظر ان کی تنخواہ میں اضافہ فرمایا جائے۔

چناں چہ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے اس پر ایک گراں قدر سفارش لکھی اور ان کی پر خلوص محنتوں اور مثالی کارکردگی کو یوں مختصراً بیان فرمایا:

---

(۱) منظوری کے الفاظ یہ تھے:

"چوں کہ منشی محمد عزیز صاحب کی کارکردگی قابل اطمینان ہے اور ان کے کاموں میں اضافہ بھی ہوا ہے؛ اس لئے ایک روپئے ماہوار کی ترقی یکم جمادی الاولی ۵۹ ۱۳ھ سے منظور ہے شعبہ جات متعلقہ میں اطلاعات جاری کردی جائیں۔"

حضرت والا!

منشی محمد عزیز صاحب کی ان تھک مساعی سے میں بہت اچھی طرح واقف ہوں، دیانت، احتیاط، اطاعت اور تمام امور ضروریہ کی انجام وہی کے اوصاف ان میں علی وجہ الکمال موجود ہیں، میں نے ان کے حالات آں حضرت سے زبانی بھی عرض کئے ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے خدام والا بھی ان کے حسن خدمت سے ناواقف نہیں ہیں؛ اس لئے میں مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ ان کی درخواست کے سلسلے میں ان کی معتد بہ ہمت افزائی فرمائی جائے، ان کے متعلق زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں امیدوار ہوں کہ ان کی درخواست کو شرف قبولیت عطا فرمایا جاوے گا۔

محمد اعزاز علی غفر لہ

۲۴ر محرم ۱۳۶۱ھ

حضرت حکیم الاسلام نے اس درخواست کو حسن توجہ سے نوازا اور ۱۶ر ۲ر ۶۱ ۱۳ھ کو ایک گریڈ خصوصی ترقی کی منظوری فرمائی۔ (۱)

میرا مقصد ان سطرون میں ان ساری تحریری اور زبانی سفارشوں اور رپورٹوں کو جمع کرنا نہیں۔ ہے جن کا اظہار دارالعلوم کے نامور بزرگان دین منشی محمد عزیزؒ کی ملازمت کے تمام دورانیے میں کرتے رہے تھے۔

چناں چہ اب میں حضرت مولانا سید اختر (۲) حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ جو دارالعلوم میں میری طالب علمی کے وقت ناظم تعلیمات تھے، کے قلم سے کی گئی ایک سفارش پر اکتفا کرتا ہوں جو انھوں

---

(۱) "حسب سفارش تعلیمات ایک گریڈ خصوصی ترقی یکم صفر ۱۳۶۱ھ سے جاری کیا جاتا ہے دفاتر متعلقہ کو اطلاع دے دی جائے۔

محمد طیب غفر لہ ۶۱۲۱۶ھ

حضرت مولانا سید اختر حسین بن مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ شوال ۱۳۴۴ھ مطابق اپریل ۱۹۲۵ء سے اپنی وفات یکم ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۳ر نومبر ۱۹۷۷ء تک دارالعلوم میں استاذ رہے حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ ر ۱۹۶۷ء) کی وفات کے بعد سے اپنی وفات تک ناظم تعلیمات بھی رہے نیز مولانا بشیر احمد خان متوفی ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء کی وفات کے بعد کچھ دنوں کے لئے نائب مہتمم کے فرائض بھی انجام دئے۔ مولانا سید اختر حسین دیوبند ہی کے باشندے، دارالعلوم کے ممتاز عالم اور علامہ کشمیریؒ متوفی ۱۳۵۲ھ ر ۱۹۳۳ء کے شاگردوں میں تھے۔

نے منشی جیؒ کی اس درخواست پر لکھا تھا جو انھوں نے ۲۵؍۴؍۱۳۸۷ھ کو حضرات ممبران مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں پیش کار کے عہدے پر ترقی دیئے جانے کے لئے دی تھی کہ وہ عرصہ دراز سے محرر کی جگہ کام کررہے ہیں۔ حضرت مولانا سید اختر حسین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سفارش میں پر زرو الفاظ میں فرمایا۔

منشی محمد عزیزؒ صاحب محرر اول تعلیمات کی درخواست ترقی پیش ہے، بغیر کسی ادنیٰ رکاوٹ کے عرض ہے کہ ہر دور میں ان پر اعتماد کیا جاتا رہا ہے، میں بھی ان پر پورا اعتماد رکھتا ہوں اور یہ ہر دور میں پیش کاری کے فرائض انجام دیتے رہے اور اب بھی دے رہے ہیں؛ اس لیے پرزور سفارش کرتا ہوں ان کو پیش کاری کا گریڈ عطا فرماکر ممنون فرمایا جاوے۔"

فقط والسلام سید اختر حسین

۲۶؍۷؍۸۴ھ

منشی محمد عزیزؒ کے جن صفات حمیدہ کی کبار علمائے ربانیین نے تعریف کی ہے ان کی یہی صفات ہمارے زمانے میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہیں۔ جب میں نے دارالعلوم کے محافظ خانے میں رکھے ہوئے ان کے ذاتی کارناموں کے فائل میں ان کے سلسلے میں ان سفارشوں کو پڑھا تو خوشی سے اچھل پڑا؛ کیوں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: کہ منشی جیؒ کے ان مکارم اخلاق و حسن کار کردگی کا صرف میں اور معاصرین ہی قائل نہ تھے بلکہ ان کی ان خوبیوں کے اللہ تعالیٰ کے نیک اور پرہیزگار بندے بھی قائل رہے ہیں جن میں سر فہرست شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ ہیں جو کسی کی بے جا تعریف میں مبالغہ آرائی سے بھرپور احتیاط اور اجتناب کلی میں ضرب المثل کا درجہ رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ نیک لوگوں جیسا برتاؤ کرے، جنت علیا میں اپنے متقی بندوں کے ساتھ داخل کرے اور ان کے اہل و عیال، اقارب و رشتہ دار اور ان کے محبین و متعارفین کو صبر و سکون عطا کرے

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

ایک نئی کتاب

از مولانا خورشید انور گیاوی

تعارف و تبصرہ

کتاب: فتویٰ نویسی کے رہنما اصول

مرتب: جناب مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد

صفحات: ۲۴۳

ناشر: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

علم دین کی خدمت اور مسلمانوں کی رہنمائی کے جتنے شعبے ہیں ان میں منصب افتا ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے یہ کام نازک اور پرخطر ہونے کے علاوہ شریعت اسلامی کے مآخذ و مراجع سے گہری واقفیت، فقہی کتابوں کے وسیع مطالعہ اور حالات زمانہ پر مبصرانہ نظر کا متقاضی ہے، اس سلسلے میں فقہاء امت نے جو شرائط ذکر کی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہ کام ہر کس وناکس کا نہیں ہے، اور اس کی جرأت کرنے سے پہلے آدمی کو بہت کچھ سیکھ لینا چاہیے ورنہ وہ ناواقفوں کے نزدیک تو مفتی ہو سکتا ہے اہل نظر اسکو یہ مقام نہیں دے سکتے۔

معتبر اور مستند مفتی کے کیا شرائط ہیں اور آدمی ایسا مفتی کس طرح بن سکتا ہے، زیر تبصرہ کتاب کا یہی موضوع ہے اور اپنے موضوع پر یہ ایک قیمتی دستاویز ہے، جو فاضل گرامی جناب مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری "مدیر ماہنامہ ندائے شاہی" کے سالہاسال کے تجربہ کا نچوڑ ہے، معاصر فضلاء میں موصوف کو اللہ تعالیٰ نے کام کرنے کی توفیق سے جس قدر نوازا ہے اس سے قارئین کرام عموماً واقف ہوں گے، انہوں نے تیرہویں صدی ہجری کے مشہور زمانہ فقیہ اور احناف کے سرخیل علامہ ابن عابدین شامی کی موقر کتاب "شرح عقود رسم المفتی" کو بنیاد بنا کر جس طرح فتویٰ نویسی کے ۳۴ اصول مرتب کیے اس پر بے ساختہ داد تحسین نکلتی ہے۔

مرتب موصوف نے صرف اصول منضبط کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ ہر اصول کے تحت فقہی کتابوں سے جزئیات پیش کر کے اس کی وضاحت کی ہے، اس سلسلے میں جو محنت کی گئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بعض اصولوں کے تحت حسب ضرورت ۲۰ یا ۲۵ جزئیات تک بطور مثال پیش کیے گئے ہیں اس طرح کے کام کے لیے جس عرق ریزی کی ضرورت پیش آتی ہے اس سے اس نوع کا کام کرنے والے حضرات ہی واقف ہیں۔

ان اصولوں میں سے بعض ایسے ہیں جو مستقل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں اور فاضل مرتب نے حسب ضرورت تفصیل کر کے ان کا بھی حق ادا کیا ہے۔ مثلاً روایات مذہب میں ترجیح کے اصول، استحسان پر فتویٰ، مفہوم مخالف کا اعتبار، عرف کا اعتبار وغیرہ، اسی طرح آخر میں مزید افادیت کے عنوان سے یہ بحث کہ جدید مسائل میں فتویٰ کیسے دیا جائے؟

اس کے علاوہ ہر اصول کے تحت تمرین بھی دی گئی ہے جس سے طلبہ کے لیے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے اور

[illegible]

مولانا محمد نسیم بارہ بنکوی زید مجدہ استاذ دارالعلوم دیوبند

کو صدمہ

قارئین ماہنامہ دارالعلوم بالخصوص مولانا محمد نسیم صاحب کے تلامذہ ومستفیدین کو اس اطلاع سے یقیناً رنج وغم ہوگا کہ مولانا موصوف کی والدہ محترمہ کا ۱۲ر شوال ۱۴۱۹ھ کی درمیانی شب میں انتقال ہوگیا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

مرحومہ فرائض وسنن کی پابند ایک نیک وپرہیز گار خاتون تھیں۔ اس جانکاہ صدمہ کی خلش ابھی تازہ ہی تھی کہ ۱۴ر ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ موافق ۳ر مارچ ۱۹۹۹ء بروز چہار شنبہ کو موصوف کے بڑے بھائی حافظ محمد عاشق الٰہی ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دیکر عالم جاودانی ہو گئے" ورحمه الله وادخله فی جنة نعیم"

تقریباً دوماہ کے قلیل عرصہ میں ایسے دو عظیم وجانکاہ حادثوں سے مولانا موصوف پر کیا بیتی ہوگی اس کا اندازہ ہر دردمند دل رکھنے والا بآسانی کر سکتا ہے۔ اب مولانا موصوف کے حق میں انکے احباب اور دوستوں کی جانب سے سب سے بڑی تعزیت یہی ہے کہ ان کے لئے صبر و استقامت کی اور مرحومین کے واسطے رحمت وغفران کی دعا فرمائیں بقیہ ص ر ۵۵

اس لئے اولاً قارئین ماہنامہ دارالسلام اور مولانا موصوف کے احباب و تلامذہ سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ دعوات صالحہ اور ایصال ثواب کا اہتمام کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔

کتاب میں فتوی نویسی کے اصول سے پہلے فتوی نویسی کے آداب کا عنوان بھی نہایت قیمتی ہے اس کے تحت مرتب موصوف نے اکابر فقہاء کی کتابوں سے اخذ کر کے فتوی نویسی کے جو آداب ذکر کئے ہیں وہ اس موضوع پر کام کرنے والے ہر شخص کے لیے حرز جاں بنانے کے لائق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان آداب کی مکمل پابندی کے ساتھ اس وادی پر خار میں قدم رکھا جائے تو مفتی نہایت عافیت کے ساتھ نزاعات میں الجھے بغیر اپنا فرض منصبی ادا کر سکتا ہے

شروع میں ماخذ کتاب، شرح عقود رسم المفتی، کے عالی مرتبت مصنف علامہ ابن عابدین شامیؒ کے حالات بھی تقریباً ۶ صفحات میں ذکر کئے گئے ہیں۔ اور اس سے بھی پہلے دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی مرادآباد کے بلندپایہ اساتذہ کرام اور مفتیان عظام کی آراء و تقریظات ہیں جو اس مستند کتاب کو مزید استناد و اعتبار کا درجہ عطاء کرتی ہیں۔

یہ کتاب یقیناً اس لائق ہے کہ فتوی کے میدان کا کوئی شخص اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا خصوصاً اس میدان کے نووارد حضرات کو تو اس کا بار بار مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

دار العلوم دیو بند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳	شمارہ:	فی شمارہ ۶/	سالانہ ۶۰/

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند	استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دار العلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/
ہندوستان سے ۶۰/

Tel: 01336- 22429

FAX: 01336- 22768

Tel.: 01336 - 24034 EDITER

REGD NO. SHN/L-13/NP-111/98

فہرست مضامین

☆☆☆☆ **ختم خریداری کی اطلاع** ☆☆☆☆

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی۔

ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

از: مولانا حبیب الرحمن قاسمی

ایک سیکولر اسٹیٹ اور لادینی مملکت میں دین و مذہب، تہذیب اور ثقافت کی حفاظت اور ترویج و اشاعت کی تمام تر ذمہ داری مذہب کے پیروکاروں اور ماننے والوں پر ہوتی ہے، حکومت کا فریضہ بس اتنا ہوتا ہے کہ وہاں کی بسنے والی اقوام میں سے کسی کے مذہب و شریعت میں نہ خود مداخلت کرے اور نہ ہی کسی دوسرے فرد یا جماعت کو مذہبی معاملات اور شرعی امور میں دخل اندازی کی اجازت دے۔

ہمارا ملک ہندوستان بھی دستوری اعتبار سے ایک لادینی اور جمہوری ملک ہے اس لیے یہاں اسلامی معاشرہ اور دینی عبادات ورسوم کے تحفظ و بقا کا دارومدار خود یہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے اپنے طرز عمل اور رویے پر ہے اگر مسلمانوں کو اپنے مذہبی اعمال اور ملی شعائر سے دلچسپی اور لگاؤ ہوگا تو کسی طاقت کی مجال نہیں کہ وہ ان کے شرعی اور دینی امور میں ذرہ برابر بھی تغیر و تبدل کردے، لیکن اگر خدانخواستہ مسلمان ہی دین سے بیگانہ ہو جائیں اسلامی احکام و فرائض چھوڑ بیٹھیں اور اپنے مذہبی تشخص و امتیاز کو خود اپنے ہاتھوں مٹاڈالیں تو بجز خدا کے یہاں ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہوگا؟

آج اسلامی تہذیب و ثقافت خود مسلمانوں کے ہاتھوں جس شکست و ریخت سے دوچار ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، کسی مسلم آبادی میں گھوم پھر کر دیکھ لیں آپ کو اس آبادی میں ایک گھر بھی ایسا نہ ملے گا جس میں رہنے والے تمام کے تمام افراد دین دار اور اسلامی طرز زندگی کے پابند ہوں اس کے برعکس ایسے گھر کثرت سے مل جائیں گے جن کے صد فی صد افراد غیر اسلامی زندگی کے عادی اور خوگر ہوں گے۔

آج عمومی طور پر مسلمان فرائض دین، نماز، روزہ، زکوۃ، اور حج کو چھوڑ بیٹھے ہیں ڈاڑھی جو اسلامی شعار اور آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب سنت ہے اسے عیب کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے، خرید و فروخت اور لین دین کے معاملات سے شرعی احکام کو بالکل خارج کر دیا گیا ہے، نکاح وشادی میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو پس پشت ڈال کر غیروں کی تباہ کن رسموں کو حرز جان بنالیا گیا ہے، طلاق جسے شریعت نے ابغض المباحات قرار دیا تھا اور انتہائی مجبوری اور ضرورت کے وقت اس کے استعمال کی اجازت دی تھی لیکن اسے ایک کھیل اور تماشا بنا لیا گیا ہے آخر کہاں تک اور کن کن امور کو شمار کرایا جائے یہ غم ناک فہرست بڑی طویل ہے۔

درحقیقت اسلامی ہدایات اور دینی اعمال و اخلاق سے ہماری اسی غفلت اور بے پرواہی نے مخالفین اسلام کو یہ حوصلہ دیا ہے کہ وہ ہمارے خالص شرعی معاملات میں مداخلت کریں، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنت اور اسلام کی علامت پر پابندی لگانے کا غیر منصفانہ فیصلہ دیں، اور پھر اس سے بھی اگے بڑھ کر کتاب مقدس "قرآن مجید" کی تعلیم اور اس کے نشر واشاعت پر قانونی بندش لگانے کے لیے عدالتوں کو اکسائیں، ہماری عبادت گاہوں پر قبضہ کرکے اسے مندر میں تبدیل کرنے کا برملا اعلان کریں اور خود ہمارے وجود کو (اس ملک میں جسے ہم نے اپنا لہو دے کر لالہ زار بنایا ہے جس کے چپے چپے پر ہماری قربانیوں کی داستان ثبت ہے) ختم یا بے اثر کرنے کی اسکیمیں بنائی جارہی ہیں، کیا ملت اسلامیہ کے لیے یہ باتیں ایک کھلا چیلنج نہیں ہیں؟ آخر ہماری ایمانی حرارت کس سرد خانے میں سو گئی ہے کہ دن کی روشنی میں کھلے عام ہمارے قانون، ہمارے شعائر اور ہماری مقدس کتاب پر حملے کیے جارہے ہیں مگر ہماری بے حسی اور سرد مہری بدستور قائم ہے اور ہم اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہیں، مسلم عمائدین بالخصوص علمائے دین کے لیے مسلم معاشرہ کی یہ زبوں حالی ایک لمحہ فکریہ ہے اگر آگے بڑھ کر آزادروی اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے اس سیلاب کو روکا نہیں گیا تو پانی سر سے اونچا ہو جائے گا اور پھر ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔

انگریزوں کے ملک پر تسلط کے وقت بھی مسلم معاشرہ کو انھیں جیسے حالات سے گزرنا پڑا تھا اس وقت ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے سینہ سپر ہو کر ان حالات کا مقابلہ کیا اور اس دور کے لادینی سیلاب کے آگے اسلامی درس گاہوں کا مضبوط بندھ قائم کرکے اس بڑھتے ہوئے

طوفان کے رخ کو موڑ کر ملت اسلامیہ کے سفینہ کو بحفاظت ساحل پر لگادیا تھا، بحمد اللہ آج بھی ان اسلامی درس گاہوں کی کمی نہیں بلکہ پہلے کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہم آج بھی ان اسلامی قلعوں سے اپنی مدافعت و حفاظت کا کام لے سکتے ہیں، بس ذرا سی بیداری کی ضرورت ہے، اگر ان اسلامی قلعوں کے سپاہی معاشرے کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو انشاء اللہ کایا پھر سے پلٹ سکتی ہے کیونکہ اس عام بے راہ روی اور غفلت شعاری کے باوجود قوم مسلم میں دینی حمیت و غیرت کی دبی چنگاری ابھی سرد نہیں ہوئی ہے، خواب غفلت میں مدہوش ان شیروں کے اندر ابھی روح حیات باقی ہے، بس ضرورت ہے اک صدائے رحیل کی، ضرورت ہے انھیں اپنے اسلاف کے آئینۂ حیات دکھانے کی اور یہ کام جس خوش اسلوبی سے ہمارے مدارس انجام دے سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں دے سکتا، اگر ارباب مدارس اپنے قرب و جوار کی صرف دس دس بستیوں کو اپنی اصلاحی جدو جہد کا محور بنالیں اور ایک مہم بناکر گھر گھر پہنچ کر مسلمانوں کو حکمت و موعظت کے ساتھ ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں اسلامی احکامات و ہدایات کے فوائد ان کے ذہن نشین کریں تو یقین ہے کہ مسلمان غیر اسلامی تہذیب کی حیات سوز دھوپ سے نکل کر دینی اعمال و اخلاق کے زندگی بخش سائے میں آجائیں گے پھر نہ کسی خاتون پر ظلم ہوگا اور نہ وہ اسلام کے گہوارے کو چھوڑ کر لادینی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹائے گی کہ اسلام مخالف عناصر کو دین میں مداخلت کا موقع ہاتھ لگے اور نہ کسی کور باطن کو یہ جرأت ہوگی کہ امن و آشتی کے خدائی پیغام قرآن مبین پر حرف گیری کرے اور نہ کسی ظالم کو یہ حوصلہ ہوگا کہ ہماری عبادت گاہوں پر نگاہ غلط انداز ڈالے۔

اسی کے ساتھ مسلم قائدین و ملی عمائدین ذاتی و جماعتی مصلحت کوشیوں سے بلند ہوکر حکومت وقت پر یہ بات واضح کردیں کہ اس سیکولر اسٹیٹ اور جمہوری ملک میں دستور اور قانون وانصاف کو نظر انداز کرکے مسلمانوں کے دین ومذہب اور ان کے جان ومال سے یہ کھلواڑ اب کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا، ہم اپنے مذہبی شعائر اور اپنے دستوری حقوق کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے اس لیے حکومت وقت اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے اور انھیں پور کرے، اسکی غفلت شعاری سے اگر ملک کے استحکام میں کوئی رخنہ پیدا ہوگا تو اسکی ذمہ دار صرف حکومت ہی ہوگی۔

کتاب

المسلفیة مرحلة زمنیة مبارکة لا مذھب اسلامی

کا

ایک ورق

ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی [illegible]

سلفیت اور اتباع سلف میں فرق:

گزشتہ دو ابواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان پر بمقتضائے اتباع کتاب و سنت یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے سلف صالحین کے آثار اور طریقے کو رہنما بنائے خود باری تعالیٰ کا ارشاد سورۂ حشر آیت ۷ میں ہے (وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا) (اور رسول تم کو جو دے، لے لو، اور جس سے منع کرے چھوڑ دو) رسول اللہ ﷺ کی سنت اور خلفاء راشدین اور صلحائے امت کی اتباع کا حکم ذیل کی حدیث میں ہے "بدعتوں سے بچو کہ وہ گمراہی ہے اگر کوئی یہ بدعتیں دیکھے تو میری اور میرے خلفاء راشدین مھدیین کی سنت کی اتباع کرے، اسکو دانتوں سے پکڑے" (۱)

دوسری حدیث میں ہے:

"سب لوگوں سے بہتر میرے زمانہ کے لوگ ہیں پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں" (۲)

اس خیریت اور افضلیت کے اعلان کا مطلب یہی ہے کہ انکے نقش قدم پر چلا جائے۔

اسی طرح یہ بھی طے ہو چکا ہے کہ سلف کی نسبت سے، نئے مسلک "سلفیت" کی ایجاد، اتباع سلف سے الگ چیز ہے، دونوں میں کوئی ربط نہیں جیسا کہ مذکورہ بالا جزئیات و مسائل سے

---

(۱) ترمذی کتاب العلم، ابن ماجہ مقدمہ اور ابو داؤد کتاب السنۃ۔

(۲) یہ الفاظ احمد، بیہقی اور ترمذی میں ابن مسعود کی روایت کے ہیں، مسلم شریف میں یہ روایت تقریباً انہی الفاظ میں حضرت عائشہ سے مروی ہے۔

واضح ہے۔ لہذا اس مقام پر پہنچ کر یہ سوال ذہن میں ابھرے گا کہ آج سلفیت کے نام سے جس مذہب کی پیروی کی جارہی ہے اس میں اور اتباع سلف میں فرق ہے تو وہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے اور وہی فرق ہے جو "محمدی" اور مسلمان میں ہے۔ آج کل کچھ محققین و مستشرقین مسلمانوں کو "محمدی" کہنے پر زور لگاتے ہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر اور حقیقی اسلام کی رو سے یہ نام غلط ہے، کیوں کہ "محمدی" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے وابستہ اور آپ کے ذاتی شخصی افکار وخیالات کو مانتے ہیں جب کہ لفظ مسلمان کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کا فرماں بردار اور اسکے احکام کا متبع ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی اس لئے ہے کہ آپ کے ذریعہ احکام الہی معلوم کیے جاتے ہیں آپ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اور مسلمان کو آپ سے محبت، رسول اللہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

"محمدی" اور "مسلمان" میں آپ نمایاں فرق محسوس کررہے ہیں بعینہ یہی فرق، "سلفیت" اور اتباع سلف میں محسوس کرسکتے ہیں سلفیت کا مطلب یہ کہ اسلاف کا کوئی مستقل مسلک تھا، جو انکی شخصیت اور اجتماعی وجوہ کا مظہر تھا، اس مسلک کو اختیار کرنیوالے ہی، اسلام کے ترجمان، اور شرعی حقوق کو پورا کرنے والے ہیں، اس نقطہ نظر سے اسلام انہی حضرات اور انکے مسلک میں قید ہو کر رہ جائے گا، جو اصول ومبادیات اور احکام وآداب ان حضرات کو پسند ہوں، وہی اسلام ہے، اسکے علاوہ امور کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

جب کہ اتباع سلف کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرون ثلاثہ کے جن مخلصین امت کی تعظیم واحترام کا حکم دیا ہے انکا احترام ہو، نصوص فہمی اور اسلامی مبادیات واحکام کے استنباط میں ان حضرات کے بیان کردہ "منہاج" کو پیش نظر رکھا جائے اس صورت میں، اصل اتباع اسلام کی ہو گی اور فہم ودرایت میں اسلام ہی کا "منہاج" محور واساس ہوگا اس محور واساس تک پہونچنے کیلئے یہ حضرات سلف واسطہ اور راہ نما ہوں گے لہذا دین کے منہاج کی پاس داری کرنیوالا بلند مرتبہ ہوگا اور اس کی رعایت نہ کرنے والا دین اسلام کے معیار و میزان کی رو سے دائرہ سلف صالح سے خارج ہوگا، حضرت عمر فاروق نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا کہ هو الذی رفع منهم اناسا و وضع اخرين یعنی جن لوگوں نے اسلامی منہاج ومعیار کو اختیار کیا وہ رفعت وبلندی کے مقام اعلی پر فائز ہوئے اور جنھوں نے اس سے

اعراض کیا وہ ذلت و پستی کے گڑھے میں گر گئے۔

"سلفیت" اور اتباع سلف میں یہی فرق ہے، اتباع سلف عین دین اور سنت مطہرہ کی ایک اہم بنیاد ہے، جس کی دعوت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، جب کہ "سلفیت" ایجاد بندہ ہے شرعی دلیل سے عاری محض خیال آفرینی ہے اور تاریخ سے اس کا کوئی ربط و ثبوت نہیں۔

ابتدائے اسلام کی تین صدیوں میں امت اسلامیہ کے اندر کوئی سلفی مسلک نہیں ملتا جس کے خصوصی امتیازات اور عناصر ترکیبی ہوں اور اس کے ماننے والوں کو کوئی اہم رتبہ و درجہ حاصل ہو کہ دوسرے مسلمان اس سے محروم ہوں، اگر انکا کوئی امتیاز تھا تو صرف یہی کہ ان پر دین کی گہری چھاپ تھی وہ مذکورہ بالا منہاج کی روشنی میں دین کو سمجھتے اور عمل کرتے تھے لہذا جس شخص کے اندر یہ خصوصیت پائی جائے وہ دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہے اسلام کا ایک فرد بلکہ سرگرم رکن ہے، زمان و مکان کی تبدیلی اس میں رکاوٹ نہیں بنے گی، اسکے برعکس جس شخص کے اندر یہ خصوصیت نہیں، یعنی اس نے اسلام سے سرکشی کی اور فہم و درایت میں اسلامی اصول و منہاج سے ہٹ گیا، وہ اسلامی جماعت سے کٹ گیا، تقدم زمانی، امتیاز مکانی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت یا عین عہد سلف کا ہونا، کچھ کام نہیں دے گا اور ہم جانتے ہیں کہ عصر سلف میں بہت سی جماعتیں اور فرقے تھے بلکہ بعض تو اس اخیر دور کے اہل بدعت سے زیادہ خطرناک اور برے تھے اس کے باوصف محض عصر سلف سے وابستگی ان کو کچھ کام نہ آئی۔

اب ہر شخص بڑی آسانی سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ نصوص عربیہ عموماً اور خاص طور پر نصوص قرآن و حدیث کی فہم کے متفقہ اصول و ضوابط کی پابندی اور صحیح و باطل عقائد و نظریات میں تفریق کے "علمی منہاج" کی رعایت کر کے اسلامی جماعت کی دائرہ بندی کی جاسکتی ہے، جو ان اتفاقی قواعد کی پابندی کرے، یا اجتہادی ضوابط میں اجتہاد کرے، اسلامی جماعت میں شامل ہے، خواہ جس دور کا ہو، ہاں اسلاف کی یہ خصوصیت باقی رہے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کی وجہ سے اسلامی مبادیات اور شرعی نصوص پر انکی نظر نہایت پاکیزہ اور صاف تھی اسی وجہ سے اس منہاج کی پابندی اور تفسیر نصوص کے مقررہ ضوابط کی تطبیق کے سلسلہ میں وہ بجا طور پر بعد والوں کے استاذ ہیں جس طرح نحوی و صرفی قواعد کی تحدید، و تطبیق اور تعمیل کے باب

میں متقدمین عرب، ائمہ لغت کے امام واستاذ تھے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

یہاں سے "سلفیت" اور "اتباع سلف" کا فرق بالکل واضح ہوگیا، سلفیت ایک اہم بدعت ہے اور اتباع سلف مذکورہ بالا مفہوم کے اعتبار سے واجب وفرض ہے، احادیث کا تقاضا یہی ہے۔

اگر آج کے سلفی کہلانے والوں کے یہاں روا ہے کہ وہ عصر سلف کو پیش نظر رکھ کر عام مسلمانوں سے الگ تھلگ ایک نئے مسلک کی طرح ڈالیں اور اس کو اپنا امتیاز قرار دیں تو دوسروں کے لئے بدرجہ اوّل روا ہوگا کہ عصر خلفائے راشدین کو پیش نظر رکھ کر وہ بھی ایک نئے مسلک جس کا نام "راشدی مسلک" ہو، کی طرح ڈالیں اور ڈنکے کی چوٹ پر تمام نام نہاد سلفیوں کے سروں پر یہ دلیل گھن کی طرح رکھ دیں کہ حدیث پاک میں سلفی نہیں بلکہ "راشدی" فرمایا گیا ہے، **علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الرشدین المهدیین**...... کیا سلفیوں کے پاس اس کا جواب ہے؟

اسی طرح ایک تیسری جماعت اٹھے گی اور عصر صحابہ کو پیش نظر رکھ کر "مسلک صحابی" کے نام پر نئے مسلک کی طرح ڈالے گی، کیا آپ ان کو روک سکتے ہیں......؟ اور ان میں سے ہر مسلک والا، اپنے مسلک کے تشخص اور حیثیت کو اجاگر کرنے، اور دوسرے تمام مسالک سے ممتاز کرنے کے لئے مختلف فیہ عقائد و مسائل میں سے بہت سی آراء وافکار کو جمع کرکے اپنے مسلک کا ڈھانچہ کھڑا کردے گا، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، اور ہر مسلک والا دوسرے کو بے وقوف اور بدعتی کہے گا، اور انہی اجتہادی آراء وافکار کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرے گا۔

بلاشبہ ہر فریق اس خاص پہلو میں حق بجانب ہے، جس کا الزام دوسرے فریق کو دے رہا ہے کیونکہ ہر فریق ذاتی طور پر اسلام کی صحیح روش اور نہج، جس پر سلف صالح قائم تھے، سے منحرف ہے، خواہ وہ عصر صحابہ وخلافت راشدہ کے ہوں، یا بعد کے بلاشبہ حضرات سلف میں اختلاف ہوا، لیکن کیا انھوں نے ان اختلافات کی بنیاد پر دو دو اینٹ کی مسجدیں بنائیں......؟ مسلمانوں میں فرقہ بندی کی......؟ ہرگز نہیں......! یہ سارے اجتہادی اختلافات اسی منہاج کے دائرہ میں رہتے تھے اور ان سے گروپ بندی کیا ہوتی، ان کا اثر تو اسلامی الفت ومحبت میں پہنچ کر ختم ہوجاتا تھا، اسی لئے سلف میں سے کسی نے دوسرے

مجتہد کو بے وقوف یا بدعتی کہا ہو، اپنی آراء وافکار کے زعم میں کسی نئے مسلک کی بنیاد ڈالی ہو، اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، ایسا ہوتا بھی کیونکر، جب کہ مجتہدین امت کے یہ سارے اختلافات مقررہ منہاج کے دائرہ میں تھے۔

یقیناً کچھ فرقوں نے اس منہاج سے بغاوت کی، اہل سنت وجماعت کے دائرہ سے خروج کیا اور عام مسلمانوں سے ہٹ کر اپنے اپنے افکار وخیالات کی بنیاد پر، جماعتیں قائم کیں جن کی سرشت میں عصبیت، غلو، ہوی پرستی اور انا کی تسکین کا جذبہ تھا۔

شاید کسی کے ذہن میں کھٹک رہا ہو کہ اسلاف نے بھی فقہی مسائل میں اجتہاد واختلاف کیا جس کے نتیجے میں بہت سے فقہی مسالک سامنے آئے، اور کم از کم مذاہب اربعہ کے وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا؟

یاد رہے کہ ان مسالک کی حیثیت بس اتنی تھی کہ یہ چند اجتہادی افکار و آراء کے مظاہر تھے، جو مجتہدین امت کی اپنی اپنی بحث وتحقیق کا ثمرہ ہیں اور شرعاً ہر مجتہد کو اپنی رائے پر عمل کرنا ضروری ہے آگے ان حضرات کے باہمی تعلقات حد درجہ خوشگوار تھے ان میں سے کوئی بھی اسلامی جماعت، یا اجتہاد وتفسیر نصوص کے منہاج کے دائرہ سے خارج نہ تھا، اجتہادی میدان میں ہر ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے اور ہر ایک کو معلوم تھا کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کا مکلف ہے۔

اللہ اکبر......! کہاں تعاون کا یہ پاکیزہ ماحول، اور کہاں وہ لوگ جو چند عقائد واحکام میں اپنی اجتہادی آراء کو مخصوص اسلامی جماعت کا طرۂ امتیاز قرار دیتے ہیں، اور پھر انہی آراء کو ڈھال بنا کر، اپنے تمام مخالفین کے خلاف جنگ چھیڑ دیتے ہیں خواہ فریق مخالف ان تمام اجتہادی اصول وضوابط کا حرف بحرف پابند ہو جو سلف وخلف اور تمام علمائے امت کے مابین اتفاقی ومسلم ہیں۔ گذشتہ صفحات میں اس طرح کے کئی مسائل پیش کیے جاچکے ہیں جن میں کتاب وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اختلاف کی گنجائش ہے بلکہ بہت سے مسائل سلف کے یہاں بھی مختلف فیہ رہے ہیں لیکن اس دور کے نام نہاد سلفی ان مسائل میں جس رائے کو اچھا سمجھتے ہیں، حق اسی میں منحصر کر دیتے ہیں اور دوسری تمام آراء واقوال کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں، انھیں کوئی پرواہ نہیں کہ اصول واضوابط بھی کوئی چیز ہیں اور خود اسلاف کے مابین بھی یہ مسائل مختلف فیہ رہے ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے ان میں اختلاف کی گنجائش نکلتی ہے جو سلفیوں کے گلے سے کسی

طرح نہیں اترتی۔

بہر کیف، "اتباع سلف" (جو اسلام کو سمجھنے اور برتنے کا جز و لاینفک ہے) اور "سلفیت" (جو صحیح اسلامی مفہوم کے لیے ایک نئی چیز، ایک نیا تصور ہے، جس کی سرشت میں مسلمانوں میں تفریق ہے) کے درمیان فرق واضح ہے۔ اگلے صفحات میں اسی امر کے تفصیلی دلائل کا جائزہ لیا جائیگا۔

"سلفیت" بدعت کیوں؟

عہد سلف میں اہل کتاب وغیرہ کے علاوہ بہت سے فرقے ایسے تھے جو خود کو اسلام سے منسوب کرتے تھے لیکن عام علمائے امت کے مابین اسلام کو سمجھنے اور شرعی نصوص کی تفسیر کے "متفقہ منہاج" سے منحرف تھے اس انحراف کے مختلف اسباب تھے جن کا تجزیہ و تشریح سردست ہمارا مقصد نہیں یہ فرقے اسی انحراف کی وجہ سے گمراہ ہوگئے مثلاً معتزلہ خوارج، اور مرجیہ وغیرہ ان تمام فرقوں کی مختلف شاخیں تھیں جن میں سے اکثر کا شیوہ ایک دوسرے کی تکفیر تھی۔

ادیان و فرق کے ان مختلف گروہوں کے بالمقابل اکثریت ان مسلمانوں کی تھی جنھوں نے تفسیر نصوص اور تاویل و اجتہاد کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی فہم و بصیرت کے طریقہ سے ماخوذ "مقررہ مہناج" کی پابندی کی، اور اسی کی بنیاد پر انھوں نے بغیر کسی اختلاف کے "رائے" اور "نصوص" کے درمیان مصالحت و موافقت پیدا کی بلکہ اور دقیق تعبیر میں کہنا چاہئے کہ دونوں میں تطبیق دے دی، اور بجا طور پر ان کو اہل سنت و جماعت کا لقب ملا۔

یہاں ہماری گفتگو کا محور یہی سواد اعظم اور اہل سنت و جماعت ہیں، دوسرے گم کردہ راہ فرقے پیش نظر نہیں۔

سوال یہ ہے کہ امت مسلمہ کے سواد اعظم کو یہ لقب کیوں ملا، کیونکر انھیں اس اسلامی جماعت کا مصداق بننے کا شرف حاصل ہوا جس کا تعارف اور اتباع کا حکم تواتر معنوی کے درجہ کی رواتیوں میں ملتا ہے بعض روایتیں گوش گذار کی جاچکی ہیں۔

اس شرف و امتیاز کی اصل و بنیاد یہی تھی کہ انھوں نے نقل و عقل کے درمیان تطبیق (جس کی نشان دہی تاکید، اور اسی کی اساس پر سچے مسلمانوں کی تربیت خود قرآن کریم نے کی ہے) کے صحیح علمی منہاج، نیز تفسیر نصوص کے عربی قواعد و ضوابط کی پابندی کی اور راہ عمل کے اختیار

کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ذات ان کے لئے عملی نمونہ تھی۔

تو کیا اہل سنت والجماعت اور دیگر گم کردہ راہ فرقوں کے درمیان فرق وامتیاز اور ان کا مذہبی شعار جو انھیں دیگر فرقوں سے ممتاز کرتا ہے ان کی مذہب سلفیت کی پابندی اور اس پر عمل تھا؟...... ہر گز نہیں بلکہ یہ بات ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی، اگر بالفرض وہ ایسا کرتے اور اپنے اجتماعی وجود اور مسلکی انفرادیت کیلئے اس خود ساختہ سلفیت کو بطور امتیازی شعار کے اختیار کرتے تو امتیازی شعار سلف کی ذات ہو گی، تو یہ سارے گمراہ فرقے بھی اس کے دائرے میں آجاتے کیونکہ ہر ایک اس شعار میں رنگا ہوا تھا، یعنی دائرہ سلف میں سب ہی داخل تھے خواہ وہ خود کو اس سے منسوب کرے یا نہ کرے، پھر یہ خود امتیازی شعار سلف کی ذات ہو گی، نہ کہ وہ مسلک جو ان سے منسوب کیا جاتا ہے بلکہ یہی اسلاف اپنے تمام فرقوں اور جماعتوں کیساتھ، نیک وبد اور ہدایت یافتہ وگمراہ میں تفریق کے بغیر اس مسلک کی اصل بنیاد قرار پائیں گے۔

لہذا ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ اس شعار یا اس کی بنیاد پر جس مذہب کو آج رواج دیا جا رہا ہے اس کا صحیح اسلامی جماعت کو عام منحرف فرقوں سے ممتاز اور نمایاں کرنے میں کوئی اثر نہیں، ہاں اگر اس سلسلہ میں کوئی شئے موثر ہے تو وہ صرف، نصوص فہمی اور اصول اجتہاد واستنباط کے اس "جامع منہاج" کی جس کی وضاحت گذشتہ صفحات میں کی جاچکی ہے۔ لہذا اس منہاج کی پابندی کرنے والا، خواہ قرب قیامت کا ہو اہل سنت وجماعت میں ہے، ورنہ قرن اوّل کا ہوتے ہوئے بھی اس سے خارج ہے۔

لہذا اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ "سلفیت" جس کو آج بہت سے حضرات مذکورہ بالا منہاج کا نعم البدل تصور کرتے ہیں، قرون ثلاثہ کے اسلاف کے یہاں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بلکہ ان کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ "سلف" کو شعار بنایا جائے۔

قرون ثلاثہ کے بعد بھی یہ صورت حال باقی رہی کہ کچھ لوگ اس "منہاج" کے حرف بحرف پابند تھے اور کچھ لوگ کلی یا جزوی طور پر اس سے منحرف، طریق اوّل ہمیشہ سے ہی امت کے اس سواد اعظم کے شمار قطار میں رہا جس کو اہل سنت وجماعت کہتے ہیں، اور دوسرے تمام فرقے اس سے خارج، اور اتفاقی منہاج سے کم وبیش انحراف کے اعتبار سے اہل سنت وجماعت سے ان کی دوری کم یا زیادہ رہی۔

لیکن ان تمام صدیوں میں ہمیں کوئی ایسا نہیں ملا جس نے اس منہاج (جو اب تک ہدایت

وضلالت کا حد فاصل تصور کیا جاتا رہا ہے) کے بجائے سلفیت کو معیار وکسوٹی بنایا ہو کہ جو اس معیار پر پورا اترے وہ ھدایت یاب ہے اور جو اس معیار سے گرا ہو وہ بدعت وضلالت کا شکار ہے۔

ہم نے ہر ممکن کوشش کی لیکن تاریخ کے کسی گوشے میں بھی "سلفیت" کا اثر نہیں ملتا، کسی نے آج تک یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ فلاں دور میں مسلمانوں میں دو جماعتیں تھیں: ایک جماعت سلفی کہلاتی تھی، اسکے مخصوص افکار و آراء اور خاص اخلاقی رنگ ڈھنگ تھا: دوسری جماعت اس کے برعکس بدعتی، گمراہ، اور خلفی کہلاتی تھی۔

اگر کچھ ملتا ہے تو صرف یہ کہ ہدایت وانحراف کا واحد معیار، مذکورہ بالا منہاج کی پابندی، یا اس سے اعراض ہے اتباع سلف تمام مسلمانوں کا ایک مجموعی رنگ ہے، اور اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس منہاج کے سمجھنے اور اس صحیح تطبیق کے سلسلہ میں حضرات سلف کے علم وعمل سے مدد لی جائے اس منہاج کے دائرہ میں رہتے ہوئے انھوں نے اختلاف کیا اور اس میں کوئی برائی نہیں تو بعد کے مسلمان جو انھیں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اگر آپس میں اختلاف کرتے ہیں تو کیا قباحت ہے؟ حضرات سلف اپنے اس اختلاف کی وجہ سے اگر پابند شرع، اور گمراہ: دو جماعتوں میں تقسیم نہیں ہوئے تو بعد میں آنے والے اپنے اختلاف کی وجہ سے بدعتی اور سلفی دو گروپ میں کیوں کر منقسم ہو جائیں گے؟!

اس طرح چودہ صدیاں گزر گئیں، لیکن کسی عالم نے یہ نہیں کہا کہ استقامت وہدایت کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان خود کو نام نہاد سلفی مسلک سے وابستہ رکھے، اس کی خصوصیات وضوابط میں خود کو ہضم کرے، ورنہ وہ گمراہ اور بدعتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس "سلفیت" نے کب جنم لیا؟ جس نے پورے عالم اسلام میں جنگ وجدال کا بازار گرم کر دیا، بلکہ بہت سے یوروپین ممالک جہاں لوگ اسلام کو سمجھنے اور قبول کرنے میں دلچسپی لیتے تھے۔ میں تنافس اور ہنگامہ کھڑا کر دیا!

سلفیت کا شعار اول اول غالبًا مصر میں اس وقت سامنے آیا جب برطانوی سامراج کے دور میں دینی اصلاحی تحریک (جسکے علم بردار جمال الدین افغانی، اور محمد عبدہ تھے) پروان چڑھ رہی تھی، گویا یہ تحریک اور یہ سلفی شعار دونوں ایک ساتھ منظر عام پر آئے۔

اس کا سبب خود مصر کے اندرونی حالات تھے، کیوں کہ، جامع ازہر، اسکے علمائے بلکہ مصر کے چپے چپے میں علمی چہل پہل کے باوجود، مصر گونا گوں بدعتوں اور خرافات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا،

مصر بلکہ جامع ازہر کے گوشے گوشے میں، تصوف کے نام پر بلکہ ان صوفیانہ طریقوں کی سرپرستی میں یہ خرافات پروان چڑھ رہی تھیں، جن کا دین سے دور کا واسطہ نہ تھا جن کو شعبدہ بازی بے وقوفی، یا لہو و مستی، اور اباحیت کے سوا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

خود جامع ازہر کی علمی سرگرمیاں رسمی، جامد، اور بے اثر ہو چکی تھیں لفاظی، زبانی مباحثات، قدیم الفاظ و عبارات کے علاوہ ان میں کچھ نہ تھا، زندگی اور حقیقی صورت حال سے لاتعلق، "ازہری" نہ صرف یہ کہ اپنے معاشرہ سے کٹ چکا تھا، بلکہ اصلاح و انقلاب کی اپنی ذمہ داری کا احساس بھی کھو چکا تھا، مزید براں یہ کہ جامع ازہر کے کمرے، راستے اور صحن وغیرہ غلاظت سے بھرے پڑے رہتے تھے جن سے طبیعت میں گھن آتی تھی، اور دل کڑھتا تھا۔

اس المناک صورت حال کی اصلاح کے لئے دو نقطہ نظر سامنے آئے: کچھ حضرات کہتے تھے کہ اسلامی حدود و ضوابط بلکہ افکار و نظریات کو قربان کر کے، مغربی تہذیب کے قافلہ سے مل جانا چاہئے اس میں مسلمانوں کی ترقی مضمر ہے، لیکن کچھ لوگوں کی رائے اس کے برعکس یہ تھی کہ مسلمانوں کے اندر، خرافات و اوہام، اور بدعتوں سے پاک و صاف اسلام دوبارہ زندہ کیا جائے، شیوخ ازہر نے اسلام کو جن چہار دیواریوں میں قید کر رکھا ہے اس سے نجات دلائی جائے، زندگی کے تیز رفتار قافلہ سے اس کو جوڑا جائے اور دوسری تہذیبوں کے ساتھ بقاء باہم کا طریقہ تلاش کیا جائے۔

اس دوسرے فریق اور رائے کے علم بردار شیخ محمد عبدہ، اور جمال الدین افغانی تھے، وہ بڑی محنت و اخلاص کیساتھ مسلمانوں کی اصلاح کا نعرہ بلند کر کے میدان میں کود پڑے۔(۱)

ہر تحریک کا کوئی نہ کوئی شعار ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ اس کا تعارف ہو اور لوگوں کو اس سے وابستہ کیا جائے۔ اس اصلاحی تحریک کے علم برداروں نے "سلفیت" کا شعار بلند کیا، جس کا مقصد حدود و قیود سے آزاد، خرافات و بدعات کی کثافت سے پاک اور مسلمانوں کو سلف صالح کے طریقہ پر گامزن کیا جائے، وہ مصر تھے کہ جب تک اسلامی معاشرہ کو بدعات و خرافات، اور اوہام پرستی کے مرض سے نجات نہیں ملتی، مسلمان، سلف صالح کے طریقہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ اسلام محنت و عمل اور جد و جہد کا دین ہے غفلت کوشی عیش و عشرت، اور رزم گاہ حیات سے کنارہ کشی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔

(۱) دیکھئے: ڈاکٹر محمد حسن کی کتاب "الاتجاهات الوطنية في الأدب المعاصر" ۱؍۳۰۰

ان کی یہ ساری باتیں نہایت عمدہ صدفی صد صحیح، اور حقیقی اسلام کی ترجمان تھیں لیکن ان کو سلفیت کے بجائے کوئی اور نام دیا جاسکتا تھا، اور ان تمام معانی کی نہایت سچی ترجمانی اسلام کے علاوہ کسی اور لفظ سے نہیں ہوسکتی وہ اسلام جو ہر طرح کی بدعات وخرافات اور اوہام سے پاک ہو، لیکن اس تحریک کے علم بردار، اسلام کے دور زریں "عہد سلف" اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کے درمیان موازنہ کرکے مسلمانوں میں دینی غیرت وحمیت کی آگ بھڑکانا چاہتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو عہد سلف سے مربوط کئے بغیر ان کی ترقی وکامرانی کی راہ ہموار نہیں کی جاسکتی۔ اسی جذبہ سے انھوں نے اپنی تحریک کیلئے سلف یا سلفیت کا شعار منتخب کیا۔

انہی حالات واسباب میں سلفیت کے شعار نے جنم لیا، لیکن اسوقت یہ محض ایک تحریک کا عنوان اور اس کے تعارف کا ذریعہ تھا، سلف کی مجاہدانہ زندگی، ان کا صاف ستھرا اسلام اور موجودہ وقت کے عام مسلمانوں کی بدعات وخرافات میں ابتلاء کو یاد دلانا تھا۔ رہا یہ کہ سلفیت کوئی اسلامی مسلک تھا جس سے اس تحریک کے علم بردار وابستہ رہے ہوں، ایسا کچھ نہ تھا، یاد رہے کہ یہ تحریک جس نے سلفیت کا نعرہ بلند کیا، بدعات وخرافا سے اجتناب کی حد تک تو یقیناً اس نے سلف سے قریب جانے کی کوشش کی، لیکن دوسرے بہت سے اعتبارات سے، سلف سے بہت دور تھی۔ (۱)

---

(۱) چنانچہ شیخ محمد عبدہ نے بہت سے مواقع پر جو فتوے صادر کئے سلف کیا، خود اسلامی مبادیات واصول سے بالکل متصادم تھے، مثلاً ان کا یہ مشہور عالم فتاوی: ایک محدود مقدار میں سود جائز ہے، نصرانی ذبیحہ جس طرح سے بھی ہو جائز ہے انگریزی ٹوپ بلا قید وشرط جائز ہے، اور مجسموں کو تراشنا، اور نصب کرنا علی الاطلاق جائز ہے۔ اسی طرح انھوں نے سلف وخلف کے متفقہ اصول تفسیر کو نظر انداز کرکے حسب مصلحت تفسیر کی، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لئے جن فرشتوں کے نزول کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اس سے مراد معنوی طاقت (حوصلہ وجذبہ) اور توفیق الٰہی ہے اصحاب فیل پر غول در غول پرندوں نے سنگ باری نہیں کی اس سے مراد لشکر میں چیچک پھیلنا ہے، (اس کا ذکر پہلے آچکا ہے) انہوں نے بہت سے معجزات او . خارق العادت واقعات کی بھی تاویل کی اس سلفیت کے تحت ان کے تلامذہ بھی انہی کے نقش قدم پر چلے۔

یاد رہے کہ شیخ محمد عبدہ کا دو دور ہے: ایک جیل جانے سے قبل، دوسرا جیل سے نکلنے کے بعد، اپنے پہلے دور میں انہوں نے بلاشبہ نہایت دل سوزی کے ساتھ اسلام کی حمایت کی۔

بدعات وخرافات کے خلاف محاذ جنگ قائم کیا۔ اس زمانے کے ان کے رسائل ومقالات کوٹ کوٹ کر اسلامی غیرت وحمیت سے بھرے رہتے تھے، لیکن جیل سے نکلنے پر ان کی کایا پلٹ چکی تھی، اور وہ مغربی تہذیب وتمدن کے سامنے گھٹنے ٹیک چکے تھے۔ یہ اس لئے کہا جارہا ہے تاکہ ان کے دونوں دور کا امتیاز باقی رہے کسی کو التباس نہ ہو۔

لفظ سلف اور سلفیت نہایت محدود علمی مناسبت سے استعمال ہوتا تھا، مصر کی اس دینی اصلاحی تحریک نے اس لفظ کی اشاعت و ترویج میں، بڑا اہم رول ادا کیا، اور اس صدی کے اوائل میں، یہ لفظ اپنے محدود علمی دائرہ سے نکل کر بہت سے ثقافتی اور معاشرتی حلقوں میں استعمال ہونے لگا بہت سے ماہنامے، کتب خانے اور مطابع اسی نام سے قائم ہوئے مثلاً مصر کا مکتبہ سلفیہ ومطبعہ سلفیہ جن کو شیخ محب الدین خطیب چلاتے تھے اس طرح یہ لفظ عام حلقوں میں گونجنے لگا اور مصر کی دینی اصلاحی تحریک کی طرح اسکے ساتھ بھی عزت احترام کا تصور وابستہ ہوگیا۔

اسی دور میں شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ = ۱۷۰۳ء) سے منسوب، وہابیت، نجد اور جزیرۂ عرب کے اطراف میں پھیلی ہوئی تھی، اسکے اسباب و عوامل معروف ہیں یہاں ان کے تذکرہ کی گنجائش نہیں، اس وہابی مسلک، اور مصر کی دینی اصلاحی تحریک میں قدرِ مشترک یہ تھا کہ دونوں نے بدعات و خرافات خصوصاً تصوف کے نام پر رائج بدعتوں کے خلاف محاذِ جنگ کھول رکھا تھا اسی قدر مشترک پل کے ذریعہ لفظ ''سلفیت'' جزیرۂ عرب میں پہنچا، اور اس نے بہت سے دلوں میں اچھا مقام حاصل کرلیا، دوسری طرف یہ لوگ لفظ وہابیت سے بدکتے تھے، کیوں کہ لفظ وہابیت سے مترشح ہوتا تھا کہ اس مسلک کا مرجع ومنتہاء شیخ محمد بن عبدالوہاب کی ذات ہے ان سے پہلے اسکا کوئی تصور نہیں، یہ چیز انکو کسی طرح گوارانہ تھی، اس لئے انھوں نے وہابیت کو چھوڑ کر ,,سلفیت،، کو اختیار کیا، اور اسی وہابیت کی، سلفیت کے نام سے ترویج شروع ہوئی اس لفظ سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ان کا مسلک شیخ محمد بن عبدالوہاب پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ اسکی کڑیاں سلف صالح سے ملتی ہیں، وہی حقیقت میں سلف کے عقائد وافکار اور اسلام کو سمجھنے، اور برتنے کے طریقہ کے پاسبان ہیں۔

اسی طرح یہ لفظ کسی خاص تحریک کا شعار نہیں خاص مسلک کا لقب ہوکر رہ گیا جس کے ماننے والوں کا مقصد یہ ہے کہ وہی راہ حق، اور سلف کے عقیدہ و مسلک پر ہیں باقی ساری دنیا راہ حق سے ہٹی ہوئی ہے۔

سلفیت بدعت کیوں؟

فرقہ ناجیہ کی وضاحت "اہل سنت وجماعت" یا "مسلمانوں کا سواد اعظم" جیسے الفاظ سے کی جائے تو اس میں معقولیت نظر آتی ہے کیوں کہ اس کی اصل وبنیاد احادیث ہیں، خود حضرات ائمہ اور سلف صالح نے اس امت کو انھی الفاظ سے یاد کیا، لہذا اگر کوئی کہے کہ وہ "اہل سنت و جماعت" میں سے ہے، تو اس نے اپنے لئے کوئی نیا نام منتخب نہیں کیا جس پر قرآن وحدیث کی مہر تائید ثبت نہ ہو بلکہ اس نے اپنا انتساب اس جماعت کے ساتھ کیا، جس کی اتباع کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، وہ جماعت جس کا محور اساسی کتاب وسنت کی اتباع ہے اور نمونۂ عمل خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد صحابہ کرام ہیں۔

لیکن اگر خود کو سلفیت سے منسوب کرے تو بدعت ہے کیوں کہ اگر لفظ سلفیت کا مصداق اہل سنت وجماعت سے ہم آہنگ ہے تو نیا نام رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو سلف کے اجماعی نام کے خلاف ہے۔ اور اس نام کے بدعت ہونے کے لئے کیا یہ کم ہے کہ اس نے مسلمانوں کی صفوں میں ہنگامہ اور بے چینی پیدا کر دی ہے۔

اور اگر سلفیت کا مصداق ومدلول، اہل سنت وجماعت کے مصداق سے الگ ہے اور واقعہ بھی یہی ہے تو اس کا بدعت ہونا خود اسکے لفظ سے اور اسکے غلط مدلول ومفہوم سے ثابت ہے، جو اہل سنت وجماعت جیسے اجماعی نام کے بدلہ الگ امتیاز اور حیثیت ثابت کرتا ہے پھر متحدہ اسلامی جماعت جس پر اہل سنت وجماعت کے لفظ اور مفہوم دونوں کی چھاپ ہے کو منتشر کر کے کسی نئی جماعت کے لیے سلفیت کا عنوان قائم کرنا خود بدعت ہے۔

آج سلفی کون کہلاتا ہے؟ وہی جو مخصوص آراء کا پابند ہو، اور اس کے لئے لڑنے کے لیے تیار ہو، اس کے خلاف زبان کھولنے والا بدعتی وبے وقوف ہے خواہ عقیدہ کا مسئلہ ہو یا فقہ کا یہی حکم ہے اس طرح کے مسائل پر تفصیلی بحث کی جاچکی ہے اور یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ تفسیر نصوص کے متفقہ ضوابط اور اس کا معیار ومنہاج ہی اصل چیز ہے۔ اس کے

دائرہ میں رہتے ہوئے اجتہاد واختلاف، اسلامی جماعت سے خروج کا سبب نہیں، بلکہ ہر مجتہد ماجور ومثاب ہے۔

گذشتہ باب میں بہت سی ایسی آراء وافکار کا تذکرہ آچکا ہے، جو سلفیت کا ڈھانچہ ہے اور ایک سلفی ان کو حق وباطل کی حد فاصل سمجھتا ہے لیکن فی الواقع یہ نصوص کی فہم وتفسیر کے لئے مقررہ منہاج وضابطہ کی تعمیل میں پیدا شدہ چند احتمالات میں سے ایک احتمال ہے مخالف آراء وافکار دوسرے احتمالات پر قائم ہیں اس کے دائرہ سے خارج نہیں۔

اس طرح کے مسائل میں حق اپنی رائے میں منحصر کرکے دوسرے مجتہد کو بدعتی وگمراہ کہنے والا خود بدعتی ہے، اسی نے اسلامی صفوں میں بغض وعداوت کو شہ دی، اور اجتہادی مسائل میں اہل سنت وجماعت کے متفقہ منہاج سے انحراف کیا، حالانکہ ایک زمانہ تک باہم دست وگریباں رہنے کے بعد اسی منہاج پر اہل رائے واہل حدیث متحد ومتفق ہوگئے تھے۔ اور اس منہاج کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کے یہ اختلافات تلاشِ حق کی راہ میں ایک شاندار دوستانہ تعاون کا نمونہ تھا، لیکن یہ سفی سلف کے اس طرزِ عمل سے بالکلیہ برگشتہ ہیں۔

یہ لوگ ذاتی عصبیت اور مسلکی عداوت کی وجہ سے اپنے تمام مخالفین کو بدعت وانحراف کا الزام دیتے رہتے ہیں، سوچنے کی بات ہے کیا بدعت کا اس سے زیادہ واضح اور نمایاں مظہر مل سکتا ہے؟!

تجزیہ: مرزا غلام احمد کے طاعون کی پیشگوئی کا

جس سے اس کا گھر بھی محفوظ نہ رہا

از: محمد اقبال رنگونی مانچسٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم:

انیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ جس سے لوگوں میں خوف وہراس کا پایا جانا ایک فطری امر تھا۔ اس وباء میں بہت سے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب مرزا غلام احمد کو ان حالات کا علم ہوا کہ ملک کے مختلف حصے طاعون کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں تو اس نے دعویٰ کیا کہ میں نے طاعون کے آنے کی پہلے سے خبر دے رکھی تھی سو یہ طاعون خود بخود نہیں آیا بلکہ میں نے اسکے آنے کی دعا کی تھی جو آسمانوں میں سنی گئی اور مبارک خدا نے پورے ملک میں طاعون پھیلا دیا اب اس طاعون سے سارے لوگ تباہ ہو جائیں گے سوائے انکے جو میری نبوت کو مانیں گے۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے کہ قادیان کے سوا کوئی جگہ محفوظ نہ ہو گی اور جب تک میری رسالت کو تسلیم نہ کرلیں ان سے طاعون کا عذاب ختم نہیں کیا جائے گا۔ مرزا غلام احمد نے لکھا کہ

”براہین احمدیہ کے آخری اوراق کو دیکھا تو ان میں یہ الہام درج تھا دنیا میں ایک نذیر آیا اور دنیا نے اسکو قبول نہ کیا پر خدا اسکو قبول کرے گا اور زور دار حملوں سے اسکی سچائی ظاہر کرے گا اس پر مجھے خیال آیا کہ اس الہام میں ایک پیش گوئی تھی جو اس وقت طاعون پر صادق آرہی ہے اور زور دار حملوں سے طاعون مراد ہے“۔ (ملفوظات احمدیہ ج ۷ ص ۵۲۲ مرتبہ منظور الٰہی قادیانی)

یعنی مرزا غلام احمد نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے کسی نے نہ مانا خدا کی غیرت کو جوش آیا اور اس نے کئی سالوں پہلے والا الہام حقیقت بنا دیا۔ مرزا بشیر احمد کا کہنا ہے کہ: خدا کا قاعدہ ہے کہ بعض اوقات اس قسم کی بیماریوں کو بھی اپنے مرسلین کی صداقت کا نشان قرار دیتا ہے اور ان (بیماریوں) کے ذریعہ سے اپنی قائم کردہ سلسلوں کو ترقی دیتا ہے۔ (سلسلہ احمدیہ

ص ۱۲۰ مطبوعہ قادیان ۱۹۳۹ء)

مرزا غلام احمد کا کہنا ہے کہ یہ طاعون خود بخود نہیں آیا بلکہ درحقیقت اس نے خود طاعون پھیلنے کی دعا کی تھی مرزا صاحب نے لکھا حمامۃ البشری میں جو کئی سال طاعون پیدا ہونے سے پہلے شائع کی تھی میں نے یہ لکھا تھا کہ میں نے طاعون پھیلنے کی لئے دعا کی تھی سو وہ دعا قبول ہو کر ملک میں طاعون پھیل گئی (حقیقۃ الوحی ص ۲۲۴۔ ر۔خ۔ج ۲۲ ص ۲۳۵)

مرزا غلام احمد نے یہ دعائیں کی تھی۔ اسکا جواب درج ذیل مرزا صاحب کی تحریر میں موجود ہے۔ طاعون ہماری جماعت کو بڑھاتی جاتی ہے اور ہمارے مخالفوں کو نابود کرتی جاتی ہے ہر مہینہ میں کم از کم پانچسو آدمی اور کبھی ہزار دو ہزار آدمی بذریعہ طاعون ہماری جماعت میں داخل ہوتے ہیں..... اگر دس پندرہ سال تک ملک میں ایسی ہی طاعون رہی تو میں یقین رکھتا ہوں کہ تمام ملک جماعت سے بھر جائے گا بس مبارک وہ خدا ہے جس نے دنیا میں طاعون میں طاعون کو بھیجا تا کہ اسکے ذریعہ سے ہم بڑھیں اور پھولیں اور ہمارے دشمن نیست و نابود ہوں۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۱۳۳ حاشیہ۔ ر۔خ۔ج ۲۲ ص ۵۷۰)

پھر مرزا صاحب کا یہ اعلان بھی تھا کہ جب تک مرزا صاحب کو خدا کا رسول نہیں مانا جائے گا یہ طاعون دور نہیں ہوگا۔ مرزا صاحب نے لکھا:

جب تک وہ خدا کے مامور اور رسول کو مان نہ لیں تب تک طاعون دور نہیں ہوگی۔
(دافع البلاء ص ۵)

یہ طاعون اس حالت میں فرو ہوگی جب لوگ خدا کے فرستادہ کو قبول کر لیں گے (ایضا ص ۸)

یعنی طاعون آئے تو پھر لوگ خوف کے مارے قادیانی ہو جائیں گے اور اپنا گھربار چھوڑ کر سیدھے قادیان چلے آئیں گے کیونکہ قادیان کے طاعون سے محفوظ رہنے کی پیشگوئی تھی اور خدا نے کہا تھا کہ قادیان طاعون سے محفوظ رہے گا۔ مرزا صاحب نے لکھا کہ:

وہ قادر خدا قادیان کو طاعون کی تباہی سے محفوظ رکھے گا تا کہ تم سمجھو قادیان اسی لئے محفوظ رکھی گئی کہ وہ خدا کا رسول اور فرستادہ قادیان میں تھا (دافع البلاء ص ۵۔ ر۔خ۔ج ۱۸ ص ۲۲۶)

سوال پیدا ہوا کہ کیا قادیان طاعون کی لپٹ میں آئے گا؟ مرزا صاحب نے اس کا جواب دیا:

بہر حال جب تک کہ طاعون دنیا میں رہے گو ستر برس تک رہے قادیان اس کی خوفناک تباہی سے محفوظ رہے گا کیونکہ یہ اس کے رسول کا تخت گاہ ہے (دافع البلاء ص ۱۰۔ ر۔خ۔ج ۱۸ ص ۲۳۰)

مرزا غلام احمد نے اعلان کیا کہ اس پر خدا تعالی کی یہ وحی اتری بھی ہے کہ خدا کا وعدہ ہے کہ قادیان میں کبھی طاعون نہیں آسکتا کیونکہ :

خدا نے اس گاؤں کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے (مجموعہ اشتہارات ج ۳ص ۴۰۳)

مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ اسے خدا نے یہ وحی بھیجی ہے۔

ماكان الله ليعذبهم وانت فيهم انه اوى القرية لولاالاكرام لهلك المقام.(۱) (ایضا)

(ترجمہ از مرزا) خدا ایسا نہیں ہے کہ قادیان کے لوگوں کو عذاب دے حالانکہ تو ان میں رہتا ہے اور وہ اس گاؤں کو طاعون کی دستبرد اور اس کی تباہی سے بچالے گا اگر تیرا پاس مجھے نہ ہوتا اور تیرا اکرام مد نظر نہ ہوتا تو میں اس گاؤں (قادیان) کو ہلاک کر دیتا۔

مرزا غلام احمد نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ جو مرزائی مرزا صاحب کی چار دیواری میں آئیں گے وہ طاعون سے بچ جائیں گے۔ مرزا صاحب نے اسکے لئے خدا کی یہ وحی سنائی :

وہ خدا زمین و آسمان کا خدا ہے جس کے علم اور تصرف سے کوئی چیز باہر نہیں اس نے مجھ

---

(۱) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے اس الہام کی عربی پر ایک نظر کریں۔

اکرام کے معنی ہیں عزت کرنا تیری عزت قطعاً نہیں۔ تیری کی لئے عربی میں ك ہے اگر ہم یہاں ك محذوف تصور کرلیں تو پھر عبارت یوں ہوگی: لولاالاکرامك جو صریحاً غلط ہے اسلئے کہ اکرام مضاف ہے اور مضاف پر ال (الف لام) داخل نہیں ہو سکتا اگر ہم ال کو بھی حذف کر دیں تو فقرہ بنے گا لولا کرامت جسکے معنی ہونگے اگر تیرا عزت کرنا نہ ہوتا ظاہر ہے کہ اس فقرے میں بھی کوئی مفہوم موجود نہیں۔

علاوہ ازیں مقام کے لفظی معنی ہیں وہ جگہ جو دو پاؤں کے نیچے ہو یا وہ جگہ جہاں آپ دوران سفر قیام کریں مستقل جائے قیام کو بیت یا دار کہتے ہیں لغت کے لحاظ سے ہر جگہ مقام کہلاتی ہے لیکن اصطلاحاً عرب کسی بستی کو مقام نہیں کہتے اسکے لئے قریہ کا لفظ ہے۔ پھر اہل عرب کی لغت میں ہلاکت کا لفظ جاندار اشیاء کی لئے مخصوص ہے انسان جانور اور پرندے ہلاک ہوتے ہیں نہ کہ پتھر دریا صحرا اور درخت۔ جب عرب یہ کہتے ہیں کہ فلاں بستی ہلاک ہوگئی تو انکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس گاؤں کی اینٹیں اور مکان فوت ہوگئے ہیں بلکہ یہ بسنے والے تباہ ہوگئے ہیں۔ عربی ادب میں ہلک القری (بستیاں ہلاک ہوگئیں) تو ملے گا لیکن ہلک المقام کہیں نظر نہیں آئیگا۔ مقام کا یہ استعمال خالص ہندی ہے۔ تو گویا اس الہام میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی جاتی ہیں۔

(۱) الاکرام کا استعمال غلط اور بے معنی ہے۔

(۲) مقام کا استعمال ہندی ہے۔

(۳) ہلاکت کی نسبت مقام کی طرف عربی محاورہ کے خلاف ہے (حرف مجرمانہ ص ۲۹۶)

پر وحی نازل کی کہ میں ہر ایک ایسے شخص کو طاعون کی موت سے بچاؤں گا جو اس گھر کی چار دیواری میں داخل ہو گا۔ (کشتی نوح ص ۲۔ ر۔ خ۔ ج ۱۹ ص ۲)

مرزا غلام احمد نے اس طاعون کو مخالفین کے لئے عذاب اور خود اپنے لئے رحمت قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ ہمارے لئے طاعون رحمت ہے اور ہمارے مخالفین کے لئے زحمت اور عذاب ہے (تتمہ الوحی ص ۱۳۱۔ ر۔ خ۔ ج ۲۲ ص ۵۶۹ حاشیہ)

مرزا غلام احمد کے مذکورہ بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ طاعون مرزا صاحب کے کہنے پر آیا تھا اور اس نے اس لئے طاعون منگوایا کہ دنیا نے ایک نذیر (یعنی مرزا صاحب) کو قبول نہ کیا تھا۔ سو اب یہ طاعون جہاں جہاں جائے گا مرزا صاحب کے لئے رحمت ہو گا اور انکے مخالفین کے لئے زحمت بنے گا۔ اب سب کی خیر اسی میں ہے کہ وہ قادیان چلے آئیں اور مرزا صاحب کے اپنے گھر میں پناہ لے لیں ورنہ عمریں گزر جائیں گی طاعون جانے کا نام نہیں لے گا اور سب کی جان لے کر چھوڑے گا۔

مرزا غلام احمد کی پیشگوئی تھی کہ قادیان اور اسکا گھر طاعون سے بچا رہے گا آیئے دیکھیں کہ اسکی یہ پیشگوئی کا کیا حشر ہوا اور وہ کس طرح جھوٹی نکلی۔ مرزا غلام احمد نے گو یہ پیش گوئی کر دی لیکن اسے پھر خوف ہوا کہ کہیں یہ رحمت ہمارے گھر پر زوردار حملہ نہ کر دے چنانچہ اس نے دوائیں لے کر روزانہ گھر کی صفائی شروع کر دی۔ قادیانی ڈاکٹر محمد اسماعیل کہتے ہیں:

حضرت مسیح موعود کو خصوصاً طاعون کے ایام میں صفائی کا اتنا خیال رہتا تھا کہ فینائل لوٹے میں حل کر کے خود اپنے ہاتھ سے گھر کے پاخانوں اور نالیوں میں جا کر ڈالتے تھے۔ (سیرۃ المہدی)

مرزا صاحب کا بیٹا بشیر احمد کہتا ہے:

بعض اوقات حضرت گھر میں ایندھن کا بڑا ڈھیر لگوا کر آگ بھی جلوایا کرتے تھے تاکہ ضرر رساں جراثیم مر جائیں اور آپ نے ایک بڑی آہنی انگیٹھی منگوائی تھی جسے کوئلہ ڈال کر اور گندھک وغیرہ رکھ کر کمروں کے اندر جلایا جاتا تھا اور اسوقت دروازے بند کر دیئے جاتے تھے (سیرۃ المہدی ج ۲ ص ۵۹)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ طاعون مرزا صاحب کے حق میں رحمت تھا اور خود انھوں نے خدا سے مانگ رکھا تھا تو پھر اس رحمت کو فینائل لے کر ختم کرنیکی کیا ضرورت تھی۔ پھر جبکہ

خدا نے بتا بھی دیا تھا کہ قادیان اور مرزا صاحب کا گھر طاعون سے بچا رہے گا پھر دوائیں ڈالنا اور اپند ھن جلوانا اور گندھک رکھنا یہ سب کن باتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ مرزا صاحب کو اپنے خدا پر ہی یقین نہ ہو کہ کہیں وہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اسکی پیش گوئی پوری نہ کرے اور خدا کی یہ رحمت سیدھی اسکے گھر چلی آئے۔ یا پھر مرزا صاحب کو اپنی باتوں پر خود بھی اعتبار نہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ یہ سب باتیں بناوٹی ہیں۔ مرزا غلام احمد کو اس رحمت بی بی (طاعون) کا اتنا خوف پیدا ہوا کہ انھوں نے گھر میں گوشت کھانا تک چھوڑ دیا۔ صاحبزادہ بشیر احمد کہتے ہیں جب طاعون کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نے اس (بٹیر) کا گوشت کھانا چھوڑ دیا کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ اس میں طاعونی مادہ زیادہ ہے (سیرۃ المہدی ج ا ص ۵۰)

آپ ہی سوچیں کہ جب خدا نے مرزا صاحب کو بشارت سنادی تھی اور مرزا صاحب خود اسے اپنے حق میں رحمت قرار دے چکے تھے تو اب موصوف پر اس رحمت کا اتنا خوف کیوں مسلط ہو رہا ہے؟ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کے اپنے دل میں چور تھا۔ اور انھیں ہر وقت فکر رہتی تھی کہ کہیں یہ رحمت بی بی انہیں اپنی بانہوں میں نہ لے لے۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ:

اگر کسی کارڈ کو بھی جو وبا والے شہر سے آتا چھوتے تو ہاتھ ضرور دھو لیتے (الفضل قادیان مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

مرزا صاحب نے خدا سے طاعون منگوا تو لیا لیکن اب وہ خود ان کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ یہ طاعون قادیان کے قریب ہو گیا۔ مرزا غلام احمد نے اپنے حکیم دوستوں کی مدد سے طاعون سے بچاؤ کی دوا تیار کرنی شروع کر دی۔ قادیان کے مفتی محمد صادق نے اپنی ایک تقریر میں اس کا ذکر کیا جو الفضل قادیان میں شائع ہوئی اسکا یہ حصہ دیکھئے:

جب ہندوستان میں پیش گوئی کے مطابق طاعون کا مرض پھیلا اور اسکے کیس ہونے لگے تو حضرت مسیح موعود نے اسکے لئے ایک دوا تیار کی جس میں کونین۔ جدوار۔ کافور۔ کستوری مروارید اور بہت سی قیمتی ادویہ ڈالی گئیں اور کھرل کر کے چھوٹی چھوٹی گولیاں بنائی گئیں میں نے دیکھا کہ بعض مخالف ہندو بھی آکر مانگتے تو آپ مٹھی بھر ان کو خندہ پیشانی کے ساتھ عطا کر دیتے (الفضل ۱۴؍ ۱۱؍ اپریل ۱۹۴۶ء)

مرزا صاحب نے طاعون مخالفین کی ہلاکت کے لئے منگوایا تھا ان کو تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ انکی پیش گوئی پوری ہو رہی ہے مگر یہاں معاملہ اسکے برعکس ہو رہا تھا۔ خود مرزا صاحب کو

اپنی فکر پڑی تھی اور مخالفین کو بھی بچانیکی فکر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ تعلی اور دعوے کہاں گئے؟ کیا یہ خدا پر افتراء نہیں تھا؟ یہ بات خدا کی نہیں تھی۔ اس لئے قادیان میں رحمت بی بی (یعنی طاعون) نے قدم رکھ لیا۔ مرزا بشیر احمد اعتراف کرتا ہے کہ قادیان میں سخت طاعون آیا تھا۔ اس نے لکھا قادیان میں طاعون آئی اور بعض اوقات کافی سخت حملے بھی ہوئے مگر اپنے وعدہ کے مطابق خدا نے اسے اس تباہ کن ویرانی سے بچایا جو اس زمانہ میں دوسرے دیہات میں نظر آرہی تھی پھر خدا نے حضرت مسیح موعود کے مکان کے اردگرد بھی طاعون کی تباہی دکھائی اور آپ کے پڑوسیوں میں کئی موتیں ہوئیں۔ (سلسلہ احمدیہ ص ۱۲۲ مطبوعہ قادیان ۱۹۳۹ء)

مرزا بشیر احمد نے تسلیم کیا ہے کہ قادیان میں سخت طاعون آیا اور مرزا غلام احمد کے پڑوسیوں کی موتیں بھی ہوئیں تھیں۔ قادیانی اخبار الحکم نے ۱۰/اپریل ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں لکھا: اللہ تعالیٰ کے امر و منشاء کے ماتحت قادیان میں طاعون، مارچ کی اخیر تاریخوں میں پھوٹ پڑا۔ ۴۔ اور ۶ کے درمیان روزانہ موتوں کی اوسط ہے۔ اخبار اہل حدیث امرتسر نے ۲۲/اپریل ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں خبر دی۔ قادیان میں آج کل سخت طاعون ہے مرزا صاحب اور مولوی نوردین کے ایڈیٹر نے لکھا:

قادیان میں جو طاعون کی چند وارداتیں ہوئی ہیں ہم افسوس سے بیان کرتے ہیں کہ بجائے اسکے کہ اس نشان سے ہمارے منکر اور مکذب کوئی فائدہ اٹھاتے اور خدا کے کلام کی قدر اور عظمت اور جلال ان پر کھلتی انہوں نے پھر سخت ٹھوکر کھائی (بدر ۲۴/اپریل ۱۹۰۳ء)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قادیان میں طاعون داخل ہو چکا تھا اور مرزا صاحب کی رحمت بی بی بہت قادیانیوں کا شکار کر چکی تھی۔ بجائے اسکے کہ قادیانی اس سے عبرت حاصل کرتے اور مرزا صاحب پر دو بول پڑھتے الٹا مخالفوں پر برسنے لگے کہ انہیں عبرت حاصل کرنی چاہیے تھی۔ ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ قادیان میں طاعون کے نہ آنے کی پیش گوئی مرزا صاحب کی تھی یا انکے مخالفین کی؟ کچھ دنوں بعد جب طاعون کی شدت میں کمی آئی تو مرزا صاحب نے لکھا:

آج کل ہر جگہ مرض طاعون زوروں پر ہے اسلئے اگرچہ قادیان میں نسبتاً آرام ہے الخ

(اخبار بدر ۱۹/دسمبر ۱۹۰۲ء)

مرزا صاحب کے اس اعتراف سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے خدا کی یہ بات

غلط ہوئی کہ قادیان طاعون سے محفوظ رہے گا۔ اگر یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تو قادیان کبھی طاعون کا شکار نہ ہوتا اللہ کی بات سچی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے مقبولوں کو کبھی بے عزت نہیں کیا کرتا۔

مرزا صاحب نے بار بار لکھا کہ انہیں خدا نے بذریعہ وحی بتایا ہے کہ قادیان چونکہ اسکے نبی کی تخت گاہ ہے اسلئے وہ محفوظ رہے گا مگر مرزا صاحب کا یہ نادان مرید کس طرح دجل و فریب دیتا ہے اسے ملاحظہ کیجئے اس نے لکھا: قادیان میں طاعون حضرت مسیح کے الہام کے ماتحت برابر کام کر رہی ہے (اخبار بدر ۱۶ مئی ۱۹۰۳ء) حالانکہ لکھنا یہ چاہئے تھا کہ مرزا صاحب کی پیشگوئی کے مطابق قادیان میں طاعون کا نام و نشان نہیں ہے۔ مگر لکھا یہ جارہا ہے کہ قادیان میں طاعون اسلئے اپنا کام کر رہا ہے کہ مرزا صاحب نے قادیان میں طاعون کے آنے کی پیشگوئی کی تھی۔ کیا یہ کھلا جھوٹ نہیں؟ افسوس کہ مرزا صاحب اس پر کچھ نہ بولے اور اپنے مرید کی اس غلط بیانی اور دجل کی داد دیتے رہے کیونکہ اس میں انکا اپنا ہی بھلا تھا۔

پھر مرزا غلام احمد نے کہا تھا کہ جو قادیان میں آئے گا وہ طاعون سے بچا رہے گا اور اب نوبت یہاں تک آگئی کہ خود مرزا صاحب قادیان چھوڑ کر بھاگ آئے اور ایک کھلے باغ میں پناہ لے لی۔ انہوں نے ایک سیٹھ کے نام خط لکھا میں اس وقت تک مع اپنی جماعت کے باغ میں ہوں اگرچہ اب قادیان میں طاعون نہیں ہے لیکن اس خیال سے کہ جو زلزلہ کی نسبت مجھے اطلاع دی گئی ہے اسکی نسبت میں توجہ کر رہا ہوں اگر معلوم ہوا کہ وہ واقعہ جلد اترنے والا ہے تو اس واقعہ کے ظہور کے بعد قادیان واپس چلے جائیں گے بہر حال دس یا پندرہ جون تک میں اسی باغ میں ہوں (مکتوبات احمدیہ ج ۵ ص ۳۹)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قادیان سے طاعون کے ختم ہونے کے باوجود مرزا صاحب قادیان واپس جانے سے ڈرتے تھے کہ کہیں کسی کونے میں رحمت بی بی بیٹھی نہ ہو اور وہ ہلکا پھلکا حملہ ہی نہ کردے۔ مرزا غلام احمد کے کئی مریدوں نے محسوس کیا کہ مرزا صاحب طاعون کے خوف سے قادیان سے بھاگ گئے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ اس قسم کی باتیں کرنے والے بے وقوف ہیں۔ مرزا بشیر الدین کہتا ہے: کئی بیوقوف کہہ دیا کرتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود طاعون سے ڈر کر باغ میں چلے گئے اور تعجب ہے کہ بعض احمدیوں کے منہ سے بھی یہ بات سنی ہے حالانکہ طاعون کے ڈر سے حضرت نے کبھی اپنا گھر نہیں چھوڑا اس وقت

چونکہ زلازل سے متعلق آپ کو کثرت سے الہامات ہو رہے تھے اسلئے۔ الخ (الفضل ۱۱ مئی ۱۹۳۳ء) مرزاصاحب نے خدا سے طاعون کا یہ عذاب اس لئے مانگا تھا کہ مرزاصاحب کی جماعت ترقی کرے اور انکے مخالفین نیست نابود ہو جائیں مگر حالت یہ ہو گئی کہ مرزاصاحب کے معتقدین یکے بعد دیگرے نیست ونابود ہو رہے تھے۔ لاہور کے پیر بخش پنشنر پوسٹ ماسٹر نے مرزاصاحب کے ان خصوصی مریدوں کے نام لکھے ہیں جو طاعون سے مرے تھے۔ موصوف لکھتے ہیں:

بڑے بڑے مرزائی طاعون سے ہلاک ہوئے مثلاً مولوی برہان الدین جہلمی۔ محمد افضل ایڈیٹر البدر اور اسکا لڑکا۔ مولوی عبدالکریم سیالکوٹی۔ مولوی محمد یوسف سنوری۔ عبداللہ سنوری کا بیٹا۔ ڈاکٹر بوڑے خان۔ قاضی ضیاء الدین۔ ملاں جمال الدین سید والہ۔ حکیم فضل الٰہی۔ مرزا فضل بیگ وکیل۔ مولوی محمد علی ساکن زیرہ۔ مولو نور احمد ساکن لودھی ننگل۔ ڈنگہ کا حافظ (تردید نبوت قادیانی ص ۹۶ مطبوعہ جنوری ۱۹۲۵ء)

مرزا قادیانی اپنے مریدوں کی موت سے بہت پریشان تھا چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں اسکی جماعت کی ترقی معکوس میں نہ ہو یہ فتوی جاری کر دیا کہ قادیانی میت کو نہ غسل دیا جائے نہ کفن پہنایا جائے۔ چار آدمی اسکا جنازہ لے کر چلیں اور سو گز کے فاصلے سے اسکی نماز جنازہ ادا کر کے اسے دفن کر دیا جائے۔ فتوی ملاحظہ کیجئے:

جو خدانخواستہ اس بیماری میں مر جائے... ضرورت غسل کی نہیں اور نہ نیا کپڑا پہنانے کی ضرورت ہے۔ چوں کہ مرنے کے بعد میت کے جسم میں زہر کا اثر زیادہ ترقی پکڑتا ہے اس واسطے سب اس کے گرد جمع نہ ہوں حسب ضرورت دو تین آدمی اسکی چارپائی کو اٹھائیں اور باقی سب دور کھڑے ہو کر مثلاً ایک سو گز کے فاصلہ پر جنازہ پڑھیں (مرزاصاحب کا ارشاد مندرجہ الفضل ۲۱ مارچ ۱۹۱۵ء)

سو قادیان میں مرزاصاحب کے مریدوں کے جنازے اٹھ رہے تھے اور لوگ سوالیہ نظروں سے مرزاصاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف مخالفین یہ اعتراض کر رہے تھے کہ خدا کا وہ وعدہ کہاں گیا جس میں قادیان کو اور قادیانیوں کو طاعون سے بچانے کی بشارت سنائی گئی تھی؟ مرزاصاحب کے پاس اسکا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ میت انکے سامنے تھی جنازے اٹھ رہے تھے۔ گھروں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ مرزاصاحب نے مخالفین کے اعتراض کے جواب میں

جو موقف پیش کیا پہلے اسے ملاحظہ کیجئے:

اگر خدا نخواستہ کوئی شخص ہماری جماعت سے اس مرض سے وفات پاجائے تو گو وہ ذلت کی موت ہوئی لیکن ہم پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ کا ہماری جماعت سے وعدہ ہے کہ وہ متقی کو اس سے بچائیگا (ملفوظات احمدیہ ج۷ ص ۲۹۲ مرتبہ منظور الٰہی قادیانی)

مرزا صاحب نے تسلیم کیا کہ طاعون کی موت ذلت کی موت ہے مگر چونکہ قادیانی اس کا شکار ہو رہے تھے اسلئے اسکی یہ تاویل کرلی کہ خدا نے سب قادیانیوں کو بچانے کا وعدہ نہیں کیا صرف متقیوں کو بچانے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن جب اس سے بھی کام نہ بنا تو اب صاف کہہ دیا کہ جو قادیانی اس ذلت کی موت مرتا ہے وہ تو مرزا صاحب کی جماعت میں سے ہی نہیں اسلئے ان پر اعتراض کہاں رہا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مرزا صاحب کہتے ہیں اگر ہماری جماعت کا کوئی شخص طاعون سے مرجائے اور اس وجہ سے ہماری جماعت کو ملزم گردانا جائے تو ہم کہیں گے کہ یہ محض دھوکہ اور مغالطہ ہے کیونکہ طاعونی ثابت کرتی ہے کہ وہ فی الحقیقت جماعت سے الگ تھا۔ (ملفوظات احمدیہ حصہ ۶ ص ۳۵۸)

مرزا صاحب کا یہ بیان قادیانی عوام پر بجلی بن کر گرا۔ انکے گھر ماتم کدہ بنے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب کے لیے لازم تھا کہ مرنے والے قادیانی کے گھر جاتے اور ان کی تعزیت کرتے انہیں تسلی دیتے۔ مرزا صاحب نے سرے سے ہی ان مرنے والے قادیانیوں کو جماعت سے الگ قرار دے دیا۔ آپ ہی سوچیں کہ جن لوگوں نے اپنی زندگی بھر کی کمائی مرزا صاحب کو دیدی تھی اور اپنے خون پسینے کی کمائی سے مرزا صاحب کا گھر پال رہے تھے اگر وہ اس حادثے کا شکار ہوگئے تو محض اپنے جھوٹ کو بچانے کے لیے ان غریب قادیانیوں کو جماعت سے خارج بتانا کیا ظلم وزیادتی نہیں؟ اور کیا ان دکھی گھر والوں پر مرزا صاحب کا یہ ایک اور حملہ نہیں؟ مرزا صاحب کے اس بیان سے کئی قادیانی اکھڑنے لگے اور مرزا صاحب کے چندوں کا سلسلہ کم ہونے لگا۔ جب مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ انکے اس بیان سے کئی قادیانی جماعت سے نکلنے لگے ہیں اور مخالفین سے مل رہے ہیں تو اس نے اعلان کیا کہ جو قادیانی طاعون کی موت کا شکار ہوتے ہیں وہ تو شہید ہیں اور پھر مرزا صاحب نے ان مرنے والے قادیانیوں کو حضور کے شہید ہونے والے صحابہ کے مثل بتادیا۔ مرزا صاحب نے لکھا:

"بعض نادان کہتے ہیں کہ جماعت احمدیہ کے بعض لوگ بھی طاعون سے ہلاک ہوئے

ہیں..... ہم ایسے متعصبوں کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری جماعت میں سے بعض لوگوں کا طاعون سے فوت ہونا بھی ایسا ہے جیسا کہ آنحضرت علیہ کے بعض صحابہ لڑائیوں میں شہید ہوتے تھے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۱۳۱ ر۔خ۔ج۔ ۲۲ ص ۵۶۸)

قادیانی عوام مرزا صاحب کی یہ دورنگی چال دیکھیں۔ کہ پہلے تو یہ کہہ کر قادیانیوں کو تسلی دی گئی کہ طاعون قادیانیوں کے حق میں خدا کی رحمت ہے اور اس سے سلسلہ کی ترقی ہوگی جب کہ مخالفین تباہ ہوں گے۔ مگر جب طاعون سے خود قادیانی فوت ہونے لگے تو مرزا صاحب نے اپنی بات کی لاج رکھنے کے لیے یہ کہا کہ وہ متقی نہیں جب اس سے بھی کام نہ بنا تو صاف کہہ دیا کہ وہ جماعت سے خارج تھے اس لیے وہ طاعون کا شکار ہوئے مگر جب چندوں میں کمی ہونے لگی اور قادیانی مرزا صاحب سے متنفر ہونے لگے تو جھٹ بات بدل دی اور کہا کہ یہ نہ صرف شہید ہیں بلکہ صحابہ کے مثل ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیا اس دو چہرے والے آدمی سے جس کو حدیث میں منافق کہا گیا ہے کچھ بھی خیر کی توقع ہو سکتی ہے؟ بڑا ہی بدنصیب ہے وہ شخص جو ان حقائق کے دیکھنے کے بعد بھی مرزا صاحب کو خدا کا نبی اور اس کا رسول مانے۔ (العیاذ باللہ تعالی)

ہماری مذکورہ گذارشات کا حاصل یہ ہے کہ مرزا صاحب نے قادیان کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی کہ خدا تعالی محفوظ رکھے گا وہ پیش گوئی غلط نکلی اور قادیان میں طاعون پھیل گئی قادیانی اس کا شکار ہوئے اور مرزا صاحب نے قادیان میں طاعون کے آنے کا اقرار کیا ہے۔

رہا یہ سوال کہ کیا مرزا صاحب کا اپنا گھر جسے انھوں نے کشتی نوح قرار دیا تھا اور اسکی تعمیر کے لیے چندہ بھی لیا تھا اس طاعون سے محفوظ رہا؛ مرزا صاحب کے خطوط بتاتے ہیں کہ نہیں۔ اگر انکا گھر محفوظ ہوتا تو وہ گھر چھوڑ کر کبھی باہر نہ جاتے اور نہ اپنے گھر میں دوائیں ڈال ڈال کر اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بچانے کی فکر کرتے۔ مرزا صاحب کا یہ بیان قادیانیوں کے لیے مقام عبرت ہے کہ:

طاعون کے دنوں میں جب کہ قادیان میں طاعون کا زور تھا میرا لڑکا شریف احمد بیمار ہوگیا اور ایک سخت تپ محرقہ کے رنگ میں چڑھا جس سے لڑکا بالکل بے ہوش ہوگیا۔ (حقیقۃ الوحی ص ۸۴، ص۔ر۔خ۔ج ۲۲ ص ۸۷)

مرزا صاحب کے گھر میں یہ طاعون داخل ہوا مرزا صاحب اس کا اعتراف نواب محمد علی خان کے نام ۱۰ راپریل ۱۹۰۴ء کو لکھے خط میں کرتے ہیں:

"بڑی غوثاں (نوکرانی کانام) کو تپ ہو گیا تھا اس کو گھر سے نکال دیا ہے لیکن میری دانست میں اس کو طاعون نہیں ہے احتیاطاً نکال دیا ہے ماسٹر محمد دین کو تپ ہو گیا اور گلٹی نکل آئی اسکو بھی باہر نکال دیا ہے میں تو دن رات دعا کر رہا ہوں اور اس قدر زور اور توجہ سے دعائیں کی گئیں کہ بعض اوقات ایسا بیمار ہو گیا کہ یہ وہم گذرا کہ شاید دو تین منٹ جان باقی ہے اور خطرناک آثار ظاہر ہو گئے۔ (مکتوبات احمدیہ۔ ج۵ ص۱۱۵)

لاہور کے پیر بخش پنشنر پوسٹ ماسٹر لکھتے ہیں:

خاص مرزا صاحب کے گھر میں عبدالکریم اور پیران دتہ طاعون سے ہلاک ہوئے۔ (تردید قادیانی ص۹۲)

مرزا صاحب کو خدا نے بذریعہ وحی بتایا تھا کہ اسکی چار دیواری طاعون سے محفوظ رہے گی لیکن مرزا صاحب کی چار دیواری محفوظ نہ رہی۔ اگر انہیں واقعی اس وحی پر یقین ہوتا تو وہ اپنے نوکر اور نوکرانی کو کبھی گھر سے باہر نہ نکالتے۔ ان دونوں کا طاعون کی لپیٹ میں آنا اور مرزا صاحب کا گھبرا کر دونوں کو نکال دینا واضح کرتا ہے کہ مرزا صاحب کی یہ رحمت بی بی (طاعون) اسکے گھر قدم رنجہ فرما چکی تھی۔ معلوم نہیں مرزا صاحب نے گھر بلائے مہمان کو بار بار نکالنے کی کوشش کیوں کی؟ کیوں فینائل ڈال کر اسے ختم کرنے کی سازشیں کرتے رہے؟

مرزا صاحب کا یہ خوف اور انکی یہ احتیاط اور بچاؤ کی متعدد ترکیبیں ثابت کرتی ہیں کہ مرزا صاحب اپنی پیشگوئی میں جھوٹے تھے۔ اور انھوں نے جھوٹ بول کر اپنے لئے لعنت کا داغ خریدا۔ یہ الفاظ انکے ہیں اور ہم انھی کے الفاظ انھی کے نذر کرتے ہیں۔

"خدا پر جھوٹ باندھنا لعنت کا داغ خریدنا ہے۔ (مجموعہ اشتہارات جلد ۲ ص۴۱۸۔ ر۔خ۔ جلد ۱۵ ص۴۰۹)

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ جو خدا پر جھوٹ باندھکر لعنت کا داغ خریدتا ہے تو کیا یہ داغ اسے نہیں لگے گا جو اس جھوٹ کو نہ صرف یہ کہ مانتا ہے بلکہ اس جھوٹ کو خدا کا مامور قرار دینے سے بھی باز نہیں آتا۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الاَبْصَار۔

گیا دورِ حدیث لن ترانی

محمد بدیع الزماں ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہارون نگر فرسٹ سیکٹر پھلواری شریف پٹنہ

اس مضمون کا عنوان "بال جبریل" کی درج ذیل رباعی کا ایک مصرعہ ہے:۔

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی
گیا دور حدیث لن ترانی
ہوئی جسکی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی ، وہی آخر زمانی

اقبال نے یہ رباعی نعت رسول ﷺ میں لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دیدار کی درخواست کی تھی مگر اللہ نے اس کے جواب میں "لن ترانی" فرمایا۔ کیونکہ اللہ کو اس بات کا علم تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود اشتیاق تاب دیدار نہیں لا سکتے تھے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی مگر قبول نہ ہو سکی جب کہ حضور انور ﷺ کی شان یہ ہے کہ بغیر درخواست کے، معراج کے موقعہ پر دولت دیدار سے سرفراز فرمایا گیا۔ اس لئے اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات یعنی شرائع موسوی کا دور ختم ہو گیا اور اب دور اس نبی کی شرع کی پیروی کا ہے جس نے کائنات اور حیات کے اسرار و رموز کو کھول کھول کر بیان فرمایا ہے اور جو اب امامت عادلہ کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ اس رباعی کے پہلے مصرعہ میں اقبال کا اشارہ ایسی آیات کی طرف ہے۔

"ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا، جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔ لہذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو، کفران نعمت نہ کرو، (البقرہ، ۱۵۰ تا ۱۵۲)

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:۔

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے"۔(آل عمران، ۱۶۴)

سورۃ الاعراف کے رکوع ۱۳ تا ۱۹ میں خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بنی اسرائیل کو جس میں آپ ﷺ مبعوث کئے گئے تھے بیان فرمایا ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام و فرعون، موسیٰ علیہ السلام اور سامری، لن ترانی کا واقعہ اور توراۃ عطا کئے جانے کے قصے شامل ہیں مگر آخر میں سامری کے قصہ کو لے کر جب ایک زلزلے نے آگھیرا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رحم کی درخواست کی تو اس قصہ کو ختم کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر یمان لائیں گے،(الاعراف، ۱۵۶)

مگر موقع کی مناسبت سے فوراً ہی بیان کا رخ بدل کر بنی اسرائیل کو حضرت محمد ﷺ کے اتباع کی دعوت ان الفاظ میں دی گئی:

"(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی امی (ﷺ) کی پیروی اختیار کریں جسکا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندش کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

ایک اور موقع پر اس پیروی کی وجہ یہ بھی بیان فرمائی گئی ہے:

"دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے" "تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے" (التوبہ، ۱۲۸)

اگر اقبال اس رباعی کے دوسرے مصرعہ میں یہ کہتے ہیں کہ: "گیا دورِ حدیث لن ترانی" تو وہ ایسی ہی آیات کی طرف دھیان مبذول کراتے ہیں اور یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں

۔ چونکہ سورۂ یونس کی آیت ۴۷ میں ارشاد ہے کہ:

"ہر امت کے لیے ایک رسول ہے" اس لیے اب چونکہ امامتِ عادلہ کے منصبِ جلیلہ سے بنی اسرائیل کو ان کی نااہلی اور عہد کی پاسداری نہ کرنے کی وجہ معزول کر کے امت محمدی کو فائز کیا گیا ہے لہٰذا اب اس امت کے رسول محمد ﷺ کی پیروی امت مسلمہ پر لازم ہے۔ امت کا لفظ قرآن میں محض قوم کے معنی میں نہیں آتا بلکہ ایک رسول کی آمد کے بعد اس کی دعوت جن جن لوگوں تک پہنچے وہ سب اس کی امت ہیں۔ نیز اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ رسول ان کے درمیان زندہ موجود ہو، بلکہ رسول کے بعد بھی جب تک اس کی تعلیم موجود ہے اور ہر شخص کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن ہو کہ وہ در حقیقت کس چیز کی تعلیم دیتا تھا سب لوگ اس کی امت ہی قرار پائیں گے اور اس وقت تک رہیں گے جب تک قرآن اپنی خالص صورت میں شائع ہوتا رہے گا۔ اس وجہ سے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ:

"ہر قوم میں ایک رسول ہے" بلکہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ "ہر امت کے لیے ایک رسول ہے"

"حدیث لن ترانی کہہ کر اقبال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خدا تعالیٰ کے درمیان ایک گزرے ہوئے واقعہ کی بھی یاد دلائی ہے جس میں "لن ترانی" کی بات آتی ہے۔ فرمایا گیا ہے:۔

"جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ: "اے رب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں" فرمایا: "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا" (لن ترانی) "ہاں، ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ! اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا" چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا: پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں" (الاعراف ۱۴۳)

دوسری جانب حضور انور ﷺ کی شان یہ ہے کہ بغیر التجا کے آپ ﷺ کو شرف دیدار بخشا گیا۔ فرمایا:۔ "پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے" (بنی اسرائیل ۱)

پھر اسی پر اکتا نہیں فرمایا بلکہ اس حد تک شرف قربت عطا کیا کہ:

"وہ سامنے آ کھڑا ہوا جب کہ وہ بالائی افق پر تھا، پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی

پہنچائی جو وحی اسے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کو اترتے دیکھا جہاں پاس ہی میں جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرۃ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ (النجم، ۷ تا ۱۸)

زیر تجزیہ رباعی کا تیسرا مصرعہ، ''ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار'' اس حدیث سے ماخوذ ہے :۔ (کنت نبیا وآدم بین الماء والطین) (میں اس وقت مرتبہ نبوت سے سرفراز ہو چکا تھا جب آدم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے) اقبال اس مصرعہ میں، اس حدیث کے پس منظر میں یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ مجد و شرف کے لحاظ سے حضور انور ﷺ کی خودی سب سے پہلے مقام نبوت پر فائز ہوئی تھی لیکن زمانہ کے لحاظ سے آپ سب انبیاء کے بعد آئے۔ زیر تجزیہ رباعی کے چوتھے اور آخری مصرعہ : ''وہی مہدی، وہی آخر زمانی'' میں مہدی سے ذات مہدی مراد نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کا وصف آخر الزماں ہونا مراد ہے۔ ارشاد ہے: ''(لوگو)، محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے'' (الاحزاب، ۴۰)

نگاہ عشق و مستی میں، وہی اول، وہی آخر وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

(بال جبریل، غزل ۱۔ دوم)

''حدیث لن ترانی'' کی ترکیب سے ان ہی معنوں میں کلام میں کل دو اشعار ہیں۔ دوسرا شعر ''ارمغان حجاز'' کی ایک رباعی کا یہ ہے ؂

نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز سزا وار حدیث لن ترانی

صرف ''لن ترانی'' سے اقبال کے کلام میں کل تین درج ذیل اشعار ہیں جو علی الترتیب ''بانگ درا'' کی نظم ''خفتگان خاک سے استفسار'' کے آخری بند اور اسی مجموعہ کی غزلیات حصہ اول کی دسویں غزل اور ''ضرب کلیم'' کی نظم ''خاقانی'' میں ہیں :۔

دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی

ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

خاموش ہے عالم معانی کہتا نہیں حرف لن ترانی

• • •

"حج" عالمی سیاحت کا اہم محرک

اور کچھ سیاحوں کے تذکرے

(محمد خالد حسین قاسمی معین مدرس دارالعلوم دیوبند)

انسان فطری طور پر تحرک پسند واقع ہوا ہے آمد و رفت اور سیر و سیاحت اس کی سرشت میں داخل ہے۔ انسان کے دل میں طبعی طور پر یہ خواہش ابھرتی ہے کہ وہ ایسی جگہوں کی سیر کرے، جو اس کے لئے نئی ہوں، ایسی مبارک سر زمین اور مقدس عبادت گاہوں کی زیارت سے مشرف ہو، جو اسکے کے لئے قابل صد احترام ہوں، ایسی عمارتوں کا جائزہ لے جو اپنے اندر عروج وزوال کی تاریخیں چھپائی ہوئی ہوں، ایسے کھنڈرات کو پرکھنے کی کوشش کرے، جو سینکڑوں تہذیب و تمدن کے امین ہوں، ایسی وادیوں، پہاڑوں آبشاروں اور مرغزاروں کا مشاہدہ کرے اور اسکے دلچسپ اور سحر انگیز مناظر سے لطف اندوز ہو جو نیرنگی قدرت کے عظیم شاہکار ہیں۔ اسی وجہ سے سیاحت پرانے زمانے سے ہی انسانوں کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے، ایک ملک سے دوسرے ملک ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک خطے سے دوسرے خطہ کی آمدرفت کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ اسی سیاحی نے مختلف قابل قدر علوم وفنون کو جنم دیا، جس میں جغرافیہ (علم مساحت الارض) تاریخ، وقائع نویسی، سفر نامے اور آپ بیتی جیسے علوم لطیفہ اہمیت کے حامل ہیں۔

سیاحوں نے جس محنت ومشقت کے ساتھ بے شمار قوموں، لاتعداد طبقوں، ان گنت خطوں اور اس میں بسنے والے قبیلوں کے احوال ان کے رہن سہن کے طریقوں، ملکوں اور اسکی رنگا رنگ ثقافت اور متنوع تمدن کا جائزہ لیا ہے اور اقوام وملل کی خوبیوں اور خرابیوں کا جس طرح گہرائی گیرائی اور باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، شاید ہی یہ کسی اور طبقہ کے حصے میں آیا ہو۔ نہیں سیاحوں کی بدولت بہت سی ایسی قوموں [illegible]

بارے میں اگر ان ریکارڈوں سے صرف نظر کرلیا جائے تو۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ قومیں بھی روئے زمین پر اپنا وجود رکھتی تھیں!!

• خود قدیم ہندستان کے تہذیبی نقوش اور اس میں پائی جانے والی قوموں کے احوال اکثر وبیشتر ایک مشہور چینی نژاد بدھسٹ سیاح ہیونگ شیانگ (۵۹۶ء) کے مرہون منت ہیں، جس نے انتہائی جانفشانی کے ساتھ ۶۳۰ء تا ۶۴۵ء یعنی مکمل پندرہ سال کے طویل عرصے تک ہندستان میں صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کرکے قدیم ہندستان کے ایک غیر ترقی یافتہ عہد کو تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لئے ثبت کردیا۔ اسے دوران سفر ہولناک قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، ڈاکوؤں اور قزاقوں کے پنجے میں بھی گرفتار ہونا پڑا، لیکن اس نے حق جویائی ادا کرنے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔

دوسری طرف جب ہم سیاحت کے اسباب اور اس کے محرکات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس سلسلے میں مذہبی جذبات کو سب سے عظیم محرک پاتے ہیں۔ مذہبی اماکن، مقدس مقامات او رتاریخی جگہوں کی زیارت کا داعیہ ہی ایک ایسی چیز ہے، جو بالعموم انسان کو سیر وسیاحت کے لئے رخت سفر باندھنے پر آمادہ کرتی ہے، چنانچہ اگر پوری دنیا کے مقدس مذہبی مقامات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح دور دراز ممالک کے سیاح ان مقامات پر پروانے کی طرح گرتے ہیں۔ ہندستان میں بودھ گیا، نالندہ میں پائی جانے والی بودھوں کی عظیم یونیورسٹی کے کھنڈرات، کنیا کماری اجودھیا، ہری دوار، اجمیر، دہلی، بھونیشوار کشمیر وغیرہ ایسے مقامات ہیں جو مختلف العقائد سیاحوں کے لئے بے انتہا کشش رکھتے ہیں۔ خود مذکورہ عظیم چینی سیاح بھی ایک مذہبی داعیہ کے تحت ہی ہندستان آیا تھا۔ مؤرخ اسلام اکبر شاہ نجیب آبادی ھیونگ شیانگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ پنجاب و گجرات سے بنگال واڑیسہ تک اور کوہ ہمالیہ سے مہاراشٹر تک پھرا اسکا مقصد سفر ہی مذہبی عالموں سے ملنا تھا، اس نے اپنے سفرنامے کو خوب شرح وبسط سے لکھا۔ وہ نالندہ کی خانقاہ میں سیکڑوں ودیار تھی اور پاٹھک دیکھتا ہے وہاں بطور تبرک خود بھی طلبہ کے ساتھ شامل ہو کر ایک دو سبق پڑھتا ہے اور اگر کوئی بے دین اسے مباحثہ کرنے کے لئے چیلنج دیتا ہے تو ہیونگ شیانگ اسکے مقابلے کو نکلتا ہے" (آئینہ حقیقت نما ص ر ۸۷)

دیگر قوموں کے برعکس مسلمانوں کے اندر سیاحی کی صفت سب سے زیادہ پائی جاتی

ہے، اس لئے کہ خدائے تعالیٰ اور اسکے برگزیدہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے بار بار مسلمانوں کو سیر وسیاحت کی ترغیب دلائی۔ ارشاد باری ہے **قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المجرمین (النمل ۷۹)** یہ آیت کریمہ واضح انداز میں سیاحت فی الارض کی ترغیب دلارہی ہے تاکہ انسان گھوم پھر کر گزری ہوئی قوموں کے انجام کو دیکھے اور اس سے عبرت ونصیحت حاصل کرے، کبھی مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے سیاحت پر آمادہ کیا گیا، کبھی دعوت وتبلیغ کی غرض سے اور کبھی تعلیم وتعلم کی غرض سے چنانچہ اسی حقیقت کے پیش نظر یہ کہا گیا ہے: **اطلبوا العلم ولو کان بالصین** (علم حاصل کرو چاہے اس کے لئے تمھیں ملک چین جیسے دور دراز علاقے کا سفر کرنا پڑے)

ان تمام ترغیبی کلمات کے علاوہ، مسلمانوں کے اس جذبہ سیاحت کو ایک ایسے فریضہ خداوندی نے سرمدی شوق میں تبدیل کردیا، جو اسلام کے چوتھے اور اہم ترین رکن کے ساتھ ساتھ اپنے جلو میں صفت سیاحت کو بھی لئے ہوئے ہے۔ دنیا کا ہر مسلمان۔ چاہے اسکا تعلق کسی بھی خطے یا کسی بھی ملک سے ہو۔ حج جیسے عظیم الشان فریضے کو ادا کرنے کا ہمہ وقت خواہشمند اور محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ کو دیکھنے کے شوق میں بسمل بنا رہتا ہے۔ اور اپنے اس شوق کی آگ کو بجھانے کے لئے پوری زندگی کوششیں کرتا رہتا ہے اور زندگی کے جس مرحلے میں بھی اسباب سفر مہیا ہوجائیں: وہ موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور دور دراز علاقے "بیت اللہ الحرام" کی زیارت کے لئے پابرکاب ہوجاتا ہے، اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نداء عام "**واذن فی الناس بالحج**" پر لبیک کہنے کا جذبہ سفر کی تمام مشکلات کو اسکی نگاہ میں ہیچ بلکہ اس راہ کی تمام تکلیفوں کو راحت بنادیتا ہے۔ اور کیوں نہ ہوں جب کہ خلیل اللہ نے اپنے پروردگار سے اس مقدس سرزمین کے لئے دعائیں کرتے ہوئے کہا تھا **فاجعل افئدة من الناس تهوی إليهم** (ابراہیم ۳۷) یعنی اللہ! کردے بعضے لوگوں کے دل کہ مائل ہوں انکی طرف۔ خدائے کریم نے اپنے نبی کی دعا کو قبول فرمایا اور اس نداء کو پوری دنیا میں عام کرنے اور تمام روحوں تک پہنچانے کی ذمہ داری لیتے ہوئے یہ خوشخبری سنائی **یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق (الحج ۲۷)** یعنی آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے آئیں گے آپکی طرف پیدل چل کر اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر، چلے آئیں گے دور دراز علاقوں سے۔

خدا جانے حسن ازل کے کتنے شیدائی یہاں آئے اور چلے گئے اور محبوب نادیدہ کے کتنے طلب گار اسکو ڈھونڈھنے آئے اور واپس پھرے آج بھی تمام دنیائے اسلام میں سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اس در پر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں ان زائرین حرم میں ایسے بھی شہید جستجو ہوتے ہیں جنھیں ذوق طلب اور علمی رغبت اس امر پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ دنیا بھر کے تمام اسلامی مشاہد، زیارت گاہ اور آثار قدیمہ کی زیارت کریں اور اپنی قوم وملت کی عظمت رفتہ کے بکھرے ہوئے نقوش کو دیکھ سکیں اور اس آئینے میں روشن ماضی کی طرح، تابناک مستقبل کی بھی تصویر دیکھ سکیں اور اس طلب کو حقیقت کا جامہ پہنانے اور اس خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لیے، وہ اس وقت تک ہفت خوان تحقیق کی اسیری کرتے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ دنیا کے گوشے گوشے کونہ چھان ماریں۔ اور اس وقت تک گھر لوٹنے کی نہیں سوچتے جب تک کہ انہیں سیر وسیاحت اور تحقیق واکتشاف سے واقعی سیر چشمی حاصل نہ ہو جائے۔

ان کے اندر یہ جذبہ بھی ہوتا ہے کہ محبوب حقیقی کے مادی بارگاہ میں انہیں جو کچھ بھی نظر آیا وہ دوسروں کو بھی دکھائے، جو اس نے سمجھا وہ دوسروں کو بھی سمجھائے اور جو اس پر گزری وہ دوسروں کو بھی سنائے۔ لیکن کوئی اس نہ ختم ہونے والی داستان کو کس طرح سنا سکتا ہے؟ زبان میں وہ طاقت کہاں جو تجلیات ربانی کو بیان کر سکے! مجبوراً وہ قلم وقرطاس کا سہارا لیتا ہے اور آغاز سفر سے انتہا تک جو کچھ اس پر بیتی ہے اسے رقم کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ ان آثار قدیمہ اور مقامات مقدسہ کے احوال کو بھی قلمبند کرتا ہے جنھیں دوران سفر دیکھتا ہے۔ اور اس لذت کی بھی عکاسی کرنا چاہتا ہے جو کعبہ شریف، مسجد نبوی اور روضۂ اقدس کو دیکھ کر حاصل ہوتی ہے۔ لیکن سب کچھ لکھنے کے بعد بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ قلم بھی اس کا ساتھ دینے سے قاصر ہے!

مشاہدات نگاری کا یہ سلسلہ کوئی آج سے نہیں بلکہ سینکڑوں سال سے تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اور صدیوں سے ہزاروں صاحب قلم حاجی ہر سال اپنے مشاہدات وتاثرات کو حوالہ قرطاس کرتے رہے ہیں۔ اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حج کس طرح سے نفع بخش علمی تصنیف وتالیف کا اہم ترین ذریعہ بنا رہا ہے، اور صرف حج کی وجہ سے مشاہدات ارضی کے کتنے عظیم الشان ذخیرے کا ہر سال دنیا میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں جو بھی بڑا سے بڑا سیاح گزرا ہے ان سب کے طلب کی اصلی منزل اور روح کا کعبہ مقصود بھی یہی

مقدس سرزمین تھی۔ اپنے وطن سے حج وزیارت کی غرض سے نکلے، راستے کے عجائب وغرائب، شہروں اور ملکوں کے دلکش مناظر، تہذیبوں کی رنگارنگی اور قوموں کے عجیب وغریب احوال کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس خطۂ پاک میں پہونچے۔ فرائض سے فرصت پائی تو اور آگے کا راستہ لیا، دنیاجہاں کی سیر کی، ایک ایک کا جائزہ لیا اور پھر موقع ملا تو اسی مرکز پر لوٹ کر آگئے۔ اور پھر دوسری سمت کو نکل گئے اور جو خود دیکھا وہ دوسروں کو بھی دکھانے کی کوشش کی۔

ابن حوقل بغدادی، حکیم ناصر خسرو بلخی، اسطخر فارسی، ابن جبیر اندلسی، ابن بطوطہ مغربی اور بیسیوں نامور سیاح اس قسم کے گزرے ہیں، جنھوں نے اپنے سفر کا آغاز حج وزیارت کی نیت سے کیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد جب شوق میں اضافہ ہوا تو کچھ اور دیکھنا چاہا۔ اس طرح جب سیر وسیاحت کی چاٹ لگ گئی، تو دنیا کے گوشے گوشے کو چل پھر کر دیکھا اور اپنے مشاہدات وتجربات کو سفر نامے کی صورت میں قلمبند کرتے رہے۔

خدا جزائے خیر دے ان سیاحوں کو (جنھیں ایک سفر حج نے ہمیشہ کے لیے سیاح بنادیا اور) جنھوں نے انتہائی جانفشانی کے ساتھ اسلامی لائبریریوں اور علمی مراکز کو مختلف زبانوں میں ایسی وجد آفریں تحریروں اور گراں قدر تصانیف اور سفر ناموں سے مالامال کردیا کہ اگر حج کا مبارک سفر نہ ہوتا شاید معلومات کا یہ گراں مایہ خزینہ کبھی بھی صفحہ قرطاس پر ظاہر نہ ہوتے۔ اور وارفتگی وخود فراموشی کے ہزاروں واقعات دنیا میں رونما ہی نہ ہوتے۔

ان تمام سیاحوں کا تذکرہ جن کی سیاحی کا بنیادی سبب اور اصلی محرک حج بیت اللہ بنا کچھ آسان کام نہیں؛ بلکہ اس کے لیے تو ایک مستقل کتاب ہی نہیں بلکہ کتابوں کے ایک سلسلے کی ضرورت ہے۔ تاہم پیش نظر تحریر میں تین ایسے بڑے سیاح جنھیں خدائے تعالیٰ نے بار بار بلد امین کے مرکز پر لوٹنے کی سعادت نصیب فرمائی؛ یعنی ناصر خسرو، ابن جبیر اور ابن بطوطہ کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حکیم ناصر خسرو:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کا اس طرح اسیر ہوتا ہے کہ اپنے خالق ومالک سے کٹ کر دنیاوی لذتوں اور اس کے عیش وآرام ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے، لیکن پھر بھی اسے

حقیقی راحت حاصل نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اسے اپنے وجود سے بھی نفرت سی ہونے لگتی ہے اور قلبی طور پر ایسی تکلیف وہ ندامت محسوس کرتا ہے جو اسے بالآخر توبہ پر آمادہ کرتی ہے خود کردہ گناہوں پر نادم اور پشیمان انسانوں کے لیے توبے کی بہترین شکل یہ ہے کہ وہ حج کے لیے پابرکاب ہوجائیں اور خدائے ذوالجلال کی عظیم جلوہ گاہ تک پہونچ کر سچے دل سے توبہ کریں. گناہوں پر روئیں، گڑگڑائیں اور گناہوں سے پاک ہو کر اپنی کتاب زندگی کا ایک نیا باب وا کریں۔

مشہور فارسی سیاح ناصر خسرو بھی اپنی ابتدائی زندگی میں انہیں احوال سے دوچار رہے، ان کی پیدائش چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں بلخ کے شہر میں ہوئی۔ وہ طبعی طور پر سیاحت پسند واقع ہوئے تھے، جس کی وجہ سے انھوں نے آگے چل کر عالم اسلام کے اکثر حصوں کی سیاحت کی اور مشرق و مغرب کے دور دراز ممالک کا سفر کیا۔ شروع میں وہ حکومت سلجوقیہ کے ایک اہم ترین عہدے پر فائز تھے اور بڑے ہی عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک دن وہ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک حسین و وجیہ شیخ ان کے سامنے کھڑے ہیں اور انہیں اس بات پر آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ اپنی پرعیش زندگی کو خیرباد کہہ دیں اور توبہ کرنے اور اپنے کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے حج کے ارادے سے جلد از جلد مکہ مکرمہ پہونچیں...... ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ خواب اسی احساس کے زیر اثر دیکھا ہوگا جو ان کی غافلانہ زندگی کی وجہ سے ان کے دل و دماغ میں موجزن تھا۔ اس خواب کی تعبیر واضح تھی اور نفس کی غلاظتوں اور گندگیوں کے دھلنے کا اچھا موقعہ سامنے تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس شیخ وجیہ کی دعوت پر لبیک کہا۔ جسے انھوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ اور سوئے حرم روانہ ہوگئے۔ دوران سفر انھوں نے جزیرۃ العرب کے مسلمانوں کے احوال کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ جس نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے احوال سے بھی آگاہی حاصل کریں جب ان کی وطن واپسی ہوئی تو سیاحی کے شوق نے انھیں اپنے وطن میں زیادہ ٹھہرنے نہیں دیا بلکہ فوراً ہی ایران سے مصر کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ اور مصر کے تمدن و ثقافت کا بھی حسب عادت باریک بینی سے مطالعہ کیا، اور اپنے احساسات کو پورے انصاف کے ساتھ سفر نامے کی شکل میں قلمبند کیا۔ جو اس وقت سے آج تک ہر اس مصنف کے لیے بنیادی مرجع بنا ہوا ہے؛ جس نے مصر کی فاطمی حکومت کے زمانے کی ثقافت اور تمدن وغیرہ کے حوالے سے

کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے کہ انھیں دوسرے امور کے بنسبت تمدنی نقوش، تعلیمی ارتقاء میل میلاپ، رہائش کے طور طریقے اور دیگر اجتماعی امور سے زیادہ دلچسپی تھی: اور وہ ان چیزوں کے بیان میں بھی دلچسپی کا ثبوت دیتے ہیں۔

جب کہ ان کے معاصرین کی کتابوں میں ان چیزوں کا تذکرہ اس انداز میں نہیں ملتا؛ جس وقت نظری کے ساتھ ناصر خسرو ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ فاطمی دور کا ایک تاریخ نویس وہاں کی سیاسی صورت حال کی اچھی نقشہ کشی کرتا ہے، مگر اس میں ایک قسم کی تشنگی ہوتی ہے اور ایسی چیزوں کے اضافے کی ضرورت ہوتی ہے، جسے ہم صرف ناصر خسرو کے پاس پاتے ہیں۔ اسی لیے تمدن نویس مورخوں نے بنیادی طور پر انہیں کو قابل اعتماد شمار کیا ہے اور ان کے سفر نامے کا متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔

ناصر جزیرۃ العرب کے اجتماعی تعلقات اور انسانیت نوازی پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اسی ضمن میں وہ "احساء" نامی جگہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی انسانیت دوستی کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں "احساء" کے باشندے دوسروں کی خیر خواہی اور کرم گستری میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ اجتماعی کفالت مندی اور آپسی انسانی تعاون میں اعلاء درجے پر فائز ہیں۔ ان میں اگر کسی کا پڑوسی تنگ دست ہوتا ہے تو دوسرا فوراً قرض دے دیتا ہے تاکہ وہ اپنی معیشت کو سدھار سکے، اور ضرورت پوری ہونے کے بعد بلا سود کے روپے واپس لے لیتا ہے۔ اس لیے کہ سود کی حرمت (اسلامی تعلیمات سے قربت کی وجہ سے) ان کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ وہ شہر کے فقراء و غرباء کے ساتھ نرم روی کا معاملہ کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی کا گھر گر جائے تو گھر کی از سر نو تعمیر میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی غریب الدیار مسافر ان کے ہاں پہونچ جائے تو ان سے اعراض نہیں کرتے، بلکہ ان کی بھی اخلاقی اور مالی ہر اعتبار سے مدد کرتے ہیں اور ضیافت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، یہ تمام صفات خیر ان میں صرف اس وجہ سے ہیں کہ وہ قرآن کریم، احادیث رسول ﷺ، صحابہ اور خلفاء راشدینؓ کے عمل کو اپنے لیے نمونہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک انسانی بھائی چارگی، آپسی تعاون اور ایک دوسرے کی عزت و احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ (مستفاد: از سفر نامہ حکیم ناصر علی خسرو، فارسی)

ابن جبیر اندلسی:

ابن جبیر الاندلسی دوسرے اہم اسلامی سیاح ہیں؛ جنھیں خداوند کریم نے ایک دوبارہ نہیں بلکہ مکمل تین بار اپنے مبارک گھر کی زیارت اور اسلام کے اہم ترین فریضہ حج کی ادئیگی کا شرف عطا کیا۔ انھیں اس کا بھی موقع ملا کہ اس زمانے کے حرمین شریفین کے کبار علماء کے سامنے زانوئے تلمذ طے کریں۔

حج بیت اللہ کی غرض سے ان کے جو اسفار ہوئے وہ امت کے لیے علمی اور تحقیقی اعتبار سے قابل قدر اور نفع بخش ثابت ہوئے۔ اس لیے کہ انھوں نے اس کا بہت زیادہ اہتمام کیا کہ وہ عالم اسلام کے تمام اہم مقامات کے احوال کو تفصیل کے ساتھ قلم بند کریں؛ جن کی انھوں نے سیاحی کی۔ اور انہیں اپنے فرض کی ادائیگی کا موقع بھی خوب ملا۔

یہاں پر ان کے صرف ایک اہم تاریخی بیان کے نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے؛ جس میں انھوں نے مکہ مکرمہ کے اندر ماہ رمضان المبارک کا اہتمام، اس کے لیے کی جانے والی غیر معمولی تیاریوں کے حوالے سے اپنے مشاہدات کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس میں ایسی اہم باتیں تحریر کی ہیں جو اس مقدس ترین سرزمین میں رمضان کی قدردانی اور اس کے شایان شان اہتمام کے تعلق سے ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس سے اس کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابن جبیر کس نوعیت کی چیزوں پر اپنی نگاہ رکھتے ہیں۔

ابن جبیر اندلسی کے زمانے میں اہل مکہ کا رمضان المبارک میں ایک خاص معمول ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ رمضان کے اخیر عشرے کی تمام راتوں میں حرم شریف کے اندر مکمل قرآن کریم کے ختم کرنے کا اہتمام کیا جاتا، اور قرآن کا پڑھنے والا مکہ کا کوئی ایسا نوعمر طالب علم ہوتا جس نے اسی سال قرآن کریم کا حفظ مکمل کیا ہو۔ اور تمام لوگ پورے اطمینان کے ساتھ تلاوت سنتے رہتے۔ اسی نوعیت کی ایک مجلس ختم قرآن میں ابن جبیر بھی شریک ہوتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں ایک مجلس جمی ہوئی ہے اور اس میں مکہ مکرمہ کے ایک صاحب ثروت گھرانے کا نوعمر طالب علم قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے، تمام لوگ ہمہ تن گوش ہوکر اس روح پرور مجلس سے لذت آشنا ہورہے ہیں۔ چاروں طرف روشن شمعیں بکھری ہوئی ہیں، جنھیں ایک خاص انداز سے شاخوں کے

نند بنایا گیا ہے، اس میں مختلف قسم کے پھل اور پھول بھی بنائے گیے ہیں۔اس مجلس کے اختتام روسط حرم میں ایک محراب رکھا جاتا ہے، ایک نوعمر طالب علم وہاں آتا ہے اور لوگوں کو تراویح کی ماز پڑھاتا ہے پھر وہ منبر پر براجمان ہوتا ہے، اسکے قریب بعض قراء بھی آکر بیٹھ جاتے ہیں جو وگوں کو قرآن کریم کی تلاوت محظوظ کرتے ہیں جب وہ تلاوت سے فارغ ہو جاتے ہیں تو وہ بچہ کھڑا ہوتا ہے اور تیاری کے مطابق نصیحت آموز تقریر کرتا ہے بچے کی اس حوصلہ مندی اور جرأ تمندانہ عمل سے بچہ کے والد، چچا اور دیگر رشتہ داروں کو بے انتہا خوشی و مسرت ہوتی ہے، رمضان کے اخیر عشرے کی راتوں کا ہر روز یہی سحر انگیز سماں ہوتا ہے لیکن ۲۷ستائیسویں شب کو (جو کہ ظن غالب کے مطابق لیلۃ القدر بھی ہے) تو اس رونق میں چار چاند بلکہ کچھ زیادہ ہی چاند لگ جاتے ہیں، اس لیے کہ اس رات میں قاضی مکہ بذات خود لوگوں کی امامت کرتے ہیں۔اور صلوۃ تراویح کے بعد فاضلانہ تقریر بھی کرتے ہیں۔

یہ تو رہے ابن جبیر کی زبانی مکہ مکرمہ کے وہ مناظر جو رمضان میں ہوتے ہیں۔اسی طرح ذی الحجہ میں مکہ کی حسن آفرینیوں کو بیان کرتے ہوئے بھی اپنے بیان میں وہ جدّت اختیار کرتے ہیں جو دوسروں کے ہاں مفقود ہے۔چونکہ ابن جبیر اندلسی کے اسفار اس زمانے میں ہو ے ہیں جب کہ صلیبی جنگیں زوروں پر تھیں اور مرد مجاہد و مرد آہن سلطان صلاح الدین ایوبی علیہ الرحمہ عیسائیوں سے نبرد آزما تھے، اس لیے ابن جبیر وہاں دیکھتے ہیں کہ حجاج کرام نہایت ہی گریہ وزاری کے ساتھ کعبہ کے پردے سے چمٹ کر صلاح الدین ایوبی اور مسلمانوں کے لیے صلیبی جنگوں میں فتح کے واسطے دعائیں کرتے ہیں۔

اور جب خطیب حرم مکی اپنے خطبے میں سلطان صلاح الدین کی فتح کے لیے دعا کرتے ہیں؛ تو اس دعاء پرکہی جانے والی آمین کی آوازوں سے پوری مسجد گونج اٹھتی ہے اور دلوں میں رقت طاری ہو جاتی ہے۔اس لیے کہ صلیبی جنگ کی وجہ سے حاجیوں کو بڑی فکر لاحق رہتی تھی۔چونکہ راستہ غیر مامون اور پر خطر تھا، اور بعضوں کو خطرناک حالات کا سامنا ہوتا تھا اور حاجیوں کے قافلے صلیبی قزاقوں اور ڈاکوؤں کے حملے کا شکار ہو جاتے ہیں اس موقع پر سلطان کی فوجیں ہی حاجیوں کی مدد کے لیے پہونچی تھیں۔

(مستفاد از "رحلۃ ابن جبیر")

ابن بطوطہ :

بلاشبہ ابوعبد اللہ محمد بن عبداللہ ابن بطوطہ کو اسلامی تاریخ کا ایسا سب سے بڑا سیاح قرار دے سکتے ہیں جنھیں حج کے ایک سفر نے ہمیشہ کے لیے سیاح بنادیا سیر وسیاحت میں جو شہرت اللہ تعالیٰ نے ابن بطوطہ کو عطا کی ہے وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔ انھوں نے دوسروں کے بالمقابل روئے ارضی کو کہیں زیادہ گھوم پھر کر دیکھا، ان کی پیدائش شمالی افریقہ کے شہر طبخہ میں مورخہ ۱۷ر رجب ۷۰۳ھ مطابق ۱۳۰۴ء کو ہوئی اور ۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۷ء میں وفات پائی۔ ابن بطوطہ نے اپنی زندگی کا تقریباً آدھا حصہ یعنی مکمل تیس سال سیاحت میں گذارے، اس عرصے میں انھوں نے تقریباً ۷۵۰۰۰ میل کا سفر طے کیا۔ اس اعتبار سے ان کی سیاحت کا دائرہ بھی سب سے زیادہ وسیع ہے۔

خدائے تعالیٰ نے انھیں نظر خاطف، منظر کش نگاہ اور عقل دانا سے نوازا تھا؛ جس چیز کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کی تہہ تک پہنچ گئے اور فکر بینا کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی صحیح اور مکمل منظر کشی کی اور واقعے کا شاندار تحلیل و تجزیہ پیش کیا۔ اور اپنے زمانے کے لحاظ سے جب کہ فن سیاحت کو اتنا فروغ نہیں ملا تھا جتنا کہ بعد کے زمانے میں ملا اور اس قدر سہولیات بھی مہیا نہیں تھیں جس قدر سائنسی انقلاب کے بعد مہیا ہوئیں۔ انھوں نے بڑی خوبی اور پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مزید یہ کہ ابن بطوطہ اپنے زمانے کو خود اپنے قلم سے بڑی ذمہ داری کے ساتھ مرتب کرتے ہیں، اور جہاں کا سفر کرتے ہیں وہاں کی اخلاقیات، معاشیات اور بادشاہ کا اپنی رعایا کے ساتھ سلوک اور حکومت کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً:

۷۳۴ھ میں ابن بطوطہ دہلی پہونچتے ہیں اور عرصہ دراز تک وہاں قاضی کی حیثیت سے مقیم رہتے ہیں۔ یہ زمانہ سلطان محمد تغلق کی حکومت کا ہے۔ وہ اپنے سفرنامے میں سلطان کے بارے میں لکھتے ہیں ”اس سلطان کی صفتِ سخاوت تمام صفات پر غالب ہے۔ میں نے اس کی سخاوت کے برابر کسی پہلے سلطان کا حال نہیں سنا، یہ سب سے زیادہ عدل کو ملحوظ رکھتا ہے اور متواضع و منکسر المزاج ہے“۔ دوسری جگہ دربار سلطانی کے احوال کو بیان کرتے ہوئے یوں

رقمطراز ہیں:

"سلطان محمد تغلق کے دربار میں جب کوئی شخص آتا اور سلام کرنے کی جگہ پر پہنچتا ہے۔ تو نقیب بلند آواز سے کہتا ہے بسم اللہ۔ اور اگر یہ شخص ہندو ہوتا، تو نقیب بجائے بسم اللہ کے ہداک اللہ کہتا"۔ تیسری جگہ سلطان کی مذہبی رواداری اور ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ اسکے سلوک کو یوں بیان کرتے ہیں:

"کسی ہندو امیر نے قاضی صاحب کے یہاں نالش کی کہ سلطان نے میرے بھائی کو بے سبب قتل کیا ہے۔ قاضی نے سلطان کی طلبی کا حکم نامہ جاری کیا۔ سلطان قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا اور جب تک قاضی نے بیٹھنے کا حکم نہیں دیا، برابر کھڑا رہا۔ قاضی نے فریقین کے بیانات سنے، آخر وہ ہندو امیر اپنے بھائی کے خون سے دست بردار ہو گیا۔ اور جب تک قاضی نے اجازت نہ دی سلطان قاضی کی عدالت میں ٹھہرا رہا"۔

ابن بطوطہ ایک سیاح ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب دل اور بڑے سخی تھے۔ جس کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے جو کہ انھوں نے ہندوستان میں ۷۴۲ھ کے قحط عظیم کے بارے میں لکھا ہے: "مفلسی اور لوگوں کی تہی دستی دیکھ کر پانچ سو محتاج لوگوں کا میں بھی کفیل بن گیا، دونوں وقت ان کو کھانا کھلاتا اور ان کے رہنے کے لیے بھی مجھے ایک بڑا مکان بنوانا پڑا تھا"۔ ظاہر ہے کہ دس بیس نہیں بلکہ مکمل پانچ سو کی کفالت صاحب دل ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

ابن بطوطہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ رب ذوالجلال نے اپنے جلوہ گاہ کی زیارت سے پورے چار مرتبہ انہیں مشرف کیا اور چار مرتبہ انہیں حج کرنے کی سعادت حاصل ہوئی: سیر و سیاحت کرتے ہوئے مکہ پہنچے، حج کی ادائگی کی اور کسی دوسری سمت کی راہ لی، گھوم پھر کر دوبارہ مکہ پہنچے، اپنے شوق کی چنگاری کو بجھایا، پھر کہیں اور چلے گئے............ اسی وجہ سے ان کی زندگی پر حج کا گہرا چھاپ ہے۔

چنانچہ جب وہ اپنے سفر نامے میں اس مقدس سرزمین کا تذکرہ کرتے ہیں تو لفظ لفظ سے عقیدت و محبت کے وہ چشمے پھوٹتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی اپنے اندر بیخودی محسوس کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی سیر چشمی کے ساتھ وہاں کی ایک ایک چیز کو ذکر کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ دنیا میں کون سی ایسی جگہ ہے جو مکہ سے زیادہ قابل تقدیس اور

کون سا خطہ ہے جو حجاز سے زیادہ لائق احترام ہو سکتا ہے؟ اور کون سا ایسا منظر ہو گا جو حج سے زیادہ پر رونق اور اثر انگیز کہلا سکتا ہے؟

ابن بطوطہ بطحائے مکہ؛ اس کی پہاڑیاں، دروازے، سڑکوں، محلوں اور ریگ زاروں میں سے ہر ایک کے احوال کو ذکر کرتے ہیں۔ خصوصاً حرم مکی کی تو ایسی منظر کشی کرتے ہیں جسے روح کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ مسجد حرام کے طول و عرض، اس کی وسعت، چھت کی اونچائی اور ستون کی لمبائی وغیرہ کی حد بندی بھی کرتے ہیں۔ اور کعبہ شریف، میزاب رحمت، حجر اسود، مقام ابراہیم، رکن یمانی، رکن عراقی، چاہِ زمزم اور حرم شریف کے اردگرد کے مکانات کی بھی جذب و طرب کے ساتھ انوکھے انداز میں نقشہ پیش کرتے ہیں۔

اسی طرح وہ اہل مکہ کے اخلاقی احوال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اہلِ مکہ نیک خو، سخی اور بہت ساری خوبیوں کے مالک ہیں۔ مفلوک الحال لوگوں، محتاجوں، ضعیفوں اور بیواؤں کی خبر گیری اور پرورش کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مردم شناسی میں بھی وہ ممتاز ہیں۔ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ ان کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دلیمے میں سے دوسروں سے پہلے فقرا اور غرباء کو کھلاتے ہیں۔ اور کھلانے سے پہلے بڑے عزت و احترام کے ساتھ انہیں مدعو کرتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی نرم روی کا معاملہ کرتے ہیں۔ پھر وہ انہیں خوبیوں کو ذکر کرتا ہے جو ناصر خسرو نے اہل احساء کے سلسلے میں کیا۔

حج اور اس کے شعائر کے ذیل میں ابن بطوطہ شرح و بسط کے ساتھ ان تمام ثقافتی سرگرمیوں کو بھی بیان کرتے ہیں جنہیں اہل مکہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حج کے مہینوں کے استقبال کے طور پر کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ موسم حج کی تشہیر کے لیے صبح و شام دُف بجایا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ تک مسلسل جاری رہتا اسی تاریخ میں حرم مکی شریف کے خطیب محترم منبر پر جلوہ افروز ہو کر مناسک حج اور اس کے احکام کے سلسلے میں فصیح و بلیغ تقریر فرماتے۔ علاوہ ازیں موسم حج کے آغاز پر اہل عرب کے درمیان شمع فروزاں کرنے میں مقابلہ آرائی بھی ہوتی تھی؛ لیکن بالعموم اس سلسلے میں اہلِ شام دوسرے

عرب ممالک کے باشندوں پر فوقیت لے جاتے تھے۔

اسی طرح ابن بطوطہ منیٰ، عرفات، مزدلفہ، صفا، مروہ میں اپنی حاضری کے احوال کے ساتھ ان تمام اکابر علماء اور مشائخ کا بھی مختصراً تذکرہ کرتے ہیں، جو اس سال حج بیت اللہ اور روضۂ اقدس کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔ اور ان تمام چیزوں کے بیان میں وہ کمال کی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ (مستفاد از "رحلۃ ابن بطوطہ")

یہ مختصر تذکرہ ہے ان شیدائیوں کا جنھیں جلوہ گاہ الٰہی کی بے پناہ کشش نے ایک مرتبہ کھینچا تو اپنی پوری زندگی کو اسی محور کے گرد گھومنے میں کھپا دیا۔ اور یہ مختصر سی منظر کشی ہے اس حسین تصویر کی جس کی عکاسی میں ہر زمانے کے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں صاحب دل اہل قلم نے ان گنت صفحات کالے کر دیے۔ اور اسی نے ان میں سے بعض کو پوری دنیا کی عکاسی پر مجبور کر دیا اور جنھوں نے اپنے پر جوش قلم سے انسانی تاریخ میں۔ صرف حج کی وجہ سے۔ ایسے نقوش کا اضافہ کیا جو مدتوں پژمردہ دلوں کو گرماتے رہیں گے۔

حج کے عالمی سیاحی کے عظیم ترین محرک ہونے کے مواقع موجودہ زمانے میں ہر زمانے سے زیادہ ہیں۔ اس لیے کہ اب پہلی جیسی تنگی نہیں رہی نہ سفر کی پریشانی۔ جدید سائنسی انقلاب اور تیز رفتار ذرائع سفر کی ایجاد نے سابقہ تمام مصائب کو سہولت سے بدل دیا۔ اب مسلمانان عالم کے لیے ایک ایسی مقدس سرزمین کی زیارت مشکل نہ رہی، جس کی خاک کا ذرہ ذرہ مسلمان کے لیے کحل الجواہر بنانے کے قابل ہے۔ اور ایک ایسے خطے کے دیدار سے شوق حسرت کی چنگاری کا بجھانا بہت آسان ہو گیا، جس کے تئیں ہر مسلم دل کی یہ صدا ہے ؎

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است ای خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی

۴۴- ایک عجیب قصہ :

عبدالغنی بن حسین جزری جو ابن القلد کے نام سے معروف و مشہور تھے وہ تجارت کی غرض سے ملکوں ملکوں میں گئے ، گھومے پھرے ، ہندوستان اور اسکے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی گئے ، ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "ابن الجزری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ ریشم کی خریداری کے لئے بافیانس گئے ، اسی علاقہ کے ایک گاؤں میں شام ہو گئی ، ان کے ساتھ ان کے سفر کے ساتھی بھی تھے اس لئے گاؤں سے باہر ہی مسجد میں رات گذارنے کے لیے گئے ، رات کے وقت اس مسجد کے پیش امام صاب عشاء کی نماز پڑھانے کے لئے آئے ، اور عشاء کی نماز پڑھائی اسکے بعد ان سب کو شیر سے آگاہ کیا اور ہوشیار کرتے ہوئے کہا کہ "اگر مجھے پہلے ہی تمہاری آمد کا علم ہوتا تو میں تمہیں یہاں رات گذارنے سے منع کرتا کیوں کہ یہاں تو ہر رات کو وہ شیر آتا ہے اور یہیں رہتا ہے (قصہ کے راوی خود کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر) ہم نے لکڑیاں ایندھن کے لئے لیا تاکہ آگ جلا کر اسے تاپیں گے ، بس آگ جلانے اور اسے تاپنے لگے ، ہمارے ساتھ ایک (سواری کا) گدھا بھی تھا ، اسے ہم نے مسجد کے دروازہ کی کنڈی میں باہر باندھ دیا ، اتنے میں وہ شیر بڑبڑاتے ہوئے آیا ، اسے دیکھ کر گدھا ڈرا اور اپنے سر سے کو زور سے دھکا مارا اسکی وجہ سے دروازہ کھلا ، گدھا مسجد کے اندر گھس آیا ، اسکے پیچھے شیر بھی مسجد میں داخل ہو گیا ، پھر گدھا مسجد سے باہر نکلا ، اور اسکے نکلنے کی وجہ سے دروازہ بھی بند ہو گیا ، رات بھر

شیر ہمارے ساتھ وہیں رہا لیکن جو آگ ہم نے جلا رکھی تھی اسکی وجہ سے وہ ہمارے اوپر حملہ نہیں کرپارہا تھا، یہاں تک کہ صبح ہوگئی تو وہی (محلہ کے) امام صاحب آئے اور انہوں نے دروازہ کو دھکادے کر کھولا ہی تھا کہ شیر ان پر حملہ کر بیٹھا اور انھیں پکڑا اور لے کر ،چل پڑا، اور وہ چیختے چلاتے رہے، اور یہی وقت ان کی زندگی کا آخری موقع اور لمحہ تھا اور اسکے بعد ہم وہاں سے صحیح وسالم نکلے۔

۲۵- عبدالکریم بن یحییٰ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

۷۰۳ھ میں وہ "شیخ الشیوخ" کے مقام پر اس وقت فائز ہوئے جب کہ شیخ صفی الدین الہندی نے ذی قعدہ کے مہینہ میں اس عہدہ اور منصب کو چھوڑ دیا تھا۔

-: اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صفی الدین ہندیؒ بھی دمشق میں مقیم تھے بلکہ شیخ الشیوخ تھے مگر ان کے تفصیلی حالات یہاں نہیں ہیں، شاید آئندہ جلدوں میں ذکر ہو۔

۲۶- نصیحت آمیز اشعار:

(۱) انسان مر جائے گا، اس طرح سے کہ اسکے جسم کے اعضاء ایک ایک کرکے فنا ہوجائیں گے، اور اسکے بعد اسکی پوری روح یک لخت ختم ہوجائے گی۔

(۲) لہٰذا اے مخاطب! درازیٔ عمر سے تو کسی دن بھی خوش اور فرحاں مت ہو اگر یہ عمر لہو ولعب، کھیل کود اور غفلت ورنگ ریلی میں گذر رہی ہو۔

(۳) تو بلا تاخیر اللہ سبحانہ کے حضور توبہ کرو، اور نفس پرستی کو دور پھینک، اور شیطان ملعون پر پوری طرح حملہ کر، کامیاب ہو جاؤ گے۔

۲۷- بھیانک قحط سالی:

عبیداللہ بن محمد الہاشمی الفرغانی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

ان کی وفات تبریز میں ہوئی، اور اسی سال میں خراسان، عراق، فارس، آذربائی جان، دیار بکر میں سخت مہنگائی ہوگئی تھی یہاں تک ناقابل بیان حد تک پہنچ گئی تھی۔

مارے قحط سالی کے کہیں باپ نے اپنے بیٹے کو کھایا اور کہیں بیٹے نے باپ کو کھایا، بازاروں کے کھلے عام آدمیوں کے گوشت فروخت ہوئے اور یہی حالت چھ ماہ تک جاری رہی،

اس زمانہ میں پورے علاقہ کے اندر سب سے (خوش حال) اہل تمریز ہی تھے۔

اللہ اللہ رونگٹے کھڑے کردینے والا واقعہ ہے اللھم احفظنا من الآفات و البلیات، وآتنا من جمیع الحسنات فی الدینا والآخرۃ آمین۔

۲۸- تیس مرتبہ بخاری شریف پڑھی :

عثمان بن محمدؒ المالکی نزیل مکہ معظمہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ :

وہ فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے بخاری شریف تیس مرتبہ پڑھی اور ان کے شیوخ کی تعداد تقریباً ہزار تک پہنچ گئی ہے اور بہت کثرت سے حدیث بیان کیا ہے سب طرف سے یکسو ہوکر مکہ معظمہ میں عبادت و ریاضت میں ہمہ تن مشغول ہوگئے تھے، اصول میں ان کی تصنیف بھی ہے۔

بہت اچھی سمجھ اور فہم کے مالک تھے، ان کا محاضرہ (یعنی بیان) بڑاہی دل آویز ہوتا تھا، ربیع الآخر ۱۳۷ھ میں انتقال فرماگئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

۲۹- امانت داری کی نادر مثال :

عثمان بن ابی العالی التنوخی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ :

آپ بڑے انصاف پرور تھے، کامل طور پر بلند کردار تھے، بہت زیادہ امانت دار تھے، صدقہ اور تلاوتِ قرآن پاک کے نہایت پابند تھے، حضرت عزالدین الخفاجیؒ کی امانت کو امانتداری کے ساتھ واپس کیا جس کی وجہ سے اس خاص صفتِ امانتداری میں بڑی شہرت کے مالک ہوگئے، وہ "تجریدہ" میں نکلے تھے کہ اسی میں انتقال ہوگیا، تو ان کے پاس جتنا کچھ رکھا تھا وہ سب ان کے ورثاء کو واپس لوٹادیا اور اس مال کی کل مقدار ساٹھ ہزار دینار تھی۔

ساٹھ ہزار سونے کے مہروں کو ورثاء کو واپس کرنا اس امت کی امانتداری کی نادر مثال ہے، یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کے دل میں یوم الحساب اور اللہ تعالیٰ شانہ کے سامنے کھڑے ہونے کا مضبوط تصور ہو۔

۳۰- فی البدیہہ شعر کہنے والا شاعر:

عثمان بن ابی النوق المعری شاعر کے بارے میں ہے کہ وہ برجستہ شعر کہنے کی قدرت کے مالک تھے، صرف مقفی و مسجع انداز میں ہی گفتگو کرتے تھے، وہ دمشق آگئے پھر وہاں سے حلب گئے اور ان ممالک کی خاک چھانی، ابن فضل اللہ نے بیان کیا ہے، انھوں نے ان کے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھی توانہوں نے برجستہ یہ اشعار کہے اسطرح جیسے وہ بات کررہے ہوں۔

میں تم کو دیکھ رہاہوں کہ کوئی ایک کو دیکھ رہے ہو۔

جس کے شروع حصہ پر کچھ سونا لگاہوا ہے، اسکے شروع میں سے کچھ روپئے اگر تم خرچ کرنا چاہو تو علم وادب والوں سے اسکے لئے کچھ دینار کو خرچ کروگے۔

۳۱- ایک عالم کا استغناء:

عضد بن قاضی یزد التاجر خواجہ کی شخصیت، علم و معرفت اور وعظ و بیان میں مشہور تھی، ابوسعید نے ہندوستان کے بادشاہ سلطان محمد تغلق کے پاس ان کو بھیجا، سلطان نے ان کا خوب بڑھ بڑھ کر اعزاز و اکرام کیا، منقول ہے کہ بادشاہ نے ان کو اپنے مالی خزانہ میں داخل کیا اور کہا کہ اس خزانہ میں سے جو چیز بھی ان کو پسند آیئے اسے لے لیں، لیکن ان قاضی صاحب نے بادشاہ کے خزانہ سے سوائے مصحف شریف یعنی قرآنِ پاک کے علاوہ کچھ بھی نہیں لیا، جب بادشاہ کو اسکی اطلاع ملی تو تعجب میں پڑگیا اور بادشاہ نے ان سے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے (قاضی صاحب نے) کہا کہ ! بادشاہ سلامت کے احسانات اور نوازشات نے مجھ (بندہ) کو ہر طرح بے نیاز کردیا ہے، البتہ مجھے اپنے رب سبحانہ و تقدس کے کلامِ مبارک سے بے نیازی نہیں ہے اس لیے میں نے قرآن پاک کو لے لیا، بادشاہ کو ان کی یہ شان (بے نیازی اور استغنا) بڑی اچھی لگی اور مال کی ایک بڑی بھاری مقدار ان کی خدمت میں پیش کی۔ صحیح ہے، جو دنیا کو ٹھوکر مارتا ہے دنیا اس کے قدموں میں آتی ہے۔

ایک ضروری ہدایت

از: حضرت شیخ الحدیث سہارنپوریؒ

ان ہذا الدین متین فاوغلوا فیہ بالرفق فان المنبت لاارضاً قطع ولاظہراً ابقی۔

یہ دین ایک مضبوط چیز ہے اس میں نرمی کے ساتھ تیز چلو۔ اس لیے کہ جس شخص نے سواری کو تھکا ڈالا اس نے نہ تو راستہ ہی قطع کیا نہ سواری ہی کو باقی رکھا کہ دوسرے وقت قطع مسافت کر سکتا۔ اسی لئے حدیث بالا میں ارشاد فرمایا گیا کہ (فسددوا وقاربوا) سیدھے سیدھے اور قریب قریب چلے چلو یعنی توسط کی رفتار رکھو۔ مندوبات میں اتنا توغل نہ کرو کہ فرائض میں کوتاہی ہونے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ صبح کی نماز میں سلیمان بن ابی حثمہ کو نہ دیکھا۔ نماز کے بعد بازار تشریف لے جارہے تھے، راستے میں ان کا مکان آگیا وہاں تشریف لے گئے اور ان کی والدہ سے دریافت فرمایا کہ آج صبح کی نماز میں سلیمان کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے عرض کیا کہ رات بھر نوافل میں مشغول رہے نیند کے غلبہ سے آنکھ لگ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں صبح کی نماز جماعت سے پڑھوں یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ تمام رات عبادت میں گزاروں۔

تمام رات کی عبادت کتنی اہم چیز ہے لیکن چونکہ جماعت کی نماز اس سے زیادہ مؤکد ہے اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو ترجیح دی۔ اور بھی بہت سی روایات

اس مضمون کی مؤید ہیں کہ احکام شرعیہ میں بھی ہر چیز کا ایک درجہ ہے کہ اس سے نہ گھٹانا چاہیے نہ بڑھانا۔ محض اس وجہ سے کہ ہم ایک کام میں لگے ہوئے ہیں یا ہمارے نزدیک ایک کام اہم ہے باقی ساری عبادات پر دوسرے سارے دینی کاموں پر پانی پھیر دینا سخت ناانصافی ہے۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ اس کی ترغیب نہ دی جائے یا دوسروں کو اس طرف متوجہ نہ کیا جائے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ اس میں اتنا غلو نہ کیا جائے جو حدود سے متجاوز ہو جائے کہ نہ اس کے مقابلہ میں کوئی فرض رہے نہ واجب نہ عذر رہے نہ معذرت۔ جو لوگ اس کے سلسلہ میں منسلک نہ ہوں وہ جہنمی بنادیئے جائیں وہ بے ایمان اور کافروں میں شمار کردیئے جائیں جیسے کہ بہت سی تقریروں اور تحریروں میں دیکھا جاتا ہے اور بہت زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض اونچے درجہ کے اکابر اور ذمہ دار حضرات کی زبان سے بھی ایسے لفظ نکل جاتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی کے بارے میں ایسی بات کو شائع کرے جس سے وہ بری ہے تو حق تعالیٰ شانہ اس کو قیامت کے دن جہنم میں پگھلائیں گے یہاں تک کہ اپنی بات کو سچا ثابت کرے (درمنثور) پگھلانے کا مطلب یہ ہے کہ جہنم کی آگ میں ڈالدیں گے کہ اس کا بدن لہو پیپ بن کر پگھلتا رہے گا اور جب تک اپنی بات کو سچا ثابت نہ کرے گا اس وقت تک نکلنے کا حق نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ جب ایسی بات کہی ہے جو دوسرے میں موجود ہی نہیں ہے تو اس کو سچا کیسے ثابت کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں پھر اسی کی مہربانی کی طرف توجہ کرنا پڑے گی جس پر جھوٹا الزام لگایا تھا کہ یا وہ معاف کردے یا اللہ جل جلالہ اپنے لطف سے اس کو معاوضہ دے کر راضی فرمائیں ورنہ اپنی نیکیاں انکے حوالہ کریں اور نیکیاں اپنے پاس نہ ہوں تو ان کی برائیاں اپنے سر رکھیں۔ جو صورت بھی ہو بہر حال ندامت کتنی سخت ہوگی کہ آج جن کو سب وشتم کیا جارہا ہے کل ان کے سامنے ذلیل ہونا پڑے گا۔

جدید کتابیں

تعارف وتبصرہ

سبحانہ باسمہٖ

کتاب: امام کے پیچھے مقتدی کی قرأت کا حکم

تالیف: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی۔ استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

ناشر: مرکز دعوت وتحقیق دیوبند

صفحات: ۸۸

امام کے پیچھے مقتدی قرأت کرے یا نہ کرے؟ یہ مسئلہ علمی اعتبار سے اختلافی تو ہر دور میں رہا ہے۔ حضرات ائمۂ مجتہدین کی آراء اس میں مختلف ہیں اور ہر زمانے میں ان کے متبعین اپنے اپنے امام کی رائے کو علمی انداز میں مدلل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن ایک ڈیڑھ صدی سے یہ مسئلہ اختلافی سے بڑھ کر نزاعی بن گیا ہے اور اس کو نزاعی بنانے کا سہرا جماعت غیر مقلدین کے سر ہے۔ جو اس موضوع پر سادہ لوح ناواقف عوام کو گمراہ کرنے کی ناپاک کوشش کرتے رہتے ہیں۔

غیر مقلدین کی ان ناروا کوششوں سے عوامی سطح پر سخت نقصان پہنچتا ہے اس لیے ایسی کتابوں کی ضرورت تسلیم شدہ ہے جو ان کا مدلل جواب فراہم کریں اور مسئلہ کی صحیح نوعیت کو سامنے لاسکیں۔ زیر نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کی ایک کامیاب کوشش ہے، جو دارالعلوم دیوبند کے موقر استاذ حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی دامت برکاتہم مدیر رسالہ دارالعلوم دیوبند کے قلم کا شاہکار ہے حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے تدریس حدیث کی توفیق سے بہرہ ور فرمایا ہے اس لیے زیر بحث قسم کے موضوعات پر قلم

اٹھانا ان کو زیب دیتا ہے، پیش نظر کتاب مولانا کی اس صلاحیت کا بہترین ثبوت فراہم کرتی ہے کتاب کے آغاز میں پیش لفظ کے عنوان سے تالیف کا پس منظر بیان کرتے ہوئے جماعت غیر مقلدین اور ان کے طرز فکر پر نہایت جامع تبصرہ کیا گیا ہے، اس کے بعد اسلامی احکام کے تمام مآخذ سے قرأت خلف الامام کے ترک پر دلائل و شواہد نہایت دیانت کے ساتھ مرتب و مربوط انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

سب سے پہلے قرأت خلف الامام اور قرآن حکیم کے عنوان کے تحت بعض آیات قرآنی اور ائمہ تفسیر کے حوالوں سے ان کی تفسیر بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مقتدی کے پیچھے قرأت کے ترک کا احناف کا مسلک قرآنی ہدایات کے عین مطابق ہے۔

دوسرا عنوان ہے قرأت خلف الامام اور احادیث رسول ﷺ، اس عنوان کے تحت تمیں احادیث درج ہیں جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کہ غیر مقلدین کا یہ پروپیگنڈہ قطعاً خلاف واقعہ ہے کہ قرأت خلف الامام نہ کرنے والے حدیث کی مخالفت کرتے ہیں۔ اکثر احادیث کے ذیل میں ضروری تشریحات کے علاوہ حاشیہ میں اصولی مباحث بھی ذکر کردئے گئے ہیں جو اہل علم کے لیے خاصہ کی چیز ہیں اور جن کی ضرورت اس لیے بھی پیش آتی ہے کہ بعض مرتبہ غیر مقلدین انھی مباحث کے ذریعہ غلط فہمی پیدا کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔

احادیث رسول ﷺ کے بعد، آثارِ صحابہ، آثارِ تابعین اور اقوالِ ائمہ کے مختلف عناوین کے تحت مسئلہ کے تمام گوشوں کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کتاب کا مطالعہ ایک منصف مزاج شخص کو یہ سمجھانے کے لیے یقیناً کافی ہے کہ اس مسئلہ میں مسلک حنفی نہایت مستحکم اور معتبر دلائل پر مبنی ہے اور اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی پھیلانے کی کوشش بددیانتی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور صاحب کتاب اس سعی مشکور پر احناف کی طرف سے بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کتاب: خواتین اسلام کی بہترین مسجد

تالیف: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

صفحات: ۴۷

ناشر: مرکز دعوت وتحقیق دیوبند

عصر حاضر میں تشکیک والحاد کے منہ زور سیلاب کے نتائج بد میں ایک نمایاں چیز یہ سامنے آئی ہے کہ بعض منفی مقاصد کے تحت موقع بموقع مختلف اسلامی موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔اس مقصد کے لیے اخبارات وجرائد کے صفحات بڑی کشادہ دلی کے ساتھ استعمال ہوتے ں۔ہر کس وناکس اس بزم میں شریک ہونااور گہرافشانی کرنااپنا حق سمجھتا ہے۔جس کے نتیجے میں ،دہ لوح مسلم عوام مزید شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اس قلمی معرکہ آرائی میں بہت لم تحریریں،بامقصد، تعمیری اور علمیٰ علمی(مکمل واقفیت کی بنیاد پر) لکھی جانے والی نظر آتی ہیں۔

ماضی قریب میں مذکورہ ذہنیت کے ساتھ صنف نازک سے متعلق جو مسائل سامنے آئے ان میں ، مسجد میں عورتوں کی نماز کا مسئلہ بھی عرصہ تک اخبارات ورسائل کی زینت بنارہا،اوراس میں مزید جان پڑگئی بعض مذھبی طبقوں کی جانب سے اس آزادانہ نقطہ نظر کی تائید سے جسے اسلامی شریعت اور اس کے مزاج ومذاق سے ناواقفیت یاعناد کی بناء پر دوسرے لوگ پیش کررہے تھے۔

ان حالات میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے فضلاء وخدام کی جانب سے جو ٹھوس اور مدلل تحریریں سامنے آئیں ان میں، دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث اور ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی مدظلہ کا زیر تبصرہ رسالہ نمایاں مقام رکھتا ہے۔حضرت مولانا کواللہ تعالیٰ نے وسعت مطالعہ کے ساتھ تحریر وتالیف کاجو ملکہ عطافرمایا ہے یہ رسالہ اس کاایک نمونہ ہے۔

اس رسالہ میں زیر بحث موضوع کو کس جامعیت واختصار کے ساتھ سمیٹا گیا ہے اس کا اندزہ پیش لفظ میں حضرت مولاناریاست علی صاحب دامت برکاتہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے ان جملوں سے ہو سکتا ہے کہ :

"دار العلوم دیوبند کے صف علیا کے کامیاب مدرس اور ماہنامہ دار العلوم کے مدیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی زید مجدہم نے تقاضائے حال کے مطابق محد ثانہ انداز پر اس موضوع کی تنقیح کی ہے، سب سے پہلے ان احادیث اور روایات کو جمع فرمایا ہے جن سے عورتوں کی مسجد میں حاضری کے لیے اباحت مرجوحہ نکلتی ہے پھر ان احادیث کو نقل کیا ہے جن میں عورتوں کی مسجد میں حاضری کے لیے شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ پھر وہ روایات ذکر کی ہیں جن سے شرائط کے باوجود مسجد میں نہ جانا بہتر معلوم ہوتا ہے" (ص ۵)

رسالہ کے آغاز میں تمہید کے عنوان سے اس موضوع پر مختلف حوالوں کے ذریعہ شریعت اسلامی کا مزاج پیش کیا گیا ہے اس کے بعد پہلے عنوان کے تحت وہ پانچ احادیث ذکر کی گئی ہیں جن سے بظاہر عورتوں کی مسجد میں حاضری کا جواز سمجھ میں آتا ہے ان احادیث کی تشریح: ائمۂ حدیث کے اقوال سے ثابت کیا گیا ہے کہ زمانۂ نبوت میں مسجد میں حاضری کی اجازت کے باوجود عورتوں کے لیے گھروں میں نماز پڑھنا بہتر سمجھا جاتا تھا۔

دوسرے عنوان کے تحت تین ایسی احدیث ہیں جن سے رات میں مسجد کی حاضری کا جواز نکلتا ہے، تیسرے عنوان کے تحت انیس احادیث پیش کی گئی ہیں جن سے مسجد میں عورتوں کی حاضری کے لیے چند شرائط کا ثبوت ملتا ہے، چوتھے عنوان کے تحت اٹھارہ احادیث سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عورتوں کے لیے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ پانچویں عنوان میں نو احادیث و آثار مذکور ہیں جن سے عورتوں کے لیے مسجد میں حاضری کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا عناوین کے بعد موضوع کی تکمیل کرتے ہوئے چھٹے عنوان میں عیدین کی نماز میں عورتوں کی حاضری زیر بحث لائی گئی ہے جس میں آٹھ احادیث مذکور ہیں۔

اس طرح ۶۲ احادیث کا یہ قیمتی ذخیرہ جو مختلف موقر اسلامی حوالوں سے مزین ہے یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مسجد میں عورتوں کی حاضری کے موضوع پر ابنائے زمانہ جو بھی کہیں، شریعت اسلامی بہر حال اس کو مناسب نہیں سمجھتی اور عورتوں کا گھروں پر ہی نماز پڑھنا منشائے شریعت کی تکمیل ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ مئی [illegible]

جلد ۸۳ شمارہ ۵ فی شمارہ /۶ سالانہ ۔/۶۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند	استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۴۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰
ہندوستان سے ۔/۶۰

Tel: 01336- 22429
FAX: 01336- 22768
Tel.: 01336 - 24034 EDITER

REGD NO. SHN/L-13/NP-111/98

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤدوالا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند کی معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

عشرۂ محرم کو دیار پورب کے مشہور عالم ربانی اور صاحب نسبت وارشاد بزرگ حضرت مولانا عبدالحلیم فیض آبادی جون پوری رحلت فرماگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

حضرت مولانا مرحوم علمی تبحر، سلامتی طبع، زہد و تقویٰ، حلم و بردباری، تواضع و بے نفسی وغیرہ صفات میں اسلاف رحمہم اللہ کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ حضرت مرحوم کا خاص میدان اسلامی علوم وفنون کی نشرواشاعت اور ارشاد وسلوک تھا۔ انھیں درس نظامی پر عالمانہ عبور تھا۔ وعظ وتذکیر میں بھی پوری مہارت تھی وعظ سادہ لیکن نہایت مؤثر ہوا کرتا تھا۔ وہ سیکڑوں تلامذہ کے استاذ، ہزاروں سالکین کے مرشد ومربی اور کئی دینی تعلیمی مراکز کے مؤسس ومدیر تھے۔

ظلمت مادہ پرستی اور طوفان خدا فراموشی کی پھیلی ہوئی تاریکیوں میں حضرت مولانا کی علمی وروحانی شخصیت طالبانِ راہ حق کے لیے ایک مشعل ہدایت تھی افسوس کہ یہ قندیلِ ہدایت بھی ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

وہ اک ستارہ جو ضوفشاں تھا حیات کے مغربی افق پر
سیاہی شب کے پاسبانوں خوشی مناؤ کہ وہ بھی ڈوبا

حضرت مولانا کو وقت کے دو نہایت اہم بزرگوں حضرت مصلح الامت شاہ وصی اللہ فتح پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ مہاجر مدنی قدس اسرارہما سے خلافت واجازت حاصل تھی اور بیک وقت دونوں بزرگوں کی نسبت کے امین اور ان کی خصوصیات کے حامل تھے۔ تقریباً اٹھائیس برس تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے اور جب تک قویٰ وصحت ساتھ دیتے رہے برابر اس کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے رہے اور اس راہ سے دارالعلوم دیوبند کی اہم خدمات انجام دیں۔

حضرت مولانا مرحوم کا آبائی وطن ضلع فیض آباد کی ایک بستی، دیوریا تھی یہیں ۱۹۰۹ء میں آپ کی پیدائش ہوئی ابتداء میں گاؤں ہی کے سرکاری اسکول میں داخل ہوئے مگر چند ہی دنوں میں اسکول کی تعلیم چھوڑ کر قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کی مشہور دینی درسگاہ مصباح العلوم میں داخل ہوگئے۔

خوش قسمتی سے اس وقت مدرسہ کے صدر مدرس اور کرتا دھرتا حضرت مولانا محمد اسماعیل (برہی والے) تھے جو حضرت چاند شاہ ٹانڈوی کے خلیفۂ خاص اور حضرت شیخ الہند و حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہما اللہ کے شاگرد تھے۔ مولانا موصوف روحانی اور علمی دونوں لحاظ سے پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ شاگردوں کے ساتھ بڑی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ اس لیے طلبہ بہت جلد ان سے نہ صرف مانوس بلکہ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب رحمہ اللہ کی تعلیم و تربیت کا یہ خصوصی اثر تھا کہ طلبہ میں تحصیل علم کے جذبہ کے ساتھ خیر و صلاح کا داعیہ بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو اپنے تلامذہ کی تعلیم و تربیت کا کس قدر اہتمام تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو خود حضرت مولانا عبدالحلیم رحمہ اللہ کی ذات سے متعلق ہے مولانا محمد احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند (جو مرحوم کے تلامذہ میں سے ہیں) نے احقر سے مولانا مرحوم کے واسطہ سے بیان کیا کہ میں نے عین العلوم میں ایک سال تعلیم حاصل کرکے کھیتی باڑی کی مصروفیت کی وجہ سے پڑھائی چھوڑ دی اور کاشتکاری میں لگ گیا۔ مدرسہ سے مسلسل غیر حاضری کی بناء پر حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو احساس ہو گیا کہ میں نے تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا ہے۔ چناں چہ وہ ایک دن اپنی گھوڑی پر سوار میرے گاؤں پہنچ گئے جو ٹانڈہ سے تقریباً ۲۰-۲۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ گھر پر معلوم کیا تو بتایا گیا کہ کھیت میں ہوں چناں چہ مولانا اسی وقت کھیت پر پہنچ گئے اور گھوڑی پر سوار میرے پاس آکر فرمایا اگر "جلوا" بننا چاہتے ہو تو کھیتی باڑی ہی میں مصروف رہو اور اگر مولانا عبدالحلیم صاحب بننے کی خواہش ہو تو میرے ساتھ عین العلوم چلو مولانا مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت الاستاذ نے کچھ اس انداز اور دل کی گہرائیوں سے یہ بات کہی کہ اسی وقت اسی حالت میں ان کے ساتھ مدرسہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ چناں چہ آگے آگے مولانا اپنی گھوڑی پر سوار اور ان کے پیچھے میں پیدل اسی کیفیت کے ساتھ ۲۰-۲۵ میل کا سفر طے ہو گیا مگر شدت تاثر کی وجہ سے تعب وغیرہ کا کچھ احساس نہیں ہوا۔ اس کے بعد تو میں پھر مدرسہ اور مولانا ہی کا ہو گیا۔ اور پورے انہماک اور توجہ سے عربی اول سے لیکر موقوف علیہ تک کی تعلیم عین العلوم میں حضرت مولانا محمد اسماعیل ہی سے حاصل کی۔ پھر تکمیل کی غرض سے ۱۳۴۷ھ میں مظاہر علوم سہارن پور آ گیا اور یہاں حضرت شیخ الحدیث، حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری وغیرہ اساتذۂ حدیث سے دورۂ تکمیل کرکے ۱۳۴۸ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

حضرت مولانا مرحوم نے ایک خط میں تفصیل کے ساتھ اپنے حالات کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کا وہی خط درج کر دیا جائے جو اس سلسلے میں سب سے مستند اور وقیع ماخذ ہے۔ آئندہ سطور میں یہ خط ملاحظہ ہو۔ تحریر فرماتے ہیں:

پیدائش: ۱۹۰۹ء بمقام دیوریا ضلع فیض آباد۔ یو۔ پی۔

بچپن کی تعلیم و تربیت: اپنے گاؤں میں کوئی دینی مکتب نہ تھا۔ برطانیہ کے دور میں ہر شہر و قصبہ اور دیہات میں سرکاری اسکول قائم تھے ایک سرکاری اسکول میں داخلہ لیا۔ چند ہی دنوں میں سرکاری اسکول کی تعلیم چھوڑ کر قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کی مشہور دینی درس گاہ عین العلوم میں تعلیم شروع کی۔ مدرسہ کے صدر مدرس اور اس ناکارہ کے ابتدائی استاذ مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ (جو حضرت شیخ الہند و حضرت حکیم الامت تھانویؒ قدس سرہ کے شاگرد اور حضرت شیخ الاسلام مدنی نوراللہ مرقدہ کے رفیق درس اور ٹانڈہ کے مشہور بزرگ میاں چاند شاہ صاحبؒ کے خلیفہ اور مجاز تھے) اس ناکارہ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور تعلیم و تربیت کی پوری نگرانی رکھتے تھے۔ موقوف علیہ تک کی تعلیم انھی استاذ موصوف سے حاصل کی۔

مظاہر علوم میں داخلہ: اس کے بعد اعلیٰ تعلیم دینی کے لیے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں ۱۳۴۷ھ میں داخلہ لیا۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ و حضرت مولانا عبداللطیفؒ صاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور و حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوریؒ وغیرہم سے حدیث کی تکمیل کی۔ ۱۳۴۸ھ میں۔

مظاہر علوم میں مدرسی: فراغت کے بعد حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ نے فرمایا کہ بہت سے متمول طلباء مظاہر علوم میں پڑھانا چاہتے ہیں جو اپنے قیام و طعام کے خود کفیل ہوں گے اور مدرسہ سے کوئی معاوضہ نہ لیں گے مگر مدرسہ انھیں اجازت نہیں دیتا۔ تیرے بارے میں اہل مدرسہ کی رائے ہے کہ اگر تو چاہے تو تجھ کو اسباق دے دیئے جائیں اس ناکارہ نے اپنی سعادت سمجھا اور معین مدرس ہو گیا۔

وطن میں خدمات: لیکن اسی سال غالباً رجب میں شدید بیماری کی وجہ سے بغرض علاج حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ اور حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت کے بعد وطن چلا آیا۔ اہل وطن نے اصرار کیا کہ گاؤں ہی میں دینی مکتب قائم کر کے ہمارے بچوں کو دینی و تعلیمی نفع پہنچاؤ۔ اس پر اس ناکارہ نے حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ گاؤں والوں کی خواہش ہے کہ اپنے گاؤں ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کروں مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں بچوں کو اردو قرآن شریف وغیرہ پڑھانا ہے۔ عربی درسیات کے لیے کوئی سبیل نہیں۔ ایسی صورت میں آں مخدوم جو حکم دیں اس پر عمل کروں۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ الحمد للہ یہاں کام کرنے والے بہت ہیں۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ اکناف عالم میں رہیں اور دین کا کام ہو باقی تم نے جو یہ لکھا ہے کہ یہاں صرف اردو وغیرہ پڑھانا پڑے گا تو میرے

پیارے مقصود دین ہے اس کے لیے اردو عربی سب برابر ہے ہاں اپنی استعداد کی بقاء کے لیے کتب دینیہ شامی مشکوٰۃ وغیرہ کو مطالعہ میں رکھو باقی تمھارے لیے ہمیشہ یہاں جگہ خالی ہے جب جی چاہے آجاؤ۔ (انتہی) چناں چہ گاؤں کے مکتب میں پڑھانے لگا۔ پھر حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ کی دعاو توجہ سے عربی درسیات کا بھی نظم ہوگیا۔

جونپور میں تدریسی خدمات: چند سال بعد جونپور کے قصبہ مانی کلاں میں دینی تعلیم شروع کی۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ کی دعا اور توجہ بے انتہا رہتی تھی۔ تقریباً چالیس سال بعد ۱۹۷۲ء میں ایک نیا ادارہ مدرسہ عربیہ ریاض العلوم کے نام سے ضلع جونپور ہی میں قائم کیا۔ اس نئے مدرسہ کے لیے حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ نے خصوصیت سے بہت دعائیں دیں اور لکھوایا کہ تمھارے مدرسے ریاض العلوم کے لیے بہت دعا کرتا ہوں۔

مدرسہ کے لیے سفارشی گرامی نامہ: ایک بار حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ نے مدرسہ کے لیے دعاو سفارش لکھوایا جو مندرجہ ذیل ہے:

> "یہ ناکارہ مولانا عبدالحلیم صاحب زید مجدہم خلیفہ ارشد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ سے تو اس زمانے سے واقف ہے جب یہ مظاہر علوم سہارنپور میں دورۂ حدیث پڑھتے تھے میں اس وقت بھی ان کی خوبیوں کا معترف تھا اور اسی وقت سے مولانا موصوف سے میرے تعلقات بہت زیادہ وسیع ہوتے رہے اور جب سے حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت کا حال معلوم ہوا اس وقت سے تعلق اور بڑھ گیا۔ مولانا کے مدرسہ ریاض العلوم چوکیہ گورینی کے لیے دل سے دعاگو ہوں اس کو اللہ تعالیٰ ہر طرح کی ترقیات سے نوازے۔ مولانا کے مدرسہ کے طلبہ جامعہ مظاہر علوم میں تکمیل کے لیے داخلہ لیتے رہتے ہیں اور آج کل ہمارے جامعہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف ہی کے شاگرد ہیں مولانا موصوف کے مدرسہ کے اور بھی متعدد طلبہ ہمارے یہاں مختلف شعبہ ہائے علم میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ مدرسہ ریاض العلوم کو اور مولانا موصوف کو زیادہ سے زیادہ ترقیات سے نوازے۔ اہل خیر حضرات سے یہ ناکارہ پرزور سفارش کرتا ہے کہ مدارس عربیہ خصوصاً مدرسہ ریاض العلوم چوکیہ گورینی کی جو بھی خدمت ہوسکتی ہو اس سے دریغ نہ فرمائیں کہ ان مدارس کی خدمت صدقۂ جاریہ ہے۔ مرنے کے بعد یہی کام آنے والی ہے۔ واللہ الموفق لمایحب ویرضیٰ"۔

طالب علمی میں حضرت کی خدمت میں: ۱۳۴۷ھ میں جب مظاہر علوم میں داخلہ لیا تو اسی وقت سب سے پہلی بار حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ جدید طالب علم ہونے کی وجہ سے حضرت شیخ کا رعب بہت زیادہ تھا جس کی بناء پر سبق کے دوران بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اگر چہ اکثر عبارت پڑھنے کا موقع اسی ناکارہ کو ملتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ نے فرمایا کہ فیض آبادی طلبہ تو بالکل خاموش رہتے ہیں کچھ بولتے ہی نہیں۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں آمد و رفت شروع ہو گئی اور دوپہر کا کھانا بھی ساتھ ہی ہونے لگا۔ ان دنوں دستر خوان پر یہ ناکارہ اور مولانا امیر احمد صاحب کاندھلوی اور چند خدام ہوتے تھے اور بس۔ دورۂ حدیث کی مشغولی اور وقت کی تنگی کے باوجود یہ ناکارہ دوپہر میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر پابندی سے سر پر تیل ملتا۔ سر پر تیل ملتے وقت حدیث پاک کے بعض اشکالات عرض کرتا اور حضرت شیخ بسط سے جواب مرحمت فرماتے۔

طالب علمانہ سوال کا جواب: ایک بار اس ناکارہ نے عرض کیا کہ احادیث میں بکثرت بین السجدتین دعاء پڑھنے کا ذکر ہے اور حضرات احناف سب کو نوافل پر محمول کرتے ہیں۔ وجہ کیا ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ فرائض کا مبنیٰ تخفیف پر ہے اور قومہ و جلسہ کی دعائیں تخفیف کے منافی ہیں۔ اس ناکارہ نے عرض کیا یہ حکم تو جماعت کے لیے ہو سکتا ہے منفرد کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ فرض میں ادعیہ طویلہ پڑھے اس پر حضرت شیخ نے فرمایا کہ پیارے فرض نماز بھی کہیں تنہا ہوتی ہے۔ فقہا کی نگاہ میں فرض نماز کے لیے جماعت لازم ہے گویا منفرد کی نماز نماز ہی نہیں۔ (انتہیٰ)

تیرے مولوی نے کیا بیان کیا؟: اسی زمانہ یعنی ۱۳۴۸ھ میں حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہ کا معمول تھا کہ ہر پنجشنبہ کی شب کو دیوبند سے سہارن پور تشریف لاتے اور جامع مسجد میں سیرت پاک پر وعظ فرماتے طلبہ کو وعظ میں شرکت کی عام اجازت تھی اس لیے یہ ناکارہ بالالتزام وعظ میں شریک ہوتا۔ جمعہ کے دن جب حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری ہوتی تو مزاحاً فرماتے کل تیرے مولوی (حضرت شیخ الاسلام) نے کیا بیان کیا۔ چوں کہ یہ ناکارہ فیض آبادی تھا اور حضرت مدنی قدس سرہ بھی قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے اصل باشندے تھے اس لیے بربنائے محبت حضرت شیخ یوں سوال فرماتے جو کچھ یاد ہوتا عرض کر دیتا۔

تیرے مولانا کو خوب موقع ملا: ایک بار حضرت مدنی نے سیرت پاک کا وہ واقعہ ذکر فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ کی رواح مبارک کو ایک بدو نے زور سے کھینچا کہ شانۂ مبارک پر چادر کے نشانات پڑ گئے۔ حضرت مدنی نے یہاں پہنچ کر بڑے تیز لہجہ میں فرمایا کہ چادر مبارک ململ کی نہیں تھی نرم نہیں تھی موٹی تھی گاڑھے کی تھی کھدر کی تھی اور پوری تقریر دیسی اور ولایتی کے فرق پر

فرماتے رہے۔ حضرت شیخ ململ وغیرہ نفیس کپڑے زیب تن فرماتے تھے۔ اور حضرت مدنی ململ کے مخالف اور کھدر کے فریفتہ تھے۔ حضرت شیخ کے سوال پر کہ رات کیا وعظ ہوا تھا۔ اس ناکارہ نے مذکورہ بالا مضمون کو نقل کیا۔ اس پر حضرت شیخ بے ساختہ ہنسے اور فرمایا کہ ہاں تیرے مولانا کو خوب موقع ملا۔

تیرے فیض آباد میں بھی کوئی پڑھا لکھا ہے: ایک بار حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے مزاحا فرمایا کہ ارے تیرے فیض آباد میں بھی کوئی پڑھا لکھا ہے۔ اس ناکارہ نے عرض کیا جی ہاں وہ کیا ہر پنجشنبہ کو تشریف لاتے ہیں ہنس کر فرمایا چل بس وہی ایک غرضیکہ حضرت شیخ درس میں اور دستر خوان پر اور سر میں تیل ملتے وقت بڑی شفقت کرتے تھے جس سے طبیعت بہت متاثر ہوتی اور تعلق وعقیدت کا سلسلہ اخیر عمر تک قائم رہا۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ سے اصلاحی تعلق طالب عالمی کے زمانے میں حضرت شیخ سے انتہائی قرب ومحبت اور عقیدت وتعلق تھا۔ تعلیم سے فراغت پر حضرت شیخ کی ایماء سے مظاہر علوم میں معین مدرسی کا بھی شرف حاصل ہوا جو اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا لیکن اپنے وطن آنے کے بعد حضرت شیخ ہی کے حکم سے دینی مکتب قائم کیا۔ اور دوسرے امور دینیہ حضرت شیخ ہی کے مشورہ سے انجام پاتے رہے۔ لیکن حضرت شیخ سے اس وقت اصلاحی تعلق قائم نہ ہو سکا بلکہ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ خلیفہ ومجاز حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق قائم ہو گیا اور اپنی نااہلی کے باوجود حضرت کے یہاں سے خلافت واجازت بھی ملی۔ جب حضرت شیخ کو اس کا علم ہوا تو حضرت شیخ نے حکما فرمایا کہ لوگوں کو بیعت کرنا شروع کردو۔ ۱۹۶۸ء میں حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد حضرت شیخ کو اطلاع کئے بغیر ہی بیعت ہو گیا اور خط وکتابت کا تو ہمیشہ سے معمول تھا ہی۔

خلافت: غالباً ۱۳۹۴ھ میں رمضان المبارک میں قیام سہارن پور میں تھا۔ دار جدید کی مسجد میں یہ ناکارہ بھی معتکف تھا۔ سحر کے وقت حضرت شیخ نے بلوایا اور اجازت مرحمت فرمانے کے بعد ایک مصلیٰ عنایت فرمایا۔ جب بھی حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کا قیام رمضان مبارک میں سہارن پور رہا اس ناکارہ نے اعتکاف میں شرکت کی خواہش کا اظہار کیا اور اجازت چاہی تو فرمایا کہ پیارے اپنی جگہ اپنے انڈے اور بچے لے کر کام کرو۔

• • •

جناب مولانا قطب الدین ملا ایم اے بی ایڈ فاضل دینیات، ادیب کامل کریم داد خان مسجد۔
باغبان گلی بیلگام۔ ۵۹۰۰۰۲ (کرناٹک)

معراج کے ایمانیاتی، عملیاتی اور تحمیدی وغیرہ وہ پہلو ہیں جو ایک صاحب نظر کی نظر کے سامنے فوری طور پر آجاتے ہیں لیکن اس واقعہ عظیمہ کا سب سے اہم پہلو، دعوتی ہے جس کی طرف عام طور پر توجہ مبذول نہیں ہوتی حضور اقدس ﷺ داعیٔ اعظم و آخر ہیں آپ کی سیرت طیبہ کے ہر ہر واقعہ میں دعوتی رنگ، دعوتی مزاج، دعوتی اصول اور اس سلسلہ کی سرگرمیوں کے نتائج نہاں وعیاں ہیں۔ یہاں موضوع چونکہ واقعہ معراج ہے اس لیے اسی سے متعلق دعوتی پہلوؤں کے مختلف نکات پر غور کیا جارہا ہے۔

معراج اور دعوت:

سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ انبیاء علیہم السلام معراج کے لیے مبعوث نہیں کئے جاتے بلکہ دعوت الی الحق کے لیے مبعوث کئے جاتے ہیں سلسلۂ دعوت کی کڑی، زمانۂ خدا فراموشی، آغاز دعوت، مخالفت کی شدت، معراج، ہجرت، جہاد اور تکمیل دعوت جیسے عناوین سے مربوط ہوتی ہے۔ اس طرح شرف معراج ایک تلازمی شرف ہوتا ہے جو راہ دعوت میں سنگ وسطی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے دعوت ضروری ہے:

لیکن واقعتاً اور حقیقتاً اصل چیز دعوت الی الحق ہے اپنی مخلوق پر خدا کی شفقت اور

رحم کا حال یہ ہے کہ بگڑے سے بگڑے انسانوں کو اس وقت تک نہیں پکڑتا جب تک کہ ان میں ہدایت کی راہ بتانے والے کسی نبی کو نہیں بھیجتا۔ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ اور وہ نبی انتہائی دل سوزی کے ساتھ ان کو صراط مستقیم کی طرف بلاتا ہے جس کے نتیجہ میں لوگوں کو ہدایت ملتی ہے اس کے باوجود کچھ لوگ ہوتے ہیں جو سرکشی اور بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو پھر خدا، ان نافرمانوں کو پکڑ لیتا ہے۔ نبی پاک ﷺ نے مسلسل ۱۱/ سال تک اہل مکہ کو دعوت دی۔ پھر طائف کا سفر فرمایا جہاں مصائب و ابتلاء کی انتہاء ہو گئی۔ اس کے بعد مدنی زندگی میں حق کو سربلندی ملی اور باطل کو رسوا ہونا پڑا۔

جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقاً سربلندی تو بعد کو ملتی ہے لیکن ابتداء دعوت کے ساتھ ہی مخالفت کا آغاز ہو جاتا ہے اور یہ مخالفت رفتہ رفتہ زور پکڑنے لگتی ہے۔ دعوت و مخالفت گویا لازم و ملزوم چیزیں ہیں حضور ﷺ کو شرف معراج جو عطا ہوا ہے وہ مخالفت کی انتہا کے بعد ہی عطا ہوا ہے۔

مخالفت کی انتہاء عروج دعوت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے:

دعوت کا ابتدائی مرحلہ نہایت ہی بے کسی و بے بسی اور کس مپرسی کا ہوتا ہے۔ یہی وہ دور ہوتا ہے جب کہ مخالفت کا زور اپنی تمام تر شدت کے ساتھ حق پر ٹوٹ پڑتا ہے لیکن یہی وہ دور ہوتا ہے جس میں ایمان کی جلاء، اعمال کی روح اور تعلق مع اللہ جیسی صفات عالیہ حاصل ہوتی ہیں۔ اور پودے کی کونپل جس طرح ہوا کے تھپیڑوں کو، زمین کی سختی کو، سورج کی تمازت کو اور دیگر ناگہانی حملوں کو خدا کی مدد اور اس کی حکمت بالغہ کے سہارے جھیلتی ہے اور پھر تناور درخت کی شکل میں ڈھل جاتی ہے اور مخلوق خدا اس کی چھاؤں میں راحت کا سانس لیتی ہے بالکل اسی طرح دعوت اپنی تمامتر ناتوانی و کمزوری کی شکلوں کے باوجود سب مرحلوں سے گزر کر قوت پکڑتی ہے پھر مخلوق خدا کو ہدایت کی چھاؤں، ایمان کی تازگی، اعمال صالحہ کی ٹھنڈک، اور تعلق مع اللہ کا کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال مخالفت کی انتہا عروج دعوت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ طائف کی گلیوں میں حضور اقدس ﷺ کو ایک بے بسی کے عالم میں جس دردناک اور کرب انگیز مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا

جس کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ وہ دن میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن تھا اور قلب اطہر کا یہی وہ کرب والم تھا کہ زبانِ معصوم سے مرقعہ دعاء بن کر نکل پڑتے ہیں۔

اللهم اليك اشكو ضعف قوتى و قِلَّةَ حِيلتى وهَوَانِى على الناس يا ارحم الراحمين۔ انت رب المستضعَفين وانت ربى الى من تكلنى الى بعيد يَتجهَّمنى ام الى عدوٍّ مَلَّكتَه امرى ان لم يكن بك علىَّ غضبٌ فلا ابالى ولكن عافيتك هى اوسع لى اعوذ بنور وجهِك الذى اشرقَت له الظلمات وصلح عليه امر الدنيا و الآخرة من ان تنزل بى غضبك او يحل على سخطك لك العتبى حتى ترضى ولاحول ولا قوة الا بك۔

ترجمہ :۔ اے اللہ تجھی سے شکایت کرتا ہوں میں اپنی کمزوری اور بے کسی کی اور لوگوں میں ذلت و رسوائی کی اے ارحم الراحمین تو ہی ضعفاء کا رب ہے اور تو ہی میرا پروردگار ہے تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے، کسی اجنبی بیگانہ کے جو مجھے دیکھ کر ترش رو ہوتا ہے اور منہ چڑھاتا ہے یا کسی دشمن کے جس کو تو نے مجھ پر قابو دے دیا اے اللہ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہے تیری حفاظت مجھے کافی ہے میں تیرے چہرے کے اس نور کے طفیل جس سے تمام اندھیریاں روشن ہو گئیں اور جس سے دنیا و آخرت کے سارے کام درست ہو جاتے ہیں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غصہ ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو تیری ناراضگی کا اس وقت تک دور کرنا ضروری ہے جب تک تو راضی نہ ہو تیرے سوا کوئی طاقت ہے نہ قوت۔ (حکایات صحابہ ص ۱۰)

بہرحال طائف کا دن انتہائی مخالفتوں کا دن تھا اور یہی دن گویا عروج دعوت کا پیش خیمہ ثابت ہوا کہ اللہ جل شانہ نے جلد ہی نبی معصوم کو بارگاہ اقدس میں شرف باریابی عطا فرما کر فتح و نصرت کا مژدہ سنایا۔(۲)

فانصرنا على القوم الكافرين

---

(۱) مولانا مناظر احسن گیلانی نے معراج کو شعب ابی طالب کی محصوری کے بعد کا واقعہ مانا ہے۔ دیکھئے النبی الخاتم ص ۶۲۔ لیکن ہم نے سیرۃ المصطفی کے مباحث پر اعتماد کیا ہے۔ دیکھئے سیرۃ المصطفی ج ۱ ص ۸۷۔

مخالفت کی شدت کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین کے سلسلہ میں ترک وطن کیا جائے۔ اس کو ہجرت کہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ہجرت واقعہ معراج کے بعد فرمائی۔

حق کی سربلندی کے لیے ہجرت ضروری ہے:

ہجرت، دعوتی سرگرمیوں کا ایک اہم مرحلہ ہوتی ہے اور اس کے بعد حق کو سربلندی ملتی ہے۔ حضور اقدس ﷺ کی سیرت طیبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کو پہلے ہجرت کا حکم ہوا اور حضورؐ نے ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے آٹھویں سال مسلمانوں کو فتح مکہ کے ذریعہ فتح مبین سے سرفراز فرمایا۔ اور قریش کو ان کی نافرمانی کی وجہ سے تولیت کعبہ کے شرف سے معزول کردیا گیا۔

قبل بعثت و قبل ہجرت کا زمانہ:

حکم ہجرت کے آنے سے پہلے اس کی علامات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ اور حالات میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور پیش آنے والے واقعات خود اس کے غماز ہوتے ہیں۔ انھیں کی روشنی میں حضرت صدیق اکبرؓ نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ اب حکم ہجرت آنے کو ہے۔

علمائے سیر نے تحریر فرمایا ہے کہ قبل بعثت جو فوق الفطرت واقعات رونما ہوتے ہیں انھیں ارہاص کہا جاتا ہے یہ ارہاصات کسی نبی کے مبعوث ہونے کی علامتیں ہوتی ہیں پھر نبی کی بعثت کے بعد جو فوق الفطرت واقعات ہوتے ہیں وہ معجزات کہلاتے ہیں جو نبی کے برحق ہونے کی دلیل ہوتے ہیں اسی طرح دعوت کی سرگرمیوں اور جدوجہد کے دوران چند ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو حکم ہجرت کا پتہ دیتے ہیں۔ پھر ہجرت، فتح ونصرت کی نشان بن جاتی ہے۔ جو امور قبل ہجرت رونما ہوتے ہیں وہ دوگانہ ہوتے ہیں۔

۱- دعوت کی راہ میں بے کسی وکس مپرسی کی انتہا۔

۲- داعی کی تسکین خاطر کا سامان۔

آغاز دعوت اور ہجرت کا درمیانی وقفہ ایک عالم کس مپرسی کا ہوتا ہے۔ باطل راہِ حق میں انسداد حق کے لیے کافی دراڑیں پیدا کردیتا ہے۔ اور اس زعم باطل میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ اب اس کا پاٹنا آسان نہیں ہے۔ لیکن باطل کی ان تخریبی کارروائیوں کے نتیجہ میں

خداوند حکیم مثبت نتائج ظاہر فرماتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ مخالفت کی شدت کے تناسب سے دعوت کی جڑیں دلوں میں مضبوطی کے ساتھ جمتی چلی جاتی ہیں۔ اور قلوب پر ان کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور داعی صفاتِ داعیانہ سے متصف ہوتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں ایمان کی پختگی، اخلاص کی مایہ اور دین کے لیے سر فروشی کے جذبات نہ صرف پرورش پاتے ہیں بلکہ فروغ پاتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ اس دور آزمائش میں انھیں سکون قلب اور اپنی معرفت عطا فرمانے کا سامان مہیا فرماتا ہے اور یہی وہ محل مناسب ہوتا ہے کہ نبی کو شرفِ معراج سے نوازا جائے۔

حرا سے طائف تک کے دعوتی سفر میں حضور اقدس ﷺ کو مختلف مصائب برداشت کرنے پڑے۔ جس کی روداد بڑی درد انگیز ہے۔ شعب ابی طالب کی محصوری، حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کا اٹھ جانا، پھر طائف کی گلیوں میں گالیوں کی بوچھار، استہزاء و تمسخر اور اذیتوں و کلفتوں کی انتہا۔

پھر معراج کے ذریعہ حضور ﷺ کی تسکینِ خاطر اور مقام دنو و تدلّی کا اعلیٰ و ارفع مقام اور قرب الٰہی کی وہ دولت جو کسی کے حصہ میں نہیں آتی۔

واقعۂ معراج اور سورۂ بنی اسرائیل:

واقعۂ معراج کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں آگیا ہے۔ علامہ سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سورۂ بنی اسرائیل مکی ہے۔ اور یہود مضافاتِ مدینہ میں رہتے تھے۔ لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ مکی سورۃ میں یہود اور بنی اسرائیل کا ذکر آگیا ہے اس لیے کہ اب ہجرت کا وقت قریب تر ہے اور واسطہ بنی اسرائیل سے پڑنے کو ہے۔ گویا بنی اسرائیل کو توبہ و انابت کا تیسرا اور آخری موقع دیا جارہا ہے۔ علامہ موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کو ارض مقدس کی تولیت کا شرف اس شرط اور معاہدہ کے ساتھ عطا ہوا تھا کہ وہ غیر اللہ کو اپنا کارساز نہ بنائیں۔ لیکن انھوں نے اپنے عہد سے روگردانی کی تو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں جو نیابت اور وراثت دی گئی تھی بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں چھین لی گئی اور وہ ارض مقدس سے جلا وطن کر دیئے گئے۔ پھر انبیاء کی دعوت پر بنی

اسرائیل نے توبہ وانابت کی تو اللہ نے ایرانیوں کے عہد میں دوبارہ ارض مقدس کی تولیت عطا کی۔ پھر انھوں نے عہد شکنی کی تو اللہ نے ان پر یونانیوں اور رومیوں کو مسلط کر دیا۔ جنھوں نے بیت المقدس کو جلا کر خاک کر دیا یہودیوں کا قتل عام کیا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر انھیں اب تیسرا اور آخری موقع دیا جارہا ہے۔ لیکن انھوں نے حضور ﷺ کی دعوت و توبہ وانابت کو قبول نہیں کیا۔ اس لیے حضور ﷺ کے مدنی دور میں وہ مدینہ اور اطراف مدینہ خیبر وغیرہ سے بے دخل کر دیئے گئے۔ اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے سپردی کر دی گئی۔ جس کی طرف اشارہ معراج کے موقع پر حضور ﷺ کو عروجِ آسمانی سے قبل بیت المقدس کا سفر کرا کر اور تمام انبیاء کی امامت کروا کر کر دیا گیا تھا۔

سطور بالا میں اب تک مزاج دعوت، کیفیت دعوت اور مراحلِ دعوت کے سلسلہ میں جو بحث زیر قلم آگئی ہے اس کی روشنی میں معراجی عطایا پر بھی ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ واقعہ معراج سے دعوتی پہلو کا کتنا اہم تعلق ہے۔

معراج کے عطایا میں دعوتی امور:

حضرت موسیٰ کو ہجرت سے پہلے جو احکام عشرہ عطا کئے گئے تھے ان میں سے ایک ایمان سے ایک عبادت سے اور بقیہ آٹھ اخلاق و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن شبِ معراج کا تخلیہ خاص اور مقام دنو و تدلیٰ میں جو آٹھ چیزیں خصوصی طور پر امت محمدیہ ﷺ کو عطا کی گئیں ان میں ایمان و عمال کے ساتھ ساتھ دعوت کو بھی شامل کیا گیا ان میں ایک اسلام اور مسلمانوں کا لقب ہے۔ بقیہ اور تین کا تعلق جانی و مالی عبادات سے ہے جیسے نماز روزہ اور صدقہ اور چار چیزیں دعوت سے متعلق ہیں جیسے

۱- ہجرت

۲- جہاد

۳- امر بالمعروف اور

۴- نہی عن المنکر

اور یوں دیکھا جائے تو صدقہ بھی دعوت ہی کے سلسلہ میں معاون ہونے والی ایک چیز ہے جو نصرت اور تالیف قلب کے لیے کار آمد ہوتی ہے ان امور ہشت گانہ سے جن میں آدھے سے زیادہ کا تعلق دعوت سے ہے جہاں دعوتی پہلو کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے وہیں اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس امت کو خصوصی طور پر دعوت کے مزاج پر اٹھایا گیا ہے۔

ذیل میں انھیں مذکورہ دعوتی ارکانِ اربعہ یعنی ہجرت، جہاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں بحث کی جارہی ہے۔

دعوت الی الحق کی دو بہت ہی اہم چیزیں:

دعوت و عزیمت کے راستہ میں دو چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

۱-اپنی مالوفات و متعلقات و جذبات کی قربانی

۲-انسان کی متاعِ عزیز تر جان کو نسبتِ خداوندی پر جھونک دینا

پہلی کی انتہا ہجرت اور دوسری کی انتہا شہادت ہے۔

پہلی چیز ہجرت:

تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوتی سرگرمیوں تبدیلی حالات کا جو نقطہ انقلاب (Turning Point) نظر آتا ہے وہ ہجرت پر مرکوز ہوتا ہے۔ ظاہر میں ہجرت بڑی بے بسی و بے کسی او کس مپرسی کے عالم میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وطن سے بے وطن ہونا پڑتا ہے جسے بعض ناعاقبت اندیش راہِ فرار (Flight) اختیار کرنا کہتے ہیں حقیقت میں یہ فرار نہیں ہوتا بلکہ حکم خداوندی کی تعمیل میں نکلنا ہوتا ہے اور انتہا درجہ کی قربانیوں کے حوصلے کے ساتھ نکلنا ہوتا ہے اور آٹھ طرح کی مالوفات و متعلقات و جذبات جیسے

۱-اپنے آباء واجداد ۲-اپنی اولاد ۳-اپنے بھائی ۴-اپنی ازواج ۵-اپنا کنبہ ۶-اپنا کمایا ہوا مال ۷-اپنی تجارتیں ۸-اور اپنے محبوب گھروں کی محبتوں کی قربانیوں کے ساتھ نکلنا ہوتا ہے۔ جو آسان نہیں ہے۔ اسے ہجرت (Mijration) کہتے ہیں۔

"فرار" ایک اضطراری فعل ہے لیکن ہجرت ایک اختیاری عمل ہے چھپتے چھپاتے

اس لیے نکلنا ہوتا ہے کہ کہیں موانع حائل نہ ہو جائیں اور دعوت کے راستے کی اس اہم سعی و کوشش یعنی ہجرت میں رکاوٹ نہ پیدا ہو جائے۔ اس سراپا عزیمت عمل کو فرار کہنے والوں کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عمل کافی و شافی جواب ہے کہ انھوں نے خانۂ کعبہ میں حاضر ہو کر اور طواف بیت اللہ سے فارغ ہو کر مخالفوں کے سامنے بلکہ ان کے سرغنوں کے سامنے یہ کہا کہ اس وقت عمرؓ راہِ خدا میں ہجرت کر رہا ہے جو چاہتا ہے کہ اس کی ماں اس پر روئے وہ حدودِ حرم سے باہر آکر مجھ سے مقابلہ کرے۔

بہر حال دعوتِ دین کے سلسلہ میں ہجرت ایک کلیدی مرحلہ ہوتی ہے۔ اس طرح ہجرت سے دو تین سال پہلے معراجی ہدایات میں ہجرت کو شامل کر کے امت کی ذہن سازی کی گئی کہ اب عنقریب ایمان والوں کو دعوت کے سلسلہ کی اہم چیز ''ہجرت'' کو اختیار کرنا ہے۔

دوسری اہم چیز جہاد:

جیسا کہ عرض کیا گیا دعوت کے سلسلہ کی دوسری اہم چیز جہاد ہے۔ خدا کے راستے میں جدوجہد جان و مال کے ساتھ مکی زندگی سے رخصتی اور مدنی زندگی کے داخلہ کے موقع پر تمام مہاجرین نے اپنا سب مال خدا کی نسبت پر چھوڑ دیا۔ انھوں نے مال دیکر جان و ایمان کا سودا کیا۔ اور مدینہ والوں نے مہاجرین کو رہنے کی جگہ دی اور مال ان پر لگایا اور ان کی مدد کی۔ گویا سو فیصد مال اپنی مرضی پر نہیں، خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق لگایا۔

پھر مکی زندگی میں اپنی مشہور عربی شجاعت، حوصلہ و جرأت مندی کے باوصف چونکہ خدا کا حکم نہیں تھا اپنے جذباتِ انتقام کے پیچ و خم پر قابو رکھا اور اپنے ہاتھوں کو روکے رکھا۔ مار تو کھائی مگر مارا نہیں۔ موت کے گھاٹ خود اتر گئے کسی کو اتارا نہیں۔ اس طرح انھیں جذباتِ انتقام سے پاک کر دیا گیا تو اب ان کے لڑنے کا جذبہ صرف رضائے الٰہی کے لیے ہو گیا۔ تو پھر مدنی زندگی کے دوسرے ہی سال سے جہاد کی آخری کڑی "فقاتل فی سبیل اللہ" کا حکم بھی آگیا۔ پسپائی کو اتنا اختیار کرنا کہ وطن بھی چھوڑ دے اس کے باوجود باطل اپنے مفسدانہ رویہ اور غرور کو نہ چھوڑے بلکہ اور اکڑنے لگے اور اس کی مفسدانہ

سرگرمیاں مزید بڑھ جائیں تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ قتال فی سبیل اللہ کی اجازت دیدی جائے۔

قبل ہجرت کا وقفہ جمالی ہوتا ہے جس میں تواضع ہے، تحمل ہے اور سب کچھ جھیلنا ہے۔ اور یہ سب کچھ تو اصبوا بالصبر کا مظہر ہوتا ہے۔ بعد ہجرت کا وقفہ جلالی ہوتا ہے کہ باطل اچھلنے لگتا ہے تو اپنے تمام اخلاقی ضابطوں کے مظاہروں کے ساتھ ساتھ اسے دبانے کے لیے طاقت کا استعمال کیا جائے اور یقتلوا و یقاتلوا کا مظاہرہ کیا جائے۔

معراج کے موقع کے اوامر میں جہاد کو شامل کرکے گویا اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ ایمان والوں کو ہجرت کے ساتھ ساتھ جہاد کے لیے بھی اپنے آپ کو تیار رکھنا ہے۔ اللہ کے راستے میں جدو جہد کرنے والوں کی مثال بھی معراج کے تمثیلی واقعات میں دکھائی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا جو ایک ہی دن میں تخم ریزی بھی کرلیتی ہے۔ اور فصل بھی کاٹ لیتی ہے۔ کاٹ لینے کے بعد وہ کھیتی پھر پہلے جیسی ہوجاتی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔ ان کی ایک نیکی سات سو نیکیوں سے بھی زیادہ ہوجاتی ہے اور یہ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو نعم البدل عطا فرماتا ہے۔

معراجی ہدایات کے اگلے دو امور یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر بحث کرنے سے پیشتر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر اس بارے میں بھی غور کیا جائے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے معراجی تمثیلی اشارات اور معراجی ہدایات کے بارے میں کیا اقدامات کیے۔ (۱)

معراجی تمثیلی اشارات کی ترغیب:

معراج کے عدیم النظیر سفر میں جو واقعات تمثیلی انداز میں دکھائے گئے تھے اور وہ احکامات وہدایات جو عطایا کے طور پر مرحمت فرمائے گئے تھے، ان پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ دوران سفر عالم مثال کے واقعات کی روشنی میں جن امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جسے ہم نے تمثیلی اشارات سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) اس سے ہماری مراد وہ امور ہیں جن کا ذکر مسلم شریف کی حدیث اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں کیا گیا ہے جسے ہم نے معراجی ہدایات سے تعبیر کیا ہے۔

اپنے مہتم بالشان سفر سے واپسی کے بعد عمل شروع فرمادیا۔ایک طرف خصوصی احکامات کے لیے بیعت لینی شروع فرمائی تو دوسری طرف دعوت کے سلسلہ کی اہم اور آخری کڑیاں یعنی ہجرت وجہاد کے لیے آمادہ ومستعد کرنا شروع فرمایا۔اس کے لیے واقعات کے تسلسل کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔مختلف کتب سیرت کے مندرجات کو ذہن میں رکھیں تو واقعات کا جو ترجیحی تسلسل(۱) سامنے آتا ہے وہ اس طرح ہے۔

(الف) رمضان یا شوال ۱۰ھ نبوی میں ابو طالب کا انتقال۔اس سے تین یا پانچ ہی دن بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا وصال۔

(ب) ان زخمہائے پے درپے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نبی اکرم ﷺ اخیر شوال میں طائف کا تبلیغی سفر فرماتے ہیں۔

(ج) سفر طائف کے تقریباً ۹ ماہ بعد ۲۷رجب ۱۱ھ نبوی کو معراج کا مہتم بالشان سفر درپیش ہوتا ہے۔

(د) واقعہ معراج کے ۴/۵ ماہ بعد اسی سال ذی الحجہ ۱۱ھ نبوی میں مدینہ والوں کا ایک وفد آتا ہے۔حضور اقدس ﷺ اس وفد سے مقام عقبہ پر ملاقات فرماتے ہیں اس وفد مدینہ میں ۶/ حضرات تھے جنھوں نے حضور اقدس ﷺ کے دست مبارک پر ایمان کی بیعت کی۔اور اہل مدینہ کو نبی رحمت ﷺ کی دعوت کی طرف متوجہ کرنے کا عزم کیا۔

(ھ) اس سعئ مسعود کے نتیجہ میں ذی الحجہ ۱۲ھ نبوی میں مدینہ سے ایک دوسرا وفد آتا ہے جو ۱۲/ افراد پر مشتمل تھا۔اور مقام عقبہ پر ہی اس وفد نے بھی حضور اقدس ﷺ سے ملاقات کی۔ان بارہ حضرات میں پانچ پرانے اور سات نئے حضرات تھے۔ان سب نے حضور اقدس ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی جو بیعت عقبۂ اولیٰ کہلاتی ہے۔

(و) پھر ذی الحجہ ۱۳ھ نبوی میں ۷۳/مرد اور ۲/ عورتوں پر مشتمل ۷۵/ افراد کا ایک

---

(۱) ترجیحی تسلسل سے مراد واقعات کے مہینوں اور سالوں کے بارے میں بعض جگہ اختلاف ہوتا ہے۔کتب سیرت کے مندرجات کی روشنی میں واقعات کے جس تسلسل کو ترجیح دی گئی ہے اسی کو ترجیحی تسلسل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قافلۂ مدینہ اسی مقام عقبہ پر حضور اقدس ﷺ سے ملاقات کرتا ہے اور آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرتا ہے اس بیعت کو بیعت عقبۂ ثانی کہتے ہیں۔

(ز) سفر معراج کے قریباً دو سال سات ماہ بعد حضور اقدس ﷺ نے ربیع الاول ۱۳ نبوی میں مدینہ کو ہجرت فرمائی۔(۱)

واقعات کے اس ترتیبی تسلسل کو ذہن میں رکھیں تو یہ بات بہت واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ معراج سے واپسی کے ۴/۵ ماہ کے اندر ہی اندر حضور اقدس ﷺ نے وفد مدینہ کے چھ حضرات پر مقام عقبہ میں ایمان پیش کیا۔ اہل مدینہ، احبار یہود سے اس بات کو سنتے تھے کہ نبی آخر الزماں ﷺ کے مبعوث ہونے کا زمانہ قریب ہے اور یہود اس بات کی تمنا رکھتے تھے کہ وہ (یہود) نبی آخر الزماں ﷺ کا ساتھ دیکر اپنے قومی ادبار کو دور کریں گے اور گذشتہ شان و شوکت اور حکومت کو حاصل کریں گے۔ اہل مدینہ نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہود اس سعادت اور فضیلت میں ہم سے سبقت لے جائیں۔ اس لیے انھوں نے فوراً بطیب خاطر حضور ﷺ پر ایمان لاکر سبقت فی الایمان کا اعزاز حاصل کیا۔

بہر حال قبول ایمان کے ساتھ ان چھ حضرات مدینہ نے یہ اجازت بھی چاہی کہ وہ اہل مدینہ کو دعوت ایمان دیں گے۔ جو انھیں دربار رسالت سے مرحمت فرمادی گئی۔

---

(۱) تمام ہی سیرت نگاروں نے (سیرۃ النبی، سیرۃ المصطفےٰ، سیرت رحمۃ للعالمین، اور قصص القرآن) حضور ﷺ کی ہجرت کو بیعت عقبۂ ثانی کے بعد تحریر فرمایا ہے اور بیعت عقبۂ ثانی کو ذی الحجہ ۱۳ نبوی کا اور ہجرت کو ربیع الاول ۱۳ نبوی کا واقعہ قرار دیا ہے۔ اس طرح گویا دو باتوں پر سیرت نگاروں کا اتفاق ہے۔ ایک یہ کہ ہجرت بیعت، عقبۂ ثانی کے بعد ہوئی ہے دوسرے یہ کہ یہ دونوں واقعات یعنی بیعت عقبۂ ثانی اور ہجرت ایک ہی سال کے واقعات ہیں۔ لیکن جبکہ ہجرت ربیع الاول میں اور بیعت عقبۂ ثانی ذی الحجہ میں ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہجرت پہلے ہوئی اور بیعت عقبۂ ثانی کی بات ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے۔ اور اگر بیعت عقبۂ ثانی کو ذی الحجہ سے پہلے مان بھی لیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں واقعات ایک سال کے نہیں ہیں۔ اور بیعت عقبۂ ثانی ذی الحجہ ۱۳ نبوی اور ہجرت ربیع الاول ۱۳ نبوی کا واقعہ ہے یا بیعت عقبۂ ثانی، ذی الحجہ ۱۲ نبوی اور ہجرت ربیع الاول ۱۳ نبوی کا واقعہ ہے۔ اس الجھاؤ کا حل اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ سن نبوت کا آغاز باعتبار سال ماہ محرم سے نہیں بلکہ باعتبار نبوت ماہ نبوت سے مان لیا جائے۔ اور مورخین کی تصریحات کے مطابق حضور ﷺ کو ۸/ ربیع الاول یا ۷/ رمضان المبارک میں خلعت نبوت سے نوازا گیا اس طرح پہلے والے سال کے ربیع الاول یا رمضان سے بعد والے سال کے ربیع الاول یا رمضان تک ایک ہی نبوی سال ہوگا۔ اس طرح پہلے سال کا ذی الحجہ اور دوسرے سال کا ربیع الاول ایک ہی سال میں شمار ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس طرح دعوت دین کی یہ سعی اول تھی جو مدینہ تک پہنچ گئی۔ اور جس کے نتیجہ میں ذی الحجہ ۱۲ھ نبوی میں ۱۲/ حضرات مدینہ سے تشریف لائے جن میں پانچ تو پہلے والے تھے اور سات حضرات نئے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے ان بارہ حضرات سے باقاعدہ بیعت لی۔ بیعت کے امر حسب ذیل تھے۔

۱- ہم خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔
۲- ہم چوری اور زناکاری نہیں کریں گے۔
۳- ہم اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔
۴- ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کریں گے۔
۵- ہم نبی کی اطاعت ہر ایک بات میں کیا کریں گے۔ (رحمۃ للعالمین ج۱ ص ۷۷)

ان امور پنجگانہ میں تیسری بات کے علاوہ ہر بات کا ذکر معراج کے موقع پر آگیا ہے۔ پہلی بات تین خصوصی عطایا میں سے ایک ہے جس طرح کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالی نے حضور ﷺ کو تین عطیے مرحمت فرمائے۔ (۱) نماز (۲) خواتیم سورۂ بقرہ۔ اور (۳) شرک سے اجتناب پر کبائر سے درگزر۔ دوسری اور چوتھی بات کو بیت المقدس تک کے سفر میں عالم تمثیل میں دکھایا گیا ہے کہ آپؐ نے زانی مردوں اور عورتوں کو دیکھا کہ وہ پکا ہوا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے چغل خور اور عیب چینی کرنے والوں کو دیکھا کہ ان کے پہلو کا گوشت کاٹ کر انھیں کو کھلایا جا رہا تھا۔ پانچویں بات کا اشارہ خواتیم سورۂ بقرہ میں آگیا ہے سمعنا واطعنا غفرانك ربنا واليك المصير۔

اس طرح معراج کے بعد کے اس ایک سال اور ساڑھے چار ماہ کے زمانہ میں حضور اقدس ﷺ، معراجی اشارات واحکامات کی تنفیذ کی فکر وکاوش فرماتے رہے۔ اس کے مزید ایک سال بعد تک یعنی ذی الحجہ ۱۳ھ نبوی کے انھیں معراجی اشارات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ان کی ترغیب دیتے رہے۔

معراج سے بیعت عقبۂ ثانی تک ان تمام اشارات یا احکامات پر عمل درآمد کرتے رہے جو بیت المقدس تک کے سفر کے دوران عالم مثال میں دکھائے گئے تھے۔ اس کے بعد معراجی خصوصی ہدایات حکیمانہ تسلسل کے ساتھ فرائض میں شامل ہوتی گئیں۔ (جاری)

اسلام، عورت اور مغربیت

از: محمد فرقان قاسمی۔ علیگ۔ سلطان پوری

مشرق میں آج کل عورت کے حقوق اور مردوں کے ساتھ اس کی کامل مساوات کے متعلق زور و شور سے بحث جاری ہے۔ اس بحث میں حقوق نسواں کے سرگرم حامیوں جس میں وہ مرد اور عورتیں بالخصوص قابل ذکر ہیں جو اسلام کے نام پر بعض انتہائی احمقانہ باتیں کہتی اور ذکر کرتی ہیں۔ ان میں بعض تو محض شرارتاً یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے ہر لحاظ سے مردوں اور عورتوں میں کامل مساوات ملحوظ رکھی ہے اور بعض اپنی جہالت یا کم فہمی کے باعث یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام عورت کا دشمن ہے کیونکہ وہ اسے حقیر خیال کرتا ہے۔ اور ذہنی لحاظ سے فرومایہ قرار دے کر معاشرے میں اس کو ادنیٰ مقام دیتا ہے۔ جس کے بعد اس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں رہتا...... عورت مرد کی حیوانی شہوات و خواہشات کی محض تسکین کا ذریعہ اور بچے پیدا کرنے کی ایک مشین بن کر رہ جاتی ہے۔ مرد عورت کا حاکم بن بیٹھتا ہے اور زندگی کے ہر میدان میں اس پر اپنی بالادستی کی دھونس جمالیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں گروہ یکساں طور پر اسلام کے متعلق جہالت میں مبتلا ہیں یا پھر یہ لوگ جان بوجھ کر دوسروں کو دھوکا دینے کی خاطر حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہیں تاکہ مسلم معاشرے میں انتشار اور ابتری پھیلے اور اس طرح ان کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

یورپ کی تحریکِ آزادیٔ نسواں:

اسلام میں عورت کے مقام پر تفصیلی گفتگو کرنے سے قبل ہم یورپ کی تحریک آزادیٔ نسواں (Emancipation Movement) کی تاریخ کا ایک طائرانہ جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جدید مشرق میں پائے جانے والے تمام تر منحرف رجحانات کا سرچشمہ یہی تحریک ہے۔

عہد قدیم میں عورت کی حیثیت:

قدیم یورپ بلکہ دنیا بھر میں عورت کو کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں تھی۔ قدیم علماء اور فلاسفہ عرصۂ دراز تک اس بارے میں کچھ اس قسم کے موضوعات پر سر کھپائے رہے کہ کیا عورت میں بھی روح ہوتی ہے؟ اگر اس میں روح ہوتی ہے تو یہ انسانی روح ہے یا حیوانی روح؟ اور اگر انسانی روح ہے تو مرد کے مقابلے میں اس کا صحیح معاشرتی مقام کیا ہے؟ کیا عورت پیدائشی طور پر ہی مرد کی غلام ہے یا غلام سے اس کا مقام کچھ اونچا ہے؟

یونان اور روم:

یہ صورتِ حال تاریخ کے ان قلیل وقفوں کے دوران بھی جوں کی توں رہی جن میں بظاہر عورت کو معاشرے میں مرکزی اہمیت حاصل تھی جیسا کہ قدیم تاریخ یونان اور روما میں نظر آتا ہے مگر عورت کی یہ ساری قدر و منزلت اس کی نسوانیت کی بناء پر نہیں تھی اور نہ ہی بحیثیت مجموعی پورے طبقۂ نسواں کی عزت و تکریم تھی بلکہ یہ بات بڑے بڑے شہروں میں رہنے والی چند نمایاں عورتوں کی تعظیم و تحریم تک ہی محدود تھی جو اپنے بعض ذاتی اوصاف کی وجہ سے معاشرتی تقریبات کی روحِ رواں تھیں۔ انکی حیثیت بگڑے ہوئے اور عیاش طبقے کے لیے محض ایک ذریعہ، تفریح کی تھی۔ چنانچہ ایسا طبقہ دل کھول کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا مگر یہ عورت کی بحیثیت انسان تعظیم و تکریم نہ تھی کیونکہ اس کا تمام تر انحصار اس بات پر تھا کہ عورت مرد کے لیے کہاں تک عیش و عشرت کا ذریعہ بن سکتی ہے؟

جاگیرداری دور میں:

یورپ میں عورتوں کی یہ حیثیت زرعی غلامی اور جاگیرداری (SERBDOM) دور میں بھی برقرار رہی۔ اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے عورت باربار زندگی کی ظاہری زیب وزینت اور چکاچوند سے فریب کھاتی رہی۔ اور یہ سوچ کر کہ زندگی صرف اسی کا نام ہے اس نے محض کھانے پینے بچے پیدا کرنے اور دن ورات جانوروں کی طرح کام میں جتے رہنے کو اپنا وظیفہ حیات سمجھ لیا۔

جب یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا تو یہ عورت کے لیے بدترین مصائب و آلام کا پیغام ثابت ہوا۔ اب اسے جن مصائب و آلام میں مبتلا ہونا پڑا انھوں نے پچھلی ساری داستان ظلم وستم کو مات کردیا۔

یورپ کا جو مجموعی مزاج اب تک سامنے آیا ہے وہ کچھ ایسی کجی اور سنگدلی سے مرکب ہے کہ جن کی وجہ سے وہ فیاضی اور خلوص دونوں صفات سے عاری نظر آتا ہے۔ اس نے ہر جگہ انسانوں کو شدید مصائب و آلام سے دوچار کیا مگر اس کے عوض انھیں کوئی فوری یا دُوررس مادی فوائد عطا نہیں کیے۔ بہر حال غلامی اور جاگیرداری کے ادوار میں حالات کچھ اس قسم کے تھے اور اس وقت کا مروجہ زراعتی نظام اس طرح کا تھا کہ اس میں مرد ہی کو عورت کے تمام اخراجات کا بار اٹھانا پڑتا تھا۔ یہ اس زمانہ کے حالات اور مزاج کے عین مطابق تھا مگر اس وقت بھی عورت گھریلو صنعتوں میں حصہ لیتی تھی جو صنعتیں ہر زراعی معاشرے میں پائی جاتی تھیں ان گھریلوں صنعتوں کے ذریعہ عورت مرد کو ان اخراجات اور مالی بار کا معاوضہ چکادیتی تھی جو وہ اس کی وجہ سے برداشت کرتا تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد:

مگر صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی کیا شہر اور کیا دیہات۔ سب جگہ صورت حال بالکل بدل گئی۔ خاندانی زندگی بالکل تباہ ہوگئی اور خاندان کے افراد کو جوڑنے والا رشتہ بھی ختم ہوگیا کیونکہ صنعتی انقلاب کی لائی ہوئی تبدیلی کے بعد مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں کو بھی گھر چھوڑ کر کارخانوں کی راہ اختیار کرنی پڑی تاکہ ملازمت کرکے

اپنا پیٹ پال سکیں۔ مزدوری پیشہ طبقے رفتہ رفتہ دیہات کو خیر باد کہہ کر شہروں میں آنے لگے۔ دیہات کی زندگی میں باہمی ذمہ داری اور تعاون واشتراک کی روح پائی جاتی تھی مگر اب جس شہری زندگی سے وہ دو چار ہوئے اس میں کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ کسی کو دوسروں حتی کہ اپنے ہمسایوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی ہر آدمی کی زندگی کا محور اس کی اپنی ذات تھی جس کے سوا اسے کسی سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی وہ اپنے سوا کسی اور کا بوجھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ شہروں میں نہ کوئی اخلاقی اصول تھا اور نہ کسی کو اخلاقی اصولوں کی پابندی کا کوئی خیال تھا۔ ساتھ ہی جنسی انارکی کی ایسی وبا پھیلی کہ مرد اور عورت اپنے جذبات و شہوات کی تسکین کا جو موقع پاتے اس سے بلا تکلف فائدہ اٹھاتے اور اخلاقی بندشیں منہ دیکھتی رہ جاتیں۔ اس کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں شادی کرنے اور گھر بسانے کی خواہش کمزور پڑگئی۔ اگر کچھ لوگوں میں یہ خواہش باقی بھی رہی تو وہ یہی چاہنے لگے کہ یہ مصیبت چند سال اور ٹل جائے تو بہتر ہے۔

اسی قسم کی شہادت پر بھروسہ کر کے مادہ پرست اور مارکسیت وکمیونزم کے علم بردار یہ دعویٰ کرنے لگے کہ صرف اقتصادی حالات ہی سماجی حالات کو وجود میں لاتے اور انسانی روابط کو متعین کرتے ہیں۔ ہمیں انسانی زندگی میں معاشیات کی اہمیت سے انکار نہیں مگر یہ کہنا غلط ہے کہ انسانی خیالات وجذبات اور طرز عمل کو صرف اقتصادی عوامل ہی درست کر سکتے ہیں۔ یورپ میں معاشیات کی جو اہمیت نظر آتی ہے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یورپ کے پاس کوئی اعلیٰ نصب العین نہ تھا جو دنیائے اسلام کی طرح یورپ کو روحانی عظمتوں سے روشناس کراتا اور وہاں کے معاشی روابط کو خالص انسانی بنیادوں پر استوار کرنے میں مدد دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو صرف یورپ کے مادی مسائل ہی حل نہ ہوتے بلکہ باقی دنیا کے لوگ بھی اس کی حد سے بڑھی ہوئی اور استحصالِ بے جا کا نشانہ نہ بنتے۔

عورت کی مظلومی اور محرومی:

ان صفحات میں ہمارا مقصد یورپ کی تاریخ پر کوئی تفصیلی گفتگو نہیں ہے کہ ہمیں صرف ان عوامل سے دلچسپی ہے جو یورپی تاریخ میں عورت کی تقدیر بنانے کے لحاظ سے

اہمیت رکھتے ہیں جیسا کہ ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں کہ صنعتی انقلاب کی وجہ سے بچوں اور عورتوں پر معاش کی جو ذمہ داری آپڑی تھی اس سے خاندانی رشتے کمزور پڑگئے اور خاندانی زندگی مکمل طور پر انتشار کی نذر ہوگئی۔ مگر اسی انقلاب میں سب سے مظلوم ہستی عورت تھی اس کو اب پہلے سے کہیں زیادہ شدید محنت کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسکا احترام اور وقار بھی رخصت ہو چکا تھا اس کے باوجود نہ نفسانی طور پر آسودۂ خاطر تھی اور نہ مادی لحاظ سے خوشحال۔ عورت بیوی ہو یا ماں۔ مرد نے صرف اس کا مالی سہارا بننے ہی سے انکار نہیں کیا بلکہ اپنی روزی آپ کمانے کی ذمہ داری بھی الٹا اس کے سر پر ڈال دی تھی۔ ان سب کے باوجود کارخانوں، تعلیم گاہوں اور اسپتالوں میں وہ بے انصافیوں کی شکار تھی یعنی اس کو کام زیادہ کرنا پڑتا تھا مگر معاوضہ مردوں کے مقابلہ میں کہیں کم ملتا تھا۔

یورپی عورت کی مظلومی کی اصل وجہ:

اگر یورپ کے معاشرتی مزاج کو جو بخل سنگدلی اور محسن کشی سے عبارت ہے پیش نظر رکھا جائے تو عورت کے ساتھ اس کے سلوک کو سمجھنا دشوار نہیں رہتا۔ اس نے کبھی بھی انسان کو بحیثیت انسان عزت واحترام نہیں دیا اور نہ اس کے ہاتھوں کبھی کسی کا بھلا ہوا ہے بلکہ جیسا کہ اس کا ماضی گواہ ہے اس نے ہر موقع پر دوسروں کو نقصان پہونچانے کی کوشش کی ہے بشرطیکہ اس کے نتیجے میں خود اس کو کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ یورپ کے اس مزاج میں مستقبل میں بھی کسی تبدیلی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ہے۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ اس کے حال پر رحم کر کے اس کو صحیح راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمادے اور اس کو روحانی پاکیزگی سے نوازدے تو بہتری کی امید پیدا ہو سکتی ہے۔ بہرحال جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں کمزور بچوں کو ظالم کارخانوں نے بے تحاشا اپنے مظالم اور بے انصافیوں کا تختۂ مشق بنایا ہے۔

سماجی مصلحین اور عورت:

آبادی کے ان کمزور طبقوں پر اس ظلم و بے انصافی کو بعض باضمیر افراد زیادہ دیر

تک برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ بچوں پر (جی ہاں بچوں پر عورتوں پر نہیں) اس ظلم کے انسداد کی کوشش شروع کر دی۔ ان سماجی مصلحین نے چھوٹے بچوں کو کارخانوں میں ملازم رکھنے کی مخالفت کی کیونکہ اس سے ان کی فطری نشو و نما رک جاتی تھی۔ اور جو قلیل معاوضہ انھیں ملتا تھا وہ ان کے مشکل اور غیر موزوں کاموں کے لحاظ سے ہرگز معقول نہ تھا۔ معاشرتی بے انصافی کے خلاف یہ احتجاج مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ ملازمت کی عمر بتدریج بڑھادی گئی۔ معاوضوں میں اضافہ کیا گیا اور کام کے اوقات میں کمی کر دی گئی۔

مگر عورت اب بھی مظلوم تھی کوئی اس کے حق میں آواز بلند کرنے والا نہ تھا اور نہ کسی کو اس کے حقوق کے تحفظ کی کوئی فکر تھی کیوں کہ اس کے لیے جس ذہنی پاکیزگی اور اخلاقی بلندی کی ضرورت ہے یورپ اس سے محروم تھا اس لیے عورت کی مصیبت کے ایام ختم نہ ہوئے۔ وہ دن رات محنت کرتی تب کہیں جاکر اپنا پیٹ پال سکتی تھی کیونکہ اسے جو معاوضہ ملتا تھا ویسا ہی کام کرنے والے مردوں کے معاوضہ سے بہت کم تھا۔

جنگ عظیم کا اثر:

پہلی جنگ عظیم میں یورپ اور امریکہ کے لاکھوں لوگ مارے گئے اور وہ اپنے پیچھے لاکھوں بے خاوند عورتیں چھوڑ گئے جنھیں انتہائی مصائب و شدائد سے دوچار ہونا پڑا اب نہ کوئی ان کا سہارا تھا اور نہ کوئی رکھوالا جس کی حفاظت میں وہ زندگی بسر کرتیں۔ جو لوگ ان کے لیے زندگی کا سہارا تھے ان میں سے کچھ تو مارے گئے تھے کچھ عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنھیں خوف، اعصابی کھنچاؤ اور زہریلی گیسوں نے زندگی بھر کے لیے ناکارہ بنادیا تھا اور کچھ کئی سال کی قید کاٹ کر تازہ تازہ قید خانوں سے رہا ہوئے تھے اور اپنے کھوئے ہوئے اعصابی توازن کو بحال کرنے کے لیے اپنے آپ کو دنیا کی دلچسپیوں میں گم کر دینا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے دلوں میں شادی کی کوئی خواہش موجود نہ تھی کیونکہ شادی کر کے وہ اپنے آپ کو جسمانی اور مادی جھنجھٹوں میں مبتلا کرنے کے لیے

ہر گز تیار نہ تھے۔

عورت کی بے بسی:

جنگ کی وجہ سے مردوں کی تعداد میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو پھر زندہ رہنے والوں کے بس کی بات نہ تھی۔ مزدوروں اور کارکنوں کی کمی کے باعث کارخانوں کے کام پر بہت برا اثر پڑا۔ جس کی وجہ سے جنگ کے نقصانات کی تلافی بھی ناممکن ہو گئی اس لیے عورتوں کو مجبوراً گھر سے باہر نکلنا پڑا اور مردوں کی جگہ لینی پڑی۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو وہ اور ان کے سارے متعلقین بوڑھی عورتیں اور چھوٹے بچے بھوک سے مر جاتے۔ مگر کارخانوں میں کام کرنے کے نتیجے میں عورت کو اپنی سیرت و کردار اور نسانیت کی قربانی دینی پڑی کیونکہ اب یہ اس کی ترقی میں سد راہ بن گئی تھی۔ اور اس کی موجودگی میں عورت کے لیے آزادانہ روزی کمانا مشکل ہو گیا تھا دوسری طرف کارخانہ داروں کا یہ حال تھا کہ وہ صرف کام کرنیوالے ہاتھ ہی نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنی شہوات نفسانی کا سامان بھی مانگتے تھے۔ عورت جس بے بسی سے دوچار تھی اس کی وجہ سے ان لوگوں کو اپنی حیوانی خواہشات کی تسکین کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ جس سے انھوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا اس طرح اب بیچاری کو دوہرے فرائض انجام دینے پڑے۔ ایک تو کارخانے میں مزدوری کرنا اور اس کے ساتھ کارخانہ داروں کا دل بہلانا۔ اب صرف بھوک ہی عورت کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ جنسی تسکین بھی اس کا ایک بڑا سنگین مسئلہ بن گئی تھی۔ جنگ میں مردوں کی ایک کثیر تعداد کے ختم ہونے کی وجہ سے اب ہر عورت کے لیے شادی بھی ممکن نہیں تھی کہ جائز ذریعے سے اس کے تمام صنفی تقاضے پورے ہو سکتے۔ دوسری طرف یورپ میں جو مذہب رائج تھا اس کی رو سے کثرت ازدواج کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی جیسا کہ اس قسم کے ہنگامی حالات میں اسلام نے انتظام کیا ہے۔" اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بے چاری یورپی عورت اپنے بے رحم جذبات و خواہشات پر چھوڑ دی گئی۔ ایک طرف روزی کمانے کی فکر اور جنسی نا آسودگی اور دوسری طرف قیمتی کپڑوں، بناؤں سنگار، بننے ٹھننے کی خواہش۔ ان سے مغلوب ہو کر وہ ایک مخصوص ڈگر پر چل پڑی۔

یورپی عورت کا کام اب صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ مردوں کا دل لبھائے۔ کارخانوں اور دوکانوں میں ملازمت کرے اور اپنی خواہشات ہر جائز و ناجائز ذریعے سے پوری کرے مگر اس کے پاس جس قدر سامان تعیش بڑھتا جاتا تھا اسی قدر اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی جس کو پورا کرنے کا طریقہ صرف یہ تھا کہ وہ اپنے کو زیادہ سے زیادہ محنت مزدوری کے لیے وقف کردے۔ کارخانہ داروں نے عورت کی اس مجبوری سے خوب فائدہ اٹھایا اور صریح بے انصافی کا ارتکاب کرتے ہوئے مردوں کے مقابلے میں اس کے کام کا معاوضہ بہت کم رکھا تاکہ وہ خود زیادہ سے زیادہ نفع بٹور سکیں۔

ان حالات اور واقعات کے نتیجے میں اس عظیم انقلاب کا رونما ہونا بالکل فطری امر تھا جس نے ظلم و بے انصافی پر مبنی صدیوں پرانے اس نظام کا خاتمہ کردیا۔

معاشرتی انقلاب کے بعد:

مگر اس انقلاب سے عورتوں کو کیا ملا؟ جسمانی لحاظ سے اب وہ پہلے سے زیادہ تھکی ہوئی تھی۔ معاشرے میں اس کی کوئی عزت نہ تھی وہ اپنی نسوانیت کھوچکی تھی۔ اب نہ کوئی اس کا خاندان تھا اور نہ بچے کہ جن کی خاطر قربانیاں دیکر وہ اپنی شخصیت کو اور حقیقی آسودگی اور عظمت کو پاسکتی مگر اس انقلاب کا ایک فائدہ ہوا کہ اس کے لیے بھی مردوں کے مساوی اجرت کا حق تسلیم کرلیا گیا اور یہی وہ فطری حق ہے جو اب تک یورپ عورت کو دے سکا ہے۔

مگر یورپی مرد اتنی آسانی سے اپنی بالادستی سے دست بردار ہونے والا نہیں تھا اور نہ عورت کے مقابلے میں اپنی انا کی شکست کو قبل کرنے والا تھا۔ عورت کے لیے مساوات کا اصول بھی اس نے ایک طویل اور شدید کشمکش کے بعد قبول کیا تھا یہ کشمکش بھی ایسی کہ جس میں وہ تمام سامان حرب وضرب استعمال کیا گیا جو بالعموم ایسی جنگوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اپنے حقوق کی اس جنگ میں عورت کو ہڑتالیں بھی کرنی پڑیں اور تعاون و اشتراک کا مظاہرہ بھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے متعدد پبلک اجتماعات بھی منعقد کئے اور صحافت کو بھی آلۂ کار بنایا۔ پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ملکی حالات کی اصلاح

ے لیے اس کو ملکی قانون سازی میں بھی مردوں کے ساتھ برابر حصہ لینا چاہئے۔ چنانچہ
پہلے تو حق رائے دہی کا مطالبہ پیش ہوا پھر رفتہ رفتہ یہ آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی حتیٰ
۔ یہ نعرہ گونجنے لگا کہ عورت کو ملک کی پارلیمنٹ کا رکن بننے کا حق بھی حاصل ہونا چاہئے۔
ونکہ اس کی پرورش ایک ایسے نظام تعلیم و تربیت کے تحت ہوئی تھی جو وظیفہ حیات کے
اظ سے مرد و زن میں کسی قسم کی تفریق کا قائل نہیں تھا اس لیے وہ آگے چل کر کاروبار
حکومت میں بھی مردوں کے ساتھ برابری کی مدعی ہوگئی۔

یہ اس جنگ کی داستان ہے جو یورپ میں عورت کو اپنے حقوق کی خاطر لڑنی پڑی۔
یہ ایک مسلسل داستان ہے جس کا تانا بانا بہت سے مربوط واقعات سے بنتا ہے۔ قطع نظر اس
امر کے کہ مردوں کو یہ نئی صورت حال پسند تھی یا نہیں۔ بہر حال عورت کو جلد ہی معلوم
ہوگیا کہ جس بگڑے ہوئے معاشرے کی سیادت و قیادت کے منصب سے اس نے مرد کو
تنی کامیابی سے محروم کیا اس میں وہ بھی اس قدر لاچار ہے جس قدر کہ مرد ہے۔

اس قسم کے واقعات کی شہادت کی بنیاد مارکسسٹ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ زندگی
میں معاشی عوامل ہی اصل بنیاد ہے جیسا کہ یورپ کی آزادئ نسواں کی تحریک سے ثابت
ہوتا ہے ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں کہ ہم زندگی میں معاشیات کی اہمیت کے منکر نہیں ہیں
لیکن یہ ضرور سمجھتے ہیں اگر یورپ والوں کے پاس اسلام کی طرح کوئی نصب العین اور نظام
زندگی ہوتا جو ہر طرح کے حالات میں عورت کی کفالت کے لیے مرد کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے
اور اگر بدرجہ مجبوری وہ اپنی روزی خود کمانے نکلتی ہے تو اس کو مردوں کے برابر اجرت
دلواتا ہے ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کثرت ازدواج کی اجازت دیتا ہے جس
سے عورت کو نہ یہ کہ صرف معاشی تحفظ حاصل ہوتا ہے بلکہ جنگوں کے مابعد پیش آنے
والے حالات میں اس کی جنسی تسکین کے لیے ایک جائز اور صاف ستھری راہ بھی نکل آتی
ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی نظام زندگی یورپ کے پاس ہوتا تو وہاں کی عورت کا مسئلہ یوں الجھ
کر نہ رہ جاتا۔

قارئین کرام کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آج بھی انگلستان میں سرکاری محکموں

میں مردوں کے مقابلے عورتوں کو کم تنخواہیں دی جاتی ہیں جب کہ انگلستان کو جمہوریت کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ وہاں ترقی نسواں کا یہ عالم ہے کہ کئی معزز خواتین کو برطانوی پارلیمنٹ کی اعزازی رکنیت بھی حاصل ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ اسلام عورت کو کیا مقام دیتا ہے۔ اور پھر اس سوال پر غور کریں کہ اس معاشرتی مقام کی موجودگی میں کیا کوئی ایسی تاریخی، جغرافیائی، اقتصادی، نظریاتی اور قانونی مجبوری پائی جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے ہمارے یہاں کی عورت کے لیے بھی اس طرح اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہو جس طرح کی اس کی مغربی بہن لڑ چکی ہے۔ اس کے بعد ہی ہم یہ جان سکیں گے کہ آیا حقوق نسواں مشرقی علم برداروں کا موجودہ شور و غوغا اور عوامی اجتماعات میں ہنگامہ آرائی حقیقت پر مبنی ہے یا محض یہ ان کے اپنے احساس کمتری کا کرشمہ ہے۔

اسلام کی بنیادی خصوصیت...... مساوات:

اسلامی نظام حیات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عورت کو بھی انسانیت کا ویسا ہی اہم جز قرار دیتا ہے جیسا کہ ایک مرد کو۔ اور اس میں بالکل ویسی ہی روح کا وجود مانتا ہے جیسی کہ مرد میں پائی جاتی ہے۔ چناں چہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً۔ (سورہ نساء رکوع ۱)

ترجمہ: اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد عورت پھیلائے۔

گویا مرد اور عورت اپنے نقطۂ آغاز، اپنی جائے قرار اور اپنے انجام کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ اور یکساں و مساوی حقوق کے حقدار ہیں۔ اسلام نے عورت کو مردوں کی طرح جان آبرو اور مال و جائیداد کے حقوق دیئے۔ اس نے عورت کی ذات کو محترم قرار دیا۔ اور کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں رکھی کہ وہ اس میں عیب نکالے یا پیٹھ پیچھے

اس کی برائی بیان کرے اور نہ کسی کو حق دیا کہ وہ اس کی ٹوہ میں رہے اور اس کو اپنے نسوانی فرائض کی بجا آوری کی وجہ سے حقیر جانے یہ سب حقوق عورت کو اسی طرح حاصل ہیں جس طرح مرد کو۔ ان میں مرد و عورت کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں بلکہ اس بارے میں اسلامی قوانین کا اطلاق دونوں پر مساوی طور پر ہوتا ہے چناں چہ قرآن کہتا ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَانِسَآءٌ مِّنْ نِسَآءٍ عَسٰی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَ لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ.

ترجمہ: اے ایمان والو ایک قوم کو دوسری قوم پر نہیں ہنسنا چاہئے کیا عجب (کہ جن پر ہنستے ہیں) وہ ان سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں۔ اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا یَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا. (سورۃ الحجرات آیت ۱۱)

ترجمہ: اور تجسس نہ کیا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت کرے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰی اَهْلِهَا. (سورۃ النور آیت ۲۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں مت داخل ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو اور جب تک اہل خانہ کو سلام نہ کرلو۔ کل المسلم علی المسلم حرام دمه و عرضه وماله. (بخاری و مسلم) ترجمہ: ہر ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، آبرو اور مال حرام ہے۔

اسی طرح آخرت میں اجر و ثواب کے لحاظ سے اسلام نے مرد و عورت کو مساوی مقام و درجہ عطا کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ. (سورۃ آل عمران آیت ۱۹۵)

ترجمہ: سو ان کی دعا کو ان کے ربّ نے قبول کرلیا۔ میں تم میں سے کسی شخص کے کام کو اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک دوسرے کے جز ہو۔

جائیداد کے حق میں مساوات:

جہاں تک مال و جائیداد کے حق کا تعلق ہے اس معاملے میں بھی اسلام نے عورتوں اور مردوں میں مساوات کو ملحوظ رکھا ہے۔ چناں چہ مرد ہو یا عورت۔ اپنی جائداد کی خرید و فروخت میں اور انتظام کرنے میں بالکل آزاد ہے۔ وہ چاہے اسے رہن رکھے، پٹہ پر دے، کسی کو ورثہ میں دیدے۔ فروخت کرے یا اس کو مزید زمین بنانے کا ذریعہ بنائے اس کو اپنی ضروریات پوری کرنے میں استعمال کرے۔ ان تمام معاملات میں عورتوں کو مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں قرآن کہتا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ. (سورة النساء، الآیت ۷)

ترجمہ: مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہن قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جسکو ماں باپ اور بہن نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (سورة النساء، الآیت ۳۲)

ترجمہ: مردوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ۔

یورپ اور جائیداد کا حق:

جہاں تک عورت کے حق جائیداد اور اس کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے اس بارے میں ہمیں دو باتیں یاد رکھنی چاہئے مہذب یورپ کے نظام قانون میں زمانۂ حال تک عورت کو ان میں سے کوئی ایک حق بھی حاصل نہیں تھا۔ قانونی طور پر وہ اپنے حقوق کو براہ راست استعمال کرنے کی بھی مجاز نہیں تھی بلکہ ان کا استعمال بالواسطہ طور پر کسی نہ کسی مرد مثلاً خاوند، باپ یا سرپرست کی وساطت سے کرتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ اسلام کی طرف سے عورت کو حقوق مل چکنے کے بعد بھی گیارہ صدی سے زائد عرصہ تک یورپ کی عورت اپنے ان حقوق سے محروم رہی جس کے حصول کی خاطر اس کو شدید کشمکش

ہ دوچار ہونا پڑا تھا۔ جسکے دوران نہ اس کی نسوانیت وعفت محفوظ رہی اور نہ ہی اس کا
ھی عزت ووقار سلامت رہا۔ اس کو نہ صرف ان چیزوں کی قربانی دینی پڑی بلکہ شدائد
صائب، قتل محرومیوں اور بدبختی وعزت فروشی کے ایک اندوہناک عمل سے بھی گزرنا
۔ اور ان سب کے باوجود اس کو ان حقوق کا ایک حقیر سا حصہ ملا جو اس سے پہلے اسلام
رتوں کو دے چکا تھا مگر اسلام کا یہ دینا معاشی حالات کے دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا اور نہ اس کی
ت پر کوئی دلبقاتی کشمکش کارفرما تھی بلکہ اس کی اصل اسلام کی یہ خواہش تھی کہ دنیا میں
انی زندگی کی دو بنیادی حقیقتیں ہیں۔ صدق اور عدل یہ عملی صورت میں جلوہ گر ہوں۔
ن خوابوں کی دنیا تک محدود نہ رہیں۔

دوسری یہ بات قابل ذکر ہے کہ اشتراکیت کا بالخصوص اور مغرب کا بالعموم یہ نقطہ
رہے کہ انسانی زندگی دراصل انسان کی معاشی حالات کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ ان کے
ریہ کے روسے جب تک عورت کو مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے تھے تو وہ اپنی جائیداد
یت میں آزادانہ تصرف کی مجاز نہیں تھی۔ وہ قطعاً آزادانہ حیثیت کی مالک نہیں تھی۔
کو آزاد انسانی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب وہ معاشی لحاظ سے آزاد ہوئی اور اس
ل ہوئی کہ وہ اپنی ملکیت میں کسی مرد کی مداخلت کے بغیر براہ راست پوری آزادی سے
ف کر سکے اور اس کو جس طرح سے چاہے استعمال کرے۔

رت کی آزادانہ حیثیت:

اگرچہ ہم انسانی زندگی کے بارے میں اشتراکیت اور سرمایہ داری کے اس تنگ
ریہ کے قائل نہیں ہیں جسکی وجہ سے انسانی زندگی جانوروں کی سی پست سطح پر گر کر رہ
ہے تاہم اشتراکی اور مغربی مفکرین کے اس خیال سے ہم اصولی طور پر متفق ہیں کہ
نی معاشرے میں انسانی جذبات اور خودشناسی کی نشوونما پر منظم معاشی حالت کا گہرا اثر
ہے اسلام اس لحاظ سے ایک امتیازی شان کا مالک ہے کہ اس نے عورت کو آزاد معاشی
م عطا کیا اور اس کو یہ حق دیا کہ وہ کسی درمیانی واسطے کے بغیر اپنی جائیداد میں جس طرح
ہے تصرف کرے۔ یہی نہیں بلکہ اسلام نے عورت کی زندگی کے [illegible]

شادی کے معاملے میں بھی عورت کو آزاد حیثیت عطا کی ہے اور یہ اعلان کردیا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں کی جاسکتی ہے۔ نکاح کی صحت کے لیے اس کی رضامندی ایک ضروری شرط ہے۔ (مسلم شریف و بخاری شریف)

اسلام نے عورت کی رضامندی کو اسقدر اہمیت دی کہ اگر نکاح کے بعد بھی کوئی عورت یہ کہہ دے کہ اس کا نکاح اس کی رضامندی سے نہیں کیا گیا تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔

علاحدگی کا حق:

اسلام سے قبل اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے آزادی کی طالب ہوتی تھی تو وہ ناجائز اور غلط طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہوتی تھی۔ خاوند کو اس پر کلی اختیار حاصل تھا اور وہ بالکل اس کے تابع فرمان تھی کیوں کہ نہ ملکی قانون میں طلاق کی گنجائش تھی اور نہ مروجہ مذاہب کے ضابطے ہی اس کو اپنے خاوند سے علاحدگی کی اجازت دینے کے مجاز تھے۔ اسلام نے عورت کو یہ حق بھی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں عطا کیا ہے کہ وہ جب چاہے اسے استعمال کرسکتی ہے۔

مشرق میں اس وقت جو سماجی اور معاشی حالات پائے جاتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے اس حق کی حیثیت ایک فریبِ نظر سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر مشرق کے یہ موجودہ حالات اسلام کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہیں اور یہ خواتین قوانین اسلامی کے عملی نفاذ میں سدراہ بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کے دورِ اول میں عورت اپنے اس حق کو استعمال کرتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت شارع اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے عورت کے اس حق کو تسلیم کیا ہے۔ آج ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ ان تمام اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے اور اس کی راہ میں حائل جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیا جائے۔ خواہ وہ مشرق کے موجودہ اقتصادی اور سماجی حالات کی پیداوار ہوں یا دوسروں کی دیکھا دیکھی غیر اسلامی طور طریقوں کی اندھی پیروی کا نتیجہ۔

اسلام نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھکر عورت کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جس سے چاہے شادی کرے اور اپنی پسند کے آدمی کو شادی کا پیغام دے۔

یورپی عورت کو یہ حق بہت بعد میں یعنی اٹھارہویں صدی میں حاصل ہوا۔ پھر بھی یورپ نے اس کو قدیم روایات کے خلاف عورت کی ایک بہت بڑی اور نئی فتح سے تعبیر کیا۔ گویا کہ یورپ نے کوئی نیا کارنامہ انجام دیا ہے۔

حصول علم کا حق:

اسلام ہی وہ مذہب ہے کہ جس نے ایک ایسے دور میں ساری انسانیت کے لیے علم کی اہمیت پر زور دیا جب دنیا میں ہر طرف جہالت اور تاریکی کا دور دورہ تھا۔ اس نے علم کو محض ایک مخصوص طبقے کا حق قرار نہ دیا بلکہ اس کو تمام انسانوں کے لیے ایک ناگزیر ضرورت بتایا اور تمام مسلمانوں کے لیے اس کا حصول ان کے ایمان واسلام کی ضروری شرط قرار دیا۔ یہ شرف بھی اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے عورت کو آزاد وجود قرار دے کر اس کو بتایا کہ علم کے بغیر اس کی شخصیت کی تکمیل ناممکن ہے۔ حصول علم جس طرح مرد پر فرض ہے اسی طرح عورت پر بھی فرض ہے کیوں کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ عورت جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنی عقل اور روح کو بھی ترقی دے تاکہ وہ بہتر زندگی گذار سکے۔ اس کے برعکس یورپ زمانۂ حال تک اس قسم کا کوئی حق تسلیم نہ کر سکا اور صرف اس وقت اس کو یہ حق دیا جب معاشی حالات نے یورپ کو حق دینے پر مجبور کر دیا اور اس کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہ رہی۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس جھوٹ کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام عورت کو ثانوی درجہ کی مخلوق سمجھتا ہے یا اس کو مرد کا تابع یا زیردست بنا کر رکھنا چاہتا ہے یا اسلام کی نگاہ میں اس کا وظیفۂ حیات سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا کیوں کہ اگر ان الزامات میں کچھ بھی حقیقت ہوتی تو اسلام عورت کے لیے علم کی اہمیت پر اس قدر زور ہرگز نہ دیتا عورت کے لیے حصولِ علم پر اس قدر زور دینے سے ظاہر ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عورت کو خدا کے یہاں بھی اور اسلامی معاشرے میں بھی ایک بلند اور باعزت مقام حاصل ہے۔ (جاری)

جماعت اہل حدیث کا قیام

اور اس کا پس منظر

از: مولانا محمد ناظم الدین قاسمی معلم مدرسہ مصباح العلوم بارسی ٹاکلی ضلع اکولہ۔ مہاراشٹر

نحمده ونصلي على رسوله الكريم امابعد:

اہل حدیث کا عنوان دو اصطلاحوں میں مختلف معانی کا حامل ہے:

۱- اہل حدیث باصطلاح قدیم ۲- اہل حدیث باصطلاح جدید

اصطلاح قدیم میں اس سے مراد وہ لوگ تھے جو حدیث روایت کرنے، پڑھانے، اس کے راویوں کی جانچ پڑتال کرنے اور اس کی شرح میں مشغول رہتے تھے انھیں محدثین بھی کہا جاتا تھا۔ اور وہ واقعی علوم حدیث میں شغف رکھنے والے اہل حدیث کہے جانے کے مستحق تھے اور کہے بھی گئے طبقہ علماء کی اصطلاح قدیم میں اہل حدیث سے مراد حدیث کے اہل لوگ تھے۔ اہل ادب، اہل فقہ، اہل تفسیر سب اسی طرح کی اصطلاحیں ہیں۔

اصطلاح جدید میں اہل حدیث سے مراد اہل علم کا کوئی طبقہ نہیں بلکہ ایک خاص مسلکی گروہ ہے جو ائمہ اربعہ میں سے کسی کی پیروی کا قائل نہیں۔ اہل حدیث کی یہ اصطلاح بہت بعد کی ہے۔ قرون وسطی میں یہ کسی مذہبی مسلک کا نام نہ تھا۔ جدید اصطلاح میں اس سے مراد جماعت غیر مقلدین ہے۔ اس میں پڑھے ہوئے اور ان پڑھ دونوں طرح کے لوگ شامل ہیں۔

آج کے عنوان میں اہل حدیث کا لفظ اسی جدید اصطلاح میں ہے۔ اور [illegible] سے مراد

جدید جماعت اہل حدیث ہے۔ جنھیں غیر مقلدین بھی کہتے ہیں۔ یہ حضرات براہِ راست حدیث سے انتساب کے مدعی ہیں۔ یہاں اہل حدیث سے مراد حدیث کے ماننے والے نہیں ہیں جیسا کہ اس کی لفظی دلالت ہے۔ کیوں کہ حدیث کو تو سب مسلمان اپنے لیے حجت مانتے ہیں۔ اور سب فرقے اس سے تمسک کے مدعی ہیں۔ جو حدیث کو نہیں مانتا وہ تو مسلمان ہی نہیں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا صرف ایک فرقہ اہل حدیث بمعنی حدیث کو ماننے والا ہو...... اور باقی مسلمانوں کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ وہ حدیث کو نہیں مانتے اور ہیں وہ بھی مسلمان۔

قرون اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں اہل حدیث سے مراد:

قرونِ اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں اہل حدیث سے مراد وہ اہل علم تھے جو حدیث پڑھنے پڑھانے والے راویوں کی جانچ پڑتال اور حدیث کی شرح و درایت میں مشغول رہتے ہوں۔ حدیث ان کا فن ہو اور وہ علمی طور پر اس کے اہل ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان ادوار میں اہل حدیث سے محدثین مراد لیے جاتے تھے۔ اگر کوئی علمی طور پر اس درجہ میں نہیں کہ حدیث پر کوئی فیصلہ دے یا اس کے راویوں کو پہچانے تو صاف کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ اہل حدیث میں سے نہیں ہے۔ عامی ہے۔ جیسے امام ترمذی ایک جگہ ابو ابراہیم الانصاری المدنی کے بارے میں لکھتے ہیں: **لیس ھو بالقوی عند اھل الحدیث** (ترمذی، ص ۲۴۲ ج، ۲) وہ راوی اہل حدیث کے یہاں قوی نہیں ہے۔ ایک راوی کے بارے میں لکھتے ہیں: **تکلم فیه بعض اھل الحدیث من قبل حفظه** (ترمذی، ص ۲۴۲ ج، ۲) اس میں بعض اہل حدیث نے حفظ کی رو سے کلام کیا ہے۔ پھر ایک جگہ لکھتے ہیں: **وھو ضعیف عند اھل الحدیث**۔ وہ اہل حدیث کے یہاں ضعیف ہے۔ امام ترمذی اہل حدیث کو کہیں کہیں اصحاب الحدیث کہہ کر بھی ذکر کرتے ہیں۔ حدیث **لاتزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق** کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان سے مراد اصحاب الحدیث ہیں امام بخاری نے بھی تصریح کی ہے کہ اس سے مراد علم حدیث کے ماہر اہل العلم ہیں۔

(بخاری، ص ۱۰۸۷ ج، ۲)

امام نووی شارح مسلم ساتویں صدی ہجری کے نامور محدث ہیں آپ نے ایک مقام پر حذف الفاظ کی بحث کی ہے اس میں آپ محدثین کی عادت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ جرت عادة اهل الحديث بحذف قال و نحوه فيما بين رجال الاسناد في الخط و ينبغي للقاري ان يلفظ بها (مقدمہ شرح نووی رص ۱۹ دہلی) ترجمہ: اہل حدیث کا طریقہ تحریری رجال اسناد میں قال وغیرہ کے الفاظ کو حذف کرنا رہا ہے لیکن قاری کو چاہئے کہ وہ انھیں بولا کرے...... ظاہر ہے کہ یہاں اہل حدیث سے مراد اصحاب اہل فن علماء اہل حدیث ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ کسی خاص مسلک کے عوام...... اس سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری تک اہل علم کے یہاں اہل حدیث سے مراد محدثین ہی لیے جاتے تھے۔

نویں صدی ہجری کے اہل حدیث میں حافظ ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ حدیث لن تزال هذه الامة قائمة على امر الله کی شرح میں لکھتے ہیں: وقد جزم البخاری بان المراد بهم اهل العلم بالآثار وقال احمد بن حنبل ان لم يكونوا اهل الحديث فلا ادری من هم (فتح الباری رص ۲۹۴ ج ۱) ترجمہ: امام بخاری نے پورے یقین سے کہا ہے کہ اس سے مراد احادیث کا علم رکھنے والے ہیں اور امام احمد فرماتے ہیں کہ اگر اس سے اہل حدیث مراد نہ ہوں تو میں نہیں جانتا کہ پھر کون لوگ مراد ہوں گے۔ دیکھئے یہاں اہل العلم بالآثار سے مراد ماہرین فن ہیں جو محدثین تھے۔ کسی ایک مکتب فکر یا فرقے کا نام نہ تھا۔ اسی طرح نویں صدی کے اہل حدیث میں حافظ ابن ہمامؒ ۸۶۱ھ یہ بحث کرتے ہوئے خوارج کو کافر کہا جائے یا نہیں۔ ذهب بعض المحدثين الى كفرهم قال ابن المنذر ولااعلم احداً وافق اهل الحديث على تكفيرهم (ردالمختار رص ۴۲۸ ج ۳) ترجمہ: بعض محدثین ان کی تکفیر کے قائل ہیں ابن المنذر نے کہا ہے میں نہیں جانتا کہ کسی نے اس پر محدثین کی موافقت کی ہو۔ دیکھئے حافظ ابن حجر اور حافظ ابن ہمام کے ناموں سے کون واقف نہیں ہے۔ پہلے بزرگ شافعی ہیں دوسرے حنفی۔ اور دونوں اہل حدیث سے حدیث کے علماء فن مراد لیتے ہیں۔ ان الفاظ سے کوئی خاص فقہی مسلک مراد نہیں لیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ تیرہویں صدی ہجری میں علامہ شامیؒ ۱۲۵۲ھ اسی بات کو نقل کرتے

ہیں اور اس میں کہیں یہ ذکر نہیں کرتے کہ اہل حدیث نام سے ان دنوں کوئی غیر مقلد جماعت بھی مراد لی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اہل حدیث سے وہ اہل علم ہی مراد لیے جاتے تھے جو فن حدیث میں ماہر اور صاحب الرائے ہوں۔ جس طرح تفسیر پڑھانے والے اہل تفسیر، زبان پر کامل مہارت رکھنے والے اہل لغت کہلاتے تھے۔ محدثین کا یہ طبقہ اہل حدیث کے نام سے بھی ذکر ہوتا تھا۔ ہندوستان میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے حدیث کی باقاعدہ اشاعت ہوئی آپ کے دور تک لفظ اہل حدیث اسی پرانی اصطلاح میں جاری تھا۔ اہل حدیث سے مراد ترک تقلید کرنے والوں کا خاص گروہ ہو...... یہ جدید اصطلاح اسلام کی تیرہ صدیوں تک کہیں نہیں ملتی۔ اس کا آغاز چودہویں صدی سے ہوا ہے۔

دورِ جدید میں اہل حدیث سے مراد:

اس اصطلاح جدید میں جماعت اہل حدیث سے مراد ہندوپاک کا ایک معروف مذہبی حلقہ ہے جو جمہور اہل السنّت والجماعت مسلمانوں سے ترک تقلید پر مختلف ہے۔ ان کا ائمہ اربعہ سے انفرادی فروعی اختلافات کے ساتھ کچھ ایسے بھی اختلافات ہیں جن میں یہ چاروں اماموں کے خلاف ہیں۔ جیسے طلاق ثلاثہ ایک مجلس میں اسے یہ ایک ہی طلاق قرار دیتے ہیں اور چاروں اماموں میں سے ایک بھی اس طلاق کے ایک ہونے کا قائل نہیں۔ امام نووی شارح مسلم لکھتے ہیں: قال العلماء فیمن قال لامرأته انت طالق ثلثاً فقال الشافعي و مالك و ابوحنيفة واحمد و جماهير العلماء من السلف والخلف يقع الثلاث (شرح مسلم، ص۴۷۸ ج۱) اسی طرح یہ حضرات آٹھ رکعت تراویح کے قائل ہیں حالاں کہ چاروں اماموں میں سے ایک بھی بیس سے کم کا قائل نہیں ہے۔ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں آج تک بیس رکعت تراویح پڑھی جارہی ہے اور یہی حنابلہ کا موقف ہے امام شافعی بھی اس میں جمہور امت کے ساتھ ہیں امام ترمذی لکھتے ہیں۔ اکثر اهل العلم على ماروى عن علي و عمر و غيرهما من اصحاب النبي عشرين ركعة وهو قول سفيان الثوري و ابن المبارك و الشافعي و هكذا ادركت

اهل مكة يصلون عشرين ركعة۔ (ترمذی ص۱۳۰ ج۱) اس قسم کے چند مسائل ہیں جن میں غیر مقلدین حضرات جمہور اہل سنت والجماعت سے مختلف ہیں۔

ہندوستان میں جماعت اہل حدیث باصطلاح جدید کا قیام اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بہت بعد شروع ہوا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے وقت ہندوستان کے کسی گوشہ میں فقہی اختلاف مسلک کی آواز نہ اٹھی تھی۔ سب اہل سنت والجماعت ایک ہی فقہی مسلک کے پیرو تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب اس عظیم علمی خدمت میں شریک تھے۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

"خلاصہ حال ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ہے کہ جب سے یہاں اسلام آیا چونکہ اکثر لوگ بادشاہوں کے طریقہ اور مذہب کو پسند کرتے ہیں اس وقت سے آج تک یہ لوگ (ہندوستان کے مسلمان) مذہب حنفی پر قائم رہے اور ہیں اور اسی مذہب کے عالم اور فاضل اور قاضی اور مفتی اور حاکم ہوتے رہے یہاں تک کہ ایک جم غفیر نے مل کر فتاویٰ ہندیہ جمع کیا اور اس میں شاہ عبدالرحیم والد بزرگوار شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی بھی شریک تھے"۔ (ترجمان وہابیہ ص۲۰)

شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی کے گھرانہ میں شاہ ولی اللہ صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب شاہ محمد اسحٰق صاحب وغیرہ جیسے محدثین پیدا ہوئے۔ یہ سب حضرات محدث کے نام سے معروف تھے اور پورے ہندوستان میں انھیں محدثین دہلی کی سند چلتی تھی اور علم حدیث کی مجلس ان ہی کے ہاں قائم ہوتی تھی۔ محدثین کا یہ سارا گھرانہ علم حنفیہ کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ جناب نواب صدیق حسن خاں اس خاندان کو "بيت علم الحنفيه" کہا کرتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ ان دنوں مقلد ہونے اور محدث ہونے میں کوئی تباین کی نسبت نہ تھی۔ تقلید سے ان کے مسلک کا اظہار ہوتا تھا اور حدیث سے ان کے فن کا پتہ چلتا تھا۔ حق یہ ہے کہ ان دنوں تک ہندوستان میں ترک تقلید کے عنوان سے "اہل حدیث" نام سے کوئی مذہبی مسلک معروف و موسوم ہی نہ تھا۔

مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو جانے کے بعد جب مسلمانوں پر کوئی اجتماعی گرفت نہ رہی تو عام ذہن کچھ آزادی فکر کی طرف مائل ہو گئے۔ عہد جدید کی اس آزادی میں تقلید کا

بند ٹوٹ گیا اور پھر دیکھتے دیکھتے کچھ لوگ مختلف کشتیوں میں سوار ہوگئے۔ چنانچہ شاہ محمد اسحاق دہلوی ۱۲۶۲ھ کے شاگردوں میں منسوب جناب میاں نذیر حسین صاحب ۱۳۲۰ھ سب سے پہلے اس بات میں نمایاں ہوئے۔ ان سے پہلے بنارس کے نومسلم مولوی عبدالحق نامی تقلید کے خلاف کچھ کام کر چکے تھے۔ صادق پور کے مولانا ولایت علی بھی کچھ اس طرف مائل ہوئے تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ اس سلسلہ کے شیخ الکل جنہوں نے ہندوستان میں ترک تقلید کے عنوان سے ایک علیحدہ مذہبی مسلک کی بنیاد کو اپنے طور پر مستحکم کیا وہ جناب میاں نذیر حسین دہلوی ہی تھے۔ جناب میاں صاحب بھی ابتداء میں خالص حنفی تھے اور بعد میں بھی ایک عرصہ تک کلیۃً فقہ حنفی کے خلاف نہ تھے ان کا موقف یہ تھا کہ جہاں تک حدیث سے براہ راست مسئلہ لے سکیں فقہ کی طرف رجوع نہ کیا جائے اور جو مسائل حدیث میں نہ مل سکیں ان میں فقہ حنفی پر اعتماد کر لیا جائے۔ فتاوی نذیریہ میں میاں صاحب کی یہی روش کارفرما ہی ہے اور جگہ جگہ فقہ حنفی سے استناد کیا گیا ہے۔

اہل حدیث ایک فرقہ کی صورت میں:

ابتداء میں اس جماعت کے لوگ اپنے آپ کو محمدی اور موحد کہلاتے تھے۔ پوری جماعت کسی ایک متعین نام سے متعارف نہ تھی۔ ان کے مخالفین انھیں لامذہب وہابی، غیر مقلد کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ بعد میں اس جماعت کے سرگروہ مولانا محمد حسین بٹالوی نے انگریزی حکومت کو درخواست دی کہ ان کے ہم خیال لوگوں کو سرکاری طور پر اہلحدیث کا نام دیا جائے اس کے بعد اس اصطلاح جدید میں اہل حدیث سامنے آئے اور ہندوستان میں ترک تقلید کے عنوان سے ایک مستقل مکتبہ فکر کی بنیاد پڑ گئی۔ ہندوستان کے مشہور عالم دین مولانا محمد شاہ صاحب شاہجہاں پوری لکھتے ہیں: "پچھلے زمانہ میں شاذ و نادر اس خیال کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے بلکہ انکا نام ابھی تھوڑے ہی دنوں سے سنا ہے۔ اپنے آپ کو تو وہ اہل حدیث یا محمدی یا موحد کہتے ہیں مگر مخالف فریق میں ان کا نام غیر مقلد یا وہابی یا لامذہب لیا جاتا ہے" (الارشاد الی سبیل الرشاد ص/۱۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جماعت کسی ایک نام سے موسوم نہ تھی مولانا محمد حسین بٹالوی کی کوششوں سے یہ جماعت اہل حدیث (باصطلاح جدید) کے

نام سے موسوم ہوئی۔

وہابی نام سے اختلاف کی وجہ:

وہابی نام سے اس کی اسمی مناسبت کے سبب شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے پیرو مراد لئے جاتے ہیں اور چونکہ یہ سب حضرات مقلد تھے اور امام احمد بن حنبل کی تقلید کرتے تھے اس لیے اہل حدیث جو ترک تقلید کے عنوان سے جمہور اہل سنت سے علیحدہ سمجھے جاتے ہیں مقلدین کی طرف اپنی نسبت پسند نہ کرتے تھے۔ اسلئے وہ لفظ وہابی کو اپنے لئے پسند نہ کرتے تھے۔ اسمیں انہوں نے انگریزی حکومت سے سر توڑ کوشش کی تو انگریزی حکومت نے انھیں لفظ اہل حدیث سے موسوم کردیا۔ دوسری طرف وہابیوں کے خلاف انگریزوں کی دشمنی تھی کیوں کہ جب شیخ محمد بن عبد الوہاب کے پیروں اور شریف مکہ کے مابین نجد اور حجاز کی سرحد پر جھڑپیں ہوتی تھیں۔ انگریزوں کے شریف مکہ سے گہرے تعلقات تھے وہ اسے ترکوں کے خلاف استعمال کرنے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن اسوقت نجد اور حجاز کی سرحد پر ان کی ہمدردیاں شریف مکہ کے ساتھ تھیں اسلئے ان کا وہابیوں کے خلاف ہونا ایک لازمی امر تھا۔ انگریزوں کے ہاں آل شیخ (وہابیوں) کا یہی تصور تھا کہ وہ ایک جنگجو حملہ آور گروہ ہے۔ جہاں کسی نے جہاد کا نام لیا انگریز اس پر بڑی آسانی سے لفظ وہابی سیٹ کردیتے تھے انگریز ہندوستان آئے تو یہاں بھی انہوں نے جسے ذرا سر اٹھاتے دیکھا اسے وہابی کا نام دیدیا چاہے اس کا محمد بن عبد الوہاب سے کوئی بھی رشتہ نہ ہو۔ عربی نہ جاننے کے باعث انگریز نہ جان سکے کہ شیخ کی نسبت کے بغیر کسی کو وہابی کا نام دینا علمی اعتبار سے درست نہیں۔ وہ اس لفظ کو جنگجو اور مجاہد کے معنی میں لیکر ہر آزادی پسند اور بہادر مسلمان کو وہابی کہتے رہے۔ جہاں کوئی آزادی کی تحریک چلی وہ اسے وہابیوں کی یلغار بتلاتے۔ جیسے مجاہد کبیر سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے روحانی خلیفہ اور شاگرد تھے۔ مگر چوں کہ انھوں نے ہندوستان میں فریضۂ جہاد کو از سر نو برپا کیا تو انگریزوں نے انھیں بھی باوجود حنفی ہونے کے وہابی کہا۔ انگریز چاہتے تھے کہ یہ لفظ آزادی کی تحریکوں میں حصہ لینے والوں کیلئے زیادہ سے زیادہ استعمال ہو۔ ان لوگوں کو وہابی کہتے جو کبھی ان کے سامنے آزادی کا دم مارتے یا کسی تحریک کا نام لیتے اور لفظ وہابی کا تصور ان کے ذہن میں خود نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ہی ڈالا تھا۔ موصوف لکھتے ہیں:

"اصل وہابی وہی لوگ ہیں جو پیرو محمد بن عبدالوہاب کے ہیں جس نے ۱۲۱۲ھ میں نشان مخالفت کا ملک نجد عرب میں قائم کیا تھا اور خود یہ ایک غریب جنگجو تھا اس کے جو مقلد ہیں وہی وہابی مشہور ہیں" (ترجمان وہابیہ ص ۱۱۱)

اس عبارت میں وہابی کا یہی معنی بتلایا گیا ہے کہ وہ جنگجو اور حملہ آور قسم کے لوگوں کا نام ہے۔ اور ہم غیر مقلدین ایسے ہرگز نہیں۔ غیر مقلدین نہ چاہتے تھے کہ انھیں ایک جنگجو یا جانباز قوم سمجھا جائے۔ وہ صرف ترک تقلید کے عنوان سے ایک علیحدہ مکتب فکر قائم کرنا چاہتے تھے یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہ اپنے آپ کو میدان جنگ میں نہیں صرف ایک مذہبی دائرہ میں رکھنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ مولانا اسماعیل شہیدؒ اور ان کی جماعت مجاہدین سے پوری لاتعلقی کا اظہار کرے اور لوگوں کو بتائیں کہ ان کا وہابیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ انگریز اس جماعت مجاہدین کو حنفی ہونے کے باوجود وہابی کا ٹائٹل دے چکے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ لوگ ہندوستان میں حکومت حاصل کرنے کی سعی میں ان کے خلاف ایک خطرہ ہیں۔ نواب صدیق حسن صاحب نہ چاہتے تھے کہ انکی جماعت کسی پہلو سے حکومت کی نظر میں معتوب ٹھہرے اسلئے وہ لفظ وہابی کو اپنے لئے گالی سے کم نہ سمجھتے تھے۔ مرحوم نواب صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "ہم کو وہابی کہنا ایسا ہے جیسا کوئی کسی کو گالی دے" (ترجمان وہابیہ ص ۱۰۱) اس سے معلوم ہوا کہ وہ حضرات لفظ وہابی سے کسی طرح رہائی چاہتے تھے تاکہ انگریز انھیں اپنا مخالف نہ جانیں۔

الغرض مذکورہ تفصیلات سے یہ بات سامنے آگئی کہ حضرات ائمہ اربعہ کی تقلید سے بیزار ایک گروہ نے اپنا نام اہل حدیث رکھ لیا جس کے شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی تھے لیکن ان کے عہد تک یہ جماعت مختلف ناموں سے معروف تھی کہیں یہ محمدی کہلاتی تھی کہیں انھیں موحدین کہا جاتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں کے دور تک کچھ اسی طرح کی کیفیت رہی۔ مولانا محمد حسین بٹالوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے بڑی تگ و دو سے اس گروہ کیلئے حکومت سے یہ ٹائٹل منظور کرایا اور اسی وقت سے یہ جماعت اہل حدیث کے نام سے چل رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں ترک تقلید کے عنوان سے جس شخص نے پہلے زبان کھولی وہ عبدالحق بنارسی تھا لیکن علمی پہلو سے اس کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔ جماعت کے شیخ الکل جناب میاں نذیر حسین دہلوی ہی سمجھے گئے اور انھی سے اس سلسلے کا علمی انداز میں باقاعدہ آغاز ہوا۔ (ملخصاً آثار الحدیث)

مذہب اسلام کے عورت پر احسانات

مولانا ابوجندل قاسمی

مذہب اسلام نے عورت پر بے شمار احسانات کئے ہیں۔ مرد کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور دلداری کا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی۔ لیکن قبل ازیں کہ یہ بتایا جائے کہ اسلام نے عورت کو کیا شرف بخشا یہ بتادینا ضروری ہے کہ مذہب اسلام سے پہلے وہ کس نظر سے دیکھی جاتی تھی۔

اقوام قدیمہ میں یعنی مذہب اسلام سے پہلے تمام قوموں میں عورت کو ایک ادنیٰ درجہ کی مخلوق قرار دیا گیا تھا۔ اخلاقی نقطہ نظر، قانونی حقوق اور معاشرتی برتاؤ ہر ایک حیثیت سے عورت کو گراہوا سمجھا جاتا تھا۔ عصمت وعفت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ مثلاً

یونان:

یونان میں عزت کا مقام مرد کیلئے مخصوص تھا۔ معاشرت کے ہر پہلو میں عورت کا مرتبہ گراہوا تھا۔ اس کو شیطان کی بیٹی اور برائی وبدی کی اصل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لئے نہ تہذیب وثقافت تھی اور نہ حقوق مدنیت یہ چیزیں جس عورت [illegible] وہ رنڈی ہوتی تھی۔ غرض ہر طرح اس کو محکوم اور حقیر وذلیل سمجھا جاتا تھا۔

روم:

اہل یونان کے بعد جس قوم کو دنیا میں عر[illegible] اہل روم تھے۔ مگر جب وہ تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو ان کے مجلسی نظام [illegible] ہے کہ مرد اپنے خاندان کا سردار ہے۔ اس کو اپنے بیوی بچوں پر پورے مالکانہ حقوق حاصل

ہیں۔ بلکہ بہت سے حالات میں وہ بیوی کو قتل کر دینے کا مجاز بھی ہے۔ نہ عورت کے جانی حقوق کا تصور ہے اور نہ مالی حقوق کا۔ اس کی قسمت میں ذلت و تحقیر کے سواء کچھ نہ تھا۔ اور حد یہ ہے کہ جہلاء تو در کنار علماء اور پیشوایان مذہب میں مدتوں یہ سوال زیر بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں۔ خدائے تعالیٰ نے اس کو روح بھی بخشی ہے یا نہیں؟

ہندوستانی سماج:

اسی طرح ہندوستانی سماج اور برہمنی زمانہ و تہذیب میں عورت کو ہمیشہ کمزور اور بے وفا نیز حقیر و ذلیل سمجھا گیا۔ شوہر مر جاتا تو عورت گویا جیتے جی مر جاتی۔ وہ کبھی دوسری شادی نہ کر سکتی۔ اس کی قسمت میں طعن و تشنیع اور حقارت و ذلت کے سوا کچھ نہ تھا۔ بیوہ ہو کر شوہر کے رشتہ داروں کیلئے بالکل خادمہ بن جاتی۔ اکثر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہو جاتیں۔ سسرالی رشتے ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ سسر اور سالے کے الفاظ اسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کا رواج ہو چلا تھا۔ بودھ مت میں بھی عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نیروان اور چھٹکارے کی کوئی صورت نہ تھیں۔

عرب جاہلیت:

اہل عرب میں بھی زمانۂ جاہلیت میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی کا عام رواج تھا۔ اس کے حقوق پامال کئے جاتے۔ اس کا مال مرد اپنی ملکیت سمجھتا۔ ترکہ و میراث میں وہ کچھ حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اپنی پسند سے دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا ممانعتی حکم نازل فرمایا۔ (سورۂ بقرہ آیت ۲۳۲) ایسے ہی دوسرے سامانوں اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی۔ اس سے بھی اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا۔ (سورۂ نساء آیت ۱۹) کھانے میں بہت سی چیزیں مردوں کیلئے خاص تھیں اور عورتوں کو ان سے محروم رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد مبارک ہے:

وَقَالُوْا مَافِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰیٓ اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ۔ (سورۃ انعام آیت ۱۳۹)

اور کہتے ہیں کہ جو بچہ ان مواشی کے پیٹ میں ہے اس کو تو خاص ہمارے مرد ہی کھاویں اور وہ حرام ہے ہماری عورتوں پر، اور جو بچہ مردہ ہو تو اس کے کھانے میں سب برابر ہیں۔ ترجمہ شیخ الہندؒ

دامادی ایک عیب تصور کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکیوں کا پیدا نہ ہونا ہی بہتر سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم اس جاہلانہ ذہنیت کو نہایت بلیغ انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۔ يَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَابُشِّرَبِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ اَلَاسَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۔ (النحل آیت ۵۸، ۵۹)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جاوے تو سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے۔ جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے۔ یا اس کو ذلت پر لیے رہے یا اس کو مٹی میں گاڑ دے۔ خوب سن لو ان کی یہ تجویز بہت ہی بری ہے۔ (حضرت تھانویؒ)

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ باپ نہایت سنگ دلی اور بے رحمی سے اس کو زمین میں زندہ گاڑ دیتا تھا۔ قرآن کریم کہتا ہے:۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر آیت ۸، ۹)

اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی۔ (ترجمہ حضرت تھانوی)

فرزدق شاعر کے دادا صعصعہ بن ناجیہ نے اسلام آنے تک تین سو لڑکیوں کو زندہ در گور ہونے سے بچایا تھا۔ (نفحة العرب ٤٢)

اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلے کے بڑے اندوہناک اور رقت آمیز واقعات بیان کیے ہیں ایران، چین و مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی، محکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزت نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لیکر پیدا ہوئی ہے یا اس کیلئے بھی عزت کا کوئی مقام ہے۔ مرد

اس پر ظلم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا اور وہ اس کے ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس کے اندر اس حد تک پیدا کردی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپکو شوہر کی "داسی" کہتی تھی۔ "پتی ورتا" اس کا دھرم تھا یعنی شوہر اس کا معبود اور دیوتا، کہیں اس کے زخموں کا علاج نہ تھا۔ اس بگڑے ہوئے عالم گیر ماحول میں عورت کے سلسلہ میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔

وہ اسلام ہے:

اسلام ہی نے عورتوں اور مردوں دونوں کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ اسلام ہی نے عورت کی عزت اور اس کے حقوق کا تخیل انسان کے دماغ میں پیدا کیا ہے۔ آج مساوات، حقوق نسواں، تعلیم نسواں اور بیداری اناث جیسے الفاظ کانوں میں پڑتے ہیں یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو رحمۃ للعالمین، فخر موجودات، سرور کائنات محمد عربی ﷺ کی زبان مبارک سے بلند ہوئی تھی اور جس نے افکار انسانی کا رخ ہمیشہ کیلئے موڑ دیا۔

عورتوں کے بھی حقوق ہیں:

وہ اسلام ہی ہے جس نے مرد کو خبردار کیا اور عورت میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ جیسے حقوق مرد کے عورت پر ہیں ویسے ہی حقوق عورت کے بھی مرد پر ہیں۔ ارشاد مبارک ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (سورہ بقرہ آیت ۲۲۸) اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل انہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں قاعدہ کے موافق۔

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

قربان جایئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے لائے ہوئے دین حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل وانصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں۔ آیت میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا، جس

کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خداداد تفوق کی بنا پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر ہی لیتا ہے فکر عورتوں کے حقوق کی ہونی چاہئے کہ وہ عادۃً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مسابقت کرنی چاہئے اور اگر عورتوں کی طرف سے مردوں کے حقوق میں کوئی کوتاہی بھی ہو جائے تو مرد کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے اور عورتوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ مردوں کا یہی درجہ ہے۔ (معارف القرآن از مقامات مختلفہ بتغیر واختصار)

عورتوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حکم:

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے مردوں کو حکم دیا کہ عورتوں کو ذلت و حقارت کی نظر سے مت دیکھو ظلم و بدسلوکی اور ناانصافی نہ کرو، اس کی عزت و آبرو سے کھلواڑ نہ کرو، ارشاد مبارک ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (النساء آیت ۱۹) اور عورتوں کے ساتھ خوبی کیساتھ گذران کیا کرو، اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شئی کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھدے۔ مثلاً وہ تمہاری خدمت گذار اور آرام رساں اور ہمدرد ہو، یہ تو دنیا کی منفعت ہے، یا اس سے کوئی اولاد پیدا ہو کر بچپن میں مر جاوے یا زندہ رہے اور صالح ہو جو ذخیرۂ آخرت ہو جاوے، یا اقل درجہ ناپسند چیز پر صبر کرنیکی فضیلت تو ضرور ہی حاصل ہو گی۔ (بیان القرآن)

عورت بھی مرد کی طرح روحانی ترقی حاصل کر سکتی ہے:

اسلام ہی نے عورت کو بتایا کہ ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں ان سے عورت بھی محروم نہیں، مرد اگر حسن بصری بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی شئی روک نہیں سکتی ہے۔ اس طرح سے اسلام

نے دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کیا۔ ارشاد ہے: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۔ (انساء آیت ۳۲) مردوں کیلئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کیلئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے (بیان القرآن)

ماں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم:

اسلام ہی نے بیٹے کو بتایا کہ خدا اور رسولؐ کے بعد سب سے زیادہ عزت اور قدر و منزلت کی مستحق تیری ماں ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے اچھے برتاؤ کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: امك ،قال :ثم من ،قال :امك ،قال :ثم من ،قال امك ،قال :ثم من ،قال ابوك ۔ (بخاری ص ۸۸۳ ج ۲ مسلم ص ۳۱۲ ج ۲) تمہاری ماں (تمہارے حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے) صحابی نے کہا پھر کون؟ فرمایا تمہاری ماں۔ کہا پھر کون؟ فرمایا تمہاری ماں کہا پھر کون؟ (چوتھی دفعہ) ارشاد فرمایا تمہارے والد۔

اس حدیث کا صریح پیغام یہ ہے کہ خدمت اور حسن سلوک کے بارے میں ماں کا حق باپ سے زیادہ اور مقدم ہے۔ قرآن کریم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کئی جگہ قرآن مجید میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کر کے خاص طور سے ماں کی ان تکلیفوں اور مصیبتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو حمل اور ولادت میں اور پھر دودھ پلانے اور پالنے میں خصوصیت کے ساتھ ماں کو اٹھانی پڑتی ہیں۔ (سورہ لقمان واحقاف)

جنت ماں کے قدموں میں ہے:

معاویہ بن جاہمہ سے روایت ہے کہ میرے والد جاہمہؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا جہاد میں جانے کا ارادہ ہے۔ اور میں اس سلسلہ میں آپ سے مشورہ لینے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے ان سے پوچھا: هل لك من ام، قال: نعم ،قال فالزمها فان الجنة تحت رجليها (نسائی ص ۵۳ ج ۲) کیا تمہاری ماں ہیں؟ انھوں نے عرض کیا: ہاں ہیں، آپ نے فرمایا: تو پھر انہی کی خدمت میں رہو، ان کے قدموں کے نیچے

تمہاری جنت ہے۔ قربان جایئے مذہب اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ پر کہ ایک عورت ذات یعنی ماں کو قدر و منزلت کو اتنا بڑھایا جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، بیٹے کیلئے سب سے بڑی نیکی ماں کی خدمت کو قرار دیا اور بتایا کہ اسی کی خدمت تجھکو جنت کا مستحق بنائیگی۔

ماں کی نافرمانی سخت گناہ ہے:

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان اللہ حرم علیکم حقوق الامہات۔ (بخاری ص۲۰۰ ج۱۔ مسلم ص۷۵ ج۲) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام کردی ہے۔

یعنی جب تک ماں باپ کسی ناجائز کام کا حکم نہ کریں اسوقت تک ماں باپ کی اطاعت ضروری اور نافرمانی حرام ہے۔ یہاں تک کہ علماء کرام نے فرمایا کہ اگر بیٹے نے نوافل کی نیت باندھ رکھی ہو اور ماں باپ کو پتہ نہو، پھر وہ کسی کام سے آواز لگائیں تو نیت توڑ کر آنا ضروری ہے۔

خدمت اور حسن سلوک کافر و مشرک ماں کا بھی حق ہے:

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے (حدیبیہ والے) معاہدہ کے زمانہ میں میری ماں جو اپنے مشرکانہ مذہب پر قائم تھی (سفر کرکے مدینے میں) میرے پاس آئیں، تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! ان امی قدمت علی وھی راغبۃ افاصلھا؟ قال نعم صلی امك۔ (بخاری ص۳۵۷، ۸۸۴ ج۱، ج۲۔ مسلم ص۳۲۴ ج۱) میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ کچھ خواہشمند ہے تو کیا میں اس کی خدمت کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اس کی خدمت کرو اور اس کے ساتھ وہ سلوک کرو جو بیٹی کو ماں کے ساتھ کرنا چاہئے)

حضرت اسماء صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی اور دوسری ماں سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بڑی بہن تھیں۔ ان کی ماں کا نام روایات میں "قیلہ بنت عبد العزیٰ" ذکر کیا گیا ہے۔ جنکو حضرت ابو بکرؓ نے زمانہ جاہلیت ہی میں طلاق دیکر الگ کردیا تھا۔ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں

جب مشرکین مکہ کو مدینہ آنیکی اور مسلمانوں کو مکہ جانے کی آزادی حاصل ہو گئی تو حضرت اسماءؓ کی یہ ماں اپنی بیٹی کے پاس مدینہ آئیں، حضرت اسماء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری ماں جو مشرک ہیں کچھ خواہشمند ہو کر آئی ہیں، یعنی وہ اس کی طالب اور متوقع ہیں کہ میں ان کی کچھ مالی خدمت کروں، بعض شارحین نے لفظ "راغبۃ" کا ترجمہ منحرف اور بیزار بھی کیا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میری والدہ ملنے تو آئی ہیں لیکن وہ ہمارے دین سے منحرف اور بیزار ہیں، ایسی صورت میں ان کے ساتھ میرا رویہ کیا ہونا چاہیے ؟ کیا ماں ہونیکی وجہ سے ان کے ساتھ حسن سلوک کروں یا کافر و مشرک ہونیکی وجہ سے ان سے ترک موالات اور بے تعلقی و بے رخی اختیار کروں ؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو جو ماں کا حق ہے۔ قرآن کریم میں سورۂ لقمان میں بھی اولاد کو یہی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ماں باپ کافر و مشرک ہوں اور اولاد پر بھی کافر و مشرک ہونے کے سلسلے میں زبردستی کریں تو ان کی بات نہ مانی جائے، لیکن بہر حال خدمت اور حسن سلوک میں پھر بھی کمی نہ کی جائے۔ (معارف الحدیث ۶/ ۵۴)

لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم:

آج تک بھی بہت سے علاقوں اور طبقوں میں لڑکی کو ایک بوجھ اور مصیبت سمجھا جاتا ہے، اور اس کے پیدا ہونے پر گھر میں بجائے خوشی کے افسردگی اور رنج و غم کی فضا ہو جاتی ہے، یہ حالت تو آج ہے، لیکن اسلام سے پہلے عربوں میں تو بیچاری لڑکی کو باعث ننگ و عار تصور کیا جاتا تھا اور اس کا یہ حق بھی نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کو زندہ رہنے دیا جائے۔ کچھ تفصیل اس سلسلہ کی اوپر مذکور ہو گئی۔

مذہب اسلام نے ہی باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تیرے لئے ننگ و عار اور حقارت کا باعث نہیں ہے، بلکہ اس کی پرورش، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کا حق دینا نیز اس کے ساتھ احسان کرنا تجھکو جنت کا مستحق بناتا ہے، چنانچہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من عال جاريتين حتى تبلغا جاء يوم القيمة انا وهو كهاتين، وضم اصابعه ۔(مسلم ص۳۳۰ج۲)جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہونچ جائیں تو قیامت کے دن میں اور وہ ان دو انگلیوں کی طرح ہو نگے، راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی انگلیوں کو ملادیا۔

لڑکیاں دوزخ سے بچاؤ کا سامان:

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من ابتلى من هذه البنات بشئ فاحسن اليهن كن له سترا من النار (بخاری ص۱۹۰ج۱مسلم ص۳۳۰ج۲) جس شخص پر اللہ تعالی کی طرف سے بیٹیوں کی ذمہ داری ڈالی گئی (اور اس نے اس ذمہ داری کو پورا کیا) اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو یہ بیٹیاں اس کیلئے دوزخ سے بچاؤ کا سامان بن جائیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی اگر بالفرض اپنے کچھ گناہوں کی وجہ سے سزا اور عذاب کے قابل بھی ہوگا تو لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کے صلہ میں اس کی مغفرت فرمادی جائیگی اور وہ دوزخ سے بچادیا جائیگا۔

لڑکیوں کی اچھی تربیت اور اچھے برتاؤ پر جنت کا فیصلہ:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد نقل کرتے ہیں کہ من كانت له ثلث بنات أو ثلث اخوات أو ابنتان أو اختان فاحسن صحبتهن واتقى الله فيهن فله الجنة (ترمذی ص۱۳ج۲) جس شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں پھر وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں اللہ تعالی سے ڈرے تو اس بندے کیلئے جنت کا فیصلہ ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حسن سلوک کو لڑکیوں کا صرف حق ہی نہیں بتلایا بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے اس پر یہ انتہائی خوشخبری سنائی کہ لڑکیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے اہل ایمان کیلئے داخلۂ جنت اور عذاب دوزخ سے نجات کا فیصلہ ہے۔

لڑکیوں کے ساتھ لڑکوں جیسا برتاؤ کرنے کا بدلہ:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا من کانت له أنثی فلم یأدها ولم یهنها ولم یؤثر ولده علیها یعنی الذکورا دخله الله الجنه۔ (رواہ ابوداؤد۔ مشکوۃ ص ۴۲۳) جس شخص کے ہاں لڑکی ہو اور اس کو زندہ دفن نہ کرے اور نہ اس کی توہین اور ناقدری کرے اور نہ برتاؤ میں لڑکوں کو اس پر ترجیح دے یعنی جیسا برتاؤ لڑکوں کے ساتھ کرتا ہے لڑکیوں کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت عطا فرمائے گا۔

بیوی کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم:

اسلام ہی نے مرد کو باخبر کیا کہ نیک بیوی تیرے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے وہ اگر تمہارے حقوق میں کچھ کوتاہی کرے یا آداب میں کچھ کمی ہو جائے تو تم پھر بھی اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ اور اچھا برتاؤ کرو۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

استوصوا بالنساء خیرا فانهن خلقن من ضلع وان اعوج شئ فی الضلع اعلاه فان ذهبت تقیمه کسرته وان ترکته لم یزل اعوج فاستوصوابالنساء (بخاری ص ۶۴۹ ج ۱۔ مسلم ص ۴۷۵ ج ۱) اے لوگو! بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کے بارے میں میری وصیت مانو۔ اسلئے کہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہے، اور زیادہ کجی پسلی کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے، پس اگر تم اس ٹیڑھی پسلی کو (زبردستی) سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر یوں ہی اپنے حال پر چھوڑ دوگے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، اسلئے عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کے بارے میں میری وصیت قبول کرو (یعنی اگر کوئی شخص زبردستی اور تشدد سے عورت کی مزاجی کجی نکالنے کی کوشش کرے گا اور مردوں کی طرح اس کو سیدھا کرنے کی جدوجہد کرے گا تو وہ کامیاب نہ ہو سکے گا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ افتراق اور

علیحدگی کی نوبت آجائے، اسلئے کہ دماغ وزبان میں کجی ان کی فطرت میں داخل ہے اور یہ ان کیلئے بدصورتی نہیں بلکہ خوبصورتی ہے۔ لہٰذا اگر تم ان سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسی فطرت پر قائم رکھکر اٹھالو، اسلئے مردوں کو چاہئے کہ وہ عورتوں کی معمولی غلطیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہتر سلوک اور دالداری کا برتاؤ کریں۔ "لفظ استوصوا" سے ہی آپ نے کلام شروع فرمایا تھا اور اسی لفظ پر ختم فرمایا، اس سے اندازہ کیاجاسکتا ہے کہ آپ کو عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا کس قدر اہتمام تھا۔

نیک عورت سب سے بڑی نعمت:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ الدنیا متاع وخیر متاع الدنیا المرأة الصالحة (مسلم ص۴۷۵ ج۱) دنیاایک سامان ہے، اور دنیاکا سب سے بہترین سامان نیک عورت ہے۔

مختلف احادیث میں نیک عورت کی بہت سی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً بعض احادیث میں ہے کہ بہترین عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کی آخرت کی تیاری پر مدد کرے، اور بعض روایات میں کہ بہترین عورت وہ ہے جو اپنی ذات اور شوہر کے مال میں کسی گناہ کی متلاشی نہ ہو اور کوئی خیانت نہ کرے۔ ایک روایت میں نیک عورت کی یہ علامات بتائی گئی ہیں۔ (۱) جب شوہر کوئی حکم دے تو عورت اطاعت کرے۔ (۲) جب تو اس کو دیکھے تو تجھ کو خوش کردے۔ (۳) جب شوہر قسم کھالے تو عورت بری کردے۔ (۴) جب شوہر غائب ہو تو اپنے نفس اور شوہر کے مال میں خیر خواہی کرے، نہ تو مال میں خیانت کرے اور نہ اپنی ذات میں کسی قسم کی خیانت کی مرتکب ہو۔ (الترغیب والترہیب ص۱۴۱ ج۳)

آدمی کے اچھا ہونے کا معیار:

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اکمل المؤمنین ایمانا احسنهم خلقا وخیارکم خیارکم لنسائهم (ترمذی ص۲۱۹ ج۱) مؤمنین میں سب سے کامل ایمان والا وہ شخص ہے جس کے اخلاق وعادات سب سے اچھے ہوں اور تم میں بہترین اور خیر کے حامل وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں بہتر ہوں

مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اچھائی اور بھلائی کا خاص معیار اور نشانی یہ ہے کہ اس کا برتاؤ اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہو۔

شوہر کو بیوی سے بلاوجہ نفرت نہیں کرنی چاہیے:

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لایفرك مؤمن مؤمنة إن كره منها خلقا رضی منها آخر۔ (مسلم ص۴۷۵ ج۱) کوئی ایمان والا شوہر اپنی مومنہ بیوی سے نفرت نہیں کرتا (یا نفرت نہیں کرنی چاہئے) اگر اس کی کوئی عادت ناپسندیدہ ہوگی تو دوسری کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر کو اپنی بیوی کی عادت واطوار میں کوئی بات مرضی کے خلاف اور ناپسندیدہ معلوم ہو تو اس کی وجہ سے اس سے نفرت اور بے تعلقی کا رویہ اختیار نہ کرے، اور نہ طلاق وغیرہ کے بارے میں سوچے، بلکہ اسمیں جو خوبیاں ہوں ان پر نگاہ کرے اور ان کی قدر وقیمت سمجھے، یہ بات مؤمن شوہر کی صفت ایمان کا تقاضہ ہے۔ گذشتہ آیت "وعاشروھن بالمعروف الخ" کی یہ حدیث تشریح کرتی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ در حقیقت اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عورت کی نسبت نہ صرف مرد کی بلکہ خود عورت کی اپنی ذہنیت کو بھی بدل دیا۔ اور جاہل ذہنیت کی جگہ ایک نہایت صحیح اور معتدل ذہنیت پیدا کی جس کی بنیاد جذبات پر نہیں، بلکہ خالص علم وعقل پر ہے۔

حاصل کلام:

اسی اخلاقی اور قانونی اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں عورت کو وہ بلند حیثیت حاصل ہوئی جس کی نظیر دنیا کے کسی معاشرہ اور سماج میں نہیں پائی جاتی۔ اسلام کے نزدیک عورت دین ودنیا میں مادی، عقلی اور روحانی حیثیات سے عزت اور ترقی کے ان بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے جن تک مرد پہنچ سکتا ہے اور اس کا عورت ہونا کسی بھی مرتبہ میں حائل اور رکاوٹ نہیں۔

آج اس بیسویں صدی میں بھی دنیا، اسلام سے کوسوں دور ہے، افکار انسانی کا ارتقاء اب بھی اس مقام تک نہیں پہنچا جس پر اسلام پہنچا ہے بلکہ پندرہ سو سال پہلے پہنچا تھا۔ مغرب نے جو کچھ عورت کو دیا ہے وہ عورت کی حیثیت سے نہیں دیا بلکہ مرد بنا کر دیا ہے، عورت درحقیقت اب بھی اس کی نگاہ میں ویسی ہی ذلیل ہے جیسی پرانے دور جاہلیت میں تھی۔ گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی، بچوں کی ماں نیز ایک اصلی اور حقیقی عورت کیلئے اب بھی کوئی عزت نہیں ہے۔ اگر عزت ہے تو اس مرد مؤنث یا زن مذکر کیلئے ہے جو جسمانی حیثیت سے تو عورت ہو مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو۔ اور تمدن و معاشرہ میں مرد ہی جیسے کام کرے، ظاہر ہے کہ یہ انوثت کی عزت نہیں بلکہ رجولیت کی عزت ہے۔

یہ کام صرف اور صرف اسلام نے کیا ہے کہ عورت کو تمدن و معاشرت اور تہذیب و ثقافت میں اس کے فطری مقام پر رکھکر عزت و شرف عطا کیا اور صحیح معنی میں انوثت کے درجہ کو بلند کر دیا، اسلامی تمدن عورت کو عورت اور مرد کو مرد رکھکر دونوں سے الگ الگ وہی کام لیتا ہے جس کے لئے مالک دوجہاں نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اسلام کے نزدیک مرد و عورت یکساں مفید اور یکساں قدر کے مستحق ہیں اس کے نزدیک نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ انوثت میں کوئی ذلت۔

ہم مسلمانوں کیلئے بھی ضروری ہے کہ عورت کو اس کے پورے حقوق دیں، ان پر ظلم و زیادتی سے بالکلیہ پرہیز کریں حسن سلوک سے پیش آئیں نیز حسن اخلاق کا مظاہرہ کر کے کمال ایمان کا ثبوت دیں۔ اللہ تعالیٰ سبھی مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ ●

آمین ثم آمین۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

صفر ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ جون

جلد ۸۳ شمارہ ٦ فی شمارہ /٦ سالانہ ٦٠/

مدیر	نگراں
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند	مہتمم دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۴۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰
ہندوستان سے ۔/٦٠

Tel: 01336 - 22429
FAX: 01336 - 22768
Tel.: 01336 - 24034 (EDITER)

REGD NO. SHN/L-13/NP-11/98

فہرست مضامین

یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہو گا۔

پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤدوالا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند کی معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

عوام جب دارالعلوم دیوبند کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں واقع وہ مدرسہ اسلامیہ ہوتا ہے جسے اب دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے

لیکن برصغیر کی دینی، علمی، سماجی اور سیاسی تاریخ سے واقف اصحاب علم و خبر جب دارالعلوم دیوبند کا نام لیتے ہیں تو اس سے ان کی مراد دیوبند میں واقع ایک مرکزی دینی تعلیم گاہ نہیں بلکہ ایک عظیم مکتب فکر اور ہمہ گیر انقلابی تحریک ہوتی ہے جس کی داغ بیل مسند ہند، فیلسوف اسلام امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اٹھارویں صدی کی ابتداء میں ڈالی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنت مغلیہ جسے بابر کی جفاکشی و سخت کوشی، ہمایوں کی نیک نفسی و عالی ہمتی، اکبر کا گنگا جمنی فکر و سیاسی تدبر، جہانگیر کا بے لوث عدل و محبت آشنا دل، شاہ جہاں کا لطیف ذوق و درویشانہ مزاج، عالم گیر کی بیدار مغزی و مجاہدانہ کردار نے قیام و استحکام اور عروج و ارتقا بخشا تھا۔ عیش و نشاط، شاہد و شراب اور چنگ و رباب کے سرمست طوفان میں ہچکولے کھا رہی تھی اور درباری امراء کی چیرہ دستیوں سے حکومت دہلی لعبۂ صبیاں و بازیچۂ اطفال بن گئی تھی۔

ایسے ابتر اور بگڑے حالات میں اصلاح احوال کے لئے بانی تحریک حضرت محدث دہلویؒ نے جس انقلابی پروگرام کا خاکہ تیار کیا اس کا الہامی عنوان تھا "فک کل نظام" یعنی ظلم و ناانصافی، اور جہالت و ضلالت پر مبنی ہر فکری، اقتصادی، معاشی، سماجی اور سیاسی نظام کو تہس نہس کر کے اس کی جگہ انصاف و قانون اور حق و صداقت کی بنیادوں پر قائم عادلانہ نظام برپا کیا جائے۔

حضرت شاہ صاحب نے اپنی اس انقلابی تحریک کے خدوخال، اصول و ضوابط اور دیگر تفصیلات سے تعلیم و تدریس کے ذریعہ اپنے تلامذہ و متوسلین کو روشناس کیا۔ پھر آپ کے جانشین صادق و فرزند جلیل سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی مؤمنانہ فراست، عالمانہ حکمت عملی اور پچاس سال کی پیہم سرگرمیوں سے اس نظری و علمی پروگرام کو حضرت سید شہید بریلوی، حضرت مولانا شاہ عبدالحی بڈھانوی، حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان کے رفقاء کے ذریعے عملی جہد و جہاد کا جامہ پہنایا اور بالآخر یہ انقلابی تحریک علمی، عملی، سماجی اور سیاسی تجربہ گاہوں سے ہوتے ہوئے اور جہد و عمل، دعوت و عزیمت، ایثار و قربانی اور ہجرت و جہاد کی بھٹیوں میں کندن بنتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی شکل اختیار کرلی۔

بالفاظ دیگر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا فکر و نظریہ، حضرت شاہ عبدالعزیز کی جامعیت و روحانیت، حضرت سید شہید کی استقامت و عزیمت، حضرت شاہ عبدالحی بڈھانوی کی فراست و اعتدال، حضرت شاہ اسماعیل شہید کی حمیت و صلابت، حضرت شاہ محمد اسحاق کی پاک نفسی و انکساری، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کی للّٰہیت و بے نفسی، حضرت مولانا مملوک علی کی علمی جلالت و شان و تربیت، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی روحانیت اور آہ نیم شبی، حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی عبقریت و شان مجددیت، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی فقاہت و تبحر علمی اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی جذب و فنائیت سے باہم مل کر جو مجموعی پیکر تیار ہوا علم

و تاریخ کی دنیا میں اسی پیکر جمیل کا نام دارالعلوم دیوبند ہے چنانچہ شیخ محمد اکرام! حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی ہمہ گیر خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔

"جو مذہبی نظام اسلامی ہندوستان میں سب سے زیادہ عام ہے ...... جسے شمالی ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز، مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے رائج کیا اور جو آج دارالعلوم دیوبند کی بدولت خواص سے گزر کر عوام کو متاثر کر رہا ہے۔ اسے شاہ ولی اللہ نے ترتیب دیا اور اگر کسی کو صحیح معنوں میں امام الہند یعنی اسلامی ہندوستان کے خاص مذہبی نظام کا مرتب کہا جاسکتا ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی ذات بابرکات ہے" (رود کوثر ص ۵۸۶)

مفکر اسلام، امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے اس ہمہ گیر اصلاحی و انقلابی نظام کو سینے سے لگائے دارالعلوم دیوبند ماہ و سال کی ایک صدی سے بھی زائد مسافت طے کر چکا ہے۔ اس طویل مدت میں اس کی راہ میں بارہا رکاوٹیں حائل ہوئیں اور گوناگوں مشکلات سامنے آئیں مگر اللہ کی مدد و نصرت سے راستے کی ان بندشوں اور مشکلوں کو عبور کرتے ہوئے وہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہا۔ اور اسلام کی ابدی صداقتوں کو مسلم معاشرے میں قائم و دائم رکھنے کے لئے اپنی جدوجہد سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں اسکی خدمات اور کارناموں کا سلسلہ اس قدر دراز ہے جس کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہئے۔

بایں ہمہ اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی عظمت و برتری کے اظہار کے لئے یا کسی اور مخفی مقصد کے تحت یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی خداداد عظمتوں سے انکار کیا جائے اور جس طرح انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے محیر العقول خدمات اور کارناموں سے آنکھیں بند کرلی ہیں اسی طرح سے لوگ آنکھیں بند

کرلیں۔

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کے مقابلے میں عالی شان، جدید طرز کی عمارتیں تعمیر کی جاسکتی ہیں۔ تعلیم و تدریس کے نام پر پڑھنے پڑھانے والوں کی بھیڑ بھی جمع کی جاسکتی ہے۔ جامعہ اور دارالعلوم کے نام سے اس کی پرشور تشہیر بھی کی جاسکتی ہے۔ یہ سب کچھ کیا جاسکتا ہے اور آج کی دنیا میں ہورہا ہے۔ لیکن کیا ان جامعات اور تعلیم گاہوں کو دارالعلوم کےمقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

ذرا سوچئے جس دارالعلوم کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی اطلاع کے مطابق ظلمت کدۂ ہند میں اسلام کی روشنی کی بقاء کے لئے خاصان خدا نے دعا والتجا کے ذریعہ بارگاہ خداوندی سے مانگ کر لیا ہے۔ جس دارالعلوم کو اپنے اپنے وقت کے اور اولیاء کرام کے مکاشفات و مبشرات کی تائید حاصل ہو آخر اس دارالعلوم کا مقابلہ ان ظاہر داریوں سے کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔

(فتدبر ولاتكن مع الغافلين)

ایک حادثہ فاجعہ۔

دارالعلوم دیوبند کے ہونہار، سلیم الطبع اور صالح طالب علم مولوی قمرالدین گونڈوی ابھی ہفتہ عشرہ پہلے علی گڑھ اسٹیشن پر ریل حادثہ میں شہید ہوگئے۔

موصوف نے تقریباً درجہ سوم سے آخر تک کی تعلیم دارالعلوم ہی میں حاصل کی گزشتہ سال دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ ہوئے تھے اور اس وقت تکمیل ادب میں زیر تعلیم تھے۔ علاج کے لئے علی گڈھ گئے تھے واپسی پر یہ حادثہ پیش آیا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور انکے اعزہ بالخصوص والدین کو صبر جمیل اور اجر جزیل ارزانی عطا فرمائے۔

جناب مولانا قطب الدین ملا ایم اے بی ایڈ فاضل دینیات، ادیب کامل کریم داد خان مسجد۔
باغبان گلی بیلگام۔ ۵۹۰۰۰۲ (کرناٹک)

ہجرت کی تیاری۔ معراجی ہدایات کی ترغیب:

بہر حال معراج کے بعد ۲ سال ساڑھے چار ماہ کا زمانہ انھیں ترغیبات اور ذہن سازی میں گذرا۔ پھر بیعتِ عقبہ ثانی سے معراجی ہدایات کی طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ اور یہی وہ موقع تھا گویا جس کا انتظار تھا۔ جس اہم مقصد پر امت کو اٹھانا تھا اس کے لیے پہلے امت میں اس کی استعداد پیدا ہو جائے اور پھر یہ بات امت کے اندرون کا داعیہ بن جائے۔ ذی الحجہ ۱۳ر نبوی میں جو ۷۵ر افراد کی مقدس جماعت آئی تھی یہ صرف احکامات سننے کے لیے اور صرف شرف ملاقات کے لیے نہیں آئی تھی بلکہ اپنے اندر یہ داعیہ لے کر آئی تھی کہ داعیٔ اعظم ﷺ کو اپنے یہاں تشریف لانے کی دعوت دیں گے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ بعض افراد مدینہ سے خود حضور اقدسؐ نے استفسار فرمایا تھا کہ کیا میں آپ لوگوں کے شہر آؤں؟ اس وقت انھوں نے اس کی حامی نہیں بھری تھی اور اس موقع پر خود اہل مدینہ حضور ﷺ کو اپنے یہاں تشریف لانے کی دعوت دے رہے ہیں اس مرحلہ پر علماءِ سیرت نے خود حضرات مدینہ کی گفتگو میں حکمت دعوت کے نہاں پہلو کو عیاں فرمایا ہے کہ اہل مدینہ سے پہلے حضور ﷺ کے ورود مدینہ کی حامی اس لیے نہیں بھری تھی کہ ابھی ان میں اتحاد فکر پیدا نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمارا یہ حال ہے کہ ہماری آپس میں چپقلش ہے اس کو ذرا دور ہو جانے دیجیے۔ تو معلوم ہوا کہ

دعوت حق کے حکمتی پہلوؤں میں ایک اتحاد فکر بھی ہے۔

بہر حال حضور اقدس ﷺ نے جب دیکھا کہ مدینہ آنے کی دعوت ان حضرات کا اندرون کا داعیہ ہے تو آپؐ نے معراجی اشارات سے بات آگے بڑھا کر معراجی ہدایات کی ترغیب دینی شروع فرمائی۔

مقام عقبہ پر (ذی الحجہ ۱۳ر نبوی) حضور اقدس ﷺ نے حضرات مدینہ سے ملاقات فرمائی تھی۔ اس موقع پر حضورؐ کے ساتھ ان کے شفیق چچا حضرت عباسؓ بھی تھے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ شاید صحبتِ فیض رسالت کی فیض یابی تھی کہ انھوں نے دعوت کے سلسلہ میں ایک اہم اصول کی طرف اہلِ مدینہ کو متوجہ فرمایا کہ کسی خوف لومۃ لائم کے بغیر، ہر امر سدّ راہ کا مقابلہ استقلال و پامردی کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے اہلِ مدینہ سے فرمایا۔

''محمدؐ سے عہد و پیمان کرنا سرخ و سیاہ (یعنی انتہائی خونریز اور تاریک انجام والی) لڑائیوں کو دعوت دینا ہے، جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ ورنہ بہتر ہے کہ کچھ نہ کرو۔ انھوں نے حضرت عباس کو کچھ جواب نہیں دیا۔ حضورؐ سے فرمایا کہ کچھ ارشاد فرمائیں حضورؐ نے وعظ فرمایا جس کے سننے سے وہ ایمان و ایقان کے نور سے بھرپور ہوگئے۔ اور انھوں نے حضورؐ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ حضورؐ نے فرمایا: ''کیا تم دین حق کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کروگے؟۔ میں تمھارے شہر میں چاہوں تو کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کے حمایت اپنے اہل و عیال کے مانند کروگے؟ مدینہ والوں نے پوچھا ایسا کرنے کا ہمیں معاوضہ کیا ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا بہشت (جو نجات اور خدا کی خوشنودی کا محل ہے) مدینہ والوں نے کہا کہ ہماری تسلی فرمادیجیے کہ آپ ہم کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں! میرا جینا اور مرنا تمھارے ساتھ ہوگا۔ اس آخری فقرہ کا سننا تھا کہ عاشقانِ صداقت نے عجیب سرور و نشاط کے ساتھ بیعت کی'۔ ایک شیطان نے پہاڑ کی چوٹی سے یہ نظارہ دیکھا اور چیخ کر اہلِ مکہ کو پکار کر کہا کہ لوگو! آؤ دیکھو کہ محمدؐ اور اس فرقے کے لوگ تم سے لڑائی کے مشورے کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا اس آواز کی پرواہ نہ کرو۔ مدینہ والوں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم کل ہی مکہ والوں کو اپنی تلوار کے جوہر دکھادیں۔ حضورؐ نے فرمایا

نہیں مجھے جنگ کی اجازت نہیں"(۱)

اس طرح حضور اقدس ﷺ نے مقدماتِ ہجرت و جہاد کی تیاری میں اپنے کو مشغول رکھا۔ پھر ۱۳ر نبوی میں ہجرت فرمائی اور ۲ر ہجری سے ۹ر ہجری تک معرکہ ہائے حق و باطل میں جہاد و قتال کیا۔(۲)

یہاں تک جو بحث چل رہی تھی وہ معراجی عطایا میں دعوتی ارکانِ اربعہ سے متعلق تھی۔ اور اب تک ہجرت، اور جہاد یہ دو امور زیر بحث آئے۔ اب اگلے دو امور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق بحث کی جائے گی۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

جہاد ایک وقتی عمل ہے جو کسی خاص زمانہ میں خاص حالات میں خاص موقع پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ جہاد کی اس قتال فی سبیل اللہ کی حیثیت سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اس کی ایک دوامی حیثیت بھی سامنے آتی ہے کہ ہر زمانے میں ہر مکان میں ہر وقت عمومی و اجتماعی طور پر خدا کے بندوں خدا کی طرف متوجہ کرنے کی جدو جہد کی جائے۔ اسی لیے سرکار مدینہؐ نے ایک جہاد سے واپسی کے موقع پر فرمایا تھا کہ تم لوگ جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہو (او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا کو قیامت تک رہنا ہے۔ اور اس وقت تک خدا کے بندوں کو خدا کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ لیکن حضور اقدس ﷺ خاتم الانبیاء بھی ہیں۔ سلسلۂ نبوت آپ کے بعد ختم ہوگیا۔ لانبی بعدی۔ اسی ختم نبوت کے مسئلہ کو لیکر اغیار نے طعن کیا کہ حضرت محمد کیا آئے، نبوت کو ختم کیا اور اس طرح خدا کی رحمت کا دروازہ بند کردیا۔ لیکن انھیں کون سمجھائے کہ اس چراغ مصطفوی نے ہزاروں چراغ جلادیئے۔ آسمان سے ایک شمس و قمر چھپ گئے تو کیا ہوا ان کے نور ضیا تاب کی ضیاپاشیاں ان گنت ستاروں کے واسطہ سے ہوتی رہیں گی۔ اس کی طرف اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضورؐ کی زبانی اشارہ فرمایا ہے۔

۱۔ رحمۃ للعالمین ج۱، ص ۸۰-۷۹

۲۔ یہ بھی ایک اعجاز نبوی ہے کہ اتنے معرکوں میں مقتولین کی کل تعداد ۱۰۱۸ ہے۔ جس میں ۲۵۹ مسلمان اور ۷۵۹ کافر تھے۔ بحوالہ رحمۃ للعالمین ج ۲، ص ۲۱۳

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (پ ۱۳ ارکوع ۶)

ترجمہ: آپ فرما دیجیے کہ یہ میرا طریق ہے میں (لوگوں کو توحید) خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی میرے ساتھ والے بھی۔ (بیان القرآن)

بہر حال امت کے ذمہ دعوت الی اللہ کا عظیم کام دیا گیا ہے۔ اور اسی لیے امت کو مختلف فضیلتوں سے نوازا گیا ہے۔ معراج سے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی جو حدیث اب تک زیر بحث رہی ہے اس میں امت کو خیر الامم، امتِ متوسطہ، عادلہ اور معتدلہ کہا گیا ہے۔ امت کو دعوت کے اس عظیم کام پر ڈالنے کے لیے مختلف مواقع پر حضور اقدس ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اور جس جس طرح ترغیبات دی ہیں ان سب کا احاطہ مشکل ہے۔ یہاں صرف کتاب اللہ کی ایک آیت کا ذکر کر دینا کافی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ (سورۂ آل عمران آیت ۱۱۰ پارہ ۴)

ترجمہ: تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔

اس آیت کے معارف و مسائل کے ضمن میں صاحبِ معارف القرآن نے تحریر فرمایا ہے کہ

اس آیت میں امتِ محمدیہ کے خیر الامم ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ خلق اللہ کو نفع پہنچانے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا نفع یہ ہے کہ خلق اللہ کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کی فکر اس کا منصبی فریضہ ہے۔ اور پچھلی سب امتوں سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تکمیل ...... اس امت کے ذریعہ ہوئی۔ اگرچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ پچھلی امتوں پر عائد تھا، جس کی تفصیل احادیث صحیحہ میں مذکور ہے۔ مگر اول تو پچھلی بہت سی امتوں میں جہاد کا حکم نہیں تھا۔ اس لیے ان کا امر بالمعروف صرف دل اور زبان سے ہو سکتا تھا۔ امت محمدیہ میں اس کا تیسرا درجہ ہاتھ کی قوت سے امر بالمعروف کا بھی ہے جس میں جہاد کی تمام اقسام بھی داخل ہیں اور بزور حکومت اسلامی قوانین کی تنفیذ بھی اس کا جز ہے۔ اس کے علاوہ امم سابقہ میں جس طرح

دین کے دوسرے شعائر......... غفلت عام ہو کر محو ہو گئے تھے اسی طرح فریضۂ امر بالمعروف بھی بالکل متروک ہو گیا تھا۔ اور اس امت محمدیہ کے متعلق آنحضرت ﷺ کی یہ پیشن گوئی ہے کہ "اس امت میں تا قیامت ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم رہے گی" (معارف القرآن جلد دوم ص ۵۰۔ ۱۴۹۔)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر گویا تواصوا بالحق کا مظہر ہیں جو امت محمدیہ کا وظیفہ حیات ہیں۔ بہر حال ہر حال میں ہر احوال میں ہر زمان میں ہر مکان میں انفرادی و اجتماعی طور پر اس میں مشغول ہونا ہے۔ امت محمدیہ کا یہ کام اس کا مشغلۂ زندگی ہے۔

معراجی عطایا کے حاصل ہونے کے بعد حضور ﷺ نے اس فریضہ کو بھی روبہ عمل لانے کی فکر و کوشش فرمائی۔

کارِ دعوت کے لیے ذمہ دار طے کرنا:

جیسا کہ ہم پڑھ آئے ہیں ۷۵ ر افراد پر مشتمل ایک وفد مدینہ ایام حج میں مکہ آیا تھا اور اس وفد نے عقبیٰ کی گھاٹی میں حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی۔ اس موقع پر حضورؐ نے ان میں سے ۱۲ ر افراد کا انتخاب فرمایا اور ان کا نام نقیب رکھا۔ اور ان سے فرمایا کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ بن مریم نے اپنے لیے ۱۲ ر شخصوں کو چن لیا تھا اسی طرح میں بھی تمھیں انتخاب فرماتا ہوں تاکہ تم اہل یثرب میں جاکر دین کی اشاعت کرو۔(۱)

صاحب سیرۃ مصطفیٰ تحریر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے وفد مدینہ سے فرمایا کہ جس طرح موسیٰؑ نے بنی اسرائیل میں سے بارہ نقیب منتخب فرمائے تھے اسی طرح میں بھی جبرئیل کے اشارے سے تم میں سے بارہ نقیب منتخب کرتا ہوں اور ان بارہ سے فرمایا کہ تم اپنی قوم کے کفیل اور ذمہ دار ہو جیسے حوارین عیسیٰ تھے۔(رحمۃ للعالمین ج۱، ص ۸۰)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دعوتی ارکانِ اربعہ کے اہتمام کی طرف حضور ﷺ اپنے صحابہ کرامؓ کو راغب کرتے رہے۔

انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتوں میں دعوتی مراحل:

معراج کی اشارات اور ہدایات کی ترغیب پھر اس پر عمل درآمد کے بعد سے لے کر

دعوت کے انتہائی نقطہ عروج (Climex Point) تک جو کچھ پیش آنا تھا جس کا مختصراً و اجمالاً تذکرہ سطور بالا میں آگیا ہے اس کو معراج کے موقع پر حضرات انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتوں کے ذریعہ رکھا گیا تھا۔ بیت المقدس میں امامتِ انبیاء کے ذریعہ یہ بات گویا مسلم ہوگئی تھی کہ اب دنیا کی نجات اتباع حضورؐ ہی میں ہے اور تمام انبیاء کی شریعتیں منسوخ کردی گئیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی تکمیل حضور اقدس ﷺ کے حصے میں آئی تھی، اب بس تکمیلِ دعوت اور حصول مقصد کے لئے پیش آنے والے واقعات کو ظاہر کرنا تھا جس کو آسمان میں مخصوص انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتوں کے ضمن میں اشارہ کردیا گیا تھا۔ حضرت مناظر احسن صاحب گیلانیؒ رقمطراز ہیں۔

"اور بات یہ ہے کہ جو کچھ دکھایا جانے والا تھا، کیا ہوا، اگر کسی خاص شان میں وہ کچھ دن پہلے دکھایا گیا۔ ہزارہا پیغمبروں میں سے کل آٹھ پیغمبروں اور ان میں بھی آدمؑ سے شروع کرکے معمار کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت پر، اس شخص کی ملاقات کیوں ختم ہوگئی، جو آدمؑ کی طرح اپنے وطن سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچا اور جب کعبہ فتح ہوگیا، اس کا کام بھی ختم ہوگیا۔ جس نے دیکھا اور جنہیں دکھایا گیا، دونوں کی زندگیوں پر غور کرو، نظر آئے گا کہ جو ہونے والا تھا حالانکہ انہی واقعات کے سلسلہ میں صرف زندگی نہیں .... بلکہ "امامتِ کبریٰ" کی زندگی، اقصیٰ کی مسجد میں دکھائی گئی تو اس وقت آٹھ ہی نہیں بلکہ دنیا کے سارے پیغمبر اس امام کے پیچھے کھڑے نظر آئے جو نوع انسانی کا سب سے بڑا امام ہے۔ اللّٰھم صل علیہ وسلم (سیرۃ المصطفیٰ ج ۱، ص ۳۴۴، بحوالہ ابن سعد ج ۱، ص ۱۵۰)

پھر موصوف نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ

"آدمؑ نے جس طرح اپنے وطن جنت سے نکل کر دنیا کی ہجرت کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ (وطن) سے نکل کر مدینہ پہنچے۔ مدینہ میں یہودی فتنے نے آپ کو اسی طرح گھیرا جس طرح عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام ان میں گھرے۔ ادریسؑ کتابت کے موجد تھے، بدر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں نوشت وخواند کو مروّج کیا حتی کہ ہر خواندہ قیدی سے دس بچوں کو لکھنا سکھادینا، فدیہ مقرر ہوا۔ ادریسؑ کے بعد آپؐ نے سلاطین کے نام خطوط روانہ کیے۔ آگے جس طرح ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل میں ہردل

عزیز تھے، آنحضرتؐ صحابہ میں محبوب تھے۔ پھر یوسفؑ کو اپنے وطن ثانی مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا وہی حضور کو اپنے دور ہجرت مدنیہ طیبہ میں چند سالوں کے بعد حاصل ہو گیا۔ پھر جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وطن فلسطین پر مصر سے حملہ کیا، آنحضرت ﷺ نے مکہ پر حملہ کیا اور اس کو مشرکوں کے اقتدار سے آزاد کر لیا۔ ابراہیم علیہ السلام بانی کعبہ تھے، کعبہ پر قبضہ کر کے پھر اس کو ابراہیم کی مسجد بنالیا۔ اس پر زندگی ختم ہو گئی۔ (۱)

اس سلسلہ میں دیگر علماء کی آراء بھی ہمارے اس مضمون میں "آسمانوں میں مخصوص انبیاء سے ملاقات کی حکمت" کے ذیلی عنوان کے تحت آ گئی ہیں جن کو بہت ہی اختصار کے ساتھ یہاں بھی درج کیا جارہا ہے۔

حضرت آدمؑ کو اپنے وطن جنت سے ہجرت کرنا پڑا جو انھیں نہایت شاق گذرا۔ اسی طرح حضور ﷺ کو مکہ سے ہجرت کرنا شاق گذرا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سے ملاقات میں یہود کی ریشہ دوانیوں کی طرف اشارہ تھا۔ حضرت ادریسؑ کی طرح آپؐ نے سلاطین کے نام دعوتی خطوط ارسال فرمائے۔ حضرت ہارونؑ کے ارشاد کی خلاف ورزی کی سزا میں جس طرح گوسالہ پرست قتل کر دئے گئے اس طرح جنگِ بدر میں مشرکین مکہ کے سردار مارے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ جس طرح انھوں نے ملک شام میں جہاد و قتل کیا تھا اور یہ ملک حضرت یوشع کے ہاتھ پر فتح ہوا تھا اسی طرح حضورؐ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جائیں گے اور یہ ملک حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر فتح ہوگا۔ حضرت ابراہیم بانی کعبہ ہیں اس ملاقات میں حجۃ الوداع کی طرف اشارہ تھا۔ بہر حال معراج میں حضورؐ کی دعوتی زندگی کے تمام مراحل دکھائے گئے تھے۔

مدارج معراج اور مدارج دعوت:

اس کے علاوہ "مدارج معراج" کے عنوان سے دعوتی معراج کا تذکرہ بھی ہمارے اس مضمون میں آگیا ہے۔ لیکن موضوع سخن کی مناسبت سے ان کو یہاں دوبارہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱- النبی الخاتم ص ۶۶

ابن منیر فرماتے ہیں کہ (سات آسمانوں تک) یہاں تک سات معراجیں ہوئیں۔ آٹھویں معراج سدرۃ المنتہٰی تک ہوئی اس میں فتح مکہ کی طرف اشارہ تھا جو ۸ھ میں فتح ہوا۔ اور نویں معراج سدرۃ المنتہٰی سے مقام صریف الاقلام تک ہوئی۔ اس معراج میں غزوۂ تبوک کی طرف اشارہ تھا۔ جو ۹ھ میں پیش آیا۔ اور دسویں معراج رفرف اور مقام قرب اور دنو تک ہوئی جہاں دیدارِ خداوندی ہوا اور کلام ربانی سنا۔ اس دسویں معراج میں چونکہ لقاء خداوندی حاصل ہوا اس لیے اس میں اشارہ اس طرف تھا کہ ہجرت کے دسویں سال حضور کا وصال ہوگا اور اس سال خداوندِ ذوالجلال کا لقاء ہوگا اور دارِ دنیا کو چھوڑ کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملیں گے"۔ (سیرۃ المصطفیٰ ج ۱، ص ۳۲۰-۳۱۹)

ختم نبوت:

مولانا ادریس صاحب کاندھلوی فرماتے ہیں کہ "آپ کو ایسے مقام تک سیر کرائی گئی جو کائنات کا منتہیٰ ہے۔ یعنی عرش عظیم تک جس کے بعد اب اور کوئی مقام نہیں۔ اسی وجہ سے بعض عارفین کا قول ہے کہ عرش تک سیر کرانے میں ختم نبوت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ تمام کائنات عرش پر ختم ہو جاتی ہے۔ کتاب و سنت سے عرش کے بعد کسی مخلوق کا وجود ثابت نہیں۔ اسی طرح نبوت و رسالت کے تمام کمالات آپؐ پر ختم ہیں۔ فافہم ذلك و استقم" (سیرۃ المصطفیٰ ج ۱، ص ۲۸۹)

مباحثِ بالا سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی تکمیل آپؐ کے ہاتھوں ہوئی اور آپ کے ذریعہ دین حق کو مکمل کر دیا گیا۔ اس طرح آپؐ پر نبوت و رسالت کے تمام کمالات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

حضورؐ کو دعوت عمومی کا کمال حاصل ہوا:

اور یہ سب کچھ ثمرہ ہے اس بات کا کہ آپ کو دعوت عمومی کا کمال عطا ہوا تھا۔ اس امر کی طرف بھی واقعہ معراج میں اشارہ ملتا ہے۔ معراج کے موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کر کے حضور اقدس ﷺ جب آگے بڑھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام

۱- النبی الخاتم ص ۶۶

رو پڑے۔ آواز آئی کہ اے موسیٰ اس رونے کی وجہ کیا ہے؟ حضرت موسیٰ نے عرض کیا خداوندا میرے بعد تو نے اس نوجوان (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا ہے۔ اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ بہشت میں جائیں گے۔ اس واقعہ کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رونا از راہِ حسد نہیں تھا بلکہ وہ اس بات کی تمثیل تھی کہ ان کو دعوت عامہ نہیں ملی تھی اور اس کمال کی بقا ان کو عنایت نہیں ہوئی تھی۔ جو عموم دعوت سے حاصل ہوتی ہے۔

(سیرۃ النبی جلد سوم ص: ۴۲۹-۴۲۸ بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ باب الاسراء)

یہاں تک حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی روشنی میں دعوتی ارکانِ اربعہ پر مربوط بحث کی گئی۔ ذیل میں اب ان امور پر بھی غور کیا جارہا ہے جن کا تعلق دعوت سے ہے اور وہ واقعہ معراج سے مترشح ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت یک گونہ صفاتِ دعوت کی بنتی ہے۔

عبادت اور دعوت:

معراج کے موقع پر جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان کا تعلق یا تو دعوت سے ہے یا عبادات و احکامات سے۔ اس سے ان دونوں امور کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ دعوت عبادات کی ہے اور عبادات کے ساتھ ساتھ دعوت دینا ہے امت مسلمہ کی دینی زندگی کے یہ دو رخ ہیں کہ وہ عابد بھی ہے اور داعی بھی اور داعی بھی ہے اور عامل بھی۔ ان دونوں پہلوؤں کا مظاہرہ روزانہ مسجدوں میں پانچ بار ہوتا رہتا ہے۔ اذان ہوتی ہے جو دعوت ہے اور بعد اذان نماز پڑھی جاتی ہے جو عبادت ہے۔ اور صرف نماز پڑھنے کا ہی حکم نہیں بلکہ اقامت صلوٰۃ کا بھی حکم ہے۔ اور اقامت صلوٰۃ میں یہ پہلو بھی نکل آتا ہے کہ نماز کی دعوت دی جائے۔ بہرحال دعوت و عبادت گویا باہم مربوط امور ہیں۔

امت کا دردو غم اور دعوت

معراج کے موقع پر حضور اقدس ﷺ نے دیکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام داہنی طرف دیکھتے ہیں تو مسکراتے ہیں اور بائیں طرف دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ داہنی طرف ان کی وہ اولاد تھی جو جنتی تھی اور بائیں طرف جہنمی اولاد تھی۔ جنتیوں کو دیکھ کر

خوش ہونا اور جہنمیوں کو دیکھ کر رنجیدہ ہونا امت کے بارے میں ان کے درد وغم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس موقع پر حضرت تھانویؒ نے یہ نکتہ تحریر فرمایا ہے کہ "اس سے شفقت والد کی اولاد پر ثابت ہوتی ہے کہ اس کی خوشحالی پر مسرور ہو اور بدحالی پر مغموم ہو۔ (نشر الطیب ص ۶۵)
الغرض ایک والد اپنی اولاد پر جتنا شفیق ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ انبیاء علیہم السلام اپنی امت کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں۔ معراج میں حضور اقدس ﷺ سے ملاقات کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لئے رو پڑے کہ امت محمدیہؐ کے مقابلے میں ان کی امت کے کم لوگ جنت میں جائیں گے۔ یہ بات بھی ایک نبی کے اپنی امت کے بارے میں فکر مندی اور درد وغم کو ظاہر کرتی ہے۔

بیت المقدس میں دیگر انبیاء علیہم السلام کی تحمید خداوندی کے بعد حضور اقدس ﷺ نے اللہ جل جلالہ کی جو حمد وثنا کی اس میں دیگر باتوں کے علاوہ اپنی امت کا ذکر کیا کہ اس کو بہترین امت بنایا گیا۔ یہ بات اپنی امت کے خیر الامم ہونے پر حضورؐ کی مسرت کو ظاہر کرتی ہے۔ معراج کے موقع پر جب اللہ تعالیٰ نے کہا السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (اے نبی تم پر سلامتی، رحمت اور برکتیں ہوں) تو اللہ کے نبی نے اس موقع پر بھی امت کو یاد رکھا اور فرمایا السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین (اے اللہ تیری سلامتی ہم پر بھی ہو اور تیرے تمام صالح بندوں پر بھی) اللہ اللہ دیکھئے کہ حضور اقدس ﷺ کو اپنی امت کی سلامتی اور خیر وعافیت کی کتنی فکر ہے کہ اس حضوری خاص کے موقع پر بھی اپنی امت کے لئے فکر مند ہو کر اس کی سلامتی کی دعا مانگ رہے ہیں۔

الغرض معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے سینوں میں امت کا ایک عجیب درد وغم ہوتا ہے۔ اور اسی سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ داعی کے دل میں امت کے درد وغم کا ہونا ضروری ہے۔ علمائے کرام کو وارثین انبیاء کہا گیا ہے۔ یہ وراثت علم نبوت کی وراثت ہوتی ہے۔ اور علوم نبوت کی پہلی چیز امت کا درد وغم ہی ہے۔

اسی درد وغم کے پہلو سے ایک اور بات نکلتی ہے کہ داعی کا انداز دعوت نصیحت والانہ ہو بلکہ وصیت کا ہو۔ نصیحت میں یک گونہ اپنی بڑائی کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ اور وصیت دل کی گہرائیوں کی آواز ہوتی ہے۔ جو اپنے اندر ایک عجیب درد وغم لئے ہوتی ہے۔

اسلام، عورت اور مغربیت

مرد اور عورت میں امتیاز کی بنیاد:

لیکن انسانی حیثیت سے مرد و زن میں کامل مساوات تسلیم کرنے اور انھیں یکساں حقوق کا حامل قرار دینے کے بعد بھی جہاں تک زندگی میں دونوں اصناف کے وظیفہ حیات کا تعلق ہے اسلام ان کے باہمی فرق کو نظر انداز نہیں کرتا اسلام کے خلاف خواتین کی بعض انجمنوں اور ان کے حامی ادیبوں، سماجی مصلحین اور نوجوانوں کے شور و غوغا کی اصل وجہ اسلام کا یہی تصور ہے۔

دونوں اصناف میں اسلام جن پہلوؤں سے امتیاز کرتا ہے ان پر نگاہ ڈالنے سے پیشتر آیئے طبی، حیاتی اور نفسیاتی نقطہ ہائے نظر سے اصل بنیادی مسئلہ کا مطالعہ کریں اس کے بعد ہم اسلامی نقطہ نظر پیش کریں گے۔

بنیادی مسئلہ:

کیا مرد اور عورت ایک ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں؟ یا یہ دونوں الگ الگ اصناف ہیں؟ کیا زندگی میں ان کا وظیفہ یکساں ہے یا مرد اور عورت ہونے کی حیثیت سے ان

کے فرائض کے دائرے جدا جدا ہیں؟ یہ سوالات بڑے پیچیدہ ہیں مگر دراصل ان ہی کے سلجھنے پر مرد وزن کے مسئلے کے حل کا انحصار ہے۔ جن عورتوں، ان کے حامی ادیبوں، مصلحین اور نوجوانوں کا خیال یہ ہے کہ مرد اور عورت کی جسمانی اور وجدانی ساخت میں کوئی فرق پایا ہی نہیں جاتا اور زندگی میں ان کے حیاتی فرائض یکساں نوعیت کے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ البتہ وہ لوگ جو مرد اور عورت کی جسمانی ساخت اور زندگی میں ان کے فرائض میں کوئی فرق مانتے ہیں ان سے اب بھی اس مسئلے پر مفید اور نتیجہ خیز گفتگو کی جاسکتی ہے۔

دونوں صنفوں میں مساوات کے مسئلے پر ایک تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔ کہ آیا یہ صحیح ہے نہیں؟

وظائف اور مقاصد کا اختلاف:

دونوں اصناف کے وظائف اور مقاصد میں اختلاف ہے۔ اس بنیادی اختلاف ہی کا نتیجہ اور کرشمہ ہے کہ اپنے مزاج اور ساخت کے اعتبار سے مرد اور عورت ایک دوسرے سے کچھ اس طرح مختلف واقع ہوئے ہیں کہ وہ صرف اپنے اپنے بنیادی وظائف حیات ہی کو سرانجام دے سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مرد اور عورت کے درمیان کا حل مساوات پر کھوکھلی تقریریں کرنے سے حقیقت کی دنیا میں اس مساوات کو روبہ عمل کیوں کرلایا جاسکتا ہے؟ انسان ہونے کی حیثیت سے مرد اور عورت میں مساوات ایک بالکل فطری اور معقول مطالبہ ہے۔ مرد اور عورت خانوادۂ انسانیت دو یکساں اہم رکن ہیں اور دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں لیکن زندگی میں اپنے فرائض اور ان کی بجاآوری کے عملی طریقے میں بھی کیا وہ یکساں ہوسکتے ہیں؟ کیا اس قسم کی مساوات کبھی ممکن ہوسکتی ہے؟ اگر دنیا بھر کی عورتیں بیک زبان اس کا مطالبہ کریں اور اس کے حق میں بڑے بڑے اجتماعات منعقد کریں اور قرار دادیں منظور کریں تب بھی اس مطلوبہ مساوات کا خواب

شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ اجتماعات اور ان میں منظور کی ہوئی قراردادیں مردوں کی فطرت کو بدل سکتی ہیں اور نہ عورتوں کی۔ اور نہ ان سے دونوں اصناف کے وظیفۂ حیات میں کوئی تغیر اور تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے اور نہ واقع ہو سکتی ہے کہ عورتیں مردوں کے کام کرنے لگیں اور مرد عورتوں کے بجائے حمل، بچوں کی پیدائش اور انھیں دودھ پلانے کی ذمہ داری سنبھال لیں۔

طبعی اور نفسیاتی فرق:

کوئی بھی خصوصی نوعیت کا حیاتی وظیفہ ایک خاص قسم کی طبعی اور نفسیاتی مزاج کی عدم موجودگی میں انجام نہیں دیا جاسکتا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت کی مخصوص ذمہ داریاں۔ حمل اور رضاعت۔ کو انجام دینے کے لیے مخصوص جذباتی اور ذہنی صلاحیتیں ناگزیر ہیں ان ہی کی مدد سے عورت اپنی ان مشکل ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے اور بخوبی انجام دیتی ہے۔

عورت کا قدرتی اور فطری مزاج:

واقعہ یہ ہے کہ ماں کی مامتا، اس کے پاکیزہ جذبات، اعلیٰ کردار، مصائب و شدائد کے ہجوم میں اس کا صبر واستقامت ہمدردی اور کارکردگی کا یہ نقطۂ کمال اس مخصوص طبعی مزاج کی غیر موجودگی میں ممکن ہی نہیں جو عورت کو اپنے اصل وظائف حمل ورضاعت انجام دینے کے قابل بناتا ہے اور جس کی وجہ سے اس کے نفس ذہنی اور اعصابی نظام کی ایک مخصوص صورت بنتی ہے۔ عورت کی یہ ذہنی، عصبی، نفسی اور طبعی خصوصیات پہلو بہ پہلو پائی جاتی ہیں۔ اور یہ خصوصیات نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں بلکہ ان میں باہم ربط اور ہم آہنگی بھی ملتی ہے اس لیے انتہائی استثنائی صورتوں کے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان میں سے کوئی خصوصیت دوسری خصوصیت کی عدم موجودگی میں پائی جائے۔

جذبات کی لطافت، وجدان کی نزاکت اور زود حسی جو ایک عورت کی خصوصیات ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا خمیر بنیادی طور پر عقل سے نہیں بلکہ جذبات

سے اٹھایا گیا ہے۔ اس کی یہی جذباتیت مامتا کی زندہ اور دائمی صفات کا سرچشمہ ہے کیونکہ بچے کی پرورش کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ عقل نہیں ہے بلکہ اس کے لیے تیز و تند جذبات کی ضرورت ہے جو عورت کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے ہی نہیں دیتے اور اس کو بچے کی ضروریات کے تقاضے پر فوراً بلا کسی تاخیر و سستی کے لبیک کہنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

یہ ہے عورت کی زندگی میں اس کا صحیح اور سچا کردار۔ یہ کردار وظیفۂ حیات کی انجام دہی میں اس کی مدد کرتا ہے اور اس کے تخلیقی مقصد کے حصول کو ممکن بناتا ہے۔

مرد کا وظیفۂ حیات:

اس کے برعکس مرد کے سپرد جو فرائض ہیں ان کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے وہ ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تمام ضروری صلاحیتوں سے مسلح ہے جن کی نوعیت نسوانی صلاحیتوں سے مختلف ہے۔ مرد کا اصل کام کارزارِ حیات میں معرکہ آرائی ہے وہ جنگل کے وحشی درندوں کو مطیع بناتا ہے۔ زمین و آسمان میں فطرت کی قوتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے حکومت کی تشکیل کرتا ہے اور کبھی قومی اقتصادیات اور معاشرے کے لیے قانون وضع کرتا ہے مرد کو زندگی میں ان تمام مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے تب کہیں جا کر وہ اپنی روزی کمانے یا اپنی ذات اور اپنے بیوی بچوں کو دوسروں کے ظلم و ستم سے بچانے کے قابل ہوتا ہے۔

مرد کا نفسیاتی مزاج:

چناں چہ مرد کی زندگی میں اپنے فریضے کی انجام دہی کے لیے عورت کی طرح شدید جذباتی مزاج کی ضرورت نہیں۔ اس کو جس نوعیت کا کام کرنا ہے اس میں جذبات مفید و معاون ہونے کے بجائے الٹا مضر ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ ان میں ہر آن اور ہر لحہ اتار و چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے جس کی متضاد ذہنی کیفیات جنم لیتی رہتی ہیں۔ ان جذبات میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ آدمی کسی لگے بندھے طریقے پر طویل

عرصہ تک ثابت قدم رہ سکے۔ ان جذبات کی پسند و ناپسند بھی بدلتی رہتی ہے۔ اس طرح کاہر آن بدلتا ہوا جذباتی مزاج ایک ماں بننے وظیفہ حیات کی ادائیگی کے لیے تو پوری طرح ہم آہنگ اور مناسب ہے لیکن مرد کے لیے یہ کسی طرح بھی مفید نہیں کیوں کہ اس کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کو مستقل مزاجی اور پامردی سے طویل عرصہ تک اپنے فرائض نبھانے پڑتے ہیں اس کی عملی زندگی میں جہاں اس کو بے شمار مخالف طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے وہاں اس کی عقل ہی اس کی مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے مرد کے اندر مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے، موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے اور اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس کے متوقع نتائج کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ عقل سست گام ضرور ہے مگر اس میں ثبات و استقلال پایا جاتا ہے۔ اس سے سرعتِ عمل مطلوب نہیں کیوں کہ یہ چیز تو ان جذبات کا امتیازی وصف ہے جن سے عورت کے وجود میں رنگ و نور پیدا ہوتا ہے۔ البتہ عقل سے جس چیز کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ حصول مقصد کے لیے کسی موزوں تر طریقے کی جانب ہماری رہنمائی کرے۔ خواہ ہمارے پیش نظر جنگلی جانوروں کا شکار ہو، یا کسی نئے آلے کی ایجاد یا نئے معاشی نظام کا قیام یا کسی نئی حکومت کی تشکیل ہو یا کسی بیرونی ملک کے خلاف جنگ یا صلح کا اعلان کرنا۔ مرد کی یہ ساری سرگرمیاں اس کی ذہنی صلاحیتوں پر منحصر ہیں۔ ان میں جذبات کا عمل دخل ان کو سلجھانے کے بجائے الجھانے کا سبب بن سکتے ہیں۔

کامیاب مرد کامیاب عورت:

ایک مرد کو صرف اسی صورت میں کامیاب اور زندگی سے ہم آہنگ کہا جائے گا جب کہ وہ اپنے حقیقی اعمال اور وظیفہ حیات کے لیے سرگرم ہو۔ اس سے مرد و عورت کے باہمی اختلاف کی علت سمجھ میں آسکتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مرد ان کاموں میں کیوں خوشی محسوس کرتا ہے جن میں اس کو جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ جذبات دنیا میں آکر وہ بچے کی طرح بے بس اور پریشان کیوں ہو جاتا ہے۔ اس کے

بالمقابل عورت جذبات کے دائرے میں انتہائی مسرور دکھائی دیتی ہے کیوں کہ یہی وہ دائرہ ہے جس میں رہ کر وہ اپنے فرائض کو بطریق احسن بجالا سکتی ہے۔ جن پیشوں مثلاً نرسنگ، تدریس اور دایہ گری میں اس کی نسوانیت کے لیے اپیل پائی جاتی ہے ان میں وہ خوش رہتی ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی دوکان میں کام کرتی ہے تو اس میں بھی اس کو ایک طرح کی جذباتی آسودگی ملتی ہے کیوں کہ اس سے اپنے لیے کسی مرد ساتھی کی تلاش میں اسے آسانی ہوتی ہو جاتی ہے مگر یہ سارے کام اس کے اصل فریضے کی بجا آوری میں محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں ان سے اس کی فطرت کے اصل تقاضے یعنی خاوند، گھر یا کنبہ اور بچے، کبھی پورے نہیں ہو سکتے اسی لیے یہ ایک بالکل فطری امر ہے کہ جب کبھی اسے اپنا اصل وظیفہ حیات انجام دینے کا موقع ملتا ہے تو ملازمت کو چھوڑ چھاڑ کر یا اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو گھریلو فرائض کے لیے وقف کر دیتی ہے اور اس وقت تک گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی جب تک ہنگامی حالات اور روپے پیسے کی ضرورت اس کو بالکل بے بس و مجبور نہ کر دے۔

اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مرد اور عورت میں بنیادی طور پر کوئی ایسا اختلاف ہے کہ یہ آپس میں مل ہی نہیں سکتے اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ کسی ایک صنف کے افراد میں سرے سے مخالف صلاحیت ہی مفقود ہوتی ہے کہ وہ ان مخالف وظائف کو انجام ہی نہ دے سکیں جن کے لیے قدرت نے صرف صنف مخالف کو ضروری صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

صنفوں کا نقطۂ اشتراک:

یہ دونوں اصناف ایک طرح کے ملغوبے کی صورت میں پہلو بہ پہلو ملتی ہیں اگر آپ کسی ایسی عورت کو دیکھیں جو حکمرانی کی صفات رکھتی ہو، مسندِ انصاف پر بیٹھتی ہو، بھاری بوجھ اٹھالیتی ہو اور جنگوں میں لڑتی ہو اسی طرح اگر آپ ایک ایسے مرد سے ملیں جو کھانا پکاتا ہو، گھر کا کام کاج کرتا ہو بچوں کے لیے ماں کی محبت و شفقت رکھتا ہو۔ جذباتی ہو اور تلون کا شکار ہو، اس کی طبیعت میں ہر آن اتار چڑھاؤ ہو تو آپ یہ نہ بھولیں کہ یہ سب بالکل فطری ہے اس میں کوئی چیز بھی غیر فطری نہیں۔ یہ اس بات کا منطقی نتیجہ ہے کہ ہر

جنس میں اپنے علاوہ دوسری جنس کے جرثومے بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر اس سے گم گشتہ راہ مغربی مفکرین اوران کے مشرقی شاگردوں کے اس دعوے کا اثبات ہرگز نہیں ہوتا کہ عورت اور مرد کے وظائف حیات یکساں ہونے چاہئیں اس کے برعکس، ان استثنائی مثالوں کی موجودگی سے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ آیا عورت کے یہ اجتماعی کام اس کے اصل اور حقیقی وظیفہ حیات کا بدل بن سکتے ہیں؟ کیا انھیں انجام دینے کے بعد عورت کو واقعی اپنے گھر بچوں اور کنبے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟ کیا یہ خلا واقعی پر ہو جاتا ہے؟ اور کیا ان کے بعد عورت اپنے صنفی جذبات کی تسکین کے لیے وہ کسی مرد ساتھی کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاتی ہے؟

مرد اور عورت کے باہمی اختلافات کی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آیئے اب ذرا ان پہلوؤں پر غور کریں جن کی بناء پر اسلام مرد اور عورت میں فرق کرتا ہے اور زندگی میں ان کے لئے الگ الگ وظائفِ حیات تجویز کرتا ہے۔

فطری نظامِ زندگی:

اسلام کا بہت بڑا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ زندگی کا عملی نظام ہے جو انسانی فطرت کے خلاف لڑتا نہیں ہے نہ اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ چاہتا ہے بلکہ وہ فطرت کے لیے وہی کچھ تجویز کرتا جو اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اسلام انسان کو روحانی پاکیزگی سے بہرہ ور کرتا ہے اور اُسے اتنا بلند دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے ڈانڈے عینیت (Idenism) سے مل جاتے ہیں۔ انسانی ترقی وپاکیزگی کے عمل میں وہ کہیں بھی انسانی فطرت سے نہیں ٹکراتا کیوں کہ اس کے نزدیک انسان کی فطرت میں نہ تو اس طرح کی کوئی تبدیلی ممکن ہے اور نہ ہی کسی لحاظ سے ایسا کرنا مفید ہے کیوں کہ اس کے نزدیک انسانیت کی معیاری کامیابیاں وہی ہیں جو انسان کو اپنی فطرت سے لڑکر نہیں بلکہ اس کے تقاضوں کو پورا کرکے ہوں اور اس کو اسکی تہذیب کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہو جس کے نتیجے میں انسان نیکی اور احسان کے اعلیٰ ترین مقام کو پاسکے۔ نیکی اس کی نگاہوں میں مرغوب و مطلوب بن جائے اور وہ محض خواہشات نفس کا بندہ نہ رہے۔

فرق کے دو مواقع:

عورت اور مرد کے مسئلے میں اسلام نے جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے وہ بھی انسانی فطرت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے چناں چہ جہاں کوئی بھی فطری بنیاد موجود ہوتی ہے وہاں ان دونوں کے درمیان مساوات قائم کرتا ہے۔ اور جہاں فطرت امتیاز چاہتی ہے وہاں وہ بھی ان میں فرق اور امتیاز کرتا ہے۔ مرد اور عورت میں اسلام جن مواقع پر فرق کرتا ہے۔ ان میں دو مواقع بہت نمایاں ہیں ایک، وراثت کی تقسیم اور دوسرا خاندان کی سربراہی کا معاملہ۔

وراثت:

وراثت کے متعلق اسلام کا قانون یہ ہے

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. ترجمہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے۔

یہ بالکل فطری اور منصفانہ تقسیم ہے کیوں کہ مالی اخراجات کا پورا بوجھ تنہا مرد ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ عورت پر کسی کے اخراجات کا بوجھ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس پر اپنی ذات کا بھی بوجھ نہیں ہوتا۔ البتہ جب عورت ہی خاندان کی سربراہ ہو تو معاملہ مختلف ہوتا ہے اس صورت میں بے شک عورت ہی کو خاندان کی ضروریات مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ مگر یہ ایک استثنائی صورتِ حال ہے جو اسلامی معاشرے میں شاذ و نادر ہی مجبوری کے درجہ میں پائی جاتی ہے کیوں کہ جب تک عورت کا کوئی عزیز موجود ہو وہی گھر کا ذمہ دار ہوتا ہے خواہ وہ عزیز مرد دور ہی کا رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ اس کی موجودگی میں عورت کو گھر کے باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی ہے۔ کیا حقوقِ نسواں کے علم برداروں کے بقول عورت کے لیے یہ انتظام واقعی اُس پر ظلم و زیادتی کے مترادف ہے؟ ان کھوکھلے نعرے بازوں اور تنگ نظروں کے دعووں سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اصل مسئلہ، ریاضی کا ایک سیدھا سادا سوال ہے۔ کل ورثہ کا ایک تہائی حصہ عورت کو صرف اپنی ذات کے لیے ملتا ہے اور بقیہ دو تہائی حصہ مرد کو دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی بیوی (عورت)، اپنے بچوں اور خاندان کی ضروریات

پوری کرے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وراثت کا بیشتر حصہ کس کو ملتا ہے۔ مرد کو یا عورت کو؟ ہو سکتا ہے کہ بعض مرد اپنی ساری دولت اپنے ذاتی آرام و آسائش پر ہی لٹا دیتے ہوں اور شادی کر کے گھر بسانے پر آمادہ نہ ہوں ایسی صورت بہت شاذ ہوتی ہے۔ بالعموم مرد ہی اپنے خاندان کے سارے اخراجات کا ذمہ دار ہوتا ہے اور وہی خاندان کے تمام افراد، بیوی بچوں کی ضروریات مہیا کرتا ہے مگر ایسا کر کے وہ کسی پر احسان نہیں کرتا بلکہ اپنی ذمہ داری بجالاتا ہے اگر کوئی عورت صاحبِ جائیداد ہو تو اس کا خاندان اس کی مرضی کے بغیر اس سے جائیداد نہیں لے سکتا۔ یہی نہیں بلکہ اس حالت میں بھی اس عورت کے سارے اخراجات کا بوجھ مرد ہی کو اٹھانا پڑے گا۔ اگر خاوند بیوی کو نان و نفقہ دینے سے انکار کر دے یا اپنی آمدنی کے لحاظ سے اس کو کم خرچ نہ دے تو وہ عدالت میں مقدمہ دائر کر کے اس سے نان و نفقہ وصول کر سکتی ہے یا بصورتِ دیگر اس سے علاحدگی اختیار کر سکتی ہے اسلام کے خلاف یہ بات محض بہتان ہے کہ وہ وراثت میں مرد کے مقابلے عورت کو بہت تھوڑا اور ناکافی حصہ دیتا ہے کیوں کہ مرد کی ذمہ داریاں ہی ایسی ہیں کہ وراثت میں اس کو عورت کے مقابلے میں دوگنا حصہ ملنا چاہیے۔

اسلامی قانونِ وراثت کا اصل الاصول:

ترکے کے تقسیم میں بھی اسلام ایسی ہی نسبت ملحوظ رکھتا ہے اس سلسلے میں جو قانون اصل اور اصول کی حیثیت رکھتا ہے وہ ہے لِكُلٍّ حَسَبَ حَاجَتِهِ. یعنی ہر آدمی کو اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔ اس سے زیادہ منصفانہ قانون انسانیت دریافت نہیں کر سکتی۔ آدمی کی ضروریات کا پیمانہ اس کی وہ معاشرتی ذمہ درایاں ہیں جو اس کو بجالانی پڑتی ہیں۔ لیکن جہاں تک دولت کمانے کا تعلق ہے اس بارے میں اسلام مرد اور عورت میں کوئی امتیاز نہیں کرتا ہے۔ نہ مزدوری کی اجرت میں ان کے درمیان کوئی فرق کرتا ہے نہ تجارت کے نفع کی تقسیم میں کوئی امتیاز روا رکھتا ہے۔ اور نہ زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی کے معاملہ میں سے کسی کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کرتا ہے کیوں کہ ان معاملات

میں اسلام دونوں صنفوں میں مکمل مساوات کے اصول پر عمل کرتا ہے اور ان کی محنت کے مطابق انھیں مساوی معاوضہ دیتا ہے اس معاملہ میں وہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی گوارا نہیں کرتا۔ عام طور پر پایا جانے والا یہ تاثر کہ اسلام کی نگاہ میں عورت مرد کے مقابلے میں نصف معاوضہ کی مستحق ہے سراسر غلط ہے جس کو اسلام کے دشمنوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پھیلایا ہے۔

قانون شہادت:

اسلام میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت یعنی گواہی کے مساوی ہے اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام کی نگاہ میں ایک عورت نصف مرد کے برابر ہے بلکہ یہ تو ایک دانشمندانہ اقدام ہے جس کا مقصد ہر ممکن ذریعہ سے قانونی شہادت کو غلطیوں اور خرابیوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ خواہ یہ شہادت استغاثے کے حق میں ہو یا اسکے خلاف اپنی عظمت کے لحاظ سے عورت انتہائی جذباتی اور تاثر پذیر واقع ہوئی ہے اور خطرہ ہے کہ وہ مقدمہ کے واقعات کو خلط ملط کردے۔ اس لیے اس کی گواہی کی صورت میں ایک اور عورت کو بھی اس کے ساتھ شامل کرلیا گیا ہے جس کی مصلحت قرآن کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى. (سورت ۲۔ آیت ۲۸۲)

ترجمہ: اگر ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلادے۔

کیوں کہ ہوسکتا ہے جس مجرم کے خلاف یا حق میں وہ عدالت میں گواہی دے رہی ہے وہ کوئی حسین عورت ہو جس کے خلاف ضد میں یا جھوٹی گواہی دے بیٹھے۔ اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ملزم کوئی نوجوان و خوبصورت اور صحت مند مرد ہو جس کو دیکھ کر وہ گواہ عورت فریفتہ ہوجائے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کو بچانے کی کوشش میں وہ ایسی گواہی دے دے جو حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ مگر جہاں دو عورتیں بیک وقت عدالت میں گواہی دے رہی ہوں گی وہاں ان دونوں کا ایسی غلطی میں مبتلا ہو جانا اور غلط گواہی دینا بعید از

قیاس ہے۔ایسی صورت میں قرائن یہی بتاتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک حقیقت کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوگئی تو دوسری اس کی اصلاح کردے گی۔ اس موقع پر یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ اگر کوئی خاتون گواہ نسوانی امراض کی ماہر کے طور پر عدالت میں پیش ہو تو کوئی اور گواہ نہ ہونے کے باوجود اس کی اکیلی شہادت بھی معتبر سمجھی جائے گی۔

خاندان کی سر براہی:

جہاں تک خاندان کی سر براہی کا تعلق ہے تو اس کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے صرف وہی شخص عہدہ بر آ ہوسکتا ہے جس میں انتظامی صلاحیت ہو اور جو خاندان کے معاملات کی نگرانی اور انتظام کر سکتا ہو۔خاندان، ایک مرد عورت اور بچوں کے اشتراک اور اس سے پیدا ہونے والی ذمہ داریوں کا نام ہے۔دوسرے یہ کہ معاشرتی اداروں کے مانند خاندان کو بھی ایک ذمہ دار سر براہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی عدم موجودگی میں عائلی زندگی انتشار بالآخر تباہی کا شکار بھی ہوسکتی ہے۔ خاندان کی سر براہی کے بارے میں تین صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ مرد خاندان کا حاکم ہو۔ دوسرے یہ کہ عورت اس کی سر براہی کرے تیسرے یہ کہ مرد اور عورت دونوں بیک وقت خاندان کی سر براہی کے منصب پر فائز ہوں۔

ظاہر سی بات ہے کہ تیسری صورت خارج از بحث ہے کیوں کہ تجربہ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ جہاں دو سر براہ ہوں وہاں سرے سے کوئی سر براہ نہ ہونے کی حالت سے بھی زیادہ انتشار اور مصائب جنم لیتے ہیں۔زمین و آسمان کی تخلیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید اس بارے میں یوں کہتا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا. (سورہ انبیاء، آیت ۲۱)

ترجمہ: زمین و آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہوجاتے۔

إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ. (سورۂ مومنون، آیت ۹۱)

ترجمہ: اس وقت ہر خدا اپنی مخلوق کو جدا کر لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔
اگر ان خیالی خداؤں کا یہ حال ہے تو تصور کیجیے کہ ان انسانوں کا کیا حال ہوگا جو ظالم و بے انصاف واقع ہوئے ہیں پوری انسانی تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ ہر شعبے، ہر محکمے اور ہر ادارے کا ایک ہی سربراہ ہوتا ہے۔ کسی ملک میں دو صدر یا دو وزیر اعظم کا تصور بھی احمقانہ ہے۔ یہی صورت ایک خاندان کی ہے اس میں بھی سربراہ بہر حال ایک ہی ہوگا۔

ایک سوال:

اس طرح ہمارے سامنے صرف دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں، جن پر بحث کرنے سے قبل ہم قارئین کے سامنے ایک سوال رکھتے ہیں۔

اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے خاندان کی سربراہی کے لیے عورت اور مرد میں سے کون زیادہ موزوں ہے؟ کیا عقلی صلاحیتوں سے مسلح مرد خاندان کی ذمہ داریوں سے بہتر طور پر عہدہ بر آ ہو سکتا ہے یا وہ عورت، جس کا امتیازی وصف ہی اس کی جذباتیت ہے؟ جوں ہی ہم اس مسئلے پر غور کرتے ہیں کہ اپنی ذہنی و عقلی صلاحیتوں اور مضبوط جسم و ارادے کی بدولت مرد اس قابل ہے کہ خاندان کا حاکم بنے یا عورت بنے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے سخت جذباتی اور انفعال پذیر واقع ہوئی ہے اور اقدام کی مردانہ صفات سے عاری ہے تو مسئلہ خود بخود طے ہو جاتا ہے کہ عورت حاکم نہیں بن سکتی۔ خود عورت بھی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی جو کمزور ہو اور وہ اس کو بآسانی دبا لے۔ ایسے مرد سے وہ نفرت کرتی ہے۔ اور اس پر کبھی اعتماد نہیں کرتی۔ عورت کا یہ طرز عمل اس ذہنی رویے کے بچے کھچے اثرات کا نتیجہ ہو سکتا ہے جو گزشتہ کئی سو سالوں کی تربیت کے طور پر اسکو ملا ہے۔ مگر بہر حال یہ واقعہ ہے کہ عورت آج بھی اسی مرد میں کشش پاتی ہے جو جسمانی لحاظ سے تندرست توانا اور مضبوط ہو۔ یہ حقیقت امریکی خواتین کی زندگیوں میں پوری طرح جلوہ گر ملتی ہے۔ امریکی عورت کو مرد کے ساتھ برابر کے حقوق حاصل ہیں اور اسکی آزاد حیثیت کو بھی وہاں تسلیم کیا جا چکا ہے۔ مگر اس کے باوجود مرد سے مرعوب ہو کر اسے خوشی ہوتی ہے۔ وہ ایسے مرد سے

بت کرتی ہے اور ہر طرح سے اس کا دل جیتنے کی کوشش کرتی ہے جو مضبوط جسم اور کشادہ سینے والا ہو۔ جب جسمانی قوت کے معاملے میں وہ اسے اپنے سے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی تی ہے تو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی ہے۔

عورت کو خاندان کی سر براہی کا شوق صرف اسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک اس کے اولاد نہیں ہو جاتی اور اس کو ان کی تعلیم و تربیت کی فکر دامن گیر نہیں ہوتی۔ بچوں کی موجودگی میں ان اضافی کاموں کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہیں بچتا۔ کیونکہ ماں کی حیثیت سے اس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ کچھ کم مشکل اور دقت طلب نہیں ہوتے۔

عائلی زندگی کی روح:

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ گھر میں عورت، مرد کی غلام ہے اور مرد، اس کا آقا بن کر رہے کیونکہ گھر کی سرداری چند ایسے فرائض اور ذمہ داریوں کا نام ہے جنہیں صرف اسی صورت میں پورا کیا جا سکتا ہے جب کہ خاوند اور بیوی کے درمیان محبت اور تعاون کی فضا قائم ہو۔ گھریلو زندگی کی کامیابی کے لئے باہمی افہام و تفہیم اور مستقل ہمدردی ناگزیر ضروریات ہیں۔ اسلام باہمی کشمکش اور مسابقت کے بجائے، مرد اور عورت کے درمیان محبت و ہمدردی افہام و تفہیم کو عائلی زندگی کی اساس بنانا چاہتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (سورۃ النساء پ ۶ آیت ۱۹)

ترجمہ: اور ان عورتوں کے ساتھ اچھی زندگی گزارو۔ پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے

کہ خیر کم خیر کم لاهله۔ (ترمذی)

ترجمہ: یعنی تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کی لئے اچھا ہو۔ گویا حضور ﷺ نے آدمی کے اخلاق کو ناپنے کے لئے جو پیمانہ مقرر کیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ آدمی کا اچھا سلوک کرنا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی صحیح پیمانہ ہے کیونکہ کوئی آدمی اس وقت تک اپنی بیوی سے بد سلوکی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ روحانی طور پر مریض نہ ہو اور اس میں نیکی کی کوئی حس باقی نہ رہی ہو یا وہ کسی ذہنی الجھن کا شکار نہ ہو۔

بہر حال خاندانی زندگی میں خاوند اور بیوی کے رسمی تعلق کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں جن کی اصل حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ان میں سے بعض غلط فہمیاں تو ان فرائض کے متعلق ہیں جو عورت پر اپنے خاوند کی جانب سے عائد ہوتے ہیں اور بعض غلط فہمیوں کا تعلق طلاق اور تعدد ازدواج کے مسائل سے ہے۔

میاں بیوی کی رشتہ کی پیچیدگی:

یہاں پر ہم کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شادی کا رشتہ بنیادی طور پر ایک شخصی رشتہ ہے اور دو افراد کے درمیان قائم ہونے والے باقی رشتوں کے مانند اس کا انحصار بھی متعلقہ افراد کے درمیان پائی جانے والی شخصی، نفسیاتی، ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی پر ہے۔ قانون کے ذریعہ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی وجود میں نہیں لائی جاسکتی ہے۔اس لئے اگر میاں بیوی آپس میں ہنسی خوشی سے رہ رہے ہوں اور ان میں مکمل ہم آہنگی اور اطمینان موجود ہو تو ضروری نہیں کہ اس کا راز ازدواجی زندگی کے اصولوں کی بے لاگ پیروی ہی میں مضمر ہو کیونکہ بسااوقات میاں بیوی کا شدید اختلاف بالآخران کی باہم گہری وابستگی اور محبت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔اسی طرح اگر کسی شادی شدہ جوڑے کی ازدواجی زندگی میں کشمکش اور اختلاف نظر آئے تو یہ ضروری نہیں کہ اس کی وجہ خاوند کی کوئی غلطی یا بیوی کی سرکشی ہو۔عین ممکن ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے میاں بیوی دونوں اچھے اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوں مگر اس کے باوجود ان کے مزاج مختلف ہوں اور باوجود خواہش کے وہ آپس میں کوئی مصالحت کر ہی نہ سکتے ہوں۔

قانون ازدواج کی ضرورت:

اس لیے ضروری ہے کہ قانون میں ایسی گنجائش موجود ہو کہ اس سے ازدواجی زندگی کے لیے رہنما خطوط اخذ کیے جاسکیں۔کیوں کہ انسانی زندگی کے اس نازک مسئلے کو سلجھانے کی تدبیر کے بغیر کوئی انسانی نظام جامعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔اس لیے ایک ایسا قانون ناگزیر ہے جو کم از کم مسئلے کی عمومی اور ناقابل عبور حدود مقرر کر کے مرد اور عورت

کو آزاد چھوڑ دے تاکہ وہ ان حدود میں رہ کر باقی تفصیلات خود طے کرلیں۔

اگر میاں بیوی میں محبت ہو اور وہ امن وچین سے رہ رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عدالت سے وہ صرف اس صورت میں رجوع کرتے ہیں جب ان میں اَن بَن ہو جائے اور وہ اپنے جھگڑے کو نہ چکا سکیں۔

پھر قانون بھی ایسا ہونا چاہیے جو انصاف پر مبنی ہو اور اس سے نہ کسی فریق کی بے جا حمایت ہوتی ہو اور نہ بے جا مخالفت۔ اسی طرح اس کو اتنا جامع ہونا چاہیے کہ وہ واقعات کی زیادہ سے زیادہ تعداد پر منطبق ہو سکتا ہو۔ اس موقع پر ہم یہ بات دہرانا چاہتے ہیں کہ کوئی انسانی قانون یا ضابطہ ایسا نہیں ہو سکتا جو انسانی زندگی میں پیش آنے والے تمام حالات یا واقعات پر بیک وقت حاوی ہو سکے اور نہ قانون کے جامد اور لفظی انطباق کو انصاف کے مطابق اور کوئی صحت مند قانونی نظیر قرار دیا جا سکتا ہے۔ • (جاری)

تجارت اور صنعت وحرفت سلف صالحین کی نظر میں

حصول معاش اور رزق حلال کی فراہمی کے لیے تجارت، صنعت اور حرفت وغیرہ سے متعلق فقہائے اسلام، ائمہ حدیث اور سلف صالحین سے منقول یہ ارشادات وملفوظات امام ابو بکر احمد بن محمد خلال بغدادی متوفی ۳۱۱ھ کی نادرۂ روزگار تصنیف "الحث علی التجارۃ والصناعۃ والعمل" سے ماخوذ ہیں۔ حضرات اسلاف کے ان اقوال وافادات کے ترجمہ میں عام تعلیم یافتہ اردو خواں کی رعایت میں نحوی ترکیب اور لفظی ترجمہ کی پابندی کے بجائے مفہوم ومقصد کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

۱- امام احمد کے شاگرد ابو بکر مروذی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے امام احمد بن حنبل سے عرض کیا کہ میں مستغنی ہوں (یعنی میرے پاس اس قدر مال ہے جو میری ضروریات کے لیے کافی ہے اس لیے مجھے تجارت وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں) امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا پھر بھی تجارت کر دیکیوں کہ اس سے جو مال تمھیں حاصل ہوگا اس سے اعزہ اور اقارب کی مدد اور اہل واولاد اور دوست واحباب پر خرچ کر سکو گے،، مطلب یہ ہے کہ ضرورت کی مقدار مال پر انحصار واعتماد کر کے بیکار بیٹھ رہو گے تو دیگر مصارف خیر، اور ملی واجتماعی کاموں میں خرچ کے لئے کہاں سے رقم آئے گی۔

۲- مروذی ہی سے منقول ہے کہ ابن اسلم کے تلامذہ میں سے ایک نے امام احمدؒ سے پوچھا کیا آپ میرے لئے مناسب سمجھتے ہیں کہ میں کوئی کام (تجارت، کاریگری،

مزدوری وغیرہ) کروں، ؟ تو انھوں نے فرمایاہاں اور ضرورت پر خرچ کرنے کے بعد جو رقم بچ جائے اسے خویش واقارب پر خرچ کردیا کرنا۔

۳۔ یہی مروذی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے اپنے لڑکوں سے کہہ رکھا ہے کہ وہ بازار جاکر تجارت کریں اور فرمایا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے "ان اطیب ما اکل الرجل من کسبہ"،(۱) بہترین غذا جو آدمی کھاتا ہے وہ اسکی اپنی کمائی ہے۔

۴۔ فضل بن زیاد کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے سنا کہ وہ بازار جاکر خرید و فروخت کا حکم دے رہے تھے اور فرمارہے تھے کہ لوگوں سے استغناء اور بے نیازی نہایت بہتر چیز ہے

۵۔ مشہور عابد اور قابل اعتماد محدث ابو یحیٰ الناقد بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے عرض کیا کہ میں اجرت پر مزدوری کرتا ہوں۔ میرے والد کی خواہش ہے کہ میں اپنی ذاتی دکان کرلوں۔ (اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟)

فرمایا دکان لے لو کیونکہ جب تمہاری ذاتی دکان ہوگی تو تم جنازے میں شرکت اور مریضوں کی عیادت کرسکو گے۔

(حضرت امام احمدؒ کے اس فرمان کا حاصل یہ ہے کہ اجرت پر مزدوری کی صورت میں چونکہ تم مستاجر الوقت ہوگے اور اجرت پر معاملہ طے کرلینے کی صورت میں تمہارا وقت اس معاملہ میں گھر جائے گا تو اس وقت میں نوافل ومستحبات اور دیگر پسندیدہ طاعات کی انجام دہی پر قادر نہ ہوگے اور اپنی ذاتی دکان کی حالت میں اس قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی)

ابو یحیٰ الناقد کہتے ہیں کہ (تنہا) دکانداری کرنا بہت مشکل ہے اور اگر ہاتھ بٹانے کی غرض سے کسی کو شریک کار کرلوں تو وہ پوری طرح اپنی ذمہ داری نہیں نبھاسکے گا، فرمایا

---

(۱) رواہ احمد فی مسندہ ۶/۳۱ وابوداود فی سننہ فی کتاب البیوع باب الرجل یاکل من مال ولدہ والنسائی فی سننہ فی کتاب البیوع باب الحث علی الکسب وابن ماجۃ فی سننہ والترمذی فی جامعہ وقال وھو حدیث حسن۔

شریک کار کو اسکی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہو اور اس بارے میں اس سے گفتگو کرتے رہو یعنی حضرت امام احمدؒ نے ان کے اس عذر کو نہیں سنا اور اپنے مشورے اور رائے پر قائم رہے۔

۶۔ علی ابن جعفر کہتے ہیں کہ میرے والد حضرت امام احمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ اور امام صاحب سے میرا تعارف کرایا تو امام صاحب نے مجھے دعائیں دیں اور میرے والد سے فرمایا تجارت کے لئے اسے بازار میں بیٹھا دو اور اس کے ہم عمر ساتھیوں سے اسے دور رکھو (اس دوسری ہدایت اس بناء پر کی کہ عام طور پر صالحین اور نیک لوگوں کی اولاد میں بگاڑ انھیں ساتھیوں کی صحبت اور میل ملاپ سے آتا ہے)۔

۷۔ عبد الملک المیمونی نقل کرتے ہیں کہ امام احمدؒ نے بیان کیا کہ سری بن یحیٰ بحری تجارت کیا کرتے تھے کسی نے ان سے کہا حیرت ہے کہ آپ دنیا کمانے کے واسطے دریائی سفر کرتے ہیں (یعنی دریا کا سفر تو خطرات سے گھرا ہوتا ہے اور ہر آن جان جوکھم میں رہتی ہے اس کے باوجود آپ محض دنیا کے لئے اس خطرے کو اختیار کرتے ہیں) سری ابن یحیٰ نے یہ سن کر فرمایا کہ ان خطرات کے مقابلہ میں مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ تم جیسے انسانوں سے مستغنی اور بے نیاز رہوں۔

۸۔ جصاصی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے عرض کیا کہ ایک درہم جو مشروع و جائز تجارت سے حاصل کیا جائے، دوسرا درہم جو بھائیوں اور دوستوں کی طرف سے بطور عطیہ و صلہ رحمی کے ملا ہو، تیسرا درہم جسے تعلیم کی اجرت میں لیا گیا ہو، اور چوتھا درہم بغداد کی آراضی سے حاصل ہوا ہو ان میں سب سے زیادہ پاکیزہ اور حلال ہونے کے لحاظ بہتر کونسا درہم ہے؟

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا میرے نزدیک ان چاروں میں سب سے زیادہ پاکیزہ وہ درہم ہے جو مشروع و جائز تجارت سے حاصل ہوا ہے۔ اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ وہ ہے جو اقارب و احباب سے کی جانب سے بطور صلہ و عطیہ کے ملا ہے۔ رہا تعلیم و تدریس کی اجرت کا مسئلہ تو ضرورت و احتیاج کے وقت لی جاسکتی ہے۔ اور بغداد کی زمین کے محصول کے بارے میں تمہیں خود معلومات ہے پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو (بغداد کی آراضی سے

حاصل شدہ آمدنی کے جواز و عدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہے اگرچہ راجح قول جواز ہی کا ہے پھر بھی امام احمدؒ نے حزم و احتیاط کے پہلو کو اختیار کرتے ہوئے صاف فتوی دینے سے توقف فرمایا)

۹۔ عبدالملک میمونی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن امام احمدؒ مجھ سے از خود فرمانے لگا ابوالحسن (یہ عبدالملک کی کنیت ہے) اپنی محنت و مشقت کے ذریعہ (آمدنی حاصل کرکے) لوگوں کے عطایا اور احسانات سے بے نیاز رہو۔ میں نے عرض کیا مجھ سے یہ بات آپ کیوں فرمارہے ہیں؟ تو کہنے لگے اگر تمہارے پاس تھوڑی سے رقم ہو اور تم حسن تدبیر اور محنت و توجہ سے اس میں اضافہ کرلو اور اس طرح تم دوسروں سے بے نیاز ہو جاؤ تو تمہیں اس میں پوری کوشش کرنی چاہئے "فان الغنی من العافیۃ" کیونکہ غنی اور دوسروں کا محتاج نہ ہونا من جملہ عافیت کے ہے۔

عبدالملک میمونی کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے مجھے بارہا اسکی ترغیب دی کہ اپنی آمدنی کی اصلاح اور حسن تدبیر سے اس میں اضافہ کرکے لوگوں کے عطایا اور خیرات و مبرات سے سے بے نیاز رہو۔ میمونی کہتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے دست احتیاج دراز کرنے اور بغرض امداد و اعانت اپنی ضرورت کو دوسروں سے بیان کرنے کو نہایت سخت الفاظ میں منع کرتے تھے۔ یہی میمونی بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود امام احمدؒ کو اپنے ہاتھوں کام کاج کرتے دیکھا ہے اور ایسا اتفاق تو بارہا پیش آیا کہ جب میں انکی خدمت میں حاضر ہوا تو انھیں گھر کی مرمت کرتے ہوئے پایا۔

۱۰۔ احمد بن عبدالرحمٰن زہری بیان کرتے ہیں کہ ۲۱۹ھ میں امام احمدؒ کے پاس حاضر ہوا تو اس وقت وہ ایک گھر کے فرش کی مٹی ہموار کررہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مالک مکان کی جانب اشارہ کیا۔ (اس اشارہ سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اس وقت اسی کی مزدوری کررہے ہیں

۱۱۔ امام احمدؒ کے صاحب زادے صالح بیان کرتے ہیں کہ بسااوقات والد صاحب (امام احمدؒ) پھاوڑا لیتے اور مزدوری کیلئے آبادی میں چلے جاتے۔

۱۲۔اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ مجھے مخاطب کر کے امام احمدؒ نے یہ شعر پڑھا

قليل المال تصلحه فتبقي :ولا يبقي الكثير مع الفساد

ترجمہ: تھوڑے مال کی اصلاح کروگے تو وہ باقی رہیگا۔ اور کثیر مال فساد و فضول خرچی کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ یہ شعر عربی کے مشہور شاعر متلمس ضبعی کا ہے جسے امام احمدؒ نے مال کی اصلاح و درستگی پر ترغیب دلانے کے لئے اسحاق بن ابراہیم کو پڑھ کر سنایا۔

۱۳۔ حمید بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ خلیفہ راشد سیدنا عمر فاروقؓ نے فرمایا کے میرے نزدیک معیشت میں حماقت محتاجی و تنگ دستی سے بھی زیادہ خوفناک ہے، اصلاح و تدبیر کے ساتھ کوئی مال کم نہیں اور فساد و بے تدبیر کے ساتھ کوئی مال باقی نہیں بچتا۔ (مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے وغیرہ میں اسراف اور ضرورت سے زائد خرچ کرنے کی عادت فقر و تنگ دستی سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ محنت و مشقت کر کے تنگ دستی کا مداوا کیا جاسکتا ہے مگر فضول خرچی تو ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں یہ عادت بد تو بڑے بڑے سرمایہ داروں کو بھی نان شبینہ کا محتاج اور کنگال بنادیتی ہے)

۱۴۔ میتب بن واضح بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے یوسف بن اسباط نے کہا حضرت سفیان ثوریؒ نے وفات کے وقت دو سو دینار ترکہ میں چھوڑے، میں نے عرض کیا حضرت سفیان ثوریؒ تو طبقہ علماء زہد اور دنیا کی جانب سے بے التفاتی میں ممتاز مشہور تھے پھر یہ دو سو دیناران کے پاس کہاں سے جمع ہوگئے؟ یوسف بن اسباط نے کہا وہ اپنے دوستوں کے پاس تھوڑا تھوڑا پس انداز کر رہتے تھے اللہ تعالیٰ نے اسی میں یہ برکت دی اور یہ رقم جمع ہوگئی۔ بعد از آں یوسف بن اسباط نے بیان کیا کہ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت سے کسی زمانہ میں مال صاحب مال کے لئے اسقدر نفع بخش نہیں تھا جس قدر کہ نفع بخش آج کے زمانہ میں ہے۔

۱۵۔ ابوالحسن زاہد سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے مشہور امام حدیث سفیان بن عیینہؒ سے دریافت کیا کہ اگر کسی کے پاس سو دینار ہوں جب بھی وہ زاہد اور دنیا سے بے نیاز ہوسکتا ہے؟ حضرت سفیان بن عیینہؒ نے فرمایا ہاں وہ اس حالت میں بھی زاہد ہوسکتا ہے۔

سائل نے کہا یہ کیسے؟ حضرت ابن عیینہ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا اگر ان سو دیناروں میں خسارہ اور کمی ہو جائے تو اسے رنج نہ ہو اور اگر ان میں زیادتی اور بڑھوتری ہو جائے تو اسے خوشی نہ ہو، اور ان دیناروں کے ہوتے ہوئے موت آجائے تو ان سے جدائی کی بناء پر موت کو ناپسند نہ کرے۔ (تو ایسا شخص مالدار ہوتے ہوئے دینار سے بے نیاز اور زاہد ہو سکتا ہے)

(مطلب یہ ہے کہ دنیا کے مال واسباب کا کسی کے پاس رہنا یہ اس کے زہد اور دنیا سے بے التفاتی کے خلاف نہیں ہے بلکہ متاع دنیا کی جانب دل کا میلان زہد اور دنیا سے بے رغبتی کے منافی ہے)

۱۶۔ عبد اللہ بن موسیٰ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت سفیان ثوریؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس زمانہ میں مال (مومن) کا ہتھیار ہے (امام سفیان ثوریؒ متوفی ۱۶۱ھ نے یہ بات اپنے زمانہ میں یعنی آج سے ساڑھے بارہ سو سال پہلے بیان فرمائی تھی جبکہ مادیت کے مقابلہ میں روحانیت کا اور دنیا کے مقابلہ میں فکر آخرت کا غلبہ تھا۔ عصر حاضر جو خالص مادیت کا عہد ہے جس میں ہر چیز کا مقام ومرتبہ مادی پیمانہ ہی سے جانچا جاتا ہے ایسے دور میں ایک مرد مومن کے لئے مالی کفایت کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ حضرت سفیان ثوریؒ کے اس ملفوظ سے کیا جا سکتا ہے)

۱۷۔ ابو الفتح بیان کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو جو (رزق حلال کے لئے) کاروبار اور محنت ومزدوری کے قائل نہیں تھے حضرت سفیان ثوریؒ انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کو سوال کرتے دیکھا تو اسے اپنے پاس اجیر یعنی مزدوری رکھ لیا۔ (حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی اس حکمت عملی سے در در ہاتھ پھیلانے اور دوسروں کے صدقات وخیرات پر گزارہ کرنے والے جوان سائل کو جوان عامل بنا دیا کہ اپنی محنت کی کمائی سے نہ صرف وہ دوسروں سے مستغنی اور بے پروا ہو گیا بلکہ بوقت ضرورت دوسروں کی مالی امداد و اعانت کے قابل ہو گیا)

۱۸۔ محمد [illegible] کہتے ہیں کہ ہم [illegible] حرم میں بیٹھے تھے اسی اثناء میں حضرت سفیان

ثوریؒ ہمارے پاس سے گزرے اور ہمیں دیکھ کر فرمایا تم لوگ کیوں بیٹھے ہو؟ ہم نے کہا کہ پھر کیا کریں؟ فرمایا جاؤ اللہ تعالیٰ کے فضل کو تلاش کرو اور عام مسلمانوں پر بوجھ نہ ہو (یعنی جب تم عبادت الٰہی سے فارغ ہو چکے ہو تو قرآن حکیم کی ہدایت کے مطابق (فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ) فضل الٰہی ورزق حلال کی تلاش میں زمین میں پھیل جاؤ" اگر یونہی بیکار بیٹھے رہو گے تو خواہ مخواہ لوگوں پر بوجھ بنو گے)

۱۹۔ ابن ابی عتبہ کہتے ہیں کہ امام سفیان ثوریؒ نے فرمایا اگر تمہارے پاس خرچ موجود ہے تو پھر بیٹھ کر عبادت وریاضت کرو ورنہ پھر رزق حلال طلب کرو (حضرت سفیان ثوریؒ کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ عبادت وریاضت کے لئے فراغت و تخلیہ اس شخص کے لئے مناسب ہے جس کے پاس بقدر کفایت خرچ موجود ہو اور دوسروں کے عطایا اور امداد و احسان پر اعتماد کر کے عبادت میں مشغول رہنا اور طاقت وقدرت کے باوجود کسب معاش اور کمائی کو ترک کر دینا تو یہ درست نہیں ایسا کرنے والا منشاء شریعت کے خلاف کر رہا ہے خواہ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے نیک وصالح کیوں نہ ہو)

۲۰۔ مشہور بزرگ ومحدث شعیب بن حرب فرماتے تھے ایک پیسہ جسے تم نے رضاء الٰہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کمایا ہے اسے حقیر وکمتر نہ سمجھو، کیونکہ یہ پیسہ مراد و مقصود نہیں بلکہ رب العالمین کی اطاعت ورضا مطلوب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حلال ذریعہ سے کماتے ہوئے اس پیسہ سے تم معمولی سبزی خریدو اور اس کے کھاتے ہی تمہاری مغفرت وبخشش ہو جائے۔ (چنانچہ بعض سلف کا قول ہے کہ اگر تم حلال کمائی کھاؤ گے تو اس کی برکت سے نہ چاہتے ہوئے بھی خدائے پاک کی عبادت کرو گے، اور اگر تم نے حرام غذا سے پیٹ بھرا تو اس کی نحوست سے نہ چاہتے ہوئے بھی معصیت وگناہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔)

۲۱۔ علی بن بکار بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ مزدوری کرتے تھے، حضرت سلیمان خواص کھیتوں سے دانے چنا کرتے تھے (یعنی گیہوں وغیرہ کاٹنے کے وقت جو بالیاں ٹوٹ کر کھیتوں میں گر جاتی ہیں اور عام طور پر کسان انہیں چھوڑ جاتے ہیں انہیں چن لیا کرتے تھے) اور حضرت حذیفہؒ مرعشی اینٹ بنایا کرتے تھے (یہ تینوں بزرگ

اکابر صوفیا میں سے ہیں اور عبادت وریاضت میں امتیازی شان کے مالک ہیں مگر دوسروں کے عطایا ونذرانے سے بے نیاز ہوکر خود محنت ومزدوری کرکے اپنا رزق مہیا کرتے تھے)

۲۲۔ بقیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے جب مزاج پرسی اور خیریت پوچھی جاتی تو فرماتے جب تک میرے خرچ کا بار دوسروں پر نہیں ہے خیر وعافیت ہے۔

۲۳۔ اشعت بن شعبہ سے منقول ہے حضرت ابراہیم بن ادھم نے اپنے بعض احباب کو بطور خاص یہ نصیحت فرمائی کہ دیکھو کاروبار اور کسب وکمائی کو ترک نہ کرنا کیونکہ کاروبار میں مشغول رہنے کی حالت میں (تم مستغنی سمجھے جاؤگے) اور جب کاروبار اور کمائی کو چھوڑ دو گے تو بیکاری میں مشہور ہو جاؤگے (اور اس وقت اصحاب خیر عطیات ومبرات کے ذریعہ تمہار امداد واعانت کریں گے جسے لینا عزت نفس اور مردانگی کے خلاف ہے)

۲۴۔ فیض بن اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ سے میں نے پوچھا کہ اگر کوئی شخص کاروبار اور کسب وکمائی کو چھوڑ کر اللہ تعالی پر بھروسہ کرتے ہوئے گھر میں بیٹھ رہے کہ رب العالمین کی جانب سے میرا رزق میرے پاس پہونچ جائے گا (تو کیا گھر بیٹھے اس کو رزق ملتا رہے گا؟)

حضرت فضیلؒ نے فرمایا اگر اللہ رب العزت کے علم میں ہے کہ وہ اپنے اس اعتماد میں سچا اور پختہ ہے تو منجانب اللہ اسکی مراد پوری ہوتی رہے گی لیکن یہ طرز زندگی حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی سیرت کے مطابق نہیں ان اللہ کے برگزیدہ ومنتخب بندوں نے بنفس نفیس محنت ومزدوری کر کے اپنی روزی حاصل کی ہے۔ خود سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اجرت پر کام کیا ہے، حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما محنت ومشقت کر کے اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ ان حضرات نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اللہ تعالی پر اعتماد اور بھروسہ کر کے بیٹھے رہیں رب العزت ہمارا رزق ہمیں پہونچاتا رہے گا۔ اور خود پروردگار عالم کا فرمان ہے "وابتغوا من فضل اللہ" اللہ کے فضل یعنی رزق کی طلب وتلاش کرو لہذا معاش اور روزی کا طلب کرنا ضروری ہے۔ (جاری)

از : جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

غیر مقلد حضرات کا عام مسلمانوں سے جن مسائل میں اختلاف مشہور ہے ان میں سے ایک مصافحہ کا طریقہ بھی ہے، اہل حدیث حضرات کو اصرار ہے کہ مصافحہ صرف ایک ہاتھ ہی سے کیا جانا چاہئے، دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنا مسنون طریقہ کے خلاف ہے۔ احناف کے نزدیک بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے۔ اگر تمام احادیث کو سامنے رکھا جائے تو مجموعی طور پر وہ تین طرح کی نظر آتی ہیں۔ اول وہ حدیثیں جن سے دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنا معلوم ہوتا ہے، دوسرے وہ روایات جن سے دو ہاتھ ملانا معلوم ہوتا ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ یہ ہاتھ ملانا مصافحہ کے طور پر تھا یا بطور بیعت کے، تیسرے وہ روایات جن سے مطلقاً ہاتھ سے مصافحہ کرنا ثابت ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ یا دو ہاتھ کی صراحت نہیں ہے۔ البتہ احتمال دونوں ہی صورتوں کا ہے۔

دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی روایات:

۱- جس روایت سے دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنا معلوم ہوتا ہے اس کو امام بخاریؒ نے اس طرح نقل کیا ہے:

علمنی النبی ﷺ التشهد وکفی بین کفیه (بخاری عن ابن مسعودؓ ج ۲ ص ۹۲۶)

(۲) ان النبی ﷺ قال مامن مسلمین التقیا اخذ احدهما ید صاحبه الاکان حقاً علی الله عزوجل ان یحضر دعائهما ولایفرق بین ایدیهما حتی یغفرلهما۔ (مجمع الزوائد بحوالہ مسند احمد عن انسؓ ج ۸ ص ۳۶)

ترجمہ :- آپؐ نے مجھے تشہد سکھایا اس حال میں کہ میرا ہاتھ آپؐ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا آپؐ نے فرمایا دو مسلمان جب بھی باہم ملتے ہیں اور ان میں سے ایک

اپنے ساتھی کا ہاتھ تھام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہو تا ہے کہ ان کی دعاؤں میں حاضر ہو اور وہ اپنے اپنے ہاتھوں کو الگ نہیں کرتے یہاں تک کہ ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

یہاں مصافحہ کے بعد دونوں کے لئے "ہاتھوں" کے الگ کئے جانے کا ذکر ہے اور "جمع" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہو تا ہے کہ مصافحہ کے لیے ایک ہاتھ کا نہیں بلکہ ہاتھوں کا استعمال ہونا چاہئے۔

(۳) ان رسول الله ﷺ قال اذاتصافح المسلمان لم تفرق اكفهما حتى يغفرلهما.

(مجمع الزوائد طبرانی عن ابی امامہ ج۸ص۳۷)

ترجمہ:۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو اپنے اپنے ہاتھوں کو الگ نہیں کرتے کہ ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

(۴) قدمنا فقيل ذاك رسول الله ﷺ فاخذنا بيديه۔

(بخاری عن الوازع بن عامر فی الأدب المفرد ۲/۱۳۹)

ترجمہ:۔ ہم آئے تو ہم سے بتایا گیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ ہیں تو ہم نے آپؐ کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا یعنی مصافحہ کیا۔

جس روایت سے ہاتھ ملانا ثابت ہے لیکن بعض حضرات اس کو بیعت کے ساتھ خاص قرار دیتے ہیں، وہ اس طرح ہے۔

(۱) بايعت بهاتين نبي الله صلى الله عليه وسلم۔

(بخاری عن مسلم بن اکوع فی الأدب المفرد ۲/۱۲۸)

ترجمہ:۔ میں نے ان دونوں ہاتھوں سے آپؐ سے بیعت کی۔

اس میں دونوں ہاتھوں کا ملانا تو صریحاً ثابت ہے لیکن بعض بھائیوں کا خیال ہے کہ یہ صورت بیعت ہی کے ساتھ مخصوص ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کی یہ تاویل درست نہیں ہے۔ اس واقعہ کا تعلق یقیناً بیعت ہی سے ہے لیکن اس میں اور مصافحہ میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس لئے کہ خود مصافحہ بھی بیعت ہی کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے، چنانچہ بیعت کے متعلق بعض روایات میں "مصافحہ" کا صریح ذکر ہے۔

اتیت النبی فی نساء لنبایعه (الحدیث) وفیه قلنا یا رسول الله الا تصافحنا قال انی لا اصافح النساء (ترمذی و نسائی عن امیمہ بنت رقیقہ ۲/۱۸۲)

ترجمہ:۔ میں کچھ عورتوں کے ساتھ حضورؐ سے بیعت ہونے آئی ہم نے عرض کیا، اللہ کے رسول! آپؐ ہم سے مصافحہ نہیں کریں گے، فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔

دیکھئے یہاں بیعت کے درمیان ہاتھ ملانے کو "مصافحہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور چوں کہ عورت سے مرد کے لئے مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے حضور ﷺ نے بیعت کے درمیان مصافحہ سے انکار کر دیا، پس دراصل یہ حدیث دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی صریح دلیل ہے۔

مبہم روایات:

(۱) قال رجل یا رسول الله الرجل منا یلقی اخاه اوصدیقه أینحنی له قال لا، قال أفیلتزمه ویقبله قال لا، قال أ فیاخذ بیده ویصافحه قال نعم۔

(ترمذی عن انسؓ ج۲ ص۱۰۲)

ترجمہ: ایک شخص نے کہا، اللہ کے رسولؐ! ہم میں سے ایک شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملاقات کرتا ہے، کیا وہ اس کے لئے جھکے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، دریافت کیا: کیا چمٹائے اور بوسہ لے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، پوچھا: کیا اس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کرے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں۔

(۲) کنا مع النبی وهو اخذ بیدعمر بن الخطاب فقال له عمر یا رسول اللهؐ لانت احب الی من کل شیئی الا نفسی فقال النبیؐ لاوالذی نفسی بیده حتی اکون احب الیه من نفسك فقال له عمرؓ فانه الأن والله لأنت احب الی من نفسی فقال النبی الأن یا عمر۔ (بخاری عن عبداللہ بن ہشام ۹۳۶/۲)

ترجمہ: ہم لوگ حضورؐ کے ساتھ تھے اور آپؐ حضرت عمرؓ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپؐ مجھے میری جان کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ

عزیز ہیں، آپؐ نے فرمایا نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہاں تک کہ میں تیرے نزدیک تیری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا، اب بخدا!! آپؐ مجھے اپنی ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ اے عمرؓ! اب تمہارا ایمان معتبر ہے۔

(۳) قال اذا دخلت علیه قام الیها فاخذ یدها فقبلها فاجلسها فی مجلسه وکان اذا دخل علیها قامت الیه فاخذت یده فقبلته فاجلسته فی مجلسها.

(ابوداؤد عن عائشہؓ ج۲ ص۷۰۸)

حضرت فاطمہؓ جب حضورؐ کے ہاں آتیں توحضرتؐ ان کے لئے کھڑے ہو جاتے، ان کا ہاتھ پکڑتے، ان کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھلاتے، اسی طرح حضورؐ جب حضرت فاطمہؓ کے پاس تشرف لاتے تو کھڑی ہوتیں، آپ کا ہاتھ پکڑتیں، آپ کو بوسہ دیتیں اور اپنی جگہ بٹھاتیں۔

(۴) کان النبی اذا لقی الرجل فکلمه لم یصرف وجهه حتیٰ یکون هوالذی یتصرف واذا صافحه لم ینزع یده من یده حتیٰ یکون هوالذی ینزعها.

(ابن ماجه عن انسؓ ج۲ ۲۶۴)

آپ ﷺ جب کسی سے ملتے اور گفتگو کرتے تو اپنی توجہ نہ موڑتے یہاں تک کہ وہ خود رخ موڑ لیتے اور جب مصافحہ کرتے تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہ کھینچتے تا آنکہ وہ خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے

(۵) عن النبیؐ قال ان المؤمن اذا لقی المؤمن فسلم علیه واخذبیده فصافحه تناثرت خطایاهما کما یتناثر ورق الشجر.

(مجمع الزوائد ج۵ ص۲۶۴ بحوالہ طبرانی عن حذیفہ)

ترجمہ: آپؐ سے مروی ہے، آپؐ نے فرمایا: جب مسلمان سے ملاقات ہو اسے سلام کرے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرے تو ان دونوں کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کے پتے اسی مضمون کی روایت مسند احمد میں حضرت انسؓ اور حضرت براء

بن عازبؓ سے بھی منقول ہے۔(۱)

ان روایات میں مطلقاً ہاتھ سے مصافحہ کرنے کا ذکر ہے، چونکہ عربی زبان میں "ید" واحد ہے، اس لئے بعض لوگوں نے اس کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ آپؐ کی سنت ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کرنے کی ہے لیکن اس حدیث سے صراحۃً اور قطعاً ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے کہ کبھی صرف ہاتھ کہا جاتا ہے اور اس سے دونوں ہاتھ مراد لئے جاتے ہیں، مثلاً کوئی شخص کہے کہ "میں نے خود اپنے ہاتھ سے چاول کا تھیلا اٹھالیا" تو عرف میں اس کا مطلب یہ نہیں سمجھا جاتا کہ صرف ایک ہی ہاتھ سے اس نے تھیلا اٹھایا ہوگا۔ پیدل چلنے کو "پاپیادہ چلنا" کہا جاتا ہے یہاں "پا" کا لفظ واحد ہی ہے جس کے معنی پاؤں کے ہیں لیکن کوئی بیوقوف ہی اس کا مفہوم یہ سمجھ سکتا ہے کہ فلاں شخص صرف ایک پاؤں سے چل رہا تھا، عربی قواعد کی اصطلاح میں اس کو "جنس" کہا جاتا ہے، یعنی لفظ واحد کا استعمال کیا جائے اور مراد اس سے اس کی پوری جنس لی جائے، مثلاً ان الانسان لفی خسر (بیشک انسان نقصان میں ہے۔)

اس آیت میں "انسان" واحد ہی ہے لیکن اس سے مراد صرف ایک آدمی نہیں ہے بلکہ پوری جنس انسانیت ہے۔ اسی طرح جن روایات میں مصافحہ کے لئے "ید" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور واحد کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے وہاں دراصل صرف ایک ہاتھ مراد نہیں ہے بلکہ ہاتھ کی جنس مراد ہے اور ہاتھ دو ہیں۔ تاہم چوں کہ اس میں دونوں ہی مفہوم کا احتمال ہے اسی لئے محققین نے ایک ہاتھ اور دو ہاتھ دونوں ہی طرح مصافحہ کو حدیث سے ثابت تسلیم کیا ہے۔

والحق فیه ان المصافحة ثابت بالید والیدین۔ (العرف الشذی ج۲ ص۱۰۶)

حق یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا بھی ثابت ہے اور

---

(۱) مجمع الزوائد جلد۸ ص۳۶ باب المصافحة والسلام ونحو ذلك۔

دونوں ہاتھوں سے بھی۔

کلمۂ عدل:

پس حق وانصاف کی بات یہ ہے کہ مصافحہ کے یہ دونوں ہی طریقے ثابت ہیں البتہ امام بخاری کی روش سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف سے دونوں ہاتھوں کا مصافحہ ہی متوارث رہا ہے اور یہی طریقہ صالحین کا معمول تھا، چنانچہ خود امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں "باب المصافحہ" میں صرف عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں تشہد سکھاتے ہوئے آپؐ کے دونوں ہاتھوں سے حضرت ابن مسعودؓ کا ہاتھ تھامنے کا ذکر ہے۔

(بخاری عن ابن مسعودؓ ج ۲/ص۹۲٦)

اور اس کے بعد فوراً ہی دوسرا باب "باب الاخذباليدين "(دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کا بیان) کے عنوان سے قائم کرکے اس طرح لکھا ہے: وصافح حماد بن زيد ابن المبارك بيديه) (حماد نے ابن مبارک سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا) جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امام بخاریؒ کے زمانے میں بزرگوں کا معمول دونوں ہی ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کا تھا اور بہ ظاہر ان حضرات تک یہ معمول صحابہؓ ہی کے عہد سے نسلاً بعد نسل پہونچا ہوگا۔ اس لئے یہ بات بجائے خود دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، حدیثیں بھی اس بارے میں صریح ہیں، اور ان کے مقابل جن روایتوں سے ایک ہاتھ کا مصافحہ معلوم ہوتا ہے وہ احتمال سے خالی نہیں ہیں۔ نیز دونوں ہاتھوں سے مصافحہ میں تواضع اور انکساری اور عجز و نیاز کا اظہار زیادہ ہے اور یہی باہمی ملاقات میں مطلوب ہے اور ان کے علاوہ ایک ہاتھ سے مصافحہ عیسائیوں اور آج کل کے فساق و فجار کا شیوہ ہے، ایک ہاتھ سے مصافحہ میں ان سے تشابہ اور ظاہری یکسانیت محسوس ہوتی ہے، دونوں ہاتھوں سے مصافحہ میں یہ بات نہیں ہوتی، اس لئے زیادہ بہتر طریقہ دونوں ہاتھوں

سے مصافحہ کرنا ہے، اسی بات کو فقہاء نے سنت سے تعبیر کیا ہے۔

السنة فی المصافحة بکلتا یدیه (معرف الشذی مع الترمذی ج۲ ص۱۰۱)

مسنون طریقہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا ہے لیکن ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا بھی چونکہ فی الجملہ احادیث سے ثابت ہے، اس لئے ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا بھی درست ہے، اس میں شدت نہ برتنی چاہئے،

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں

اعلم ان کما ل السنةفیها ان تکون بالیدین وتتأدی اصل السنة من ید واحدة ایضاً۔ (حوالۂ سابق۔ وشرح الأدب المفرد: ج۲ ص۴۳۱)

ترجمہ :۔ جان لو، کمال سنت یہ ہے کہ مصافحہ دو ہاتھوں سے ہو، تاہم محض سنت ایک ہاتھ سے بھی ادا ہو جائے گی۔

ھذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب۔

بدعت اور اہل علم کی ذمہ داری

از: ثناءاللہ عابد مظفرپوری معلم: شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند

بدعت کا لغوی معنی ہے: بغیر نمونے کے کوئی چیز بنانا، ارشاد خداوندی ہے: بدیع السموٰت والأرض "اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو ایک نئے انداز میں بغیر کسی نمونے کے پیدا فرمایا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ قال النووی : البدعة كل شئى عمل على غير مثال سبق "بدعت ہر وہ چیز ہے جو سابق نمونے کے بغیر بنائی گئی ہو۔

بدعت کی تعریف حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے یوں کی ہے: "البدعة ما أحدث ولم يكن له أصل في الشرع" (فتح الباری) ج۱۳ ص۲۵۳۔ بدعت وہ چیز ہے جو نئی پیدا کی گئی ہو اور شریعت میں اس کی کوئی اصل نہ ہو۔ ملا علی قاریؒ نے علامہ نووی کے حوالے سے بدعت کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی ہے:۔

وفى الشرع احداث مالم يكن فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم "(مرقات ج۱ ص ۲۱٦۔ بدعت اصطلاح شرع میں ہر اس چیز کا پیدا کرنا ہے جس کا وجود زمانۂ نبوی علیہ السلام میں نہیں تھا۔

ان دونوں تعریفوں کا ماحصل ایک ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: جو چیز نبی کریم ﷺ، صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانے میں رائج نہ رہی ہو اسے دین سمجھ کر

اختیار کرنا "بدعت" ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ: بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو عہد نبوی ﷺ اور صحابہ کرام و تابعین عظام کے بعد وجود میں آئیں، اس کے باوجود انھیں "بدعت" نہیں کہا جاتا؟ مثلاً حضور اکرم ﷺ، صحابہ کرام، (رضوان اللہ عنہم اجمعین) تابعین اور تبع تابعینؒ کے زمانے میں جہاد کے لیے بارودی اسلحوں: بم، بندوق، ٹینک، توپ اور میزائل وغیرہ کا وجود نہیں تھا، یہ سب بعد کی ایجادات واختراعات ہیں، لہٰذا جہاد کے لئے ان کا استعمال "بدعت" ہونا چاہیے، حالاں کہ کوئی اس کا قائل نہیں، اسی طرح بعض علوم وفنون ایسے ہیں جو زمانۂ نبویؐ اور صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں نہیں تھے، مثلاً نحو، صرف، وغیرہ، لیکن کوئی انھیں "بدعت" نہیں کہتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ: دیکھیے! دو چیزیں ہیں: ایک یہ کہ وہ چیز بذات خود مطلوب ومقصود ہو، دوسری یہ ہے کہ وہ چیز بذات خود مطلوب تو نہ ہو، البتہ وہ شریعت میں کسی شی مطلوب ومقصود کے حصول کا ذریعہ اور آلہ ہو، تو جو چیز ازروے شرع کسی شی مطلوب ومقصود کے حصول کا ذریعہ بنے، وہ "بدعت" نہیں ہے۔ مثلاً: قرآن کریم پڑھنا، اس کے معانی ومفاہیم کا سمجھنا، اصل اور مقصود بالذات ہے اور اس کے حصول کے لیے نحو وصرف وغیرہ پڑھنا ذریعہ اور آلہ ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نحو وصرف وغیرہ پڑھنا "بدعت" ہے۔ اسی طرح جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے فرض ہے اور یہی مقصود بالذات ہے، لیکن جنگ کرنے کے لیے نئے نئے بارودی اسلحوں کا استعمال مقصود بالذات نہیں، بلکہ جہاد کے حصول کا ذریعہ اور سبب ہے، اس لیے بارودی جنگی اسلحوں کا استعمال بھی "بدعت" میں شامل نہیں ہوگا۔ نیز یہ کہ کوئی انھیں دین سمجھ کر اختیار نہیں کرتا۔

اب سوال یہ رہا کہ "بدعت" کے پہچاننے کی کیا شکل ہوگی؟ تو اس کے حوالے سے اصل کلی (یعنی جو چیز حضور اکرم ﷺ، صحابہؓ کرام، تابعین اور تبع تابعینؒ کے زمانے میں رائج نہ رہی ہو اسے دین سمجھ کر اختیار کرنا "بدعت" ہے) ہی سے مستفاد چند اصول پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔

☆ شریعت اسلام کی تجویز کردہ مطلق شی میں اپنی طرف سے قیود جوڑدینا

"بدعت" ہے، مثلاً: کلمۂ شہادت: "لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھنا کسی زمانے اور وقت کے ساتھ مقید نہیں، آدمی جب چاہے پڑھے، لیکن نکاح سے پہلے دولہے میاں کو شرعی حکم خیال کرکے کلمہ پڑھنا "بدعت" ہے، اسی طرح شریعت نے فقراء و مساکین کو کھانا کھلانے کے لیے کسی وقت کی تعیین نہیں کی ہے، جب چاہو، لاچار و محتاج اور فقراء و مساکین کو کھلاؤ پلاؤ لیکن کسی آدمی کی وفات کے چار دن بعد چہارم کے نام سے یا چالیس دن بعد چہلم کے نام سے کھلانا پلانا "بدعت" ہے

☆ شریعت اسلام نے جس چیز کو جس موقع و محل کے لیے وضع کیا ہے، محض خواہشات کی پیروی میں اس کو اپنے مقام سے ہٹادینا "بدعت" ہی کہلائے گا۔ مثال: شریعت نے اذان کو نماز پنج گانہ کے لیے مشروع قرار دیا ہے، (اب اگر کوئی حدیث کی رو سے اجتہاد کرے کہ اذان کی آواز سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے، اس لیے میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دی جائے، تاکہ میت شیطان کے شر سے محفوظ رہ سکے، تو یہ "بدعت" ہے اور یہ اجتہاد، محض اجتہاد فاسد ہے، کوئی صاحب عقل و خرد اسے صحیح اور درست نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ شیطان کا زور انسانوں پر اسی وقت تک ہے جب تک کہ اس کی جان میں جان ہو، لیکن جب روح جسم سے جدا ہوگئی تو شیطان کا اغوا کرنا بھی ختم ہوگیا۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر کوئی شوق اجتہاد میں یہ اجتہاد کر بیٹھے کہ اذان کی آواز سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے، لہٰذا جب کوئی "بیت الخلا" جائے تو اذان کہی جائے (نعوذ باللہ) تاکہ شیطان کے شر سے محفوظ رہ سکے، اگر اس طرح کا اجتہاد کیا جانے لگے تو یہ "بدعت" ہی نہیں، بلکہ اس قسم کے فاسد قیاسات سے تو ساری شریعت مسخ ہوکر رہ جائے گی۔

☆ الغرض شریعت اسلام کی تجویز کردہ کیفیت میں اپنی جانب سے بغیر کسی شرعی استناد کے ردوبدل کردینا "بدعت" ہے، مثلاً نماز میں "ثناء" آہستہ پڑھنے کا حکم ہے، لیکن اگر کوئی اسے باآواز بلند پڑھنا شروع کردے تو یہ بدعت ہے، یا مثلاً دن کی نمازوں میں سراً قرأت کی جاتی ہے کوئی جہراً قرأت شروع کردے تو یہ بھی بدعت ہے، اسی طرح اور اوراد اذکار، اور درود وسلام تنہا اور آہستہ پڑھنے کا حکم ہے لیکن مسجدوں میں جمع ہوکر باآواز بلند تر

نم کے ساتھ پڑھنے کا رواج بنالیا جائے تو یہ "بدعت" ہوگا۔

بدعت بڑی ہی قبیح و شنیع چیز ہے، رسول معظم ﷺ نے بدعت کی اتنی زیادہ مذمت فرمائی ہے کہ کبائر اور بڑے بڑے گناہوں کی بھی اتنی قباحت و برائی نہیں بیان فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"الاوایاك و محدثات الامور؛ فان شر الامور محدثاتها، وكل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة" (ابن ماجة) ٦

ترجمہ: سنو! نئی چیزوں کے ایجاد کرنے سے بچو! کیوں کہ بدترین چیزیں بدعات (نئی پیدا کردہ) ہیں اور نو پید بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

بدعتی کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

من وقر صاحب بدعة ، فقد أعان على هدم الاسلام" (مشكاة) ٣١

ترجمہ: جس نے کسی بدعتی کی تعظیم کی تو یقین جان لو کہ اس نے اسلام کے ڈھانے میں تعاون کیا۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ "صاحب بدعة" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"صاحب بدعة سواء كان داعيا لها أم لا"

ترجمہ: یعنی وہ بدعتی خواہ بدعت کی دعوت و تبلیغ کرتا ہو یا نہیں، بہر صورت اس کی تعظیم کرنا اسلام کو ڈھانے کے مترادف ہے۔

نیز جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

"لايقبل الله لصاحب بدعة صوما و لا صلاة و لا صدقة ولا حجا و لا عمرة و لاجهادا ولاصرفا ولاعدلا ، يخرج من الاسلام كما تخرج الشعرة من العجين" (ابن ماجة) ٦

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی بدعتی کا نہ کوئی روزہ قبول کرتا ہے نہ کوئی نماز، نہ کسی کا صدقہ، نہ حج، نہ عمرہ، نہ جہاد، نہ کوئی فرض عبادت اور نہ ہی کوئی نفل عبادت۔ بدعتی اسلام سے اس طرح نکل جاتا ہے جس طرح گوندھے ہوئے آٹے سے بال۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں جہاں بدعت کی قباحت و شناعت نکھر کر ہمارے سامنے آگئی، وہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ عصر حاضر میں بدعت و ضلالت کے دل دادہ اہلِ ہوی و ہوس کے تار و پود بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتے جارہے ہیں رسم ورواج کا شیوع ہورہا ہے، عقائد شرکیہ کی اشاعت ہورہی ہے، بدعات و خرافات کا افشا ہورہا ہے اور سادہ لوح، علم سے ناآشنا مسلمان گمراہی کی وادیوں میں بھٹکے جارہے ہیں، ایسے نازک موڑ پر سیدھے سادے، بھولے بھالے اور سادہ لوح مسلمانوں کو راہِ راست پر لانے اور خواہشات کے پجاری اہلِ بدعت کی تردید کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ یہ ذمہ داری اس کے سر آتی ہے جس کے سر پر "وراثتِ انبیاء" کا تاج ہے، لہٰذا اس کے قلع قمع کرنے کی ذمہ داری علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے، یہ ان کا فرض منصبی ہے، اس کی انجام دہی ان کا فرض اولین ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ،،

ترجمہ:۔ اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونا ضروری ہے کہ (دوسروں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے لوگ (آخرت میں) پورے کامیاب ہوں گے۔ (تھانویؒ)

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ ابو بکر رازیؒ فرماتے ہیں:۔

وقد حوت هذه الآية معنيين : أحدهما وجوب الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر، والآخر انه فرض على الكفاية ليس بفرض على كل أحد فى نفسه اذا قام به غيره :۔ (احكام القرآن ج۲ ص۲۹)

ترجمہ:۔ اس آیت سے دو باتیں نکلیں: اول یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے، دوم یہ کہ یہ فرض کفایہ ہے جب امت کے بعض افراد انجام دے رہے ہوں تو ہر ایک پر انفرادا فرض نہیں ہوگا۔

حضرت علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:۔

ان الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر فرض كفاية اذاقام به بعض الناس ، سقط الحرج عن الباقين ،واذاتركه الجميع ،اثم كل من تمكن منه بلاعذروخوف ، ثم انه قد يتعين كما اذا كان في موضع لايعلم به الاهوولايتمكن من ازالته الاهو، (نووی علی حاشیہ مسلم ج۱ ص۵۲)

ترجمہ:۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ جب کچھ افراد اسے انجام دے رہے ہوں تو باقی لوگوں سے ترک فرض کا گناہ ساقط ہو جائے گا لیکن جب سب کے سب بلا کسی عذر اور خوف کے ترک کردیں تو ہر شخص گنہ گار ہوگا، بلکہ بعض مرتبہ تو خیر و بھلائی کا حکم اور منکرات کی تردید کسی متعین شخص پر فرض ہو جاتی ہے، مثلاً: ایک آدمی ایسی جگہ ہے جہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا اصاحب علم نہیں ہے، یا اس جگہ صرف وہی اس منکر کے ازالہ پر قادر ہے ایسی صورت میں اسی شخص پر فرض ہوگا۔

تشریح بالا سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے، جب تک کوئی ایک جماعت اسے انجام نہیں دیتی، فرضیت ساقط نہیں ہوگی، بلکہ بعض حضرات نے تو ہر شخص پر فرض قرار دیاہے۔ ومن الناس من يقول هو فرض على كل أحد في نفسه"(احکام القرآن ج۱ ص۲۹)

بعض حضرات کا قول ہے کہ :امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے۔

نہی عن المنکر کا جذبہ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس زمانے کا ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے بادشاہ اور حاکم وقت کو منکرات سے روک دیا کرتا تھا، مسلم شریف کی روایت ہے کہ جب مروان بن حکم نے ایک بدعت ایجاد کرنا چاہی اور عید کے دن نماز سے پہلے ہی خطبہ دینا شروع کردیا تو ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: اے مروان! خطبہ تو نماز کے بعد ہے، مروان نے جواب دیا: وہ تو کب کے ختم ہو گیا، حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا: اس آدمی کی بات صحیح ہے، میں نے نبی

کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: تم میں سے اگر کوئی اپنے سامنے خلاف شرع کوئی کام ہوتا ہوا دیکھے اور اسے روکنے کی طاقت ہے تو اس پر فرض ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں تو زبان سے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پھر اپنے دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب مروان بن حکم قبل از نماز خطبے کے لیے ممبر پر چڑھنے لگا تو حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ دیا کہ یہ "بدعت" ہے، خطبہ نماز سے پہلے نہیں، بلکہ نماز کے بعد ہے۔

کسی عربی شاعر نے سچ کہا ہے:

فأعلى البرايا من إلى السنن اعتزى

وأعمى البرايا من إلى البدع انتهى

ترجمہ: مخلوق کا بہترین فرد طریقہ نبوی کو اختیار کرنے والا ہے اور مخلوق کا بدترین و اندھا فرد بدعت اختیار کرنے والا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب شرک و بدعت اور ضلالت و گمراہی بڑھ جاتی ہے، کوئی کسی کی راہ نمائی نہیں کرنا چاہتا، منکرات سے روکنا نہیں چاہتا، بدعات و خرافات کی تردید نہیں کرنا چاہتا، ظلم و زیادتی کا خاتمہ نہیں کرنا چاہتا اور امت کی دکھتی رگوں پر ہاتھ دھرنا نہیں چاہتا تو اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا عذاب آجاتا ہے جس میں صالح و طالح، نیک و بد، اچھے برے، محتاج و غنی، مالدار و فقیر اور عالم و جاہل کے مابین کوئی امتیاز باقی نہیں رہ جاتا، سب کے سب ایک ہی ساتھ پس جاتے ہیں، فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فتنہ یا دردناک عذاب آجائے۔

بنی اسرائیل کی تباہی کا ایک سبب نہی عن المنکر سے باز رہنا تھا، حدیث شریف میں ہے:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ان أول مادخل النقص على بنى

اسرائیل کان الرجل یلقی الرجل، فیقول: یاھذا اتق اللہ، ودع ماتصنع، فانہ لا یحل لک، ثم یلقاہ من الغد فلا یمنعہ ذلک أن یکون أکیلہ و شریبہ وقعیدہ فلما فعلوا ذلک ضرب اللہ تعالیٰ قلوب بعضھم ببعض.“ (احکام القرآن) ۳۰/۳

ترجمہ: رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل میں سب سے پہلے پیدا ہونے والی خرابی یہ ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے سے ملتا تو کہتا: لوگو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ کر رہے ہو اسے چھوڑ دو یہ تیرے لیے جائز نہیں؛ لیکن جب کل کو اسی آدمی سے ملتا تو اس کے ساتھ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے سے باز نہیں رہتا، جب انھوں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفرت پیدا فرمادی۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف میں بعض نے تو جان دے دینی گوارہ کرلی؛ لیکن منکرات و بدعات کی تردید سے باز رہنا پسند نہیں کیا۔ علامہ ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بحث میں ایک واقعہ لکھا ہے جس کو ہم نقل کررہے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت ابراہیم صائغ رحمۃ اللہ علیہ کے وفات کی خبر پہنچی تو رو پڑے اور اتنا روئے کہ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ شاید آپ کی روح فنا ہوجائے۔ میں نے امام صاحبؒ سے تنہائی میں صورت حال دریافت کی تو امام صاحبؒ نے فرمایا: یہ خدا وہ ایک بڑے عقل مند و زیرک شخص تھے، مجھے ان کے سلسلے میں جس امر کا خوف تھا وہ آج پیش آگیا، میں نے پوچھا: اس کی کیا وجہ ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: وہ برابر میرے پاس آکر مسائل دریافت کیا کرتے، بڑے ہی متقی و پرہیز گار تھے، اگر میں ان کی خدمت میں کھانے کی کوئی چیز پیش کرتا تو اس سے خوش نہ ہوتے اور اسے چکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے، شاید و باید خوش ہوکر تناول فرمالیتے، وہ تو مجھ سے صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کے بارے میں سوال کرتے رہتے تا آں کہ ہمارا اتفاق ہوگیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ ہے، تو انھوں نے کہا: دست مبارک بڑھائے! میں بیعت کرتا ہوں، بس اب کیا تھا؟ میرے اور ان کے درمیان دنیا تاریک ہوگئی، میں نے پوچھا: وہ کیوں؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ:

انھوں نے مجھے اللہ تعالیٰ کے ایک حق کی دعوت دی میں اس سے رک گیا اور میں نے ان سے کہا: اگر یہ کام کوئی تنہا کرنا چاہے گا تو ہلاکت کا خوف ہے، ہاں جب چند حضرات تیار ہوں، ان میں کوئی رہ نما ہو، تب کچھ بات بن سکتی ہے، لیکن وہ جب بھی میرے پاس تشریف لاتے تو ایک قرض دار کی طرح چمٹ جاتے اور اسی کا تقاضہ کرتے رہتے، بالآخر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ "مرد" جہاں کا حاکم ابو مسلم تھا، تشریف لے گیے اور اس سے منکرات کے سلسلے میں سخت وسست کلام کیا تو اس نے انھیں گرفتار کرلیا، لیکن فقہائے خراسان اور دیگر حضرات کی وجہ سے انھیں رہا کردیا، دوبارہ انھوں نے حاکم ابو مسلم سے نہایت سخت لہجے میں گفتگو کی تو اس نے ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ پر اکتفا کیا، جب سہ بارہ اسکے پاس جاکر یہ فرمایا: کہ بدعات و منکرات سے روکنا میرے نزدیک جہاد سے بھی افضل ہے، چوں کہ میں تلوار سے جہاد پر قادر نہیں، اس لیے زبان سے جہاد کروں گا، اتنا سننا تھا کہ ابو مسلم نے حضرت ابراہیم صائغ رحمۃ اللہ علیہ کو قتل کردیا۔

یہی جذبہ، یہی ولولہ اور یہی داعیہ ہمارے اکابر علمائے دیوبند کے دلوں میں بھی کار فرما تھا، جن میں سر فہرست حضرت امام قاسم نانوتویؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ)، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۹/۸/۱۳۲۳ھ) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (متوفی ۱۸/۴/۱۳۳۹ھ)، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ (متوفی ۱۵/۴/۱۳۴۶ھ)، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۵/۹/۱۳۶۲ھ)، حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ (متوفی ۱۳۷۱ھ)، اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (متوفی ۱۲/۵/۱۳۷۷ھ) ہیں یہ حضرات اپنے اپنے زمانے میں رائج بدعات و خرافات سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہے اور دین اسلام کو بدعات و خرافات سے نکھار کر اصلی شکل و صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے، کیوں کہ یہ علمائے کرام ہی کی ذمہ داری اور ان کا فرض منصبی ہے کہ عزت و جاہ کے پجاری علماء اور شہرت پسند صوفیا کی ایجاد کردہ بدعات و خرافات سے لوگوں کو آشنا کرائیں، ان بدعات میں جو قباحتیں اور خرابیاں ہیں انھیں کھول کھول لوگوں کے سامنے پیش کریں

بدعات سے بچنے کی لوگوں کو حد درجہ تاکید کرتے رہیں، گم راہ جماعتوں سے آگاہ کریں اور ان کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں اور بدعات وخرافات کی تردید میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔

حضرت علامہ شبیر عثمانیؒ (متوفی ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۴۹ء)، فرماتے ہیں کہ: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، دین کا قطب اعظم ہے، یہ اتنا اہم ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس اہم کام کو انجام دینے کی خاطر انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا، اگر اس کی اشاعت روک دی گئی اور اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا گیا تو مقصد نبوت فوت ہوکر رہ جائے گا، دیانت مضمحل ہوجائے گی، بے ایمانی عام ہوجائے گی، ضلالت وگمراہی پھیل جائیگی، فساد اور بگاڑ رگ وپے میں سرایت کر جائے گا، خلاف ورزی بڑھ جائے گی، ملک تباہ ہوجائے گا اور بندگان خدا ہلاک ہوجائیں گے، اس کا احساس لوگوں کو قیامت میں ہی ہوگا۔ جس کا ہمیں اندیشہ تھا وہ ہوہی گیا، "اناللہ وانا الیہ راجعون" کیوں کہ دین کا یہ قطب اعظم "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" مٹ چکا، چنانچہ دلوں پر لوگوں کی مداہنت حکمراں ہوگئی قلوب سے پروردگار کی پاس داری ختم ہوچکی، لوگ چوپایوں اور جانوروں کی طرح ہوئی وہوس اور خواہشات کی پیروی میں آزاد ہوگئے اور روئے زمین پر ایسے مؤمن صادق برائے نام رہ گئے جنھیں اللہ تعالیٰ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروانہ ہو، اس لئے جو شخص اس کمی وکوتاہی کی تلافی اور اس شگاف کو بند کرنے میں کوشاں رہے گا تو "انشاء اللہ" وہ اس مٹی ہوئی سنت کو زندہ کرکے اجر وثواب کا مستحق ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ تمام بنی نوع انسان کو راہ مستقیم اور دین قویم پر برقرار رکھے، حق وباطل کے درمیان امتیاز کرنے کی شان سے نوازے، اتباع دین حق کی توفیق عنایت کرے، خواہشات نفسانی کی پیروی سے دور رکھے، بدعات وخرافات کے سر ابھارنے کے وقت اس کی سرکوبی کی ہمت وجرأت پیدا فرمائے اور اپنی ذمہ داری نبھانے کی پوری توفیق بخشے، آمین،،

وماعلینا الاالبلاغ

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳ شمارہ ۷ فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

مدیر	نگراں
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند	مہتمم دارالعلوم دیوبند

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/
ہندوستان سے ۶۰/

Tel: 01336 - 22429

FAX: 01336 - 22768

Tel.: 01336 - 24034 (EDITER)

REGD NO. SHN/L-13/NP-111/98

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤدوالا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند کی معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

حرف آغاز

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

انما المومنون اخوة

پوری دنیا کے مسلمان ملت واحدہ اور آپس میں بھائی بھائی ہیں، ملکی و جغرافیائی تقسیم اس مرکزی عظیم قومیت میں خلل انداز نہیں ہوسکتی اسی دینی اخوت و وحدت کے تحت ممالک اسلامی کی علمی و ملی تقریبات میں علمائے دیوبند برصغیر (ہند وپاک بنگلا دیش) کے اسلامی نمائندوں کی حیثیت سے شامل ہوتے رہے ہیں مدینہ یونیورسٹی ہو یا جامع ازہر موتمر اسلامی ہو یا رابطۂ اسلامی غرضیکہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں مسلمانوں کا کوئی علمی و ملی اجتماع ہو ملکی وجغرافیائی، مسلکی و مشربی تفریق و تقسیم کے ادنی احساس کے بغیر علمائے دیوبند پورے ذوق وشوق کے ساتھ ان میں شرکت کرتے رہے ہیں جوانکی اعتدال پسندی فرقہ وارانہ رجحانات سے دوری اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو ملتِ واحدہ سمجھنے کی واضح اور روشن دلیل ہے۔ اور پوری بصیرت اور ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ برصغیر میں اہل علم کا یہی وہ طبقہ ہے جو ملی و سماجی تمام وسعتوں اور عصری ضرورتوں پر نظر رکھے ہوئے سلف صالحین سے مکمل طور پر وابستہ ہے اور احقاقِ حق اور ابطال باطل کے ساتھ ساتھ قوم وملت کے اجتماعی مقاصد پر بھی انکی نظر رہتی ہے۔ ذٰلك فضل الله يوتيه من يشاء ـ ولو كره الاعداء من كل حاسد.

علمائے دیوبند کا استنادی رشتہ:

اسلام کے تسلسل حیات اور حفظ دین کی خصوصیات اس کا اسنادی پہلو ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر اسے تھامے رہنا اسلام کا معجزہ ہے اسباب کی دنیا میں اس کا باعث وہ

علمائے ربانی رہے ہیں جو آدم سے لے کر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہیں۔

دیوبندی مکتب فکر بحمد اللہ کوئی نوپید جماعت نہیں بلکہ علمی، دینی اور سیاسی احکام ومعاملات میں علمائے دیوبند کا سلسلۂ سند امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے گزرتا ہوا نبی کریم ﷺ سے مربوط ہے۔

برصغیر میں جب مسلمانوں کے کاروان شوکت پر برطانوی سامراج نے شب خوں مارا تو حکیم مطلق جل شانہ نے اسلامی تعلیمات واحکام اور تہذیب وثقافت کو بچانے کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور انکی اولاد واحفاد کو آگے کردیا ان بزرگوں کے سامنے دو منزلیں تھیں۔(۱) مسلمانوں کی لٹی شوکت کیسے واپس لی جائے۔(۲) اور سیاسی تنزل کے اس دور میں اسلامی علوم واحکام کی گرتی دیوار کو کس طرح سہارا دیا جائے۔ پہلی منزل تک پہنچنے کے لئے محدث دہلویؒ نے معاشی انقلاب صحابہ سے انتساب اور قوم کو جہد وجہاد کی راہ دکھائی، ان تینوں امور کو واضح کرنے کی غرض سے حجۃ اللہ البالغہ، مصفی ومسوی اور ازالۃ الخفاء، جیسی بلند کتابیں لکھیں اور ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل دہلویؒ حضرت سید احمد شہید دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالحی بڈھانویؒ کے ساتھ عملاً جہاد میں نکلے،

دوسری منزل تک پہنچنے کے لئے ان محدثین دہلی نے قرآن وحدیث کے درس اور اسلامی علوم وفنون کی اشاعت سے اسلامی اعمال واخلاق کی متزلزل دیوار کو سہارا دیا، چنانچہ عین اس وقت میں جبکہ سید احمد شہید اپنے جانباز رفقاء کے ساتھ میدان کارزار میں داد شجاعت دے رہے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور تلمیذ وجانشین دہلی کی مسند تدریس پر قال اللہ وقال الرسول کا غلغلہ بلند کئے ہوئے تھے

علمائے دیوبند اسی علم وفکر کے وارث اور محدثین دہلی کے اسی خاندان سے وابستہ ہیں اور برصغیر ہند وپاک اور بنگلہ دیش میں اہل سنت والجماعت کا مرکز ثقل یہی حضرات ہیں۔

اسناد سلف کا لازمی اثر :

جن لوگوں نے علم وعمل کے چراغ سلف کے اسناد سے روشن کئے ہوں انکے ذمے سلف کا دفاع لازمی ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کے مکلف ہیں کہ اپنے اسلاف کے

عمومی کردار کو ہر دور میں داغ اور آئندہ نسلوں کے لئے بمنزلہ چراغ ثابت کرتے رہیں۔ اسکے بغیر اسلام ایک مسلسل حقیقت اور ایک زندہ مذہب نہیں رہ سکتا

چنانچہ علمائے دیوبند مکمل طور پر صحابہ کرام سے لیکر محدثین دہلی تک اسناد اسلام کی ہر کڑی سے پورے وفادار رہے اور سلف صالحین کی اتباع کے اس حد تک پابند رہے کہ چھوٹی سی چھوٹی بدعت کو بھی دین نہ بننے دیا۔ تسلسل اسلام اور اسناد دین کو کمزور کرنیوالے مختلف طبقوں سے علمائے دیوبند نے اختلاف کیا تو اس لئے نہیں کہ وہ اختلاف پسند تھے یا انہیں کسی طبقے سے ذاتی بغض تھا بلکہ محض اس لئے کہ اسلام جس مبارک وپاکیزہ سلسلے سے ہم تک پہنچا ہے اس سے پوری وفا کی جائے۔ ان کے الحادی یا بدعی نظریات کی تردید و تخریب اس لئے ضروری تھا کہ اس کے بغیر اسلام تعمیر وبقاء کی کوئی صورت نہیں تھی۔ لیکن انکی یہ تردید بھی اصولی رہی اور انداز جدل احسن رہا جس کی تعلیم خود قرآن نے دی ہے۔ "و جادلھم بالتی ھی احسن" (پ ۱۴)

عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ:

اسلام کے اس عظیم بنیادی عقیدہ پر یلغار کی گئی اور انگریز کی خانہ ساز نبوت کے داعی یورپ اور بلاد افریقہ میں تبلیغی مشن کے حسین عنوان سے مسلمانوں کو ارتداد کی دعوت دینے لگے۔ علمائے دیوبند نے مسلمانوں کو اس ارتدادی فتنہ سے خبردار کیا۔ اکابر دیوبند کے سرخیل شیخ امداد اللہ مہاجر مکی نے اپنے خلفاء حضرت مولانا اشرف علی اور شیخ مہر علی شاہ گولڑوی کو اسکی سرکوبی کی جانب متوجہ کیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد علامہ انور شاہ محدث کشمیری شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد محدث عثمانی، مناظر اسلام مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری مولانا محمد عالم عاصی امرتسری، پھر حضرت محدث کشمیری کے تلامذہ میں مولانا سید بدر عالم میرٹھی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مولانا محمد ادریس محدث کاندھلوی، مولانا محمد یوسف محدث بنوری وغیرہ اساطین علمائے دیوبند میدان میں نکلے اور اپنی گرانقدر علمی تصانیف، موثر تقاریر اور بے پناہ مناظروں سے انگریزی نبوت کے دجل وفریب کا ایک ایک پردہ چاک کیا اور ہر محاذ پر ایسا کامیاب تعاقب کیا کہ اسے اپنے مولود خانہ لندن میں [illegible] جانا پڑا۔ علمائے دیوبند کے علمی وفکری

مرکز دارالعلوم دیوبند کی زیر نگرانی حریم ختم نبوت کی پاسبانی کی یہ مبارک خدمت پوری توا نائیوں کے ساتھ آج بھی جاری اور ساری ہے۔

ناموس صحابہ کا دفاع :

ناموس صحابہ کا دفاع میں علمائے دیوبند کے اکابر اور ان کے جانشینوں نے نہایت وقیع اور گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ۔چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ہدیۃ الشیعہ ،اجوبہ اربعین وغیرہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے ہدایۃ الشیعہ ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے مطرقۃ الکرامۃ ،اور ہدایات الرشید جیسی بلند پایہ کتابیں تحریر کیں اور اس بات میں محدثین دہلی کے علمی و فکری موقف کی پوری نمائندگی کی گئی جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ازالۃ الخفاء ، قرۃ العینین اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ سے ظاہر ہے پھر امام اہل سنت مولانا عبدالشکورؒ فاروقی لکھنوی دفاع صحابہ کی اس عظیم خدمات میں پوری عمر مصروف رہے اور اس اہم موضوع کے ہر ہر گوشے سے متعلق اس قدر معلومات فراہم کر دیں کہ اب شاید اب اس پر مزید اضافہ دشوار ہو نیز حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مقام صحابہ پر کامیاب مضامین لکھے اور جب وقت کی سیاسی آندھیوں نے قافلہ اسلام کی صف اول پر یلغار کی تو حضرت مدنی نے صحابہ کے معیار حق ہونے پر وہ مباحث تحریر فرمائے جو قرن حاضر کا سرمایۂ فخر ہیں ان بزرگوں کے علاوہ مولانا ولایت حسین رئیس دیورہ صوبہ بہار، مولانا محمد شفیع سنگھردی، علامہ دوست محمد قریشی، مولانا لطف اللہ جالندھری، مولانا قاضی مظہر حسین مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا عبدالستار تونسوی وغیرہ علمائے دیوبند اس محاذ پر گراں قدر خدمات انجام دی۔

رد بدعت و شرک :

اتباع سنت اور حدیث کا انکار کرنیوالا گروہ مرکز ملت کے نام سے ایک نئی اصطلاح وضع کر کے قرآن کی تعبیر و تشریح کا اختیار اسے سونپ دیتا ہے کہ یہ نام نہاد مرکز ملت زمانے کے تقاضوں اور امنگوں کے مطابق پیغمبر ﷺ کے ارشادات، صحابہ کے فیصلوں اور اجماع امت کے مسائل سے قطع نظر کر کے جو چاہے فیصلہ کر دے۔ ایک دوسرا گروہ جو زبانی

عشق رسول کا بہت دعویدار ہے اور اپنے سوا تمام طبقات اسلام کو قابل گردن زدنی اور دنیا کے ہر کافرمشرک سے بدتر سمجھتا ہے لیکن عملاً اسکا حال یہ ہے کہ شریعت کے روشن چہرے کو مسخ کر کے دین میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے اورمن گھڑت افکارکوشریعت قرار دیتا ہے جبکہ رسول ﷺ نے ایسے رسوم ورواج کو بدعت قرار دیا ہے اور اپنے ہر خطبے میں اسکی برائی بیان فرمایا کرتے تھے آپ کے بعد صحابۂ کرام سے لیکر آج تک علمائے حقانی نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ مرد بدعت پر مرکوز رکھا کیونکہ اسی سے شرک کی راہ نکلتی ہے۔

جانشینان محدثین دہلی و علمائے دیوبند) نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید نے اس بارے میں بہت مضبوط موقف اختیار کیا ان حضرات کے بعد اکابر دیوبند کی باری آئی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ نے شرک و بدعت کے رد میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی اور ماضی قریب میں مولانا حسین علی بچھروی، مولانا مرتضی حسن چاندپوری، مولانا محمد منظور احمد نعمانی مولانا سرفراز خاں صفدر وغیرہ نے بھی اس محاذ پر نہایت کامیاب خدمات انجام دیں۔ اور آج بھی علمائے دیوبند مبتدعین کے تعاقب میں سرگرم عمل ہیں۔ علمائے دیوبند کے علمی مرکز دارالعلوم دیوبند کی تاریخ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ اس کے فرزند اسلام کی سنت قائمہ کے حامی اور بدعت سے بہت دور ہیں۔ اور ایسے کسی عمل کو جو شاہراہ مسلسل سے نہ آئے وہ اسے اسلام کا نام دینے کیلئے تیار نہیں کیونکہ ان کا موقف اسلام کی سنت قائمہ سے مکمل وفاداری ہے۔ ان کے نزدیک اہل سنت و الجماعت وہ لوگ ہیں جو اسلام کی سنت قائمہ سے وابستہ اور جماعت صحابہ کے نقش پا سے دین کی راہیں تلاش کرنے والے ہوں اور بدعات کو فروغ دینے والے نہ ہوں۔ ان حضرات کا یقین ہے کہ بدعت کا دروازہ کھلا رکھنے سے تفریق بین المسلمین لازمی ہوگی کیونکہ بدعات ہر گروہ کی اپنی اپنی ہونگی یہ فقط سنت ہے جو تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو سکتی ہے اور ملت واحدہ بنا کر رکھ سکتی ہے۔ اس لئے بدعت کے رد میں علمائے دیوبند کا یہ اہتمام کوئی منفی داعیہ نہیں بلکہ شاہراہ اسلام سے مخلصانہ عقیدت ہے۔ اس موقع پر علمائے دیوبند کی تحفظ دین کے سلسلہ میں جملہ خدمات کا تعارف مقصود نہیں ہے اور نہ ہی ان سطور میں اس کی گنجائش ہے۔ البتہ ان سے علمائے دیوبند کے دینی رخ اور ان کے ذوق و مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے۔

علماء ہند اور خدمت حدیث

تحریر: مولانا محمد خالد حسین صاحب نیموی شعبۂ تدریب المعلمین دار العلوم دیوبند

ہندی النسل علماء و مشائخ کا صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور دوسرے کبار محدثین سے تحصیل حدیث اور اس وقت سے اب تک۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تحقیق و تدقیق رحلت و اسفار اور عمریں کھپا کر۔ اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگوں نے انجام دیں۔ جن کی وجہ سے ہندوستان میں علم حدیث کا منارہ رشک فلک نظر آنے لگا۔ عہد بہ عہد ان کے کارناموں کی تفصیل۔ اور (خدمات کے صحیح خدوخال کو واضح کرنے کے لئے) اس زمانے کے حالات کی کچھ جھلکیاں جس میں انہوں نے یہ خدمات انجام دیں۔

بزم نبوت کے حلقہ نشینؓ ہندستان میں:

اسلام کا آفتاب عالمتاب آسمان دنیا پر جب جلوہ افروز ہوا اور اس کی ضیافشاں کرنیں حجاز عرب سے نکل کر رفتہ رفتہ پوری دنیا کو منور کرنے لگیں، تو ہندستان بھی اس آفتاب رشد وہدایت کی ضیاپاشیوں سے محروم نہ رہ سکا۔ اور ابھی پہلی صدی ہجری کی دودہائیاں ہی بیتی تھیں کہ اسلام کا آوازہ ہندستان میں بھی محسوس ہونے لگا۔ چوں کہ قدیم زمانے ہی سے عرب وہند کے مابین وسیع تجارتی تعلقات تھے۔ اور اسی کے زیر اثر عرب تاجروں کی خاصی تعداد، دیبل (موجودہ کراچی) مالابار اور مالدیپ سے لے کر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکی تھی، اس لیے درحقیقت اس وسیع و دراز ملک میں اسلام کا چرچا انہیں کی زبانی ہوا ہوگا۔ لیکن یہ ہندستان کی بڑی خوش نصیبی ہے، کہ

اس سرزمین پر سب سے پہلے ان مقدس شخصیات نے سرود ربانی سنایا جو بزم نبوت کے حلقہ نشین اور چشمۂ فیض محمدیؐ سے بلاواسطہ سیرابی حاصل کرنے والی تھی۔ اور جنھیں تاریخ "أبناء أبي العاصي" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ (فتوح البلدان، للبلاذری ص ٤٢٠)

ابوالعاصی ثقفی کے تین صاحبزادے صحابی رسول حضرت عثمان ثقفی، حضرت مغیرہ ثقفی اور حضرت حکم ثقفی رضی اللہ عنہم وہ قدسی صفات بزرگ ہیں، جنھوں نے عہد فاروقی ۲۲ھ میں ہندستانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام کے داعی اور مبلغ کی حیثیت سے اس وقت کے مشہور ہندستانی سواحل تھانہ (ممبئی) بھروچ (گجرات) اور دیبل (کراچی) پر پڑاؤ کیا، اور پہلی مرتبہ ظلمت کدۂ ہند میں ہدایت کا چراغ روشن کیا۔ اس لحاظ سے ہندستان بھی ان خوش قسمت ملکوں میں ہے جن کی خاک؛ صحبت یافتگان نبویؐ کے پاؤں سے لگ کر ہماری آنکھوں کا کحل الجواہر بن چکی ہے۔ (۱)

تابعینؒ کے قافلے:

حضرت عثمان ثقفیؓ نے جو راہ ہموار کی تھی وہ دوسرے مجاہدین اور مبلغین اسلام کے لیے نقش اول ثابت ہوئی، ان کے بعد بے شمار مجاہدین کے قافلے وقتاً وقتاً سے ہندستانی ساحلی علاقوں میں فروکش ہوتے رہے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے حضرت حکیم بن جبلہ عبدی کو ہندستان اور اس کے سرحدوں کے احوال کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا۔ اور انھوں نے حضرت عثمان کو اس کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ ان کے بعد جب حضرت علیؓ کا زمانہ آیا تو باوجودے کہ ان کا زمانہ اندرونی خلفشار کا شکار تھا تاہم وہ ہندوستان کی طرف سے غافل نہیں رہے۔ اور ۳۸ھ کے آغاز میں مشہور شہسوار جنگ حارث بن مرہ عبدی کو رضاکاروں کی جماعت کے ساتھ ہندوستان جانے کی اجازت دی۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کے شمالی مشرقی سرحد بلوچستاں کے علاقے کا رخ کیا۔ وہاں انھیں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر جنگ ہوئی اور مجاہدین کو فتح حاصل ہوئی۔ پھر جب حضرت معاویہؓ

---

(۱) معجم البلدان للحموی ج ۳/۳۸۱۔ قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے چھ مستند دلائل سے حضرت عثمان اور ان کے بھائیوں کے ہندستان آنے کو ثابت کیا ہے۔ دیکھئے ان کی معرکۃ الآراء کتاب العقد الثمین فی فتوح الہند ۳۹ تا ۴۴۔

۷۵ھ میں خلیفہ مقرر ہوئے تو انھوں نے ہندوستان کی طرف خصوصی توجہ کی، اور مجاہدوں کی متعدد جماعتوں کو ہندوستان روانہ کیا، اور اکثروں کو جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے مہلب بن ابی صفرہ کو اس کے لیے مامور کیا۔ انھوں نے مجاہدین کی جماعت کے ساتھ لاہور اور بنون کا رخ کیا اور فتح مند ہو کر واپس آئے۔ نیز انھوں نے ہی حضرت عبداللہ بن سوار عبدی کو اور عباد بن زیاد کو سندھ و بلوچستان کے مختلف علاقوں پر یورش کرنے کا حکم دیا۔ نیز ان ہی کے حکم پر زیاد نے سنان بن سلمہ ہذلی کو مکران اور اس سے متصل علاقوں کی جانب روانہ کیا۔ اور انھوں نے اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد سے تو گویا ہندوستان کے ساحلی علاقے اسلامی مجاہدین کی جولان گاہ ہی بن گئے۔

(العقد الثمین ۷۷ تا ۱۰۹ ۔ عرب ہند عہد رسالت میں)

ہندستان میں روایت حدیث کا آغاز:

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسلامی فوج کے ہر ایک مجاہد کا لب ودہن اور قلب ودماغ "أخبرنا، حدثنا، سمعت ورأيت" کی عطر بیز خوشبو سے معطر تھا۔ اور چونکہ ان کا نصب العین ہی یہ تھا کہ عالم کے چپے چپے کو "قال الله وقال الرسول" کی صدائے روح افزاء سے معمور کردیں اور شریعت محمدیؐ کے پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پہونچادیں۔ اس لیے وہ اپنے ساتھ قرآن وحدیث کی تعلیمات بھی لائے تھے اور موقعہ بموقعہ اس کی روایت بھی کرتے تھے۔ اسی روایتِ حدیث کو اگر ہندوستان میں علم حدیث کا "اساس الحجر" قرار دیا جائے تو بے جانہ ہوگا (۱) اس کے علاوہ رضاکار مسلم مجاہدین اور عراق وعرب کے مسلمان تاجروں کی جو نو آبادیات یہاں قائم ہو چکی تھیں اس میں مسجدیں بھی قائم اور آباد تھیں۔ یہی مسجدیں در حقیقت ہندستان میں اسلام کی ابتدائی درسگاہیں تھی جو بالعموم "قال الله وقال الرسول" کی صدائے جاں بخش سے

---

(۱) تاریخی طور پر باضابطہ ہندستان میں روایت حدیث کی شہادت دوسری صدی کے آغاز سے ملتی ہے، چناں چہ اس صدی کی تیسری دہائی میں محمد بن عزاز بن اوس الفضاعی نے ہندوستان میں قیس بن بسر سندھی سے حدیث کی سماعت کی۔ مورخین اپنے علم کی حد تک اس کو ہندوستان کی پہلی روایت حدیث قرار دیتے ہیں۔ دیکھیے العقد الثمین ص ۲۱۵۔

نغمہ زار رہا کرتی تھیں۔ (مقالات سلیمان ج ۲)

ہندستان میں علم حدیث اور محدثین:

یہاں تک جب کہ اسلام کے جانباز مجاہد محمد بن قاسمؒ کی قیادت میں مسلمانوں کے ایک منظم لشکر نے ۹۳ھ میں سندھ پر ایک فیصلہ کن حملہ کرکے اسے فتح کرلیا، تو اس وقت سے ہندوستان کا خاصا حصہ باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوکر تیسری صدی تک عربوں کے قبضے میں رہا، اور ۲۵۰ھ تک براہ راست دمشق و عراق سے اس کا تعلق رہا، محمد بن قاسم کے ساتھ اور اس کے بعد کی یورشوں میں صحبت یافتگان صحابہ اور ان کے معاصرین کی ایک بڑی تعداد شریک رہی۔ جن میں مشہور تابعی کہمس بن الحسن القیسی۔ جنھوں نے صحابی رسول ابوالطفیل، عبداللہ بن بریدہ، عبداللہ بن شقیق وغیرہ سے روایت کی۔ اور ان سے بیسیوں ائمہ حدیث جن میں یحیٰ بن سعید القطانؒ، ابن مبارکؒ، وکیعؒ اور معتمرؒ وغیرہ شامل ہیں روایت کرتے ہیں۔(۱) اور زائدہ بن عمیر الطائی الکوفیؒ۔ جنھوں نے عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ ابن عمروؓ، جابر بن عبداللہؓ، نعمان ابن بشیرؓ اور ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ اور عطیہ بن سعد العوفی جو ابوسعید خدریؓ ابن عباسؓ اور ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والوں میں ہیں۔ ان کے علاوہ موسیٰ بن سنان بن سلمہ، حکم بن عوانہ بن عیاض، حباب بن فضالہ ذہلی، زید بن الجواری العمی، ابوشیبہ الجوہری، شمر بن عطیہ الاسدی، قطن بن مدرک اور قیس بن ثعلبہ رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں جن میں سے ہر ایک کو تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے، اور جنھوں نے اپنے خون پسینے کو ایک کرکے ہندستان میں اسلامی روح کی آبیاری کی۔ اور جو اپنے دل میں احادیث رسول کے عظیم الشان ذخیرے کو محفوظ کیے ہوئے تھے۔ ان حضرات نے اس وقت بطریق روایت اگرچہ ہندستان میں حدیث نہ بیان کیا ہو۔ لیکن یہ ایک طبعی امر ہے کہ آپس میں بطریق مذاکرہ ضرور بیان کرتے رہے ہوں گے۔ انھیں تابعین کو ہم ہندستان میں علم حدیث کے معمار اول کہہ سکتے ہیں۔

انھیں تابعین میں جن کا تعلق ہند سے رہا ربیعہ بن صبیح البصری بھی ہیں جنھوں نے حدیث رسول کے منتشر اوراق کو یکجا کرنے میں سب سے پہلے حصہ لیا۔ بلکہ کشف

---

(۱) التاریخ الکبیر للذھبی۔ ج ۴، ص ۲۳۹

الظنون، میں حاجی خلیفہ کے بیان: قیل ھواول من صنف وبوب فی الإسلام" سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں تصنیف و تبویب کا کارنامہ انجام دینے والی پہلی شخصیت انھی کی ہے۔ مشہور محدث اسرائیل بن موسیٰ بھی بکثرت ہندستان آتے جاتے رہتے تھے، اسی لیے ان کا خطاب ہی "نزیل الہند" ہوگیا۔ ابن حبانؒ نے لکھا ہے "کان یسافرالی الھند" اور کچھ یہیں تک محدود نہیں، بلکہ یہ تو ظاہر سی بات ہے کہ جب اتنی طویل مدت تک سندھ اور متصل علاقوں پر عربوں کی بالادستی قائم رہی تو یقیناً آبادیوں کا خاصا حصہ عرب سے ہند اور ہند سے عرب کی جانب منتقل ہوا ہوگا اور ہندی مسلمانوں کو بلا واسطہ خود حضرات صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ سے اسلامی تہذیب و تمدن علوم و فنون اور قرآن و حدیث کو اخذ و جذب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہوگی۔

ہندی نژاد محدثین اور حدیث کے تئیں ان کی جد و جہد:

یہی وجہ ہے کہ رجال واسنادِ حدیث کی کتابوں میں قرون اولی کے عرب محدثین کے دوش بدوش ہندی الأصل علماء حدیث بھی نظر آتے ہیں پیش نظر مقالے میں اسی پہلو کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے کہ ہندی نژاد علماء و مشائخ نے علم حدیث کی خدمت میں کتنا حصہ لیا؟ اور اس امانت کی حفاظت کے سلسلے میں ان کی کیا کوششیں ہیں؛ جو انھوں نے صحابہ کرام، تابعین اور ان کے فیض یافتوں سے حاصل کیا۔

مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ عہد تیموری سے پہلے ہندستان میں معقولات کا غلبہ رہا اور یہاں کے علماء کا سوادِ اعظم منطق و فلسفہ اور کلام و ہیئت کی موشگافیوں میں مگن رہا۔ تاہم اس دوران بھی ہمیں ایسی ایسی ہستیاں نظر آجاتی ہیں جن کی عظمت و جلالت کی آواز سے آج تک ایوانِ علم و فضل گونج رہا ہے، علم کے مختلف کنگروں پر انکی فضیلت کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔

ہندستان کے اس کاروان فضل میں ایسی برگزیدہ شخصیتیں بھی ہیں جس کی آنکھیں صحابہ کرام کے دیدار سے روشن تھیں۔ اور ایسے خادمان حدیث نبوی بھی جنھوں نے اپنی پوری زندگی کو احادیث رسول کی نشر و اشاعت میں کھپادیا، ذیل میں عہد بعہد ان میں سے

بعض اکابر کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عبدالرحمٰن بن ابی زید بیلمانیؒ:

یہ بیلمان (جو گجرات اور سندھ کے مابین بیلوں کا قصبہ تھا) کے رہنے والے تھے، بعد میں یمن چلے گئے تھے۔ اور ولید بن عبدالملک کے عہد میں وفات ہوئی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ "انھوں نے نو صحابہ کرامؓ (جن میں عثمان بن عفان، سعید بن زید ابن عمر، ابن عباس اور معاویہ ابن ابی سفیان بھی ہیں) سے روایت کی ہے ابن حبان نے ان کو ثقات (مضبوط راویوں) میں شمار کیا ہے۔ امام ترمذی اور نسائی نے ان کی حدیث کو اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ (تهذيب التهذيب، ج٥ ص ٥٣٦)

حارث بیلمانیؒ:

یہ بھی بیلمان کے رہنے والے تھے، انھوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ (العقد الثمين ص ٢١٨)

ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھیؒ:

انھوں نے ابوامامہ سہل بن حنیفؓ کا دیدار کیا۔ اکابر تابعین ہشام بن عروہ، نافع مولی ابن عمر، محمد بن کعب قرظی اور سعید مقبری سے حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ ۱۷۰ھ میں بغداد میں وفات ہوئی یہ اپنے وقت میں فن سیر و مغازی کے امام اور حفاظ حدیث میں سے تھے؛ بلکہ ان کا نام ان لوگوں کی قلیل فہرست میں شامل ہے جنھوں نے مغازی و سیر کے واقعات کو سب سے پہلے مرتب کیا۔ خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں: کان أعلم الناس بالمغازی" یعنی ابو معشر لوگوں میں مغازی کے سب سے بڑے عالم تھے (۱) ابن ندیم اپنی فہرست میں لکھتے ہیں کہ "وہ واقعات و سیر کو دیگر محدثین کے مقابلے زیادہ جاننے والے ہیں۔ ان کی کتاب "مغازی" بہت مشہور ہے (۲)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۴۲۷

(۲) ص ۱

یزید بن عبداللہ سندھیؒ:

تبع تابعین میں سے ہیں، سفیان ثوریؒ اور ابن جریج سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے ابوداؤد الطیالسی وغیرہ روایت کرتے ہیں ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ ان کے علاوہ عبدالرحیم بن حماد الدیبلی، عبدالرحمٰن السندی۔ جو انس ابن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں اور موسی سیلانی، سندی بن شماس، قیس بن بسر بن السندی، اسمٰعیل بن ابراہیم بن مقسم وہ ہندی الاصل معزز و مبارک ہستیاں ہیں جنھوں نے براہ راست صحابہ کرامؓ سے یا تابعینؒ سے حدیثیں سنی ہیں۔ اور ان کی جلالت شان اور ثقاہت کی وجہ سے بڑے بڑے حفاظ حدیث نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔

تابعین ہی میں ہم ایک ایسے ہندی النسل شخص کو دیکھتے ہیں جس کے نزدیک علم حدیث کی وارفتگی میں زمان و مکان کے فاصلوں کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ یہ فاصلے صفر کا درجہ بھی نہیں رکھتے، وہ ہیں مشہور امام حدیث مکحول سندھیؒ (المتوفی ۱۱۳ھ) ان کی جلالت قدر کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ جب زہریؒ جیسے امام الحدیث اپنے زمانے کے اہل و علم کا تذکرہ کرتے تو کہتے کہ حقیقی عالم اس زمانے میں تین ہی ہیں اور تین میں مکحول بن عبداللہ کا نام بھی لیا کرتے تھے، بہر حال یہی مکحولؒ اپنی تعلیمی روئداد بیان کرتے ہوئے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ "عنقت بمصرفلَم أدع بهاعلماً إلاّ حويته في ماأرى، ثم أتيت العراق ثم المدينة فلم أدع بهاعلماً إلاّ حويته عليه فيماأرى، ثم أتيت الشام فغر بلتها (۱) شاید اختصار کی وجہ سے بعض مقامات اس بیان میں انھوں نے ترک کردیا، کیونکہ ان ہی کے بعض شاگردوں نے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں "طفت الأرضَ في طلب العلم" (۲) طلب علم حدیث میں سرگرداں رہنے کی یہ کتنی واضح شہادت ہے کہ آزاد ہوتے ہی روئے زمین کو چھان ڈالا!

---

(۱) تدوین حدیث، ص ۱۱۸۔ از مناظر احسن گیلانی بحوالہ تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱۔ ص ۱۲

(۲) امام مکحول کے بارے میں سعید بن عبدالعزیز نے فرمایا "كان مكحول أفقه من زهري" امام مکحول ابن شہاب زہری سے زیادہ فقیہ تھے۔ رجال السند والهند۔ ص ۲۳۲

رجاء السندھیؒ:

رجاء السندھی بھی اس فن کے اولین شہسواروں میں سے ہیں جو ایران پہونچکر "اسفرائینی" کہلائے اور علم حدیث کی خوب خوب خدمت کی، فن اور متعلقات فن میں ایسا کمال پیدا کیا کہ مشہور محدث حاکمؒ ان کے سلسلے میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے "کان رکناً من أرکان الحدیث" (۱) وہ نہ صرف خود محدث تھے بلکہ ان کے خاندان میں اور بہت سارے محدثین اور حفاظ حدیث پیدا ہوئے..... دوسری صدی کی طرح تیسری صدی میں بھی محمد بن ابراہیم دیبلی خلف بن سالم سندھی (م ۲۳۱ھ) احمد بن عبداللہ دیبلی، ابوالفوارس احمد بن محمد سندھی اور ابوالعباس احمد بن منصوری وغیرہ کا شمار ان رجال حدیث میں ہے جن کے قومی الاسناد ہونے کی وجہ سے خود حجاز و عراق اور دمشق و شام کے محدثین نے ان سے روایتیں کی ہیں، آخرالذکر بزرگ کئی کتابوں کے مؤلف بھی ہیں۔ (۲)

تیسری صدی کی پانچویں دہائی میں سندھ سے عربوں کی بالادستی ختم ہونے کے سبب علم حدیث کی روشنی ہندوستانی علاقوں میں مدھم پڑنے لگی تھی، لیکن اس کے لیے خدائی انتظام یہ ہوا کہ پانچویں صدی کی ابتداء میں اسلام نے اپنے اثر و نفوذ کے لئے بری راستے کو منتخب کیا اور اسلام کا قابل فخر مجاہد سلطان محمود غزنویؒ "درہ خیبر" سے اسلامی افواج کے ساتھ نمودار ہوا اور دیکھتے دیکھتے لاہور فتح کرتا ہوا ہندوستان پہونچ گیا ساتھ ہی کلام اللہ اور احادیث نبوی کی شعائیں تیز تر ہو گئیں اور اس کی کرنیں پورے ہندوستان میں پھیلنے لگیں۔ اس عہد کے علماء محدثین میں سے بلند پایہ محدث ایک لاہوری بزرگ شیخ اسماعیلؒ حدیث و تفسیر کے جامع البحرین تھے اور بڑے جادو اثر واعظ بھی تھے، اہل ہندان سے بطور خاص مستفیض ہوئے اور بیشمار آدمی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور بقول "تاریخ علماء ہند" یہ پہلے شخص ہیں جو لاہور میں علم حدیث و تفسیر لے کر آئے، نیز محمد بن عبد الصمد بن عبدالرحمن لاہوری، نصراللہ بن احمد سندھی، علی بن عبداللہ سندھی وغیرہ اس صدی کے

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۳ - ص ۲۶۷۔

(۲) (ھندمه دیوبند لور علم حدیث بحواله ۔ [illegible]

بلند پایہ ہندی محدثین میں ہیں۔

امام صغانیؒ اور ان کی زبردست خدمت حدیث:

ہر چند کہ چھٹی صدی ہجری میں بھی ہندی علماء محدثین کی ایک فہرست ہے اور ان میں امام سمعانیؒ اور ابوالفضل محمد بن ناصر بغدادی کے استاذ شیخ علی ابوالحسن علی لاہوریؒ، محمد بن محمد لاہوریؒ، ابوالحسن بختیار بن عبداللہؒ، مخلص بن عبداللہ سندھیؒ اور ابوالعلا سندھیؒ جیسے اساطین علم حدیث بھی ہیں۔ اور جن پر ہمیں بجا فخر ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے فیوض و برکات سے ہندوستان کم اور دیگر بلاد اسلامیہ زیادہ مستفیض ہوئے اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ شیخ اسماعیل لاہوری کے بعد ہندوستان میں علم حدیث کے حوالے سے گھپ اندھیرا چھایا رہا تو کچھ بھی تجاوز نہ ہوگا۔

بالآخر ساتویں صدی کے شروع میں "مشارق الأنوار" کے مصنف امام صغانیؒ (م ۶۵۰ھ) ہندوستان کے لئے باعث فخر و مباہات بن کر جلوہ افروز ہوئے اور یہاں انھوں نے علم حدیث کی روشنی خوب خوب پھیلائی ان کا نام حسن بن محمد صغانیؒ تھا، ۵۷۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے، حجاز، عراق اور یمن کے بڑے بڑے محدثین سے فیض حاصل کیا اور لغت و حدیث کے امام قرار پائے، حدیث و متعلقات حدیث میں مشارق الانوار کے علاوہ مصباح الدجی فی احادیث المصطفی، الشمس المنیرہ شرح بخاری، در السحابہ، فی وفیات الصحابہ اور دو رسالے موضوعات حدیث میں آپ کی اہم تصانیف ہیں۔ (۱) اگر چہ امام صغانی سے پہلے بھی چند کتابیں لکھی جاچکی تھیں مثلاً المصباح الکبیر، کتاب الہادی اور امام رجاء سندھی کی مستخرج علی صحیح مسلم وغیرہ، مگر یہ کتابیں ہندوستان میں رواج نہ پا سکیں، برخلاف امام صغانی کی مشارق الانوار، کہ اس نے وہ حسن و قبول حاصل کیا کہ تقریباً دو صدیوں تک ہندوستان کے نصاب تعلیم کا ایک اہم جز بنی رہی، علماء محدثینؒ نے اس کی بڑی قدر کی اور بیشمار لوگوں نے۔ جن میں عرب مصنفین بھی شامل ہیں۔ اس کی شرحیں لکھیں، امام صغانی

---

(۱) مختلف علوم میں امام صغانی کی تصنیفات کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے جن میں ایک درجن سے زیادہ کتابیں صرف علم حدیث میں ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۸۸۔

نے اتنی عظیم خدمت اس دور میں انجام دی جب کہ ہندوستان میں حدیث کی کتابوں کا مطلقاً رواج نہ تھا۔ اور مشارق الانوار کے بعد بھی حدیث کی کوئی دوسری کتاب اس کا شریک نہ بن سکی مدتوں یہ تن تنہا داخل درس رہی۔ اس دوران حدیث کی دوسری کتابوں میں اگر کسی خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تو بقول سید سلیمان ندوی "وہ امام الحدیث سمجھا جاتا" اس لحاظ سے یہ کتاب دوسری کتابوں سے ممتاز ہے۔

ماحول سے متأثر ہوئے بغیر بے لوث خدمت حدیث:

باوجودیکہ صغانی کی یہ کتاب مدتوں داخل درس رہی اور اسے ایک خاص اہمیت حاصل رہی لیکن پھر بھی چونکہ امام ممدوح کا زیادہ تر تعلق ممالک عرب سے رہا اس لئے اس کا اثر گھر میں کم اور گھر کے باہر زیادہ رہا اور اس زمانے کا علمی طبقہ اس سے بہت کم متأثر ہوا اور وہ بدستور اپنے علم ودانشمندی منطق وفلسفہ کی باریکیاں اور علم کلام اور اصول فقہ کے مسائل میں الجھا رہا صدیوں معقولات کا زور وشور رہا اور ایرانی تہذیب سے متأثر ہونے کی وجہ سے وہ "رائی کا پربت" یا بقول مناظر احسن گیلانی "بات کے بتنگڑ" بنادینے میں منہمک رہے اور خواص کا ایک بڑا طبقہ "عجمی زہد" میں مبتلا رہا۔ (الفرقان لکھنؤ شمارہ ۳/۱۴۰۴ھ)

لیکن بایں ہمہ علوم نبوت کے شیدائی اور خادمان حدیث ان حالات سے متأثر ہوئے بغیر، زمانے کے چلن سے پہلو تہی کرتے ہوئے اور گردوپیش سے بے خبر ہو کر حدیث پاک کے اخذ وحصول اور نشر واشاعت میں ہمہ تن منہمک رہے اور قول رسولؐ "نضر اللّٰہ عبداً سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا واداھا" (مشکوۃ المصابیح ص ۳۵) کے مصداق بنتے رہے اس عہد کے خادمانِ علوم نبوی کے صف اول میں بھی سر فہرست شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ہیں جو مدینہ منورہ شیخ کمال الدین محدث یمنی کی خدمت میں حاضر ہو کر ۵۳ برس تک درس حدیث میں مشغول رہے۔ اور شیخ رضی الدین صغانی ہیں جنھوں نے علم حدیث میں کئی کتابیں تصنیف کی۔ نیز فاضل ادیب ومحدث حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء" شیخ فرید الدین شافعی کے شاگرد مولانا شمس الدین محمد بن یحی لودھی۔ جو ادب وحدیث کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ مشارق الانوار کے شارح بھی

ہیں۔اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ، شیخ جمال الدین مزی اور امام شمس الدین ذھبیؒ کے خاص فیض یافتہ امام عبدالعزیز دیبلی اور مولانا فخر الدین زرادی اس دور کے محدثین میں خاص اہمیت کے حامل ہیں (تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۳۔ترجمہ نظام الدین اولیاء)

ان کے علاوہ سید یسین گجراتی، حافظ الوقت شیخ عبد الرزاق بہاری، شیخ الوقت مولانا عبد المقتدر محدث بہاری، شیخ نصیر الدین محمود ہندی اور شیخ شرف الدین یحیی منیریؒ بھی ان علماء مشائخ میں ہیں جو حدیث میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ لیکن علم حدیث کے حوالے سے ان کا فیض کچھ زیادہ عام نہ تھا۔

ترویج حدیث کی ایک اور راہ ہموار:

ادھر یہ حالات تھے کہ اللہ تبارک وتعالی نے علم حدیث کی ترویج واشاعت کے لئے ایک اور باب وا کیا، اکبر نے گجرات کی خود مختار ریاست پر قبضہ کر کے اپنی حکومت میں مدغم کرلیا، بایں وجہ راستے میں سہولت پیدا ہوئی اور ہندوستان کے باشندوں کے لیے عرب وعراق کے ذریعے علم حدیث سے آشنائی آسان ہوگئی، دوسری جانب ایران میں صفویوں کی شیعی حکومت قائم ہوگئی ان کے مظالم اور تعصب کی وجہ سے کہ ایران کا سبزہ زار علمائے سنت کے لئے دہکتے ہوئے تنور سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوگیا، اس لئے وہاں کے بڑے بڑے علماء ملک کو خیر باد کہہ کر ہندوستان وغیرہ ممالک کی راہ لی۔ ان واردین میں میر سید شریف جرجانیؒ کے شاگرد، شیخ نور الدین احمد بن عبد اللہ شیرازی سب سے پہلے بزرگ ہیں جو اس عظیم دولت اور قیمتی تبرک کو باہر سے لے کے ہندوستان تشریف لائے۔ موصوف نہایت ہی اعلی سند کے حامل تھے۔اس کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حجاز ویمن میں ان کا شہرہ بلند ہوا تو بڑے بڑے محدثین نے ذوق وشوق کے ساتھ اس اسناد کو حاصل کیا۔ ہندوستان میں بھی شیخ تاج الدین بن عبد الرحمن گاذرونی، علامہ ابو العباس احمد بن محمد نہروانی اور شیخ ہبۃ اللہ چشتی وغیرہ علماء نے ان سے حدیث کی سند واجازت حاصل کی۔ شیخ رکن الدین قریشی ظفر آبادی جن کو ایک لاکھ احادیث حفظ یاد تھیں اور شیخ حسین بن معز الدین بلخی بہاری جنھوں نے اپنے زمانے میں بہار میں بیٹھ کر

شمع حدیث کو جلائے رکھا اور شیخ قطب الدین علوی بلخی وغیرہ اس صدی کے بلند پایہ محدثین میں سے ہیں۔ (مقالات سلیمان جلد،۲)

شیخ محمد بن یوسف دہلوی بھی اسی عہد کے متبحر عالم و محدث تھے، علوم ظاہر و باطن میں مجمع البحرین تھے، علم حدیث کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم میں بھی کتابیں تصنیف کی۔ ان کی تصانیف ۱۰۰ سے متجاوز ہیں جن میں مشارق الانوار کا ترجمہ بزبان فارسی اور بالکل نرالے انداز اور ایک نئے اسلوب میں "الاربعین" بھی شامل ہے۔

علم حدیث کا حقیقی فروغ:

تاہم علم حدیث کے حقیقی فروغ کا جو زمانہ ہے وہ نویں صدی ہجری کا خاتمہ اور دسویں صدی کا آغاز ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مصر، شام اور حجاز میں حافظِ حدیث محمد بن عبدالرحمٰن سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) کے فضل و کمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ موصوف کے فیض و افادہ کی کرنوں سے دنیائے اسلام کا ہر گوشہ منور ہو رہا تھا، چناں چہ بحر عرب کے پار کی شعائیں ہند بھی پہنچی، حافظ سخاوی کے تلامذہ میں سب سے پہلے غالباً مولانا راجح بن داؤد گجراتی ہیں ۸۹۴ھ میں وہ حافظ موصوف کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور احادیث کی سندیں حاصل کیں اور واپس گجرات تشریف لائے یہاں ان کی زبردست مقبولیت ہوئی، ان کے بعد شیخ وجیہ الدین علوی آئے، اور درس حدیث شروع کیا، ان کی بھی بڑی قدر ہوئی۔ (علماء دیوبند اور علم حدیث)

ان باہر سے آنے والوں میں شیخ خواجہ میر کلاں ہروی، شیخ محمد بن احمد فاکہی حنبلی، شیخ ضیاء الدین مدنی، شیخ شہاب الدین بدخشی اور شیخ رفیع الدین صفوی شیرازی کے اسماء سر فہرست ہیں ان تمام حضرات نے "أخبرنا، و حدثنا" کی صدائے حیات بخش سے ہندوستان کی خشک سرزمین کو معمور کر دیا۔

علم حدیث کی روشنی جنوب سے شمال کی طرف:

لیکن اصلی وہ شخصیت جن کے پرتوئے فضل و کمال سے اس سرزمین کے شمالی و جنوبی دونوں حصوں کو منور ہونا مقدر تھا وہ شیخ رفیع الدین صفوی شیرازی کی ذات ہے،

حدیث کا فیض انھوں نے حافظ سخاویؒ سے حاصل کیا اور حدیث کے خزینہ سے سینہ کو معمور کرکے اوّلاً گجرات اور پھر سلطان سکندر لودھی کے قدر دانی علم کی شہرت سن کر گجرات سے دہلی پہنچے، سلطان نے حسن عقیدت کیساتھ خیر مقدم کیا، سلطان ہی کی اجازت سے آگرہ میں قیام پذیر ہوئے اور درس و تدریس کی مجلس آراستہ کی۔ پروانے دور دور سے آکر اپنی قسمت کے مطابق خیر و برکت حاصل کرتے رہے، ان کے سینکڑوں تلامذہ میں سب سے عالی مرتبت شیخ ابوالفتح محدثؒ تھانسیری ہیں؛ جنھوں نے اپنے استاذ کے مسند پر بیٹھ کر پچاس برس تک علم حدیث وغیرہ کا درس دیا۔ سید ابوالفتح کے معاصر سید عبدالاول بن علاء الحسینی جون پوری ہیں۔ دکن میں پیدا ہوئے وہاں سے گجرات اور گجرات سے عرب پہنچے اور وہاں کے خزانۂ علم کے زر و جواہر سے سینہ بھر کر لوٹے اور احمد آباد میں مسند درس حدیث کو زینت بخشی۔ ان کی بہت ساری تصانیف ہیں لیکن ان میں سب سے ممتاز فیض الباری شرح بخاری ہے کیوں کہ یہ اس دیار میں خدمت صحیح بخاری کی اول ترین کوشش ہے اور موصوف سب سے پہلے ہندی شارح بخاری ہیں۔

انھی شیخ عبدالاول کے معاصر عبدالمالک عباسی گجراتی ہیں؛ جنھیں صحیح بخاری حفظ یاد تھی اور زبانی ہی درس دیا کرتے تھے۔ اور اس کے معانی و مفاہیم پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے۔ میر عبدالاول کے ایک شاگرد شیخ طیب سندھی ہیں۔ وہ تقریباً پچاس برس تک مختلف جگہوں میں خدمت حدیث شریف کرتے رہے اور نصف سے زائد عمر کو سرکارؐ کے کلام سے دار فتگی میں کھپادیا۔ اسی عہد میں ابن حجر مکی (صاحب صواعق محرقہ) کے شاگرد شیخ یعقوب کشمیری نے خدمت حدیث میں بلند مقام پیدا کیا۔ انھوں نے تفسیر قرآن کے علاوہ صحیح بخاری کی شرح اور مغازی النبوۃ دو کتابیں لکھیں، کشمیر ہی کے نامور محدث حاجی محمد ہیں انھوں نے بھی شرح شمائل ترمذی فارسی میں تصنیف فرمائی۔ (جاری)

تجزیہ

قادیانی نبی کی آسمانی شادی

مرزا غلام احمد قادیانی کی آسمانی شادی کی دلچسپ مگر عبرت انگیز کہانی

ازقلم: مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی (مانچسٹر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کسی آدمی کا شادی کے لئے کسی لڑکی کا انتخاب کرنا اور اس کے لئے پیغام دینا کوئی معیوب بات نہیں ہے لیکن ایک پچاس سال کے بوڑھے کا ایک کم سن بچی پر نظر کر کے اس کی طلب وہوس میں دن رات تڑپنا کسی شریف آدمی کا کام نہیں ہے۔ پھر یہ مسئلہ اس وقت اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب اس لڑکی کا والد کسی مجبوری میں اس شخص کے پاس آئے اور وہ اس شخص کی مجبوری سے فائدہ اٹھاکر اس لڑکی کو پانے کی کوشش کرے اور انکار پر طرح طرح کی لالچ اور انعام کے وعدے کرے اور پھر موت کی دھمکیوں تک اتر آئے۔ یہ پرلے درجے کی بداخلاقی اور گنڈہ گردی سمجھی جاتی ہے اور معاشرہ ایسے شخص کو بے حیاء اور بدمعاش کہتا ہے۔ پھر یہ بات اس وقت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے جب اس قسم کی اوچھی حرکتیں کرنے والا شخص مامور من اللہ ہونے کا مدعی ہو اور اپنے آپ کو خدا کے نبی کے روپ میں پیش کر رہا ہو۔

خدا تعالیٰ کے محبوبین اور مقبولین اخلاق و کردار کی اس بلند دیوار پر کھڑے ہوتے ہیں جس پر خدا کے معصوم فرشتوں کو بھی رشک آتا ہے۔ مخالفین ان کے دعوے کی تکذیب تو کرتے ہیں لیکن کبھی انکا اخلاق زیر بحث نہیں آتا۔ شدید ترین مخالفین بھی اللہ کے محبوبین کے اعلیٰ اخلاق و کردار کو تسلیم کرتے ہیں اور انھیں امین وصادق اور عفیف مانے

بغیر انھیں بھی چارہ نہیں ہوتا۔اس کے مقابل جولوگ خدا کے نام پر جھوٹی آواز لگاتے ہیں اور افتراء علی اللہ اور افتراء علی الرسول کے مجرم ہوتے ہیں وہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے اس قدر گرے ہوتے ہیں کہ کوئی مہذب معاشرہ ایسے آدمی کو شریف کہنا گوارا نہیں کرتا وہ اول مرحلے پر ہی اپنے آپ کو اس قدر ننگا کر دیتے ہیں کہ ذرا سی سمجھ رکھنے والا انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو شخص اس قدر بداخلاق اور بد کردار ہے وہ مامور من اللہ تو کجا ایک شریف انسان کہلانے کے بھی قابل نہیں۔جب ایک فراڈی آدمی کو کوئی شخص صالح اور پرہیزگار نہیں کہہ سکتا تو ایک بد کردار آدمی کو مامور من اللہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟مولانا روم نے ایسے ہی فرڈای قسم کے لوگوں کے بارے میں یہ کہا تھا ۔

گر ولی ایں است لعنت بر ایں ولی

قادیان کے مرزا غلام احمد کو قادیانی لوگ خدا کا نبی اور اسکا مامور مانتے ہیں اور مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ اس پر ایمان لاؤ گے تو جنت میں جاؤ گے اور اسے نہ ماننے والا حرام زادہ ہے۔اہل اسلام تو سرے سے ہی اسے پرلے درجے کا جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس کے دعوی کی بناء پر اسے اسلام سے باہر جانتے ہیں۔لیکن جو لوگ اسے مانتے ہیں انھیں غور کرنا چاہیئے کہ انہوں نے کس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے؟اگر قادیانی عوام علمی بحثوں کو علماء تک محدود رکھیں اور مرزا غلام احمد کو اخلاق و کردار اور اس کے کریکٹر کے آئینہ میں دیکھیں تو ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ انھیں سیدھا راستہ پانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی اور وہ بڑی سی بڑی قربانی دے کر بھی قادیانیت کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکیں گے۔آج کی مجلس میں ہم بتائیں گے کہ مرزا غلام احمد بداخلاقی کی کس سطح پر پہنچ چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ قادیانی عوام کو سمجھنے کی توفیق دے آمین۔

ایک مرتبہ مرزا غلام احمد کی نظر ایک کم سن لڑکی پر پڑی جو اس کے دل کو بھا گئی۔ تحقیق پر اسے پتہ چلا کہ یہ اس کے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کی بچی ہے۔انہی دنوں اس بچی کے والد کو کسی ایک ضروری کام کے لئے مرزا غلام احمد کے پاس آنا پڑا۔مرزا غلام احمد نے مختلف بہانوں کے ذریعہ اسے ٹالنے کا کھیل کھیلا مگر جب وہ کسی طرح بھی نہ ٹلا تو

مرزا صاحب نے کہا کہ میں ایک شرط پر تمہارا یہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ شرط کیا تھی اسے پڑھئے:

خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو یہ الہام ہوا کہ تمہارا یہ کام اسے شرط پر ہو سکتا ہے کہ اپنی لڑکی کا نکاح مجھ سے کردو۔ (آئینہ کمالات اسلام ص ۲۳۰)

یہ شخص احمد بیگ تھا اور یہ بچی محمدی بیگم تھی۔ احمد بیگ نے جب مرزا غلام احمد کی یہ بات سنی تو اسے کے ہوش اڑگئے کہ ایک ایسا شخص جو مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ایک کام کے لئے میری کم سن بچی مانگ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے مرزا غلام احمد کی یہ شرط ماننے سے انکار کردیا اور بغیر کام کرائے واپس چلا آیا۔ مرزا غلام احمد نے احمد بیگ کو مختلف ذرائع سے سمجھانے اور منانے کی کوشش کی مگر غیرت مند باپ کسی طرح بھی اپنی بچی کا نکاح مرزا غلام احمد سے کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ مرزا غلام احمد نے اس بچی کو پانے کے لئے خدا کی وحی آنے کی خبر دی اور احمد بیگ کے خاندان کو رحمتوں اور برکتوں کے ملنے کی خوش خبری دی، مرزا غلام احمد لکھتا ہے: اس خدائے قادر مطلق نے مجھے فرمایا ہے کہ اس شخص کی دختر کلاں کے نکاح کے لئے سلسلہ جنبانی کر اور ان کو کہہ دے کہ تمام سلوک و مروت تم سے اسی شرط پر کیا جائے گا اور یہ نکاح تمہارے لئے موجب برکت اور ایک رحمت کا نشان ہوگا اور ان تمام رحمتوں اور برکتوں سے حصہ پاؤگے جو اشتہار ۲۰ فروری ۱۸۸۰ء میں درج ہیں۔ (سیرت المہدی ج ۱ ص ۱۱۵)

مرزا غلام احمد نے یہ بھی لکھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ احمد بیگ کی دختر کلاں محمدی بیگم کے لئے ان سے تحریک کر، اگر انہوں نے مان لیا تو یہ ان کے لئے رحمت کا ایک نشان ہوگا اور یہ خدا کی طرف سے بے شمار رحمت و برکت پائیں گے۔ (ایضاً ص ۱۹۵)

احمد بیگ نے ان تمام برکتوں اور رحمتوں کو ٹھکرادیا جو اس نکاح کے نام پر اسے دی جارہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ مرزا غلام احمد کی نفسانی خواہشات ہے جسے وہ خدا کے نام پر پیش کررہا ہے۔ چنانچہ اس نے کھلے عام مرزا غلام احمد کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ مرزا غلام احمد نے اپنے رشتہ داروں کو خطوط لکھے اور انہیں مجبور کیا کہ احمد بیگ کو اس

نکاح کے لئے تیار کیا جائے اور خود احمد بیگ کو ۲۰ فروری ۱۸۸۸ء کو ایک لالچ بھرا خط لکھا کہ اگر تم نے اپنی بچی کا نکاح میرے ساتھ کر دیا تو میں نہ صرف ان کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہوں بلکہ تمہیں جائداد بھی ملے گی اور تمھارے لڑکے کو پولیس کی ملازمت بھی دلادوں گا۔ مرزا غلام احمد کے خط کا یہ حصہ دیکھئے۔

میں اپنی طرف سے تو صرف یہی عرض کرتا ہوں کہ میں آپ کا ہمیشہ ادب و لحاظ رکھتا ہوں اور آپ کو ایک دین دار اور ایمان دار بزرگ تصور کرتا ہوں اور ہبہ نامہ پر جب لکھو حاضر ہو کر دستخط کر جاؤں اور اس کے علاوہ میری املاک خدا کی اور آپ کی ہے اور میں نے عزیزی محمدی بیگ (احمد بیگ کے لڑکے) کے لئے پولیس مین بھرتی کرانے کی اور عہدہ دلانے کی خاص کوشش و سفارش کرلی ہے تاکہ وہ کام میں لگ جاوے اور اسکا رشتہ میں نے ایک بہت امیر آدمی جو میرے عقیدت مندوں میں ہے تقریباً کر دیا ہے۔

(غلام احمد لدھیانہ اقبال گنج ۲۰ فروری ۱۸۸۸ء منقول از نوشتہ غیب ص ۱۰۰)

مرزا غلام احمد نے احمد بیگ سے یہ وعدہ بھی کیا:

میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کو اپنی زمین اور مملوکات کا ایک تہائی حصہ دوں گا اور میں سچ کہتا ہوں کہ اس میں سے جو کچھ مانگیں گے میں آپ کو دوں گا۔

(آئینہ کمالات ر۔خ۔ج ۵ ص ۵۷۲)

مرزا غلام احمد کی یہ تحریر بھی دیکھیں جو وہ خدا کے نام پر پیش کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی فرمائی کہ اس شخص کی بڑی لڑکی کے نکاح کے لئے درخواست کر۔۔ اور کہہ دے کہ مجھے اس زمین کے ہبہ کرنے کا حکم مل گیا ہے جس کے تم خواہش مند ہو بلکہ اس کے ساتھ اور زمین بھی دی جائے گی اور دیگر مزید احسانات تم پر کئے جائیں گے بشرطیکہ تم اپنی لڑکی کا مجھ سے نکاح کر دو۔ (ایضاً ص ۵۷۲)

احمد بیگ نے مرزا غلام احمد کی یہ پیش کش بھی ٹھکرا دی۔ مرزا غلام احمد پھر بھی باز نہ آیا چنانچہ مرزا غلام احمد نے التجاؤں کے خطوط لکھے اور کہا کہ اب جب کہ عوام میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ خدا کی طرف سے اس رشتہ کا حکم ہے اس لئے اس میں کوئی تاخیر نہ

ہونی چاہئے اس نے احمد بیگ کے نام ۷ اجولائی ۱۸۹۲ء کو یہ خط لکھا کہ:

آپ کو شاید معلوم ہوگا یا نہیں کہ یہ پیش گوئی اس عاجز کی ہزارہا لوگوں میں مشہور ہو چکی ہے اور میرے خیال میں شاید دس لاکھ آدمی سے زیادہ ہوگا کہ جو اس پیش گوئی پر اطلاع رکھتا ہے اور ایک جہاں کی اس طرف نظر لگی ہوئی ہے۔ یہ عاجز آپ سے ملتمس ہے کہ آپ اپنے ہاتھ سے اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے لئے معاون بنیں تاکہ خداتعالیٰ کی برکتیں آپ پر نازل ہوں۔ (منقول از رسالہ کلمۃ فضل رحمانی ص ۱۲۳)

احمد بیگ جانتا تھا کہ یہ مرزا غلام احمد کا جھوٹ ہے کہ خدا نے اسے اس نکاح کے لئے کہا ہے۔ اس نے مرزا غلام احمد کی کوئی التجا نہ سنی۔ پھر مرزا غلام احمد نے احمد بیگ کو خدا کے عذاب کی دھمکیاں بھی سنائیں احمد بیگ اسے بھی کسی خاطر میں نہ لایا اور اپنی بچی کو ایک دائم المریض اور مراقی کو دینے کے لئے ہرگز راضی نہ ہوا۔

مرزا غلام احمد کو معلوم ہوا کہ محمدی بیگم کا ایک ماموں ہے جو بہت بااثر ہے مرزا غلام احمد نے منصوبہ بنایا کہ اسے رشوت دے کر یہ رشتہ حاصل کیا جائے۔ مرزا بشیر احمد کہتا ہے: محمدی بیگم کے نکاح کا عقدہ زیادہ تر اسی شخص کے ہاتھ میں تھا اس لیے حضرت صاحب نے اس سے کچھ انعام کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ (سیرت المہدی ج ۱ ص ۱۹۳)

مرزا غلام احمد جب ہر طرف سے ناکام ہوا تو اس نے احمد بیگ کو منوانے کے لئے کتنا گھاؤنا اور شرمناک طریقہ اختیار کیا اسے دیکھئے: مرزا غلام احمد کے بیٹے فضل احمد کی شادی مرزا شیر علی کی لڑکی سے ہوئی تھی اور مرزا شیر علی کی بیوی (فضل احمد کی ساس) احمد بیگ کی بہن تھی مرزا غلام احمد نے مرزا شیر علی اور اس کی بیوی (احمد کی بہن) کو مسلسل خطوط لکھے اور ان دونوں کو اس نکاح کے حصول میں مدد کرنے کے لئے کہا اور انھیں دھمکی دی کہ اگر احمد بیگ نے اپنی بچی کی شادی مرزا غلام احمد سے نہ کی تو وہ اپنے بیٹے فضل احمد سے کہیں گے کہ وہ اپنی بیوی (احمد بیگ کی بہن کی لڑکی جو مرزا غلام احمد کی بہو تھی) کو طلاق دے دے۔ مرزا غلام احمد نے لدھیانہ سے ۴ مئی ۱۸۹۱ء کو جو خط لکھا۔ اس خط کا یہ حصہ پڑھئے:

فضل احمد بھی آپ کی لڑکی کو اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا۔ فضل احمد آپ کی لڑکی کو طلاق دے دے گا اگر وہ طلاق نہیں دے گا تو میں اس کو عاق اور لاوارث کر دوں گا۔ آپ اس وقت کو سنبھال لیں۔ (کلمۂ فضل رحمانی ص ۱۲۶)

پھر ۴ مئی ۱۸۹۱ء کو مرزا غلام احمد نے احمد بیگ کی بہن (محمدی بیگم کی مامی اور فضل احمد کی ساس) کے نام بھی دھمکی بھرا خط لکھا۔ اس کا یہ حصہ ملاحظہ کیجئے:

اپنے بھائی احمد بیگ کو جس طرح بھی تم سمجھا سکتی ہو اس کو سمجھا دو اور اگر ایسا نہ ہوگا تو آج میں نے مولوی نور الدین اور (میرے بیٹے) فضل احمد کو خط لکھ دیا ہے کہ اگر تم اس ارادہ سے باز نہ آؤ تو فضل احمد عزت بی بی کے لئے طلاق نامہ لکھ دے اور اگر فضل احمد طلاق نامہ لکھنے سے گریز کرے یا عذر کرے تو اس کو عاق کیا جاوے اور اپنے بعد اس کو وارث نہ سمجھا جاوے اور ایک پیسہ اس کو وراثت کا نہ ملے۔ اگر فضل احمد نے نہ مانا تو میں فی الفور اسکو عاق کر دوں گا اور پھر وہ میری وراثت سے ایک دانہ نہیں پا سکتا اور اگر آپ اس وقت اپنے بھائی کو سمجھا لو تو آپ کے لئے بہتر ہوگا۔

(منقول از۔ نوشتہ غیب ص ۱۲۸)

مرزا شیر علی نے مرزا غلام احمد کے دھمکی آمیز خط کا جواب دو دن کے اندر دے دیا۔ مرزا شیر علی کا خط دیکھئے۔ اس سے آپ کو مرزا غلام احمد کو سمجھنے میں بہت حد تک مدد ملے گی۔ مرزا شیر علی نے لکھا:

گرامی نامہ پہنچا آپ جو کچھ بھی تصور کریں آپ کی مہربانی ہے ہاں مسلمان ضرور ہوں مگر آپ کی خود ساختہ نبوت کا قائل نہیں ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے سلف صالحین کے طریقے پر ہی رکھے اور اسی پر میرا خاتمہ بالخیر کرے۔ احمد بیگ کے متعلق میں کر ہی کیا سکتا ہوں وہ ایک سیدھا سادہ مسلمان آدمی ہے جو کچھ ہوا آپ کی طرف ہی سے ہوا نہ آپ فضول ایمان گنواتے اور الہام بیان کرتے اور نہ مرنے کی دھمکیاں دیتے اور نہ وہ کنارہ کش ہوتا۔ آپ خیال کریں کہ اگر آپ کی جگہ احمد بیگ ہو اور احمد بیگ کی جگہ آپ ہوں تو خدا لگتی کہنا کہ تم کن کن باتوں کا خیال کر کے رشتہ دو گے

اگر احمد بیگ سوال کرتا اور وہ مجمع الامراض ہونے کے علاوہ پچاس سال سے زیادہ عمر کا ہوتا اور اس پر وہ مسیلمہ کذاب کے کان کتر چکا ہوتا تو کیا آپ رشتہ دیتے؟ آپ کو خط لکھتے وقت یوں آپے سے باہر نہیں ہونا چاہئے لڑکیاں سبھی گھروں میں ہیں کچھ حرج نہیں اگر آپ طلاق دلوائیں گے تو یہ بھی ایک پیغمبری کی نئی سنت دنیا پر قائم کر کے بدنامی کا سیاہ داغ مول لیں گے باقی روٹی تو خدا اس کو بھی کہیں سے دے ہی دے گا تر نہ سہی خشک سہی مگر وہ خشک بہتر ہے جو پسینہ کی کمائی سے پیدا کی جاتی ہے۔ میری بیوی کا کیا حق ہے کہ وہ اپنی بیٹی (مرزا غلام احمد کی بہو جسے اپنے لڑکے سے طلاق دلوانے کی مسلسل دھمکیاں دیتا رہا ہے) کے لئے اپنے بھائی کی لڑکی کو ایک دائم المریض آدمی کو جو مراق سے خدائی تک پہنچ چکا ہو کس طرح لڑے۔ (خاکسار شیر علی ۴ مئی ۱۸۹۱ء)

مرزا شیر علی کے اس خط میں مرزا غلام احمد کی صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ کس سطح کا آدمی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کی نبوت خود ساختہ ہے بلکہ وہ اس دعوی میں مسیلمہ کذاب کے بھی کان کتر چکا ہے۔ اور بلیک میلنگ میں بھی اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ جسمانی بیماریوں کا بھی مجموعہ ہے اور مراقی ہے۔ پھر مرزا شیر علی نے اپنے اس خط کے ذریعہ مرزا غلام احمد پر بڑا لطیف طنز کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کی کمائی کے ذرائع کیا ہیں؟۔

مرزا غلام احمد نے اپنی سمدھی کو یہ بھی لکھا کہ وہ اپنی بیوی سے کہے کہ وہ اپنے بھائی (احمد بیگ) سے اس معاملہ پر جھگڑا کر کے بھی شادی روک دے اور کسی طرح بھی اسے میرے ساتھ نکاح کے لئے تیار کرے۔ مرزا غلام احمد نے شیر علی کے نام ۴ مئی ۱۸۹۱ء کو لکھا۔

آپ احمد بیگ کو پورے زور سے خط لکھیں کہ (وہ محمدی بیگم کا دوسری جگہ نکاح کرنے سے) باز آجائیں اور اپنے گھر کے لوگوں (یعنی بیوی وغیرہ) کو تاکید کریں کہ وہ بھائی کو لڑائی کر کے روک دیوے ورنہ مجھے خدا تعالیٰ کی قسم ہے کہ اب ہمیشہ کے لئے یہ تمام رشتے ناطے توڑ دوں گا۔

یہ بھائی بہن کو آپس میں لڑانے کی کوشش کیا کسی شریف آدمی کا کام ہو سکتا ہے؟

سو احمد بیگ اپنی لڑکی کو مرزا غلام احمد کے نکاح میں دینے کیلئے کسی طرح تیار نہ تھا ادھر مرزا غلام احمد چاہتا تھا کہ ہر قیمت پر اسے احمد بیگ کی بچی مل جائے ۔ مرزا غلام احمد نے آخر کار اپنے بیٹے فضل احمد کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اس نے بادل نخواستہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ مرزا غلام احمد کی پہلی بیوی اور اسکے بیٹے سلطان احمد نے مرزا غلام احمد کا ساتھ نہ دیا۔ مرزا غلام احمد نے اپنی بیوی کو بھی طلاق دے دی اور اپنے بیٹے سلطان احمد کو اپنی وراثت سے محروم کر دیا۔ یہ اپنی بیوی پر سراسر ظلم اور اپنے بیٹے سے کھلی زیادتی ہے۔ کیا ایسا آدمی شریف کہلانے کے لائق ہے یہ بات قادنیوں کے سوچنے کی ہے؟

مرزا غلام احمد نے اس رشتہ کیلئے پھر اپنے رشتہ داروں کو خطوط لکھے: اور انھیں بھی کہا کہ احمد بیگ کو اس نکاح کے لئے تیار کرو مرزا بشیر احمد لکھتا ہے کہ: حضرت صاحب نے اس رشتہ کی کوشش میں اپنے بعض رشتہ داروں کو خط لکھے اور اس کے لئے بڑی جدو جہد کی۔ (سیرت المہدی ج ۱۔ ص ۲۰۵)

مرزا غلام احمد سے کہا گیا کہ جب یہ خدا کی بات ہے تو اس میں اتنا شور و غل کیوں کرتے ہو اور اس کے لئے ظلم و زیادتی کہاں جائز ہے۔ مرزا غلام احمد نے اس کا یہ جواب دیا:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیش گوئی کی جائے تو اسے بغیر کسی فتنہ اور ناجائز طریق کے اپنے ہاتھ سے پورا کرنا نہ صرف جائز بلکہ مسنون ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۹۱ ر۔ خ۔ ۲۲ ص ۱۹۸)

مرزا بشیر احمد کہتا ہے کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے باوجود خدائی وعدوں کے اپنی پیشگوئیوں کو پورا کرنے کے لئے ہر جائز طریق پر کوشش نہ کی ہو۔

(سیرت المہدی ج ۱ ص ۱۹۳)

مرزا غلام احمد کی اس بات میں کوئی وزن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر جب کوئی پیش گوئی کرتا ہے تو حالات خود بخود اس کے مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں اور پیغمبر کی کہی ہوئی

پیش گوئی پوری ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں معاملہ عجیب ہے مرزا غلام احمد نے احمد بیگ کی بچی سے نکاح کو خدا کی بات بتایا۔ اب اسے ضروری تھا کہ وہ اس وقت تک کا انتظار کرتا جب خدا اپنی بات پوری کر دکھاتا مگر چونکہ یہ بات خدا کی طرف سے نہیں تھی اس کی اپنی خانہ ساز تھی اس لئے اس نے سب سے پہلے احمد بیگ کو بلیک میل کیا کہ اس کے قانونی کاغذات پر اس وقت دستخط کرے گا جب وہ اپنی بچی کا نکاح اس سے کریگا۔ (۲) مرزا غلام احمد نے احمد بیگ کو مال کا لالچ دیا جائداد کی پیشکش کی اور اس کے بیٹے کو محکمہ پولیس میں ملازمت دلوانیکی پیش کش کی (۳) اس نکاح کے لئے رشتہ داروں کے ذریعہ احمد بیگ پر دباؤ ڈالا (۴) مرزا غلام احمد نے اپنے بیٹے کو مجبور کیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے یہ عورت احمد بیگ کی عزیزہ تھی (۵) مرزا غلام احمد نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور اپنے بیٹے کو وراثت سے محروم کیا کیونکہ وہ اس بات کے لئے مرزا غلام احمد کا ساتھ نہ دیتے تھے۔ آپ ہی بتائیں کیا یہ کرتوت کسی شریف آدمی کے ہوا کرتے ہیں؟

محمدی بیگم کے والد احمد بیگ نے مرزا غلام احمد کی کوئی بات نہ مانی اور اپنی لڑکی کا رشتہ جناب سلطان محمد کے ساتھ کر دیا۔ مرزا غلام احمد کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور کہا کہ چونکہ یہ رشتہ خدا نے میرے ساتھ کر دیا ہے اس لئے کسی دوسرے کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ وہ میری آسمانی منکوحہ سے رشتہ کرے اب جو شخص بھی محمدی بیگم سے شادی کرے گا خدا کی غیرت جوش میں آئے گی اور خدا تعالیٰ ڈھائی سال کے اندر اسے مار ڈالے گا اور اس کے باپ کی بھی خیر نہ ہوگی۔ مرزا غلام احمد کا ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کا شائع کردہ ایک اشتہار سامنے رکھیں اس نے لکھا کہ:

اگر (احمد بیگ نے اس) نکاح سے انحراف کیا تو اس لڑکی کا انجام بہت برا ہوگا اور جس کسی دوسرے شخص سے بیاہی جائے گی وہ روز نکاح سے اڑھائی سال تک اور ایسا ہی والد اس دختر کا تین سال تک فوت ہو جائے گا اور ان کے گھر میں تفرقہ اور مصیبتیں پڑے گی اور درمیانی زمانہ میں بھی اس دختر کے لئے کئی غم کے امر پیش آئیں گے۔

(مجموعہ اشتہارات ج ۱ ص ۱۵۸)

(۴) خدا نے مجھے بتلایا ہے کہ اگر کسی اور شخص سے اس لڑکی کا نکاح ہوگا تو نہ اس لڑکی کے لئے مبارک ہوگا اور نہ تمھارے لئے ایسی صورت میں تم پر مصائب نازل ہونگے جن کا نتیجہ موت ہوگا تم تین سال کے اندر مر جاؤگے اور ایسا اس لڑکی کا شوہر بھی اڑھائی سال کے اندر مر جائے گا یہ اللہ کا حکم ہے۔ (آئینہ کمالات ر۔خ۔ج۵ص۵۷۳)

مرزا غلام احمد نے بذریعہ وحی یہ خبر دی کہ اگر محمدی بیگم کا نکاح کہیں ہوا تو اس کے گھر میں تفرقہ اور مصیبتیں آئیں گی۔ محمدی بیگم کا نکاح ہوا اب دیکھئے تفرقہ اور مصیبتیں کس گھر پر آئیں۔

(۱) مرزا غلام احمد کے بیٹے فضل احمد کا گھر برباد ہوا یہاں تفرقہ پڑا اور اس نے باپ کے کہنے پر بیوی کو طلاق دیدی (۲) مرزا غلام احمد کے اپنے بیٹے سلطان احمد اور فضل احمد محروم الارث ہوئے اور انھیں عاق کیا گیا: (۳) مرزا غلام احمد نے فضل احمد اور سلطان احمد دونوں کی والدہ کو طلاق دی اور وہ بے گھر ہوئیں۔

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ تفرقہ کا یہ عذاب محترمہ محمدی بیگم کے گھر آیا یا مرزا غلام احمد کا گھرانہ اس عذاب کی لپیٹ میں آیا۔ احمد بیگ نے مرزا غلام احمد کی ان دھمکیوں کی بھی کوئی پروانہ کی۔ اور اپنی بیٹی کا نکاح ۷راپریل ۱۸۹۲ء کو دھوم دھام سے کیا ادھر مرزا غلام احمد کے گھر میں ماتم برپا تھا۔ مرزا غلام احمد کے قریبی دوست تو بخوبی جانتے تھے کہ مرزا صاحب نے خدا کے نام پر جتنی باتیں کہیں ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ سب مرزا غلام احمد کے اپنے نفس کی خباثت ہے جسے وہ خدا کے نام پر پیش کر رہا ہے لیکن قادیان کے نادان عوام کو کس طرح سمجھا جائے کہ ان کے نبی کی آسمانی منکوحہ کسی اور کے نکاح میں دی جاچکی ہے اور خدا کے فیصلے پر انسانی فیصلے غالب آچکے ہیں۔ مرزا غلام احمد میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی آسمانی منکوحہ کو سلطان محمد سے چھین سکے اور نہ اس کے کسی مرید میں یہ جرات تھی کہ وہ اپنے نبی کی آسمانی بیوی کو کسی غیر کی منکوحہ ہونے سے روک سکے ۔ مرزا غلام احمد ذلت وحسرت کی تصویر بنا اپنی آسمانی منکوحہ کی رخصتی پر آنسو بہاتا رہا اور دانت پیستا رہا اور اس کے

مریدوں کے منہ پر ان کی بے بسی اور شرمندگی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

مرزا غلام احمد نے اس نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے اعلان کیا کہ اسے خدا نے وحی کی ہے کہ اس بارے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خدا نے اس کا نکاح آسمان پر تمھارے ساتھ ہی پڑھایا ہے (زوجنا کھا۔ انجام آتھم ص ۶۰) وہ تمھاری ہی منکوحہ ہے اب اس دنیا میں اگر کوئی اسے اپنی منکوحہ بنا چکا ہے تو یہ اس کی عارضی منکوحہ ہوگی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا اسے مرزا غلام احمد کی منکوحہ بنائے اور کوئی دوسرا اسے لے اڑے۔ سو وقت آئے گا کہ اس آسمانی منکوحہ کا عارضی شوہر مرے گا اور خدا پھر اسے تمھارے پاس ہی لے آئے گا۔ مرزا غلام احمد نے پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ اعلان کیا اور اشتہاروں پر اشتہار شائع کئے تاکہ اسے کی جماعت سے نکلنے والے قادیانی واپس آجائیں اور اسے اپنی آمدنی سے حصہ برابر دیتے رہیں۔ مرزا غلام احمد نے خدا کے نام سے یہ اعلان کیا:

خدا تعالیٰ نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ وہ مکتوب الیہ (احمد بیگ) کی دختر کلاں (محمدی بیگم) کو ہر ایک روک دور کرنے کے بعد انجام کار اسی عاجز کے نکاح میں لاوے گا۔

(مجموعہ اشتہارات ج ۱ ص ۱۵۸)

(نوٹ) یہ اشتہار ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کا ہے۔ اس سے پہلے ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء کے اشتہار بھی مرزا غلام احمد یہ لکھ چکا ہے:

آخر وہ عورت اس عاجز کی بیویوں میں داخل ہوگی۔ (مجموعہ اشتہارات ج ۱ ص ۱۰۲)

مرزا غلام احمد نے ۲ مئی ۱۸۹۱ء کو پھر ایک اشتہار شائع کیا اس میں لکھا

اس عاجز نے بحکم و الہام الٰہی یہ اشتہار دیا تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہی مقدر اور قرار یافتہ ہے کہ وہ لڑکی اس عاجز کے نکاح میں آئے گی۔ خواہ پہلے ہی باکرہ ہونے کی حالت میں آجائے اور یا خدا تعالیٰ بیوہ کر کے اس کو میری طرف لے آوے۔ (مجموعہ اشتہارات ج ۱ ص ۲۱۹)

قادیانیوں کو مرزا غلام احمد کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا وہ جاننا چاہتے تھے کہ مرزا غلام احمد کا خدا واقعی سچ بول رہا ہے؟ ۲۷ ستمبر ۱۸۹۱ء میں مرزا غلام احمد نے خدا کے نام پر یہ اعلان کیا کہ خدا نے کہا:

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے کہ ہاں مجھے اپنے رب کی قسم ہے یہ سچ ہے اور تم اس بات کو وقوع میں آنے سے نہیں روک سکتے ہم نے خود اس سے تیرا عقد باندھ دیا ہے میری باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ (مجموعہ اشتہارات ص ا ص ۳۰۱)

مرزا غلام احمد جہاں یہ دیکھتا کہ اس کے اپنے لوگ اس کی بات پر اعتبار نہیں کر رہے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کی جماعت کو چھوڑ رہے ہیں تو وہ فوراً خدا کے نام سے ایک اعلان سنا دیتا۔ ٦ ستمبر ۱۸۹۴ء کو اس نے پھر سے ایک اشتہار شائع کیا اور لکھا کہ:

خدا اس کو پھر تیری طرف لائے گا یعنی آخر وہ تیرے نکاح میں آئے گی اور خدا سب روکیں درمیان سے اٹھا دے گا خدا کی باتیں ٹل نہیں سکتیں۔ (ایضاج ۲ ص ۱۴)

انہی دنوں کسی نے مرزا غلام احمد سے مذاق میں کہدیا کہ آپ کی آسمانی منکوحہ زندہ نہیں رہی اس لئے اب تو امید چھوڑ دیجئے مرزا غلام احمد نے کہا کہ مذاق مت کرو مجھے معلوم ہیکہ وہ عورت زندہ ہے اور آخر کار یہ میری ہو کر رہے گی۔ مرزا غلام احمد نے ضلع گورداسپور کی عدالت میں جو حلفیہ بیان دیا ہے اس میں بھی اس کی جھلک پائی جاتی ہیں مرزا غلام احمد نے کہا وہ عورت زندہ ہے وہ میرے نکاح میں ضرور آئے گی یہ خدا کی باتیں ہیں ٹلتی نہیں ہو کر رہیں گی۔ (منظور الٰہی ص ۲۴۵ منظور الٰہی قادیانی)

جوں جوں محمدی بیگم کی شادی کے دن بڑھتے جا رہے تھے مرزا غلام احمد کی پریشانی بھی دن بدن بڑھ رہی تھی اس کے مرید اس سے بد ظن ہو رہے تھے مگر مرزا غلام احمد محمدی بیگم کی محبت اور اس کی طلب میں اس قدر دیوانہ ہو گیا تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا جب کبھی اس مسئلہ کا تذکرہ ہوتا مرزا غلام احمد فوراً کہہ پڑتا ہے کہ اسے خدا نے بتا دیا ہے کہ یہ عورت آخر کار اس کی ہو کر رہے گی۔ مرزا غلام احمد کا یہ بیان دیکھئے:

میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ خدا سے دعا کی تو اس نے مجھے الہام کیا کہ۔ وہ بیوہ کی جائے گی۔ اور پھر ہم اس کو تیری طرف لائیں گے اور کوئی اس کو روک نہ سکے گا۔

(کرامات الصادقین۔ ر۔ خ۔ ج ۷ ص ۱۶۲)

مرزا غلام احمد کی مذکورہ تصریحات اور پھر اس کی تشریحات سے یہ بات واضح ہے

کہ محترمہ محمدی بیگم کی شادی ہو جانے کے باوجود مرزا غلام احمد نے اس خاتون کی آبرو کا کوئی خیال نہیں کیا اور سالہاسال تک ایک غیر محرم خاتون کی عزت کو اچھالنے کا مشغلہ جاری رکھا۔ آپ ہی بتائیں کہ کیا مرزا غلام احمد کو اس کی اجازت تھی کہ وہ کسی کی منکوحہ کے بارے میں بار بار یہ اشتہار شائع کرے کہ وہ میری بیوی بنے گی۔ میرے گھر آئے گی۔ اس کا شوہر مرے گا۔ وہ میری ہی منکوحہ ہے کچھ ہی ہو جائے اسے میرے ہی پاس آنا ہے۔ ہر شریف آدمی اس قسم کی باتیں کرنے والے شخص کو بڑا بے شرم آدمی کہتا ہے مگر افسوس کہ قادیانیوں نے اسے خدا کا نبی کا درجہ دے رکھا ہے۔ چہ نسبت تا پاک را بعالم پاک۔

● ● ●
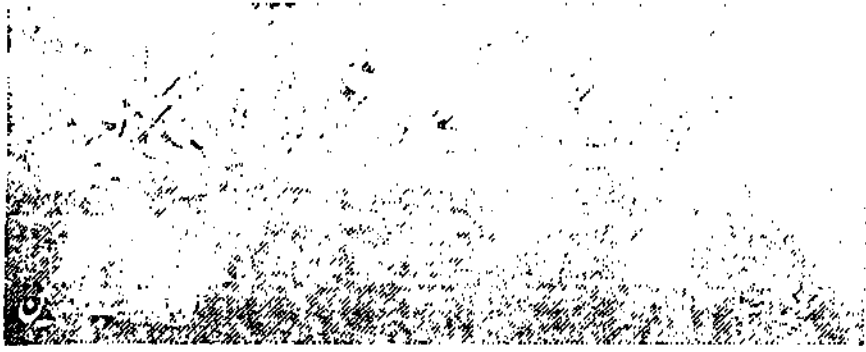
داعی کا عامل ہونا ضروری ہے:

بے عمل اور بدکار داعظوں کے بارے میں احادیث میں بڑی وعیدیں آئی ہیں۔ معراج کے موقع پر حضور پر نور ﷺ کو دکھایا گیا کہ بے عمل، دنیادار واعظوں کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے تھے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف دوسروں کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے بھی ہے قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر دعوت بر کے ساتھ اس پر عمل کرنے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسے

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ اِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ.

(سورۂ حم سجدہ ۳۳ پ ۲۴)

ترجمہ: اور اس سے بہتر کس کی بات جس نے لایا اللہ کی طرف اور کیا نیک کام اور کہا میں حکم بردار ہوں۔ دوسری جگہ ارشاد باری ہے۔

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ. (سورۂ بقرہ آیت ۴۴)

ترجمہ: کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو۔

تو معلوم ہوا کہ نیک کاموں کی دعوت کے ساتھ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ یہاں ایک اور نکتہ کو ذہن میں لینا ضروری ہے کہ نہیں کر رہا ہے کہنا نہ چھوڑے اور اگر کہہ رہا ہے تو کرنا شروع کردے۔ معارف القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص یہ سوچ کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ کیوں کہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو؟ حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے: کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ چھوڑ بیٹھیں (قرطبی)۔ بلکہ حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھا کہ جب مجھے اپنی کسی بری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طرد سے بیان کرتا ہوں تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔ (معارف القرآن، ج ۱ ص ۲۱۹ / ۲۱۸)

بہر حال داعی کا کمال یہ ہے کہ وہ خود عامل بھی ہو اور ظاہر ہے باعمل داعی کی بات میں تو تاثیر کا پہلو زیادہ ہو گا۔

دعوت اور تواضع

دعوت کے سلسلہ کی ایک اور اہم صفت تواضع ہے قرآن کریم میں کہا گیا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

علماء مفسرین "وقال اننی من المسلمین" کی تفسیر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ آدمی دعوت دے کر اپنے کو بڑا نہ سمجھے بلکہ عام مسلمانوں میں سے ایک سمجھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کے مزاج میں بے انتہا تواضع تھی ۔ معراج کے عظیم الشان عزت ورفعت کے موقع پر بھی حضور ﷺ کی اس صفت تواضع کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ باوجود امام الانبیاء اور افضل الانبیاء ہونے کے آسمانوں میں انبیاء علیہم السلام سے ملاقات پر سلام کرنے میں پہل کرنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ کو قبول کرنا، اللہ کے یہ پوچھنے پر کہ آپ کو کون سی صفت زیادہ پسند ہے حضورؐ کا صفت عبدیت کو پسند فرمانا اور بیت المقدس میں امامت انبیاء کے لئے اس وقت تک آگے نہ بڑھنا جب تک کہ حضرت جبریلؑ آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے نہ بڑھادیں۔ یہ ساری باتیں حضور ﷺ کی تواضع کے بین مظاہر ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اللہ کے سامنے تواضع اختیار کی تو اللہ نے معراج کی دولت

عطا فرمائی۔ اور مخلوق سے تواضع کی تو شفاعت کبریٰ کی دولت پائی۔ (سیرۃ المصطفیٰ ج ۱ ص ۲۱۳)

راقم عرض پرداز ہے کہ انبیاء سے تواضع کی تو امامت انبیاء کی دولت سے سرفرازی ہوئی۔

دعوت اور توبہ واستغفار:

تفصیلات سے گریز! سورہ بقرہ کی آخری آیتوں میں جو معراج کے موقع پر عطا کی گئیں توبہ واستغفار اور معافی کا مضمون آگیا ہے۔ "رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا" اور "وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا" وغیرہ تو اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ داعی اپنی کاوشوں سے اور جدوجہد کے بعد اپنی تقصیرات کے استحضار کے ساتھ اللہ رب العزت کے حضور توبہ واستغفار کو بھی اپنے لئے ضروری قرار دے۔

دعوت ودعا:

حضرات انبیاء علیہم السلام کو خدا کی طرف سے عطا کی جانے والی خاص دو چیزیں ہیں۔ ایک دعوت دوسرے دعا۔ اس سلسلہ میں قدرے تفصیل کے ساتھ "معراج کے تمہیدی ودعائیہ پہلو" میں عرض کیا جاچکا ہے۔ یہاں بس ایک نکتہ کو دوبارہ پیش کرنا ہے حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ معراج کے موقع پر

"دوسرے انبیاء کے فضائل ذکر کر کے حضور اقدس ﷺ نے اپنے لئے دعا فرمائی۔ اس سے مقام قرب میں پہنچ کر بھی دعاء کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ (نشر الطیب ص ٦٦)

اس کے علاوہ حضور ﷺ نے لقاء خداوندی کے بعد اللہ سے یہ دعا بھی فرمائی "السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین" بہر حال معلوم ہوا کہ دعوت کے ساتھ ساتھ دعاؤں کا اہتمام بھی ضروری ہے۔

رضائے الٰہی:

انسان کا ہر کام اللہ کے لئے اور اللہ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے، اس جبروت و پر عظمت واقعہ معراج کو بحیثیت مجموعی نظر کے سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانوں کی عبادت اور دین کی دعوت یہ سب کچھ رضائے الٰہی کے لیے ہی ہے معراج کے موقع پر

تخلیۂ خاص میں حضور ﷺ کے طرز عمل سے بھی اسی کا سبق ملتا ہے۔

"التحیات لله والصلوات والطیبات" (تمام تحیات، صلوٰۃ اور طیبات اللہ ہی کے لئے ہیں) مخدومی وسیدی حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب دامت برکاتہم نے تشہد کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ:

بعض شارحین حدیث نے ذکر کیا ہے کہ یہ تشہد شب معراج کا مکالمہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب بارگاہِ قدوسیت میں شرف حضوری نصیب ہوا تو آپؐ نے نذرانۂ عبودیت اس طرح پیش کیا اور گویا اس طرح سلامی دی "التحیات لله والصلوات والطیبات" اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا" السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبرکاته "آپؐ نے جواباً عرض کیا"السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین"اس کے بعد (عہد ایمان کی تجدید کے طور پر) مزید عرض کیا اشهد ان لااله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله۔

بہر حال انسان کے اعمال اس کی عبادات سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہونا چاہئے اس کے علاوہ ریاکار واعظوں کا حشر بھی معراج کے واقعات میں بتایا گیا ہے۔ اور رضا جویان خدا کے لئے جنت کے مناظر دکھائے گئے جنت رضائے الٰہی کا محل ہے۔ اللہ تعالیٰ جنتیوں سے فرمائے گا کہ میں تم سے راضی ہوا۔ اللہ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر خدا کبھی بھی ان جنتیوں سے ناراض نہیں ہوگا۔ خدائے رحیم کریم کا یہ اعلان جنتیوں کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ہوگا اس لئے اپنے ہر قول و فعل میں رضائے الٰہی کی نیت ہونی چاہئے اور بس۔

پیغام معراج کی روشنی میں ایک مختصر لائحہ عمل:

واقعۂ معراج کی تفصیلات پھر اس کے ایمانی و حکمتی پہلو، عباداتی واحکاماتی پہلو، تحمیدی دعائیہ پہلو اور معراج کے دعوتی پہلوؤں کے ضمن میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کے خلاصہ اور لب لباب کو ذہن نشین کرنا چاہئے، تو چند امور ہیں جو اپنی اہمیت کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) قرآن وحدیث کی روشنی میں سب سے اہم چیز ایمان ہے اس کے بغیر کوئی عمل، مقبول نہیں۔ معراج کے موقع پر سب سے بڑی بشارت جو امت کے لئے دی گئی وہ یہی ہے کہ ہر اس شخص کی بخشش ہوگی جو شرک کا مرتکب نہ ہو۔ ایمان کا ذرہ بھی اگر کسی کی زندگی میں ہوگا تو اس کو اللہ کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور داخل فرمائے گا۔ اس لئے ہر فرد امت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کو بنائے۔ اس کو مضبوط کرے، ایمان کو بچائے اور اس کو پھیلانے کی محنت میں موت تک مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے لئے محنت کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

(۲) معراج کے موقع پر دی گئی ہدایات واحکامات میں سب سے اہم چیز اور سب سے بڑا حکم نماز پنجگانہ کا ہے جس پر پچاس نمازوں کا اجر و ثواب ملے گا۔ اس اہم موقع پر مرحمت فرمائے گئے اس عظیم تحفہ کی قدر دانی یہی ہے کہ ایک فرد امت بھی اس فریضہ کی ادائیگی میں غفلت نہ برتے۔ اہتمام نماز پر دخول جنت کا خدا خود ضامن ہے اور غفلت پر بڑی سزائیں ہیں۔ اس لئے اقامت صلوٰۃ کی محنت جس میں اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے کی مشق و محنت کے ساتھ ساتھ اس کی دعوت دیتے ہوئے ہر فرد امت کو نمازی بنانے کی محنت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ساری امت کو اس بات کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

(۳) نماز دراصل خدا کے احکامات کو طریقۂ محمد ﷺ کے مطابق پورا کرنے کی ایک مشق ہے۔ اسی ترتیب پر پوری زندگی کو لانا ہے۔ حال کے حکم کو معلوم کر کے اس پر عمل کرنا ہے تاکہ پوری زندگی سمعنا واطعنا کا مرقع بن جائے جس کی طرف معراج میں اشارہ دیا گیا ہے اور جس کے لئے حضور اقدس ﷺ نے بیعت عقبۂ اولی کے موقع پر مستقل بیعت لی ہے۔ اس لئے احکامات خداوندی کا معلوم کرنا اور تعمیل احکامات میں سنت نبویہ (علیہ الصلوۃ والسلام) کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے تاکہ ۲۴ گھنٹے والی زندگی رضائے الٰہی والی زندگی بن جائے۔ خدا کے حکم کو معلوم کرنا یہ علم ہے اور خدا کے حکم پر عمل کرنا یہ ذکر ہے۔ نماز بھی اللہ کے ذکر کے لئے ہے۔ واقم الصلوۃ لذکری (۱) احکامات خداوندی کے اہتمام میں عموماً جو چیز سب سے بڑی مانع ہونے والی ہے وہ دلوں کی غفلت ہے اور فکر

آخرت کا نہ ہوتا ہے۔ اس لیے ذکر کے اہتمام کی طرف بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں خدا کی یاد امتیازی وصف نظر آتا ہے۔ حضرت لقمان حکیم فرماتے ہیں کہ میں نے چار ہزار انبیاء سے ملاقات کی اور ان میں چار باتیں مشترک پائیں۔ دو یاد رکھنے والی اور دو بھلانے والی۔ خدا کی یاد ہر وقت کرتے تھے۔ (۲) موت کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ (۳) نیکی کر کے بھول جاتے تھے۔ (۴) احسان کر کے بھول جاتے تھے۔

معراج کے موقع پر حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف سے خدا کی تسبیح و تحمید کا ذکر آگیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی ان کے ذکر و دعا کے کلمات محفوظ کئے گئے ہیں۔ اس لئے ذکر کے اہتمام کا ذریعہ دلوں کی غفلت کو دور کرنا اور آخرت کی فکر پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے کسی اللہ والے سے اپنا تعلق جوڑ کر ذکر معلوم کرے اور تلاوت کا اہتمام کرے کم از کم تیسرا کلمہ، درود شریف اور استغفار کی تسبیحات کا صبح و شام اہتمام کرے کہ اللہ والوں کے یہاں اس کا بڑا ہی اہتمام رہا ہے۔

(۴) معراج کے تمثیلی واقعات میں جو کچھ دکھایا گیا ہے اس سے اخلاق کی پاکیزگی اور حقوق کی ادائیگی کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ عیب چینی اور آبروریزی کی عبرتناک سزائیں دکھائی گئی ہیں اس لئے رذائل سے اپنے کو دور رکھیں اور شمائل سے اپنی زندگی کو مزین کریں۔ عیب چینی اور آبروریزی سے اپنی حفاظت کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ خود کو خطاکار اور پر عیب سمجھتے ہوئے ہر ایک کا اکرام کرتے رہیں۔

(۵) محنت و کوشش کر کے زندگی کو صحیح رخ پر لانا صرف اس لیے ہے کہ خدا کی رضا ملے۔ خدا کی رضا کے سلسلہ میں ابھی قریب ہی سطور بالا میں ضروری باتوں کو عرض کیا گیا ہے۔ جو واقعہ (سفر طائف) شرف معراج کے عطا ہونے کا سبب و ذریعہ بنا اس موقع پر ہم نے حضور ﷺ کو ان الفاظ میں دعا مانگتے پڑھا ہے۔

"اعوذ بنور وجهك الذی أشرقت حتی ترضی ولاحول ولاقوة الابك"

اے اللہ تیرے چہرے کے اس نور کے طفیل جس سے تمام اندھیریاں روشن ہو گئیں اور جس سے دنیا و آخرت کے سارے کام درست ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ

مجھ پر تیرا غصہ ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو۔ تیری ناراضگی کا اس وقت تک دور کرنا ضروری ہے جب تک تو راضی نہ ہو۔

اپنے قول و عمل کو اللہ کے لئے خالص کرنا اخلاص کہلاتا ہے، لیکن یہ چیز سب سے آخر میں ملنے والی نعمت ہے۔ اس لئے اس کے لئے دعاؤں کا اہتمام کرنا اور آہ وزاری کے ساتھ اللہ ہی سے دولت اخلاص کو مانگنا ہے، اللہ اپنے کرم سے ہم سب کو اخلاص کی دولت نصیب فرمائے۔ آمین!

(۶) معراج کے دعوتی پہلو کے مندرجات سے امید ہے کہ فریضہ دعوت کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ اس لئے اس فریضہ کی ادائیگی میں بھی اپنی ہمت و قوت اپنی جان و مال اور اپنے اوقات کو صرف کریں۔ کہیں دنیا کی ہنگامہ آرائیاں ہمیں اس فریضہ کی ادائیگی سے غافل نہ کر دیں۔

(۷) معراج کے دعوتی پہلو میں ابھی صفات دعوت سے متعلق بھی کچھ ضروری بحث کی گئی ہے۔ ان صفات کو اپنی زندگی میں لانے کی مشق میں اپنے کو ہمہ تن مشغول رکھیں اور لغویات سے اپنے کو بچانے کی فکر کریں۔

(۸) توبہ واستغفار کی خوب کثرت کریں اور راتوں کو اٹھ کر اہتمام تہجد کے ساتھ ساتھ دعاؤں کا خوب اہتمام کریں کہ ؎

ہمیں کچھ ہاتھ آتا نہیں بجز آہ سحر گاہی

اختصار کی خواہش اور کوشش کے باوجود مضمون طویل سے طویل تر ہوتا گیا اس کے باوجود یہ احساس قلب میں پھر بھی ہوتا ہے کہ معراج جیسے باجبروت واقعہ پر جو کچھ لکھا جانا چاہیے تھا اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا گیا اور اس کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ بہر حال جو کچھ بن پایا زیرِ تحریر لایا گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت بے پایاں سے اس کو قبول فرمائے۔ اور اپنی رضا کا سبب بنائے اور اس کو حضور اقدس ﷺ کی شفاعت کے استحقاق کا بھی سبب بنائے۔ آمین یارب العالمین۔ صلی اللہ علی سید المرسلین۔

●●●　●●●　●●●

اسلام، عورت اور مغربیت

از: [illegible]

اسلامی قانونِ ازدواج کے متعلق چند بنیادی سوالات:

اب آیئے ذرا اسلامی قانون کے اس حصہ پر بھی ایک نگاہ ڈالیں جو بیوی کی ذمہ داریوں سے بحث کرتا ہے اور جس کے خلاف اس قدر ہنگامہ آرائی کی جارہی ہے۔ اسلامی قانون میں بیوی کی ذمہ داریوں سے متعلق مندرجہ ذیل تین نکات قابلِ غور ہیں۔

۱- کیا یہ ذمہ داریاں عورت پر ظلم کے مترادف ہیں؟

۲- کیا یہ ذمہ داریاں ایک رخی ہیں ان کے مقابلے میں عورت کو حقوق حاصل نہیں ہوتے؟

۳- کیا یہ ذمہ داریاں دائمی نوعیت کی ہیں کہ جن سے عورت کبھی اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتی؟

بیوی کے فرائض:

خاوند کی طرف سے تین سب سے اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

۱- جب وہ مباشرت کا خواہاں ہو اور اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کرے تو وہ اس

کی اطاعت کرے۔

۲۔ بیوی کسی ایسے آدمی کو گھر میں نہ آنے دے جس کی موجودگی اس کے خاوند کو ناپسند ہو۔

۳۔ شوہر کی غیر حاضری میں اس کی وفادار رہے اور اس کی امانت میں خیانت نہ کرے۔

پہلا فریضہ:

جہاں تک ان فرائض میں سے پہلے فریضے کا تعلق ہے اس کی اہمیت محتاجِ تشریح نہیں۔ اس میں جو مصلحت کار فرما ہے وہ بالکل واضح ہے۔ مرد کی جسمانی ساخت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس کو جنسی آسودگی کی ضرورت عورت کہیں زیادہ پیش آتی ہے۔ مباشرت کے ذریعہ وہ جنسی تناؤ سے آزاد ہوتا ہے اور زندگی کے عملی میدان میں اپنے فرائض زیادہ مستعدی اور سرگرمی سے بجالانے کے قابل ہوتا ہے۔ بالخصوص جوانی میں مرد پر شہوت کا غلبہ زیادہ رہتا ہے اور اسے عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ جنسی سکون و آسودگی کی حاجت ہوتی حالانکہ عورت جنسی لحاظ سے مرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ عمیق ہوتی ہے اور جسمانی نفسیاتی لحاظ سے اس کی جانب سے عورت کا میلان زیادہ شدید ہوتا ہے مگر اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے اس جنسی میلان کا اظہار لازماً جسمانی فعل ہی کی صورت میں کرے۔ شادی میاں بیوی کی اسی فطری ضرورت کو پورا کرنے کا ایک جائز اور بہترین ذریعہ ہے اور ان کی زندگی کی روحانی، نفسیاتی، معاشرتی اور معاشی تقاضوں کا جواب بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ خاوند بیوی کے پاس جائے اور بیوی، خاوند کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے بجائے اسے اپنی سرد مہری سے مایوس کردے اور توجہ نہ دے تو خاوند کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا اسے دوسری عورتوں سے ناجائز تعلقات استوار کر لینے چاہئیں؟ کوئی مہذب معاشرہ اس طرح کے ناجائز تعلقات کا وجود برداشت نہیں کر سکتا اور نہ خود بیوی ہی یہ گوارا کر سکتی ہے کہ اس کا خاوند جسمانی یا نفسیاتی لحاظ سے اس کے بجائے دوسری عورتوں میں

کشش ڈھونڈھتا پھرے۔ میاں بیوی کے باہمی تعلقات خواہ کیسے ہی کشیدہ کیوں نہ ہوں کوئی اس طرح کی صورت حال بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔

تین صورتیں:

خاوند کی خواہش کے باوجود بیوی کے مباشرت سے انکار کی تین وجوہ ہو سکتی ہیں۔

۱- بیوی خاوند سے نفرت کرتی ہے اور اس سے صنفی تعلق پسند نہیں کرتی۔

۲- خاوند سے وہ محبت کرتی ہے مگر جنسی فعل کو پسند نہیں کرتی لہذا جب وہ اس کا تقاضا کرتا ہے تو انکار کر دیتی ہے یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے مگر عملی زندگی میں یہ عام ملتی ہے۔

۳- یوں تو وہ خاوند کو بہت چاہتی ہے اور جنسی فعل کو بھی برا نہیں سمجھتی مگر اس خاص وقت میں وہ اپنے اندر اس بارے میں آمادگی نہیں پاتی۔

پہلی صورت تو ایک مستقل حالت ہے۔ یہ کسی خاص فعل یا مدت تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ اس میں ازدواجی رشتہ زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکتا اس کا بہترین علاج صرف ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ مرد اور عورت کو ایک دوسرے سے علاحدگی کی اجازت دیدی جائے۔ اس معاملے میں مرد کے مقابلے میں اسلام نے عورت کو زیادہ سہولتیں دے رکھی ہیں۔

دوسری صورت میں بھی بیوی کی معذوری کی نقل قسم کی ہو سکتی ہے۔ اس کا سبب صرف خاوند کی جنسی خواہش میں پوشیدہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک بیماری ہے اس کا پوری طرح علاج ہونا چاہیے تاکہ میاں بیوی میں مکمل مفاہمت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اگر بیوی کی مرضی نہ ہو تو اول خاوند کو اشارے سے کام لینا چاہیے۔ ورنہ بیوی کو چاہیے کہ خاوند کی خواہش پوری کرے۔ یہی محبت کا تقاضا ہے اور طلاق سے بچنے کی راہ۔ اگر میاں بیوی آپس میں اس طرح کی مفاہمت میں ناکام رہیں تو انہیں شریفانہ طور پر ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جانا چاہیے۔ مگر جب تک وہ ازدواجی رشتے میں منسلک ہیں اسلامی قانون کا تقاضا ہے کہ مباشرت کے معاملے میں بیوی بہر صورت خاوند کی مرضی پوری کرے کیوں کہ یہی فطری

صورت ہے۔ عورت پر یہ کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے کیوں کہ قانون کا منشا صرف اتنا ہے کہ خاوند کو اخلاقی بے راہ روی میں مبتلا ہونے یا دوسری شادی کرنے سے روکا جائے جو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے زبردستی کی مباشرت سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے مگر اس قسم کے کشیدہ ازدواجی تعلقات کے دوام کو اسلامی قانون بالکل پسند نہیں کرتا۔ جن کی وجہ سے بیوی خاوند سے متنفر ہو اور بار بار زبردستی مقاربت کرنے کی وجہ سے وہ اس سے سخت بیزار ہو اس صورت میں بھی بیوی کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

تیسری حالت البتہ ایک عارضی کیفیت ہے اور اس کا بآسانی تدارک کیا جاسکتا ہے مجامعت سے عورت کی نفرت، جسمانی تھکاوٹ کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور پژمردگی و اضمحلال یا مصروفیت بھی اس کا سبب بن سکتی ہے مگر بہر حال یہ ایک عارضی حالت ہے۔ عورت اپنی جسمانی اور نفسیاتی مزاج کی مدد سے اس پر قابو پاسکتی ہے۔ عورت کی اس سرد مہری پر تحفے تحائف دے کر اور دیگر طریقوں سے خوش کر کے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے اسی طرح مقاربت سے قبل ملاعبت (اٹھ کھیلیاں) کے ذریعہ بھی اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ ملاعبت سے میاں بیوی کی مقاربت محض ایک حیوانی فعل نہیں رہتی بلکہ ان کے لیے یہ ایک اعلیٰ روحانی تجربہ بن جاتی ہے۔ اس طریقے سے جنسی فعل سے بیوی کی نفرت کی اصل وجہ بھی دور کی جاسکتی ہے۔

اس کے برعکس اگر کوئی بیوی خاوند سے مقاربت کی خواہاں ہو مگر خاوند کسی غیر معمولی وجہ سے اس پر آمادہ نہ ہو (مردوں میں ایسی صورت شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے) تو اسلامی قانون نے بیوی کو یونہی بے سہارا نہیں چھوڑ دیا کہ وہ خاوند کو تعلق زن و شوہر کی بحالی پر کسی طرح مجبور نہ کر سکے۔ جو اسلامی قانون بیوی کے لیے اپنے خاوند کی خواہش کو پورا کرنا لازمی قرار دیتا ہے وہی اس بات کا بھی پورا پورا انتظام کرتا ہے کہ بیوی کی جائز خواہشات بھی پوری ہوتی رہیں۔ وہ خاوند کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کہ بیوی تقاضا کرے تو وہ اسے جنسی لحاظ سے مطمئن کرے۔ اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو جنسی تسکین نہ دے سکے تو ان کا نکاح فسخ کو دیا جائے گا۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ نہ مرد، عورت کے حقوق

نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ عورت اپنے فرائض کو۔ اس میں کوئی ایسی شق موجود نہیں ہے جس سے بیوی کی اہانت اور استخفاف کا پہلو نکلتا ہو یا اس پر کسی طرح کا کوئی جبر واستبداد ثابت ہوتا ہو۔

دوسرا فرض:

اپنے خاوند کی جانب سے بیوی پر عائد ہونے والا دوسرا اہم فرض یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو اس کے گھر میں نہ گھسنے دے جس کی آمدورفت کو اس کا خاوند اچھی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو۔ اس ہدایت کا بیوی کی بدکاری سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ اسے اسلامی قانون برداشت ہی نہیں کرتا۔ اگر کسی کی آمدورفت خاوند کو ناگوار نہ ہو تب بھی بیوی کو اس سے بچنا چاہیے اس حکم کی حکمت بہت واضح ہے کیوں کہ میاں بیوی کے بیشتر جھگڑوں کا باعث باہر کے آدمیوں کی مداخلت ہوتی ہے جو ادھر اُدھر لگائی بجھائی کر کے خاندانی جھگڑوں کو اور زیادہ ہوا دیتے ہیں۔ اگر اس قسم کی کسی مصلحت کے پیش نظر خاوند بیوی کو حکم دے کہ وہ فلاں شخص کو گھر میں نہ گھسنے دے اور بیوی ایسا کرنے سے انکار کر دے تو ظاہر ہے کہ ان کے آپسی تعلقات خوشگوار نہیں رہ سکتے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا گھر مستقل طور پر ایک رزم گاہ بنا رہے گا۔ اور میاں بیوی کے درمیان مصالحت و مفاہمت کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے گویا خاندان اور بچوں کی بہتری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بیوی اپنے فریضے کو بجالائے کیوں کہ بچوں کی صحیح اور مناسب پرورش محبت اور ہمدردی سے بھرپور خوش گوار فضا ہی میں ہو سکتی ہے۔

اس موقع پر یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ قانونی لحاظ سے اگر یہ ضروری ہے کہ خاوند کی مرضی کے بغیر کسی کو گھر میں نہ آنے دے تو مرد کے لیے یہ کیوں ضروری نہیں کہ وہ بھی کسی ایسے شخص کو گھر میں داخل نہ ہونے دے جس کو اس کی بیوی ناپسند کرتی ہو۔ اگر میاں بیوی شائستہ سلجھے ہوئے ہوں اور ہنسی خوشی رہ رہے ہوں تو اس طرح کا کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کبھی پیدا بھی ہو جائے تو وہ اسے خود ہی سلجھا سکتے

ہیں لیکن اگر بالفرض ان میں تلخی پیدا ہو جائے اور ان کے لیے اسے ختم کرنا ممکن نہ رہے تو انہیں عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر بیوی کو یہ حق حاصل ہو جائے کہ وہ بطور خود کسی کو اپنے خاوند کے گھر میں نہ گھسنے دے تو اس سے معاملہ اور زیادہ بگڑ سکتا ہے کیوں کہ یہ بات نہ بھولیے کہ بیشتر معاملات میں عورت کے تأثرات منطق اور عقل کی قید سے آزادہ ہوتے ہیں۔ اور وہ مصلحت و دور اندیشی کے بجائے اس کی مخصوص شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں یا سسرال والوں سے اس کے کشیدہ تعلقات کا رد عمل.......... اس لیے خاوند کو اس معاملہ میں بیوی کی مرضی کا پابند بنانا کہ وہ صرف اس شخص کو گھر میں قدم رکھنے دے جس سے اس کی بیوی راضی ہو۔ یہ کوئی دانشمندانہ فعل نہیں ہوگا۔ جس کو زیادہ دیر تک نبھانا بھی ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ خود فطرت کے خلاف ہے۔

اس سے میرا مقصد بہر حال یہ نہیں کہ خاوند سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ بعض حالات میں طفلانہ حرکت کرے اور بہت متلون مزاج ہو۔ اس طرح اس گفتگو کا مطلب یہ بھی نہیں کہ غلطیاں ہمیشہ بیوی ہی سے سرزد ہوتی ہیں اور خاوند بالکل معصوم ہوتا ہے کیوں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے بیوی اپنے خاوند سے بالکل بجا طور پر متنفر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی کی اصل وجہ خاوند ہو مگر قانون اس طرح کے استثنائی حالات کے لیے نہیں بنایا جاتا بلکہ عام حالات اور عام آدمی کے لیے بنایا جاتا ہے۔ چونکہ بالعموم مرد، عورت کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ معقولیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لیے مرد کو عورت پر ایک گونہ برتری حاصل ہے لیکن اگر بیوی یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ زندگی نہیں گذار سکتی تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ عورت چاہے تو بذریعہ عدالت اس سے علاحدگی اختیار کر لے۔

تیسرا فرض:

رہ گئی عورت کی تیسری ذمہ داری یعنی اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں اپنی عفت و ناموس اور اس کے مال و دولت کی حفاظت۔ یہ تو شادی کا بالکل فطری اور منطقی تقاضا ہے جس کے بارے میں کسی بحث کی گنجائش نہیں۔ مگر یہ ذمہ داری یک رخی نہیں بلکہ دو رخی

ہے یعنی خاوند اور بیوی دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وفادار اور خیر خواہ بن کر رہیں۔

ناکام میاں بیوی:

اب آیئے ذرا ایک ایسے میاں بیوی کے معاملے پر غور کریں جو ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی کے مرتکب ہوں چوں کہ مرد گھر کا نگراں اور اس کی ضروریات فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اس لیے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ اسے یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی باغی اور سرکش بیوی کو راہِ راست پر لانے کے لیے اسے سرزنش کرے۔ چناں چہ ارشاد خداوندی ہے: وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (سورۂ آل عمران ۴ آیت ۳۴)

ترجمہ: اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف ظلم وزیادتی کے لیے بہانہ مت تلاش کرو۔

بیوی کی اصلاح کا تدریجی طریقہ:

اس آیت میں سرکش بیوی کی اصلاح کا جو طریقۂ کار بیان ہوا ہے اس میں ایک خاص تدریج کار فرما ہے۔ جسمانی سزا کا مرحلہ سب سے آخر میں آتا ہے ہم جانتے ہیں کہ بعض مرد اپنے اس حق کا غلط استعمال کرتے ہیں مگر یہ صورت صرف اسی حق کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کسی دوسرے حق میں بھی رونما ہو سکتی ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ لوگوں میں روحانی اور اخلاقی بلندی پیدا کی جائے جس کی اہمیت سے اسلام کبھی غافل نہیں رہا۔ چناں چہ مندرجہ بالا آیت میں جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس کا مقصد خانگی زندگی کا تحفظ اور استحکام ہے کیوں کہ کوئی قانون صرف اسی وقت مفید اور مؤثر ہو سکتا ہے جب اس کی پشت پر ایک ایسی قوتِ نافذہ موجود ہو جو اس کی خلاف ورزی کے مرتکبین کو سزا دے سکے۔ اگر یہ قوتِ نافذہ موجود نہ ہو تو قانون کی حیثیت ایک خالی خولی لفظ سے زیادہ نہیں رہتی

جو عمل کی دنیا میں کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتا۔

اس حکم کی مصلحت:

شادی کا مقصد مرد و عورت کی فلاح و بہبود اور گھر میں محبت و سکون کی فضا کا قیام ہے تاکہ قانون کا سہارا لیے بغیر میاں اور بیوی، دونوں زیادہ سے زیادہ مادّی اور روحانی فوائد سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ لیکن میاں بیوی میں اختلاف و جھگڑا ہوگا تو اس کے مضر اثرات صرف ان ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کے بچوں یعنی اگلی نسل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

عدالت اور گھریلو جھگڑے:

اگر گھریلو زندگی میں تلخی کا باعث بیوی کا رویہ ہو تو سوال یہ ہے کہ اس کی اصلاح کون کرے؟ کیا عدالت یہ کام انجام دے سکتی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے عدالت معاملہ کو اور زیادہ بگاڑ سکتی ہے مگر اصلاح نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے اختلافات بالکل معمولی اور عارضی ہوں جو عدالت میں جا کر اور زیادہ پیچیدہ اور خطرناک صورتِ حال اختیار کر لیں۔ دونوں کی اختلافی خلیج مزید وسیع ہو جائے اور یہ ایک ناک و شان کا مسئلہ بن جائے کیوں کہ ایک دفعہ جب کوئی معاملہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے تو طرفین کا غرور انھیں کسی قسم کی مصالحت کے قابل ہی نہیں رہنے دیتا۔ اس لیے معقول رویہ یہی ہے کہ خاندانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات کو عدالت میں نہ لے جایا جائے۔ عدالت کو صرف اہم کام اور بڑے بڑے امور میں ہی مداخلت کرنی چاہیے اور یہ صرف اس صورت میں ہے جب کہ مصالحت کے تمام ذرائع ناکام ہو گئے ہوں۔

کوئی معقول انسانی زندگی میں ہر لمحہ پیش آنے والے واقعات و شکایات اور اپنے چھوٹے چھوٹے گھریلو معاملات کو عدالت میں نہیں لے جاتا کیوں کہ اگر ایسا ہو تو پھر ہر گھر میں عدالت قائم کرنی پڑے گی اور یہ عدالتیں دن و رات انھی عائلی تنازعات کے چکانے

میں الجھی رہیں گی۔

مرد کا کردار:

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گھر میں کوئی ایسی قوت ضرور ہونی چاہیے جو گھریلو اصلاح کا کام اپنے طور پر انجام دے سکے۔ چناں چہ گھر کا حقیقی سربراہ ہونے کی حیثیت سے مرد گھر کے اندر یہی فریضہ انجام دیتا ہے۔ اوپر کی آیتِ کریمہ میں اس کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ بیوی کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچائے بغیر زبانی فہمائش کے ذریعہ اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اگر اس کے نتیجے میں بیوی اپنی اصلاح کرلے تو معاملہ ختم ہوجاتا ہے لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر اصرار کرے تو خاوند کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنی خواب گاہ سے الگ کردے۔ یہ سزا، پہلی سزا یعنی زبانی فہمائش سے قدرے سخت ہے۔ اندازہ لگائیے کہ اسلام عورت کی نفسیات کا کس قدر گہرا ادراک رکھتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے حسن اور دلکشی سے مسحور ہوکر عورت بسا اوقات اتنی مغرور اور سرکش ہوجاتی ہے کہ اپنے خاوند کی کھلم کھلا نافرمانی پر اتر آتی ہے اس لحاظ سے خواب گاہ سے اس کی علاحدگی کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خاوند کو اپنے حسن و دلکشی اور ناز و ادا سے مجبور نہیں کرسکتی۔ اس سے اس کا غرورِ حسن کچھ کم ہوجاتا ہے اور وہ دوبارہ معقول روش اختیار کرلیتی ہے مگر اس سزا کے بعد بھی اس کی اصلاح نہ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس قدر مغرور اور خودسر ہے کہ سوائے جسمانی سزا کے کوئی اور طریقۂ اصلاح کارگر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ اگر یہ صورت پیدا ہوجائے تو خاوند کو اجازت ہے کہ آخری چارۂ کار کے طور پر معمولی مار پیٹ کے ذریعہ اس کی اصلاح کرے مگر اس مار کا مقصد بیوی کی اصلاح ہونا چاہیے نہ کہ اسے اذیت پہنچانا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے یہ مار پیٹ بہت ہلکی اور معمولی ہونی چاہیے۔

محض احتیاطی تدابیر:

کیا عورت سے سختی کا یہ سلوک اس کی اہانت اور اس کی عزتِ نفس کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے؟ جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے کیوں کہ اس مسئلے کے مذکورہ

پہلو پر گفتگو کرتے وقت ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس مار پیٹ کی حیثیت محض ایک احتیاطی تدبیر کی ہے اور اس کو صرف اسی وقت اختیار کیا جاتا ہے جب اصلاح کے باقی تمام ذرائع ناکام ہو جائیں۔

سزا..........ایک نفسیاتی ضرورت:

دوسری بات ہمیں یہ یاد رکھنی چاہیے کہ بعض نفسیاتی عوارض اور بگاڑ ایسے ہیں کہ جن میں مبتلا افراد کی اصلاح جسمانی سزا اور مار پیٹ کے علاوہ کسی دوسری طرح ممکن ہی نہیں ہوتی۔ علم نفسیات ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی کے عام حالات میں مذکورہ بالا ذرائع اصلاح یعنی زبانی فہمائش اور خواب گاہ سے علاحدگی وغیرہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ مگر بعض نفسیاتی عوارض مثلاً اذیت پرستی (Masochism) وغیرہ ایسی ذہنی بیماریاں ہیں جن میں مبتلا شخص کا علاج صرف جسمانی سزا ہی ممکن ہے۔ مردوں کے بہ نسبت عورتیں اس ذہنی عارضے کی زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ اس طرح کی مریض عورتیں تحقیر اور مار پیٹ سے ایک طرح کا لطف حاصل کرتی ہیں۔ اس کے برعکس مرد عام طور پر جس نفسیاتی بیماری کا شکار ہوتے ہیں وہ سیادت پسندی (sadism) کہلاتی ہے۔ اس میں مبتلا مردوں میں ظلم و ستم سے ایک طرح کی مریضانہ محبت پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر بیوی اذیت پرستی جیسے مرض میں مبتلا خواتین کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے تو اس کی اصلاح مار پیٹ اور جسمانی اذیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے تاکہ اس کی نفسیاتی ضرورت پوری ہو اور اس کے ہوش وحواس بحال ہوں۔ یہ بات بظاہر کتنی ہی عجیب و غریب کیوں نہ معلوم ہوتی ہو مگر حقیقت ہے کہ سیادت پسند مرد اور اذیت پرست عورتیں ایک دوسرے کے لیے بہت اچھے رفیق حیات ثابت ہوتے ہیں حالانکہ ان کے باہمی تعلق کی اساس غیر صحت مندانہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اذیت پرست خاوندوں اور سیادت پسند بیویوں کی مثالیں بھی انسانی زندگی میں نایاب نہیں ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً اپنے خاوندوں کو خوب پیٹتی رہتی ہیں۔ ایسے اذیت پرست خاوندوں کا مزاج صرف پٹ پٹا کر ہی درست ہوتا ہے۔ یہ ان کی ایک نفسیاتی

ضرورت ہے جسے ان کی بیویاں بخوبی پورا کرتی ہیں۔ ایسے جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہتے ہیں۔ چناں چہ واقعہ یہ ہے کہ مار پیٹ کی نوبت صرف اسی وقت آتی ہے جب میاں بیوی مرض کے حد تک اس کے خوگر ہو چکے ہوں۔ اس کے بغیر یہ صورت پیش ہی نہیں آسکتی۔

بہر حال اسلامی قانون خاوند کو جسمانی مار پیٹ کی اجازت دیتا ہے اس کی حیثیت محض ایک احتیاطی تدبیر کی ہے کسی خاوند کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر اپنی بیوی کو زدوکوب کرتا رہے۔ قرآنی آیت میں اصلاحی تدبیر کا تدریجی ذکر اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو اپنا حق صرف انھی مواقع پر استعمال کرنے کی اجازت دی ہے جہاں دوسرے تمام ذرائع ناکام ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا یجلِدُ احدُکم امرأتَه جلدَ البعیرِ ثم یُجامعها فی آخِرِ الیوم۔ (بخاری)

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح نہ مارے جس طرح گدھوں کو مارا جاتا ہے اور پھر دن کے آخری حصہ میں بالآخر اس سے مجامعت کرے گا۔

خاوند کی بدسلوکی کا علاج:

اگر بیوی کو خاوند کی طرف سے کسی بدسلوکی کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں اسلامی قانون ذرا مختلف ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (سورت ۴ آیت ۱۲۸)

ترجمہ: اگر عورت اپنے شوہر کی طرف سے کسی سرکشی یا بے پروائی کا خوف محسوس کرے تو دونوں کو اس معاملے میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم صلح کرلیں اور یہ صلح بہتر ہے۔

بعض لوگ اس معاملے میں بھی مرد عورت کے درمیان کامل مساوات کا مطالبہ کر سکتے ہیں مگر یہ سوال محض نظری اور خیالی انصاف کا نہیں ہے بلکہ یہ انصاف کی ایک ایسی

صورت کا سوال ہے جو قابل عمل ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت سے بھی ہم آہنگ ہو۔ عورت پسماندہ مشرق کی ہو یا مہذب مغرب کی۔ وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرسکتی کہ خاوند کی مار پیٹ کا بدلہ وہ بھی مار پیٹ کی صورت میں لے اور اپنے ہاتھوں خاوند کی پٹائی کرے وہ ایسے خاوند کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھ ہی نہیں سکتی جو اتنا کمزور ہو کہ اس کے ہاتھوں پٹتا اور مار کھاتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی عورت نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ جس طرح خاوند کو اسے مارنے کا حق حاصل ہے اسی طرح اس کو بھی اپنے خاوند کو زدو کوب کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

اس معاملے کا اہم پہلو یہ ہے کہ اسلام کی نگاہ میں یہ ضروری نہیں کہ عورت چپ چاپ اپنے خاوند کی زیادتیاں اور جور وستم برداشت کرتی رہے اور اس کے خلاف اُف تک نہ کرسکے۔ ایسی صورت میں اسلام عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ چاہے تو اسلامی طریقہ کے مطابق اپنے خاوند سے علاحدگی اختیار کرلے۔

بحث کا خلاصہ:

اوپر کی مذکورہ بحث سے مندرجہ ذیل امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱- خاوند کی جانب سے بیوی پر عائد ہونے والے فرائض نرے ظلم وستم اور زور زبردستی کا مظاہرہ نہیں ہیں بلکہ ان کا اصل مقصود معاشرے کی اجتماعی فلاح وبہبود ہے جس کا ایک جز عورت بھی ہے۔

۲- بیوی کے اکثر فرائض کے مقابل میں خاوند پر بھی اسی طرح کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ جن چند مواقع پر مرد کو عورت کے مقابلے میں کسی نہ کسی طرح کی برتری حاصل ہے ان میں بنیادی نقطہ نظر ان کی طبعی ساخت ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہے اس سے عورت کی تحقیر یا تذلیل ہرگز مقصود نہیں۔

۳- عورت پر مرد کو جو فوقیت حاصل ہے اس کے مقابلے میں عورت کو یہ قانونی حق دیا گیا ہے کہ اگر خاوند اس سے بدسلوکی کرے تو وہ اس کو چھوڑ دے۔ ●

(جاری)

مولانا حبیب الرحمن قاسمی استاد حدیث دارالعلوم دیوبند

۲۵۔ابو عتبہ کے شاگرد ابوالعباس بیان کرتے ہیں کہ میں نے (اپنے عہد کے مشہور عابد وزاہد بزرگ) حضرت بشر بن حارث حافیؒ سے اکتساب یعنی کاروبار اور کمائی کے بارے میں پوچھا تو فرمایاہاں ضروری ہے اور میرے نزدیک تو کمائی کے بغیر چارہ کار نہیں۔ اور مزید یہ بات بھی بیان فرمائی کہ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی آمدنی، خوراک اور جائے سکونت (مکان) پر نظر رکھے اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی تجارت وغیرہ میں پوری احتیاط سے کام لے اور حلال وجائز اور پاکیزگی کا پورا پورا خیال رکھے۔

۲۶۔احمد بن محمد برائی بیان کرتے ہیں کہ (میرے والد کی وفات کے بعد) جب حضرت بشر حافیؒ کو یہ معلوم ہوا کہ ہمارے والد کے ترکہ کو ہمارے اوپر نہایت کشادہ دستی اور بے احتیاطی کیساتھ خرچ کیا جارہاہے تو انھوں نے مجھ سے فرمایا یہ مال تم پر جس طرح بے دریغ خرچ کیا جارہا ہے اس سے مجھے بہت دکھ ہے خرچ میں توسط ومیانہ روی ضروری ہے۔ تم بھوکے سوجاؤ اور مال تمہارے پاس موجود رہے یہ میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ تم آسودگی اور پیٹ بھر کے سوجاؤ اور گھر میں کچھ نہ رہے۔

اس کے بعد فرمایا مجھے معلوم ہوا کہ تم تجارت کے لیے بازار بھی نہیں جارہے ہو تجارت ضرور کرو پھر آخر میں فرمایا کہ اپنی والدہ کو میرا اسلام پہونچا دینا اور یہ پیغام بھی کہ خرچ میں میانہ روی کا خیال رکھیں (حضرت بشر حافیؒ کی اس ہدایت کا حاصل یہی ہے کہ

کھانے وغیرہ کی نوعیت اور مقدار میں درمیانی راہ اختیار کرنی ضروری ہے تاکہ مال ودولت فضول خرچی میں برباد نہ ہو جائے)

(۲۷) اسحاق بن داؤد کہتے ہیں کہ میں نے حسن بن ربیع کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میرے نزدیک ایک قیراط کا کمانا اس سے بہتر ہے کوئی مجھے بطور عطیہ واحسان کے دس درہم دے۔

(۲۸) ابو بکر بیان کرتے ہیں کہ میں نے محمد بن مقاتل کو فرماتے ہوئے سنا کہ آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس بات پر نظر رکھے کہ اس کی روٹی کہاں سے آرہی ہے۔ اور اس کے درہم کہاں سے آرہے ہیں یعنی کھانے اور کمانے میں حلال وحرام کا امتیاز نہایت ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ بے احتیاطی میں حلال وحرام کی آمیزش ہو جائے۔ حضرت سفیان نے فرمایا کہ کسب حلال میں جواں مردوں کی طرح جد وجہد کرو۔

(۲۹) عاصم بن ابی النجود حضرت ابو وائل کا یہ ملفوظ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ تجارت سے حاصل کیا ہوا ایک درہم عطیہ کے دس درہم سے میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

(۳۰) حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ دو خوراک نہایت پاکیزہ ہے ایک وہ جو پشت پر بوجھ لاد کر حاصل کی گئی ہے اور دوسری جو ہاتھ کی کمائی سے حاصل ہوئی ہے۔ دست کاری سے کمائی گئی ہے۔

(۳۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ سے پوچھا گیا کہ بہتر کمائی کون سی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا جو دست کاری اور جائز تجارت اور گناہوں کی آلودگی سے محفوظ ہو۔

(۳۲) حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ (ان کے زمانے میں کہا جاتا تھا۔) تاجر بیکار بیٹھے رہنے والے سے بہتر ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ مشہور محدث وفقیہ اور تابعی ہیں ان کی اس ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ اور تابعین میں یہ بات عام طور پر مشہور ومعروف تھی۔

(۳۳) مشہور امام حدیث سفیان بن عیینہ ابو اسحاق السبعی سے نقل کرتے ہیں

کہ انھوں نے فرمایا محنت ومزدوری کو دین کا معین سمجھا جاتا تھا۔ ابن عیینہ سے پوچھا گیا کیا یہ بات سفیان ثوری نے ذکر کی ہے تو انھوں نے فرمایا ہاں۔

(۳۴) مشہور محدث مہدی بن جعفر صوری بیان کرتے ہیں کہ جس وقت خلیفہ مامون (رشید) طرسوس آیا میں اس وقت وہیں تھا۔ اور امام احمد بن حنبل اور ابن نوح بیڑیوں میں مقید مامون کے ساتھ تھے۔ (ان ہر دو بزرگوں نے مسئلہ خلق قرآن میں مامون کے غلط عقیدہ کی موافقت نہیں کی تھی اس بنا پر اس نے دونوں حضرات کو مقید کر رکھا تھا) محدث مہدی صوری کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے مجھے مکتوب لکھا کہ ہم جس حال میں ہیں آپ کو معلوم بھی ہے اگر ہم اس حبس وقید کی حالت میں نہ ہوتے تو آپ کے پاس حدیث سننے کے لئے ضرور حاضر ہوتے۔ (اس مجبوری کے تحت) عرض ہے کہ آپ خود قدم رنجہ فرمائیں۔ امام صوری کا بیان ہے کہ امام احمد کی اس طلب وخواہش پر میں ان کے پاس حاضر ہوا۔ اور اس دن ان سے جو حدیث میں نے بیان کی وہ یہ تھی کہ تابعی جلیل عبداللہ بن محیریز فرماتے تھے۔ لذیذ سے لذیذ تر کھانا جو سعی وکوشش کے بعد حاصل ہوا ہو اور میں اسے آسودہ ہو کر کھاؤں اس کے مقابلے میں سچے تاجر کا کھانا زیادہ پسندیدہ ہے۔

(۳۵) ابو ظبیان کا بیان ہے کہ امیرالمؤمنین سیدنا فاروق اعظمؓ نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے ظبیان کے بیٹے مال حاصل کر۔ مطلب یہ ہے کہ حلال مال کی طلب وسعی میں سستی وکاہلی کے بجائے پوری مستعدی کا مظاہرہ کیا جائے۔

(۳۶) حکیم بن قیس اپنے والد قیس بن عاصم سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی مال حاصل کرنے میں پوری کوشش کرو اس لئے کہ مال کریم کی شرافت کی علامت ہے اور کمینوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ اور سوال کرنے سے بچنا کیوں کہ یہ آدمی کی سب سے گھٹیا کمائی ہے اور جب میری وفات ہو جائے تو مجھ پر نوحہ نہ کرنا کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نوحہ نہیں کیا گیا تھا۔

● ● ●

كنز العمال
في سنن الأقوال والأفعال
للعلامه علاء الدين علي المتقي الحنفي الهندي
خصوصیات
اعلیٰ کاغذ
جلی قلم
بیروتی طبع کے نسخے کا
اعلیٰ عکسی فوٹو
جدید اضافہ
حاشیہ کے ساتھ
فہارس
کی دو ضخیم جلدیں
تصحیح کا خصوصی اہتمام
پاکستان میں پہلی بار
انتہائی ارزاں قیمت: ۶۹۰۰/- روپے
۱۳۰۰۰ صفحات
تقریباً ۵۰،۰۰۰ احادیث پر مشتمل
مکمل اٹھارہ خوبصورت جلدیں
پیشگی رقم آنے پر
علماء و طلباء کے لئے
خصوصی رعایت
کتاب چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے خصوصی رعایت سے جلد فائدہ اٹھائیں
تعداد محدود ہے
آج ہی طلب فرمائیں
السنن الکبری بیهقی مع الجوهر النقی — کامل دس جلد — قیمت 2550/
السنن الکبری نسائی — کامل چھ جلد — قیمت 1800/
لسان المیزان في اسماء الرجال (ابن حجر) — کامل سات جلد — قیمت 1800/
نسیم الریاض في شرح الشفاء — کامل چار جلد — قیمت 1690/
تفسیر البغوی (معالم التنزیل) — کامل چار جلد — قیمت 1290/
نزهة الخواطر علامه عبد الحئ حسني — کامل آٹھ حصے — قیمت 1690/
اوجز المسالك شرح مؤطا مالك — کامل پندرہ جلد — قیمت 3300/
امانی الاحبار شرح معانی الآثار — کامل چار جلد — قیمت 1050/
مصنف ابن ابی شیبه مع رسائل مفیده — کامل نو جلد — قیمت 2400/
ہندوستان میں ملنے کے پتے۔ ☆ادارہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر ☆ کتب خانہ عزیزیہ اردو بازار جامع مسجد دہلی
ملنے کا پتہ
ادارۂ تالیفات اشرفیہ

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳ شمارہ ۸ فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

مدیر	نگراں
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
استاذ دار العلوم دیوبند	مہتمم دار العلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ دار العلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپئے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/
ہندوستان سے ۶۰/

Tel: 01336 - 22429

FAX: 01336 - 22768

Tel.: 01336 - 24034 (EDITER)

REGD NO. SHN/L-13/NP-111/98

فہرست مضامین

☆☆ ختم خریداری کی اطلاع ☆☆

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبد الستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند کی معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

اک شمع رہ گئی تھی............

حبیب الرحمن قاسمی

۲۳؍جولائی کی شب میں ایک ایسی شخصیت جس نے زندگی سے ناامید ہزاروں مریضوں کو جینے کا حوصلہ بخشا، جس کی نبض شناش انگلیوں کے لمس نے سیکڑوں درماندہ بیماروں کو زندگی کی توانائیاں دیں، جس کے محبت آمیز ہمدردانہ لہجوں نے تیرگیٔ حیات سے ہراساں دلوں میں اطمینان واعتماد کے چراغ روشن کردیئے، قضا و قدر کے فیصلہ پر لبیک کہتے ہوئے موت کی آغوش میں سوگئی۔ یعنی دواخانہ ہمدرد (وقف) دہلی کے متولی و سرپرست، جامعہ ہمدرد کے مؤسس اور وائس چانسلر جناب حکیم عبدالحمید دہلوی کارگاہِ حیات سے بارگاہِ رب کائنات میں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ دعاہے کہ مولائے رحیم وکریم مرحوم کی قبر پر اپنے رحم وکرم اور لطف و نوازش کی موسلا دھار بارش برسائے اور خدائے غفار وستار ان کی زلات و تقصیرات اور لغزشوں و کوتاہیوں پر عفو وغفران کی چادر ... دے۔

حکیم صاحب موصوف رواداری و غم گساری، محبت واخوت، خدمت و ایثار اور احترام آدمیت کے عملی نقیب و علم بردار تھے اور رہن سہن، نشست و برخاست، گفت و شنید، لباس و مزاج اور اخلاق و عادات میں مشرقی تہذیب کے نمونہ اور جیتی جاگتی تصویر تھے۔ دنیا کی نعمتوں سے مالامال اور جاہ و منصب سے ہم کنار باایں ہمہ بیجاشان و شوکت کے

انکسار سے نا آشنا، فخر و مباہات اور کبر و نخوت سے ان کی زندگی یکسر بری تھی۔ دنیوی مال و متاع کے لحاظ سے وہ ایک امیر ترین انسان تھے مگر ذوق و مزاج کے اعتبار سے وہ ایک مرد درویش تھے۔ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کے بجائے انھوں نے ہمیشہ سادگی و بوریہ نشینی کو پسند کیا۔

جہد مسلسل و سعی پیہم ان کی شناخت اور فکر و عمل ان کی شخصیت کا دوسرا نام تھا۔ تقسیم ملک کے قیامت خیز خونی منظر سے ساری قوم دہشت زدہ نالہ و شیون میں مبتلا تھی ایسے ہوش ربا اور حوصلہ شکن حالات میں بھی حکیم صاحب زندگی سے مایوس ہونے کے بجائے زندگی کی تعمیر نو اور قوم و ملک کے روشن مستقبل کا فکری خاکہ مرتب کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پھر اپنی پوری زندگی اسی خاکہ کے اندر رنگ بھرنے میں گذار دی۔ اور فکر و عمل کے ایسے چراغ روشن کر گئے جن سے اگلی نسلیں روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

●

اسی ہفتہ دارالعلوم دیوبند کے قدیم استاذ بلکہ استاذ الاساتذہ جناب حکیم محمد عمر صاحب طویل علالت کے بعد وفات پاگئے۔ موصوف ایک بااصول، اپنے کام سے کام رکھنے والے، سادگی پسند، متواضع اور ماہر فن استاذ تھے۔ فن طبابت کے اس دور زوال میں موصوف کی ذات مرجع کی حیثیت رکھتی تھی۔ کم و بیش ساٹھ سال کے طویل عرصہ تک انھوں نے فن طب کی خدمت انجام دی اور اس طویل مدت میں ہزاروں تلامذہ نے ان سے فیض اکتساب کیا۔ درس و تدریس کے ساتھ فارغ اوقات میں مطب بھی کرتے تھے اس راہ سے بھی انھوں نے خلق خدا کی بہت خدمت کی عام طور پر نسخہ نویسی کی کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ اور دواؤں کی تجویز میں بھی مریض کی معاشی حالت کا خاص خیال رکھتے تھے۔

مساجد و مدارس کی تاسیس و تعمیر میں بھی دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ شہر دیوبند میں اپنے جیب خاص سے ایک مسجد کی تعمیر کرائی جو بحمد اللہ جمعہ و جماعت سے آباد ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی شمارہ میں تفصیل کے ساتھ حکیم صاحب مرحوم و مغفور کے حالات و خدمات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ ●

دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ایک ضروری وضاحت

از حضرت مہتمم صاحب

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار احسان ہے کہ دارالعلوم دیوبند اپنی روایات کے مطابق اسلامی علوم وفنون کی تعلیم و تدریس میں پوری اجتماعیت کے ساتھ مصروف ہے، اور اس کے تمام انتظامی و تعلیمی وتربیتی شعبے حسب معمول اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن لگے ہوئے ہیں۔

البتہ دارالعلوم دیوبند چوں کہ ایک عظیم ادارہ ہے، جس میں کم و بیش تین سو کا عملہ ہے، جن میں پیش آمدہ مسائل کے سلسلہ میں اختلاف رائے کا پیش آجانا کوئی مستبعد نہیں ہے۔ یہ اداروں کے اپنے داخلی معاملات ہیں جو اتفاق و اختلاف رائے سے طے پاتے رہتے ہیں۔ اجتماعی معاملات میں اس طرح کی صورت حال کارونما ہو جانا ایک طبعی امر ہے۔

لیکن بعض طبائع اس قسم کے معمولی اختلاف رائے کو اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادی ہوتی ہیں جس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ رفقاء کار میں باہمی افتراق اور گروپ بندی ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

ادھر تقریباً ایک مہینہ سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے تعلق سے کچھ اسی طرح کی خبریں اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں جن سے ہمدردان ملت و بہی خواہان دارالعلوم میں تشویش کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے، چناں چہ بعض موصولہ خطوط میں اس کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ جب کہ یہ سارے بیانات واقعہ کی غلط ترجمانی پر مشتمل و سچائی سے دور ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی رکن شوریٰ نے استعفاء نہیں دیا ہے۔ اور ناظم تعلیمات صاحب بدستور اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں۔ جو عناصر اس طرح کے بیانات شائع کر رہے ہیں وہ اپنے اس بے جا عمل سے دارالعلوم کی نیک نامی اور اس کی حیثیت عرفی کو مجروح کرنے کے درپے ہیں۔ بلاشبہ ان کا یہ رویہ قابل مذمت ہے۔

اخبارات کے نمائندوں اور دیگر صحافی حضرات سے بھی ہماری گذارش ہے کہ وہ ملک کے ایک تاریخی وعظیم ادارہ سے متعلق اس طرح کے بے سروپا بیانات نہ شائع کرائیں یہ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ ان کا قابل قدر تعاون ہوگا اور ادارہ ان کے اس تعاون پر مشکور ہوگا۔

● ● ●

تحریر: مولانا محمد خالد یمین صاحب نیوی، شعبۂ تدریب المعلمین دارالعلوم دیوبند

ہندوستان کا ایک ستارۂ درخشاں

شیدائیانِ علومِ نبوی کی زبردست خدمات کے باوجود ہندوستان میں ابھی تک مکمل طور پر تعلیم حدیث کا رواج نہ ہو پایا تھا۔ اور اس دیار میں علمِ نبوی کی روشنی معقولات کے دباؤ میں آکر دھیمی پڑ جاتی تھی۔ لیکن دسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی قسمت چمکتی ہے اور اس کے اقبال کا ستارہ اس شہر میں طلوع ہوتا ہے جس کو شاہجہاں کی قدر دانی نے "شیراز ہند" کا خطاب دیا تھا۔ ہندوستان کی یہ قسمت بیدار شیخ علی متقی (المتوفی ۹۷۵ھ) کی ذات تھی۔ (الثقافة الاسلامیہ فی الهند ـ ونفحة العنبر ص ۱۵)

موصوف جوانی میں ملتان جاکر شیخ حسام الدین ملتانی سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی، یہاں سے جاذبہ توفیق نے مرکز کی طرف کھینچا، گجرات ہو کر دیار عرب کی طرف لنگر اٹھایا، اس وقت عمر سرسٹھ برس کی تھی، لیکن اس عزم کے سامنے لندکی پیرانہ سالی رکاوٹ نہ بن سکی۔ عرب پہنچ کر حجاز کے مشہور و معروف اساتذہ سے علم ظاہر و باطن کی تکمیل کی، بالخصوص ابن حجر مکی، شیخ ابوالحسن بکری اور محمد بن محمد سخاوی کی خدمت میں خصوصیت حاصل کی(۱) علی متقی نے چند ہی سال میں بتوفیق ربانی و استعداد روحانی وہ مرتبہ حاصل کیا کہ ان کے اساتذہ و شیوخ شاگرد کے درجے میں آگئے اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے اور شاگرد کہلانے میں فخر بھی محسوس کرنے لگے چنانچہ ابن حجر مکی ان سے اہم مسائل میں رجوع کیا کرتے (۲) إن هند امن أعاجيب الزمن. شیخ علی متقی نے حجاز میں بیٹھ کر وہ "دائرة المعارف" ترتیب دی جو "کنز العمال فی سنن الأقوال و الافعال" کے نام سے مشہور ہے اور منتخب کنز العمال کے نام سے اس کی

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی (۲) الفاروق کراچی شمارہ ۳ ـ ۱۴۱۶

تلخیص بھی مرتب کی لہذا یہ وہ کتابیں ہیں جنھوں نے امام رزینؒ اور حافظ سیوطیؒ کے مجموعوں پر خط نسخ کھینچ دیا۔ ان کتابوں کو دیکھ کر ان کے استاذ ابوالحسن بکریؒ اپنے شاگرد کے حق میں فرماتے کہ "للسیوطی منة علی العالمین و للمتقی منة علیه"۔ شیخ متقی کی اور بہت ساری تصانیف ہیں، ان تصانیف پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہندی النسل عالم نے کس طرح ان کو مرتب فرمایا۔ یہی وجہ ہے حجاز مقدس کے تمام علماء و مشائخ آپ کے عقیدت مند ہوگئے۔ اور آپ کی سوانح حیات پر مستقل کتابیں لکھیں (۱)۔ شیخ کے آغوش تربیت میں ہندوستان کے بہت سارے خادمان حدیث جوان ہوئے جن میں شیخ محمد بن طاہر پٹنی، شاہ محمد بن فضل اللہ برہان پوری، شیخ عبداللہ رحمت اور شیخ عبدالوہاب متقی وغیرہ ہیں، لیکن علی متقی کے تلامذہ میں جو شہرت محمد بن طاہر پٹنی کو ہے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی۔ محمد بن طاہر نے اولاً اپنے استاذ سے تحصیل فیض کرکے مکہ معظمہ کا علمی سفر کیا۔ اور حدیث میں یہ کمال حاصل کیا کہ استاذ کی زندگی ہی میں دو کتابیں تصنیف کیں، ان کے علاوہ بھی ان کی کئی مفید ترین تصانیف ہیں جس نے امت اسلامیہ کو ممنون احسان کیا، لغت حدیث میں "مجمع البحار" آپ کی مشہور ترین تصانیف میں سے ہے، بلاشبہ یہ کتاب خدام حدیث نبوی پر احسان عظیم ہے جس کے بارے میں صحیح بخاری کے مقدمہ نگار حافظ احمد سہارنپوریؒ کے یہ الفاظ ہیں "وهو مع كونه من كتب اللغة شرح واف للصحاح الستة بل لغيرها ايضاً" (۲) اور مفتی سید عمیم الاحسان مجددی کا اس سلسلے میں دعویٰ ہے کہ "یہ اس فن کی آخری کتاب ہے، اس کو تمام کتب حدیث کی عمدہ شرح کہنا بہتر ہے" (۳) اسماء رجال میں بھی ان کی کتاب "المغنی" نہایت مفید اور درحقیقت "مغنی" (بے نیاز کرنے والی) ہے، علاوہ ازیں تذکرۃ الموضوعات اور قانون الموضوعات ان کی اہم تصانیف ہیں، ان کی عظمت کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ اکبر جیسے مغرور انسان نے جب گجرات فتح کیا۔ تو پٹن پہنچ کر شیخ سے ملاقات کی۔ اور (باوجود شیخ کی ناگواری کے) شیخ کے سر پر دستار خود اپنے ہاتھوں سے باندھی (۴) علی متقی کے دوسرے دو شاگرد شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ نے

---

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی (۲) مقدمہ صحیح بخاری

(۳) تاریخ علم حدیث ص ۳۲ (۴) آثار الکرام ج ۱ ص ۱۹۶

گجرات آکر بزم حدیث آراستہ کیا، ان کی شہرت سن کر مولانا جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی گجرات پہنچے اور دونوں بزرگوں سے حدیث کا درس لیا، واپس آکر اس فن شریف کی خدمت میں عمر بسر کردی، ملا بدایونی لکھتے ہیں وہ علم حدیث راخوب ورزیدہ و در صحبت اہل فقر رفتار سیدہ...... و با اہل دنیا کارے ندارد و بافادہ و اضافہ طلاب مشغول است۔ اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی آپ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں "جامع میان علم شریعت و طریقت بود"(۱) انھی کے معاصر مولانا میر کلاں محدث ہیں، یہ میرک شاہ شیرازی کے شاگرد تھے۔ یہ اپنے زمانے کے زبردست عالم تھے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ حدیث و فقہ کے مشہور امام ملا علی قاری نے حدیث شریف کی سند آپ سے حاصل کی چناں چہ اپنی مشہور کتاب "مرقاۃ المفاتیح" کے مقدمے میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق تاریخ میں پہلی دفعہ صحیح بخاری کے داخل درس ہونے کا تذکرہ اسی عہد میں ملتا ہے مولانا محمد لاہوریؒ اس کا درس دیا کرتے تھے۔ وہ لاہور کے مفتی تھے۔ تقریباً نوے برس تک اس بابرکت شغل میں مصروف رہے۔ (۲)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور خدمتِ حدیث کی رفتار میں تیزی:

اکبر کے اخیر عہد میں حالات ایک نیا رخ پکڑتے ہیں اور علم حدیث کی روشنی سے پورے ہندوستان کو منور کرنے کے لئے ایک زبردست خدائی انتظام ہوتا ہے، یعنی وہ عظیم ہستی نمایاں ہوتی ہے، جس نے آگے چل کر دہلی کی شاہی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے علوم دین کا دارالسلطنت بنادیا، اور جس نے اکبر کے دور کی بدعت والحاد کو حدیث نبوی کے نور سے کافور کردیا اور جس کی نسبت اہل علم کا اعتراف ہے "اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود" اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سر بمہر خزانے کو وقف عام کیا، اور قابل قدر محققانہ تصانیف کے ذریعے سے علماء ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے تحسین و آفریں کی داد وصول کی!!

شیخ نے اولاً اپنے والد بزرگوار سے علوم کی تحصیل کی، پھر مکہ معظمہ جاکر شیخ

---

(۱) تذکرہ علماء ہند ج ۱۔ ص ۲۸۰ (۲) مقالات سلیمان جلد ۲

عبدالوہاب متقی سے صحاح ستہ پڑھی اور ہندوستان واپس آکر درسِ حدیث کے فیوض سے لوگوں کو مستفیض کرتے رہے، اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سو سے زائد کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں مشکوٰۃ کی مشہور عربی شرح لمعات التنقیح اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات اور سیرت نبوی میں مدارج النبوۃ بہت اہم ہیں۔ شیخ دہلویؒ نے عمومی طور پر حدیث کو غور و فکر اور تدبر معانی سے پڑھنے پڑھانے کا رواج دیا، شیخ دہلویؒ کے بعد ان کے صاحبزادگان اچھے جانشین ثابت ہوئے اور باپ کی میراث کو سینے سے لگائے رکھا، چنانچہ شیخ کے فرزند مولانا نورالحق محدث دہلوی نے اس فیض کو عام کرنے میں پوری زندگی کھپادی، اور بخاری شریف کی شرح فارسی "تیسیر القاری" کے نام سے کئی جلدوں میں لکھی، موطاامام مالک کی بھی شرح لکھی اور صحیح مسلم کی شرح بنام "منبع العلوم" لکھنی شروع کی تھی مگر عمر نے وفانہ کی۔ ان کے فرزند شیخ فخر الدین نے اپنے باپ کی ناتمام شرح کی تکمیل کی، نیز حصن حصین کی بھی شرح لکھی، حافظ فخر الدین کے صاحب زادے شیخ الاسلام نے بخاری شریف کی فارسی میں شرح لکھی، شیخ الاسلام کے صاحب زادے شیخ سلام اللہ ہیں، جو دہلی چھوڑ کر رام پور چلے آئے تھے اور محدث رام پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے مؤطا کی شرح محلّٰی لکھی اور صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اصول حدیث پر عربی میں ایک رسالہ لکھا۔ یہ تو وہ سلسلہ تھا جو ان کے خاندان میں یکے بعد دیگرے چلتا رہا۔ ان کے علاوہ ان کے فیض یافتوں کے ذریعے بھی علم حدیث کی خوب اشاعت ہوئی، ان کے تلانذہ میں ملا حیدر کشمیری اور خواجہ معین الدین وغیرہ ہیں، جو علم حدیث میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے، انھیں ملا حیدر کے ایک شاگرد ملا عنایت اللہ کشمیری تھے جنھوں نے ۳۶ دفعہ مکمل بخاری شریف کا درس دیا نیز ملا نورالحق ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے درس کے ایک نامور فاضل میر سید مبارک بلگرامی ہیں۔ انھوں نے حدیث میں وہ کمال پیدا کیا کہ آزاد بلگرامی نے ان کو قطب المحدثین قرار دیا، ان کے شاگردوں میں میر عبدالجلیل سب سے نامور ہوئے، موصوف بھکر (سندھ) میں وقائع نویس تھے وہاں بخاری کا ایک نسخہ ہاتھ آیا، عہدہ سے برطرفی کے بعد بھی محض اس کی نقل کی خاطر چھ مہینے وہاں اور گزارے، ان کے آغوش تربیت میں علامہ غلام علی آزاد نے تربیت پائی جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح ضوء الدری

تصنیف فرمائی (جو نا تمام رہی) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نام بھی خادمانِ علوم نبوی کے ذیل میں آتا ہے۔ حدیث کا درس مولانا عبدالرحمن سرہندی اور شاگرد دانِ حجر شیخ یعقوب صرفی سے حاصل کی متن حدیث میں ایک اربعین آپ کی تالیف ہے ان کے علاوہ جس نے بھی آپ کے مکتوبات کا مطالعہ کیا ہوگا وہ شہادت دے گا کہ آپ کا پایہ علم حدیث میں کتنا بلند تھا۔ آپ کے صاحبزادے خازن الرحمۃ شیخ محمد سعید تبحر فقیہ و محدث تھے، روایت و درایت احادیث و اصول حدیث سند اور اسماء رجال میں مہارت و حذاقت کے مالک تھے (۱) انھوں نے مشکوٰۃ کی شرح بھی تصنیف فرمائی۔ خازن الرحمۃ کے فرزند فرخ شاہ کو ۷۰ ہزار احادیث متن و سند اور جرح و تعدیل کے ساتھ یاد تھیں، اسی سلسلہ مجددیہ کے ایک فرد شیخ سراج احمد سرہندی بھی ہیں انھوں نے فارسی میں جامع ترمذی کی مختصر مگر فاضلانہ شرح لکھی۔

مسند ہند اور علم حدیث کی اصلی شان و شوکت:

گیارہویں صدی کے اواخر میں زمانہ ایک عظیم تغیر کا شکار ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے ادھر حرمین شریفین کے مسند پر ابن حجر مکی اور ان کے تلامذہ کے بجائے کچھ اور لوگ متمکن ہیں۔ اسی عہد میں دو ہندوستانی محدثین مسند نشیں ملتے ہیں، عبداللہ لاہوری مکہ معظمہ میں اور ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ میں، یہ وہی شیخ عبداللہ ہیں جن سے حضرت شاہ ولی اللہ کے استاذ شیخ ابو طاہر مدنی فیض یاب ہوئے۔ ابوالحسن سندھی نے حرم نبوی میں بیٹھ کر حدیث کی متعدد کتابوں پر شروح اور تعلیقات لکھیں، چنانچہ جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، نسائی، اور ابن ماجہ کی شرحیں لکھی لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسند احمد بن حنبل کی شرح ابھی تک کسی نے نہیں لکھی تھی انھوں نے پچاس جلدوں میں اس کی شرح لکھی۔

ہندوستان میں علم حدیث کی شعاعیں تیز تر ہو رہی تھیں۔ مختلف علاقوں میں محدثین اپنے طور پر اس فن کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہندی محدثین مسند

---

(۱) علامہ عبدالحق اسامی [illegible]

آرائے حرمین بنے ہوئے تھے تاہم حدیث کا فن ہند میں خواص ہی کا موضوع سخن تھا۔ کہ یکایک ہندوستان کی تاریخ میں ایک حیات بخش انقلاب آتا ہے اور اسلام کا وہ اختر تاباں نمودار ہوتا ہے جس کو دنیا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نام سے جانتی ہے۔ شاہ صاحب کا وجود ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ منطق و حکمت، ریاضی ہیئت کے ہنگاموں سے پرشور تھا اور عوام و خواص میں قرآن و احادیث کے مطالب و احکام سے ناواقفی عام تھی، اہل ہند کے لئے موہبت عظمی اور عطیہ کبری تھا۔ شاہ صاحب نے ہندوستان میں تحصیل علوم کرنے کے بعد تکمیل حدیث کی غرض سے حجاز کا رخ کیا اور وہاں رہ کر شیخ ابو طاہر بن ابراہیم کردی جن کا تذکرہ بھی اوپر آیا ہے سے صحاح ستہ کا درس لیا اور دوسری کتابوں کی سند و اجازت لی ۱۱۴۵ھ میں بطحا و یثرب کے چشموں سے سیراب ہو کر ہندوستان واپس آ گئے۔ اور پورے تیس برس تک فیوض و برکات کا بادل اپنے زبان و قلم سے برساتے رہے۔ حضرت شاہ صاحب نے قدیم دستور کے مطابق صرف مشکوۃ شریف پر اکتفا نہ کیا بلکہ صحاح ستہ کا درس جاری فرمایا اور فن حدیث میں تفقہ فی الحدیث اور اسرار و حکم کا ایک نیا باب وا کیا، تصنیف کے ذریعہ بھی حدیث کو عام کرنے کی زبردست سعی فرمائی اور حدیث کی اولین اور صحیح ترین کتاب موطا امام مالکؒ کی عربی و فارسی میں مجتہدانہ شرحیں مصفی اور مسوی کے نام سے تالیف کی، صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی، اور "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین" اور فقہ و اسرار حدیث میں "حجۃ اللہ البالغہ" لکھی اور ہزاروں احادیث سے خلفاء راشدین کے مناقب کو واضح و ثابت کرنے کے لئے ازالۃ الخفاء جیسی محققانہ کتاب تصنیف کی (۱) اور ہندوستان میں علم حدیث کے منارے کو رفعت میں رشک فلک بنا دیا۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ:

وصال کے بعد شاہ صاحب نے اپنے پیچھے صدہا ایسے شاگردوں کو چھوڑا جن کے فضل و کمال سے علم کے ایوان آج بھی گونج رہے ہیں۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں آپ کے فرزند اکبر سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ ہیں یہ بھی اپنے والد کی طرح

---

(۱) مقالات سلیمان ج ۲۔

گوناگوں فضل وکمالات کے حامل تھے، انھوں نے اپنے والد کے شروع کئے ہوئے کاموں کو آگے بڑھایا، حدیث کے درس وتدریس کا ہنگامہ برپا کردیا علم حدیث کو فروغ دیا، محدثین اور کتب حدیث کے حال میں بستان المحدثین اور اصول حدیث میں ایک رسالہ عجالہ نافعہ لکھا، شاہ عبدالعزیز کے فیضان درس سے اکابر محدثین کی ایک بڑی جماعت تیار ہوکر نکلی جن میں شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر شاہ عبدالغنی، مولانا عبدالحی، مولانا اسماعیل شہید، شاہ محمد اسحاق، حسین احمد محدث ملیح آبادی، مرزا حسن علی لکھنوی اور سلامت اللہ بدایونی وغیرہ ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کے دو شاگردوں کے ذریعے یہ فیض فرنگی محل پہونچا ورنہ فرنگی محل کا دامن اس دولت سے تقریباً خالی تھا۔(۱) ان دونوں بزرگوں سے شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی نے حدیث کی تکمیل کی۔ ان سے ان کے صاحبزادوں نے یہ دولت پائی، بعد میں مولانا عبدالحلیمؒ فرنگی محلی نے اس کو مزید ترقی دی اور حرمین کے اکابر محدثین احمد شافعی، شیخ محمد جمال حنفی محمد بن محمد العرب الشافعی اور شاہ عبدالغنی سے فیوض وبرکات حاصل کی (۲) اور فرنگی محل میں درس حدیث قائم کیا جس کو ان کے صاحبزادے مولانا عبدالحیؒ نے درجۂ کمال تک پہونچایا اور انھیں کے ذریعہ فرنگی محل میں علم حدیث کی معراج کمال ہوئی، گو موصوف نے عمر کم پائی مگر اسی مختصر عرصے میں آپ کے درس وتدریس، تصنیف، وتالیف، تحقیق وتدقیق کے آواز سے دنیائے اسلام گونج اٹھی۔ حدیث ومتعلقات حدیث کی متعدد کتابیں اپنے مقدمے اور تحشیہ کے ساتھ شائع کیں (۳) مولانا کے تلامذہ میں اس فن کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے، جن میں علامہ ظہیر احسن شوق نیموی، مولوی حکیم

---

(۱) علماء دیوبند اور علم حدیث (۲) مقالات سلیمان ج ۲

(۳) ان کتابوں میں "التعليق الممجد على موطا الإمام محمد" جسے شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نے ایڈٹ کیا۔ اور "الرفع والتكميل في الجرح والتعديل" خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ ان کے شاگردوں میں مشہور اہل حدیث عالم قاضی عبدالرحمن مبارکپوری (م ۱۳۵۳ھ) ہیں ان کی ترمذی کی شرح "تحفة الأحوذي" قابل قدر ہے جو متن حدیث اور فی الباب کی تحقیق میں دوسری شروحات سے ممتاز ہے۔ اسی جماعت کے ممتاز فرد نواب صدیق حسن خاں بھوپالی (م ۱۳۰۷ھ) شمس الحق عظیم آبادی اور علامہ وحید الزماں نے صحاح ستہ اور اس کے متعلقات میں قابل ستائش تحریری خدمات انجام دیں۔

ونقلیہ کا جامع نہیں پایا، جب کہ میں نے ان ممالک کے بڑے بڑے علماء سے ملاقات کی ہے
علم حدیث ان کا خصوصی فن تھا، اور اس میں اتنی مہارت تھی کہ ان کے معاصرین نے
ثقۃ،ثبت اور حافظ جیسے معزز ترین خطاب سے نوازا،ان کے درسی امالی میں سے فیض الباری
علی صحیح البخاری، اور العرف الشذی علی جامع الترمذی ہے اول الذکر کو علامہ بدر عالم میرٹھی
نے مرتب کیا۔ چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں بیشمار ایسی خصوصیات ہیں جو دوسرے
محدثین کے یہاں مفقود ہیں اس کے علاوہ ان کی کئی کتابیں حدیث کے کسی خاص جز پر ہے
مثلاً: فصل الخطاب فی مسألۃ أم الکتاب، نیل الفرقدین، کشف الستر،بسط الیدین وغیرہ۔

(نفحۃ العنبر للبنوری ص ۱۳۴ تا ۲۲۲

(۳) مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ:

مشہور محدث، جلیل القدر عالم سنت، نامور محقق علماء میں آپ کا شمار ہے۔ آپ
نے ابوداؤد شریف کی بہت ہی مبسوط اور جاندار عربی شرح "بذل المجہود" کے نام سے لکھی۔
جو ہندستان کے علاوہ بیروت سے بھی ۱۰ار ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ آپ کو مختلف
جگہوں پر تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد دارالعلوم دیوبند بلایا گیا۔ یہاں شیخ الہند کے
نائب کی حیثیت سے بہت دنوں تک خدمت قرآن وسنت انجام دیتے رہے۔ پھر حضرت
گنگوہی نے آپ کو مظاہر علوم کا شیخ الحدیث بناویا۔ اور تا قیام ہنداسی اہم ترین عہدے پر فائز
رہ کر خدمت حدیث انجام دیتے رہے شیخ الحدیث مولانا زکریا اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
آپ کے اہم شاگردوں میں ہیں ۱۹۲۷ھ میں وفات ہوئی۔

(حیات اور کارنامے ص ۱۲۹

(۴) مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانویؒ:

ہندستانی تاریخ کے ممتاز ترین فرد، مشہور ترین مصنف، جن کی چھوٹی بڑی
تصنیف ہزاروں سے متجاوز ہیں ہر فن میں دسترس حاصل تھا۔ یوں تو ان کی درجنوں
کتابوں میں حدیث کے مختلف عنوانات پر سیر حاصل بحث ہے۔ لیکن خدمت حدیث کے
حوالے سے ان کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بھانجے علامہ ظفر احمد عثمانی

سے اپنی نگرانی میں احادیثِ احکام پر ایک ایسی کتاب مرتب کروائی جس جامعیت کی کتاب آج تک اسلامی کتب خانوں سے مفقود تھی۔ اور جو "اعلاء السنن" کے نام سے ۲۰؍۲ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ (تاریخ علم حدیث)

(۵) شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ:

دبستان دیوبند کے کلاہِ افتخار کے گوہر آبدار، ہندوستانی علماء کے سر تاج اور ہزاروں ہزار کے شیخ طریقت بیس سال کی عمر میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد اہل خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ چلے گئے۔ ۱۶ر سال سے زائد آپ نے مسلسل وہاں قیام کیا۔ اور اس دوران حرم نبوی میں درس حدیث جاری رہا۔ اور آپ کی ذات سے باری تعالیٰ دارالعلوم کے فیض کو پوری دنیا میں عام کرتا رہا۔ حضرت تھانوی کے مشورے پر آپ کو دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے لایا گیا۔ اور آپ مسلسل ۳۲ر سال تک درس حدیث میں مشغول رہے۔ چار ہزار سے زائد علماء کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ۱۹۵۷ء کو وفات پائی۔ (مآثر شیخ الاسلام ملخصاً)

(۶) مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ:

آپ نے ابوداؤد شریف کا حاشیہ "التعلیق المجهود" اور ابن ماجہ پر بھی حاشیہ لکھا ہے۔ (مآثر شیخ الاسلام ملخصاً)

(۷) شیخ احمد حسن امروہویؒ:

موصوف کو درس حدیث میں خصوصی امتیاز حاصل تھا۔

(۸) علامہ شبیر احمد عثمانیؒ:

جلیل القدر محدث، صاحب زبان، اسلام کے بے باک ترجمان، دارالعلوم میں استاذ حدیث رہے پھر علامہ انور شاہ کشمیری کی وفات کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ

الحدیث مقرر ہوئے۔ آپ کے گہربار قلم سے صحیح مسلم کی ایک مبسوط شرح اپنی خاص محققانہ انداز میں "فتح الملہم" کے نام سے وجود پذیر ہوئی جو مسلم شریف کی دیگر شرحوں کے مقابلے میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اسی طرح ان کی بخاری کی مفصل اردو شرح "فضل الباری" بھی قابل اہمیت ہے۔

(۹) علامہ یوسف بنوریؒ:

علامہ کشمیری کے مایۂ ناز شاگرد اور ان کے علوم وافکار کے شارح، ڈابھیل میں کئی سالوں تک استاذ حدیث رہے۔ اور انھوں نے ترمذی شریف کی فاضلانہ عربی شرح "معارف السنن" ۷/جلدوں میں لکھی۔

(۱۰) شیخ فخر الدین احمدؒ:

حضرت مدنی کے بعد کافی دنوں تک دارالعلوم کے شیخ الحدیث رہے، جن کے درسی افادات کو مولانا ریاست علی بجنوری نے ایضاح البخاری کے نام سے مرتب کیا۔

(۱۱) مولانا ادریس کاندھلویؒ:

مشہور مفسر، دارالعلوم میں بہت دنوں تک شیخ التفسیر اور استاذ حدیث رہے۔ انھوں نے مشکوٰۃ المصابیح کی جامع عربی شرح "التعلیق الصبیح" لکھی۔

(۱۲) علامہ بدر عالم میرٹھیؒ:

انھوں نے فیض الباری مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ ترجمان السنہ کے نام سے اردو میں حدیث شریف کی عام فہم کتاب لکھی۔

(۱۳) محدث کبیر حبیب الرحمٰن اعظمی(۱)۔ (۱۴) شیخ عبدالجبار اعظمی۔ (۱۵)

---

(۱) ان کی بے شمار محققانہ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں تعلیق علی مسند الحمیدی، تعلیق علی مسند سعید بن منصور، تعلیق علی مصنف عبدالرزاق، تعلیق علی کتاب الزہد والرقاق اہمیت کی حامل ہیں۔

علامہ ابراہیم بلیاوی۔ (۱۶) شیخ الادب مولانا اعزاز علی ۔(۱۷) حضرت مولانا منظور احمد نعمانی(۱) یہ سب ایسے نیر تاباں ہیں؛جو آسمان علوم معارف پر ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔اور جن کے فضل وکمال سے صدیوں ایوان علم لرزتے رہیں گے۔ (تاریخ دارالعلوم)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مجدد الف ثانی کے بعد علم حدیث کے کاموں میں جو نئی ہلچل پیدا ہوئی، اور اس کے بعد ہندوستان کا علم حدیث کی طرف جو رجحان بڑھتا رہا اور اس دوران حدیث شریف کے جو عظیم الشان تصنیفی کارنامے انجام پائے؛اس نے پندرھویں صدی تک پہنچتے ہوئے علم حدیث کے متعلق ہندوستانی علماء اسلام کی خدمات کو اتنا وزنی کردیا کہ اس وقت اگر یہ کہا جائے کہ قرون متأخرہ کے اندر اس باب میں ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی شریک وسہیم نہیں تو اسے قطعاً مبالغہ نہیں کہا جاسکتا۔ اور اب کوئی بھی ملک ان خدمات کے مقابلے میں کوئی ایسا سرمایہ نہیں پیش کرسکتا جسے ہم قابل لحاظ قرار دیں، یہی وہ حقیقت ہے جس نے علامہ رشید رضا مصری کو یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ :علوم حدیث کی طرف ہمارے ہندی علماء کی توجہ نہ ہوتی تو مشرقی علاقوں سے حدیث کا خاتمہ ہوجاتا۔ (مقدمہ مفتاح کنوزالسنۃ ص۹)

(۲) عبدالجبار اعظمی اور مولانا منظور احمد نعمانی کی معارف الحدیث ۸ جلدوں میں حدیث کا اہم کارنامہ ہے۔
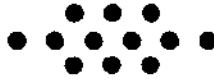
عبد الباری عظیم آبادی، مولانا حسین الہ آبادی اور مولانا عبد القادر سہسرامی وغیرہ ہیں جنھوں نے ملک کے گوشے گوشے میں پہونچ کراس فن کی خدمت کی۔

علامہ ظہیر احسن شوق نیموی اور آثار السنن:

لیکن ان کے شاگردوں میں نابغہ روزگار شخصیت اور مطلع ہند کا ایک روشن ستارہ علامہ شوق نیموی ہی کی ذات گرامی قدر ہے علامہ نیموی نے ابتدائی تعلیم عظیم آباد پٹنہ کے مشہور عالم شمس العلماء محمد سعید حسرت (م ۱۳۰۴ھ) کی خدمت میں حاصل کی پھر لکھنؤ جاکر فقیہ الدہر علامہ عبد الحیؒ سے کسب فیض کیا غالباً انھیں کی صحبت نے علامہ میں فقہ و حدیث کا خاص ملکہ پیدا کیا جو بعد میں ''آثار السنن'' کی شکل میں ظاہر ہوا۔ پھر علامہ نے شاہ فضل الرحمٰن بن اہل اللہ بکری کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام کتب حدیث کی سند عموماً اور مسلسلات کی سند خصوصاً ان سے حاصل کی،ان کے علاوہ علامہ کو شیخ عبد الحق مہاجر مکیؒ سے بھی روایت حدیث کی سند و اجازت تھی۔ مولانا حکیم عبد الحی نے علامہ نیمویؒ کے تذکرے میں لکھا: الشیخ العالم الفقیه ظهیر أحسن أحد العلماء المبرزین فی الفقه و الحدیث (۱)ان کے علاوہ علامہ کشمیریؒ نے تو ان کی شان میں دو طویل قصیدے کہہ ڈالے جس کے ہر مصرع سے عقیدت کی شان ٹپکتی ہے،انھوں نے اپنی جس تالیف کے ذریعے امت مسلمہ کو ممنون احسان کیا وہ آثار السنن ہے،ایسی معرکۃ الآراء کتاب جس میں انھوں نے صحیح و حسن احادیث جمع کی اور جرح و تعدیل،رواۃ اور فنی مباحث سے یہ ثابت کردیا کہ فقہ حنفی کی بنیاد محض قیاس و رائے پر نہیں بلکہ اس کی اساس قرآن و حدیث ہے،جس کے بارے میں حکیم عبد الحیؒ فرماتے ہیں۔ وهو کتاب نادر غریب " (۲)اور علامہ زاہد بن الحسن کوثریؒ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے" تکلم علی کل حدیث منها جرحاً و تعدیلاً علی طریقة المحدثین و اجاد فیما عمل کل الاجازة" (۳) اسی کتاب کے بارے میں نذیر حسین محدث دہلویؒ فرمایا کرتے تھے "یہ محدثانہ نقد و نظر اور

---

(۱) الإعلام بمن فی الهند من الأعلام ۲۰۶/۸ (۲) ایضاً

(۳) مآثر علماء دیوبند فی شرح الأحادیث

مذہب حنفی کی تائید میں ایک بلند پایہ تصنیف اور ہندوستان کی فن حدیث کی تصنیفات میں ایک وقیع اور جدید اضافہ ہے۔ (بحث ونظر شمارہ ۸۔ ۱۴۱۱ھ)

"دیوبند" رشک عراق وشام:

شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد آپ کے نواسے شاہ محمد اسحاق (المتوفی ۱۲۶۲ھ) نے مسند تدریس کو سنبھالا، آپ کی ذات اپنے عہد میں علم حدیث کا سب سے بڑا مرجع و مرکز تھی۔ اکناف عالم کے تشنگان علم حدیث نے ان کے در پر حاضر ہو کر کسب فیض کیا۔ پورے عالم میں اس کی نظیر اس عہد میں شاید ہی مل سکے، ان کے تلامذہ میں مولانا احمد علیؒ محدث سہارنپوری، شیخ محمد تھانویؒ، شاہ فضل الرحمٰنؒ، گنج مرادآبادی قاری عبدالرحمن پانی پتی، سید نذیر حسین محدثؒ بہاری علامہ نواب قطب الدینؒ دہلوی مصنف مظاہر حق۔ وغیرہ شامل ہیں لیکن ان تمام میں شاہ عبدالغنی مجددی (م ۱۲۹۶ء) مہاجر مدنی ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں، سنن ابن ماجہ پر انجاح الحاجہ کے نام سے ان کا حاشیہ ہے۔ شاہ مجددیؒ کے درس حدیث سے ہندوستان اور حرمین شریفین کے علماء کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی اور ہندوستان کی پوری فضا علم حدیث کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے معمور ہو گئی۔

حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے باکمال تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ اس قدر وسیع ہے؛ جس کی تحدید نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان کے سرآمد روزگار تلامذہ میں حجۃ الاسلام سیدنا الامام محمد قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) اور قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۹۰۸ء) کو اللہ نے جو مقام بلند عطا فرمایا وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آیا ہو۔ خدمت حدیث کے حوالے سے حضرت نانوتوی کا عظیم ترین کارنامہ جس کی نظیر ہندوستان سمیت کئی ممالک کی تاریخ سے مفقود ہے اور جو ہندوستان کی علمی تاریخ میں ہمیشہ ممتاز اور سر فہرست رہے گا؛ وہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن و حدیث کی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور اس کی حفاظت و صیانت کے لیے ایسا عظیم الشان مرکز قائم کیا جو آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہے اور جس کے آغوش تربیت نے پل کر اب تک محتاط اندازے کیمطابق پندرہ ہزار سے زائد اشخاص علوم نبوی کے لباس آراستہ ہو کر دنیا کے ہر ہر گوشے میں علمی، دینی

اصلاحی اور تدریسی خدمات دیتے رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اسی آب و تاب کے ساتھ جاری ہے ساتھ ہی دارالعلوم کے نہج پر چلنے والے سیکڑوں مدارس میں فیض یافتگان دارالعلوم کے درس حدیث کی بزم آرائی بھی روز افزوں ہے۔ اور انشاء اللہ تا صبح قیامت دارالعلوم کے دم سے خدمت حدیث کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔(۱)

حضرت گنگوہیؒ کا قیام دارالعلوم اور اس کی ترقی میں حضرت نانوتوی کے شریک کار ہونے کے علاوہ دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے گنگوہ ہی میں درس حدیث کی بزم سجائی، جو پودا لگایا گیا تھا انھوں نے اسے اپنی سعی پیہم اور خلوص وللّٰہیت سے تناور درخت بنادیا، آپ کے درس سے تقریباً تین سو سے زائد علماء کبار اور محدثین عظام پیدا ہوئے حضرت گنگوہی کی تحریری یادگار بخاری اور ترمذی کی وہ تقریریں ہیں جنھیں مولانا یحییٰ کاندھلوی نے عربی زبان میں قلمبند کیا اور مولانا شیخ زکریا نے اسے اپنے مقدمے اور حاشیے کے ساتھ لامع الدراری اور الکوکب الدری کے نام سے شائع کیا۔ اور حضرت نانوتویؒ کی قلمی یادگار بخاری شریف کے اخیر کے پانچ پاروں پر ان کی تعلیق ہے۔(۲)

دارالعلوم کے قیام کے تقریباً چھ مہینے بعد اس کے نہج پر سہارنپور میں مظاہر علوم کا قیام عمل آیا؛ جس میں شیخ احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا سعادت علی، خلیل احمد محدث انبیٹھوی اور شیخ الحدیث مولانا زکریا اور ان کے والد مولانا یحییٰ کاندھلوی جیسے معزز اکابر اپنے اپنے زمانے میں درس حدیث دیتے رہے۔ اس درسگاہ سے بھی ہزاروں کی تعداد میں علماء اور طالبان حدیث پیدا ہوئے۔(۳)

تصنیفی میدان میں بھی دارالعلوم و مظاہر علوم کے فرزندوں نے فن حدیث اور شرح حدیث میں بے شمار ایسی کتابیں تصنیف کی ہیں جو بلاشبہ قرون ماضیہ کے محدثین کی کتابوں سے آنکھیں ملا سکتی ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض تو ایسی نادر روزگار تصنیف ہے جس کے مقابلے میں مشکل ہی سے گذشتہ زمانے کے محدثین کی کتابیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کی خدمات کی جامع تفصیل (جس کے لیے کتابوں کے ایک سلسلے کی

---

(۱) تاریخ دارالعلوم ملخصاً (۲) رشید احمد گنگوہی حیات اور کارنامے ص ۳۰۶۔

(۳) تاریخ مظاہر علوم ملخصاً

ضرورت ہے) ان مختصر سطور میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کہ ان کی خدمات کا باب اتنا وسیع ہے کہ ہندوستان سے گزر کر اکثر مسلم ممالک میں علم حدیث اور قرآنی تعلیمات کی جو کچھ بھی روح نظر آرہی ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ انھی دواداروں کے فیض یافتوں کی وجہ سے ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے وہ فرزند باکمال جنھوں نے خاص طور سے درس حدیث اور اس موضوع پر تصنیف و تالیف میں زبردست شہرت پائی یہ حضرات ہیں۔

(۱) شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ:

دارالعلوم کے فرزند اول، سراپا علم و عمل اور صدیوں کے ملیے لائق رشک و تقلید۔ انھوں نے دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتوی کی خدمت میں رہ کر بطور خاص علم حدیث کی تحصیل فرمائی۔ اس کے بعد دارالعلوم کے استاذ اور پھر اس کے صدر المدرسین کے عہدے پر فائز ہوئے، آپ کے زمانہ صدرات میں ۸۶۰ طلبہ نے حدیث نبوی سے فراغت پائی جن میں نابغین عصر بھی شامل تھے، ان کے قلمی آثار میں مفید رسالہ "التراجم للبخاری" جو بخاری کے شروع میں ہے اور التقریر للترمذی ہے۔

(۲) امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ:

شیخ الہند کے مایۂ ناز شاگرد اور ان کے حقیقی جانشین۔ حدیث نبوی سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے استاذ پھر شیخ الحدیث مقرر کیے گئے اور بیس سال سے زیادہ عرصے تک مسلسل صحیحین بخاری اور مسلم کا درس دیتے رہے، ان کے زمانے میں درس حدیث کے طرز کے اندر ایک انقلاب برپا ہوگیا، بالآخر انھی کا طریقۂ درس اکثر مدارس میں رواج پاگیا۔ ۱۳۵۲ھ میں وفات ہوئی۔ علامہ بلاشبہ خدا کی نشانیوں میں سے اہم ترین نشانی تھے۔ خدا نے بے پناہ ذہانت سے نوازا تھا، علوم عقلیہ و نقلیہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، ان کی انھیں صلاحیتوں سے متاثر ہوکر مشہور فاضل سید سلیمان ندویؒ نے کہا: کہ علامہ کی مثال اس سمندر جیسی ہے؛ جس کے اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں۔ شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنیؒ نے ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا "کہ میں نے حجاز، عراق، شام اور ہند کہیں بھی علامہؒ کی طرح علوم عقلیہ

تجزیہ

دوسری اور آخری قسط

قادیانی نبی کی آسمانی شادی

مرزا غلام احمد قادیانی کی آسمانی شادی کی دلچسپ مگر عبرت انگیز کہانی

از قلم: مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی (مانچسٹر)

مرزا غلام احمد کو اس بات کا توقع تھا کہ وہ محمدی بیگم کے شوہر کے انتقال کر جانے کے بعد پھر سے اپنے رشتہ کی بات چلاتا اور اسے لالچ اور دھمکیوں کے ذریعہ اپنی منکوحہ بناتا مگر اسے یہ حق ہرگز نہ تھا کہ وہ ایک شخص کی منکوحہ کے بارے میں مسلسل یہ دعویٰ کرے کہ یہ اسی کی بیوی ہے اور اس کا شوہر مر جائے گا یہ واپس میرے پاس آجائے گی۔ یہ انداز گفتگو اور اشتہارات اس بات کے شاہد ہیں کہ مرزا غلام احمد کو شریف آدمی کہنا بھی شرافت کے خلاف ہے۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ قادیانیوں کے ہاں شرافت اسی بداخلاقی اور بے شرمی کا نام ہو اس لیے کہ مرزا غلام احمد اس شرمناک کرتوت کے باوجود ان کے ہاں سب سے بڑے شریف سمجھے جاتے ہیں۔

ان دنوں محمد بخش جعفر زٹلی نے اپنے رسالہ میں اعلان شائع کیا کہ وہ عنقریب نصرت جہاں بیگم (مرزا غلام احمد کی بیوی) سے بیاہ رچانے والا ہے اس نے اپنے اعلان کی تائید میں چند خواب بھی سنائے اور بشارتیں بھی نقل کیں مرزا غلام احمد نے جب یہ اعلان پڑھا تو مارے غصہ کے سرخ ہو گیا اور اس نے لکھا:

میری بیوی کی نسبت شیخ محمد حسین کے دوست جعفر زٹلی نے محض شرارت سے گندی خوابیں بنا کر سراسر بے حیائی کی راہ سے شائع کیں اور میری دشمنی سے اس جگہ وہ لحاظ وادب بھی نہ رہا جو اہل بیت رسول کی پاک دامن خواتین سے رکھنا چاہیے مولوی کہلانا اور یہ بے حیائی کی حرکات افسوس ہزار افسوس۔ (تحفہ گولڑویہ ص ۵۶ حاشیہ۔ ر۔خ۔ ج ۱۷ ص ۱۹۹)

اگر جعفر زٹلی اس لیے بے حیا ہے کہ وہ مرزا غلام احمد کی بیوی کے بارے میں خواب سناتا ہے اور کسی وقت اس کے نکاح میں آنے کی خبر دیتا ہے تو مرزا غلام احمد اس سے زیادہ بے حیا ہے کہ وہ مدعی نبوت ہو کر سلطان محمد کی بیوی محترمہ محمدی بیگم کے بارے میں الہامات سناتا ہے اور کسی دوسرے کی بیوی کو اپنے نکاح میں لانے کے بارے میں اشتہار شائع کرتا ہے۔ اگر جعفر زٹلی اس وجہ سے لائق نفرت ہیں تو مرزا غلام احمد اس سے بدرجہ اولیٰ لائق نفرت ٹھہرا۔ ہے کوئی قادیانی جو انصاف کا دامن تھامے اور مرزا غلام احمد کو بر سر عام بے حیا مانے۔

مرزا غلام احمد نے جب خدا کے نام سے احمد بیگ کو اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کے لیے کہا تو اسے یقین تھا کہ احمد بیگ اپنی مجبوری کے پیش نظر اس کی بات مان لے گا لیکن احمد بیگ نے غیرت کا مظاہرہ کیا۔ مرزا غلام احمد نے دیگر ذرائع سے لالچ اور دھمکیاں دیں وہ بھی بے اثر ثابت ہوئیں اب جب کہ لڑکی کا نکاح کسی اور جگہ ہو چکا اور وہ لڑکی کسی کی بیوی بن چکی پھر بھی بار بار یہ بات دہرانا کہ اس کا شوہر مر جائے گا ہمیں کسی اور بات کی خبر دیتا ہے مرزا غلام احمد کے خیال میں محمدی بیگم کس طرح بیوہ ہو سکتی تھی اس وقت ہم اس پر بحث نہیں کر رہے ہم صرف مرزا غلام احمد کی غیر شریفانہ ذہنیت کی نشاندہی کر رہے ہیں تاکہ قادیانی عوام اس سے عبرت حاصل کریں اور وہ جان پائیں کہ مرزا غلام احمد بد اخلاقی کی کس سطح تک گر چکا تھا۔

مرزا غلام احمد نے محمدی بیگم کے ساتھ نکاح کو نہ صرف خدائی پیغام بتایا بلکہ اسے اپنے صدق و کذب کا اہم عنوان بھی بتادیا اپنے اس عنوان صدق کی لاج رکھنے اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے کہ یہ خدائی معاملہ ہے مرزا غلام احمد نے اوچھی حرکتوں کے اختیار تک سے اجتناب نہ کیا۔ ایک ظالم اور لالچی شخص کوئی چیز حاصل کرنے کے لیے جتنا کچھ کر سکتا ہے مرزا غلام احمد نے وہ سب راہ عمل اپنائیں تاکہ وہ کسی طرح یہ کہنے میں کامیاب ہو جائے کہ یہ خدائی معاملہ ہے اور وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ مرزا غلام نے اس رشتہ کو جو اہمیت دی ہے اسے مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیر احمد نے اس طرح بیان

کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ الہامات (جن کا تعلق محمدی بیگم سے ہے) پیشگوئی کا بنیادی پتھر ہیں۔ (سیرت المہدی ج ۱ ص ۱۹۵)

آیئے دیکھیں کہ یہ بنیادی پتھر کس طرح ٹوٹتا ہے۔ اس کی بنیادیں کس طرح ہلتی ہیں اور مرزا غلام احمد کس طرح اپنی بات میں جھوٹا نظر آتا ہے۔ مرزا غلام احمد نے اپنے صدق وکذب کا معیار محمدی بیگم کے ساتھ نکاح رکھا اور کھلے طور پر اعلان کیا کہ اگر یہ پیش گوئی پوری ہو جائے تو وہ اپنے دعویٰ نبوت میں سچا ہے اور اگر محمدی بیگم اس کے نکاح میں نہ آئے تو وہ جھوٹا ہے اور اس کے گلے اور پاؤں میں رسی ڈال کر اسے ذلیل کیا جائے۔ مرزا غلام احمد لکھتا ہے۔

میں بار بار کہتا ہوں کہ نفس پیش گوئی داماد احمد بیگ کی تقدیر مبرم ہے اس کا انتظار کرو اور اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیش گوئی پوری نہیں ہوگی اور میری موت آجائے گی اور اگر میں سچا ہوں تو خدا تعالیٰ ضرور اس کو بھی ایسا ہی پورا کر دے گا۔ (انجام آتھم ص ۳۱۔ رخ۔ ج ۱۱ ص ۳۱)

مرزا غلام احمد کے یہ الفاظ بھی سامنے رکھیں:

ان هذا حق فسوف ترى واني اجعل هذا النبأ الصدق الكذبى و ماقلت الابعد ما انبئت من ربى (ایضا۔ رخ۔ ج ۱۱ ص ۲۲۳)

یہ خدائے بزرگ کی طرف سے (تقدیر مبرم) حق ہے عنقریب اس کا وقت آئے گا تم جلد ہی دیکھ لوگے اور میں اس کو اپنے سچ اور جھوٹ کا معیار بناتا ہوں اور میں نے جو کہا ہے یہ خدا سے خبر پا کر کہا ہے۔ (ایضا ۲۲۳)

مرزا غلام احمد نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کیا ہے کہ احمد بیگ کے داماد یعنی محمدی بیگم کا شوہر ڈھائی سال کے اندر مر جائے گا اور یہ تقدیر قطعی ہے یعنی ایسا ہو کر رہے گا اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے اگر محمدی بیگم میرے نکاح میں آگئی تو میں سچا ہوں اور اگر میری موت آگئی اور محمدی بیگم میری بیوی نہ بنی تو میں جھوٹا ہوں گا۔ مرزا غلام احمد نے تقدیر مبرم کی جو تشریح کی ہے پہلے اسے سامنے رکھئے:

نفس پیشگوئی یعنی اس عورت کا اس عاجز کے نکاح میں آنا یہ تقدیر مبرم ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتی کیوں کہ اس کے لیے الہام الٰہی میں یہ فقرہ موجود ہے لاتبدیل لکلمات اللہ یعنی میری یہ بات ہرگز نہیں ٹلے گی پس اگر ٹل جائے تو خدا کا کلام باطل ہوتا ہے۔ (مجموعہ اشتہارات ج ۲ ص ۴۳)

مرزا غلام احمد نے احمد بیگ کو جو خط بھیجا اس کے آخر میں بھی یہ بات لکھی تھی:

اگر میعاد گزر جائے اور سچائی ظاہر نہ ہو تو میرے گلے میں رسی اور پاؤں میں زنجیر ڈالنا اور مجھے ایسی سزا دینا کہ تمام دنیا میں کسی کو نہ دی گئی ہو۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۵۷۳۔ ر۔خ۔ ج ۵ ص ۵۷۳)

مرزا غلام احمد نے اس پیش گوئی کے پورا ہونے کی صورت میں اپنے مخالفین کے لیے کیا منصوبہ طے کیا تھا اسے دیکھیے:

ان بے وقوفوں کو کوئی بھاگنے کی جگہ نہ رہے گی اور نہایت صفائی سے ناک کٹ جائے گی اور ذلت کے سیاہ داغ ان کے منحوس چہروں کو بندروں اور سوروں کی طرح کردیں گے۔ (انجام آتھم ص ۵۳۔ ر۔خ۔ ج ۱۱ ص ۲۳۷)

مرزا غلام احمد نے آخر میں یہ دعا کی ہے:

اے قادر و علیم! احمد بیگ کی دختر کلاں کا آخر اس عاجز کے نکاح میں آنا یہ پیش گوئیاں تیری طرف سے ہیں تو ان کو ایسے طور پر ظاہر فرما جو خلق اللہ پر حجت ہوں اور کور باطن حاسدوں کا منھ بند ہو جائے اور اگر یہ تیری طرف سے نہیں ہیں تو مجھے نامرادی اور ذلت کے ساتھ ہلاک کر اگر تیری نظروں میں مردود اور ملعون اور دجال ہی ہوں جیسا کہ مخالفوں نے سمجھا ہے۔ (مجموعہ اشتہارات ج ۲ ص ۱۱۶)

مرزا غلام احمد کی مذکورہ تحریرات سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ:

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی کا نکاح محمدی بیگم کے ساتھ خدا نے آسمان پر پڑھا دیا۔ اس لیے محمدی بیگم اب کسی کی منکوحہ نہیں بن سکتی۔ (۲) اگر وہ کسی کی منکوحہ بن گئی تو خدا تعالیٰ اس کے شوہر کو ڈھائی سال کے اندر مار ڈالے گا اور محمدی بیگم بیوہ ہو کر آخرکار مرزا

غلام احمد کے نکاح میں آجائے گی۔ (۳) یہ بات اتنی قطعی ہے کہ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں یہ خدا کی باتیں ہیں جو ٹلا نہیں کرتیں اور اگر خدا کی بات ٹل جائے تو اس کا کلام باطل ہو جاتا ہے۔ (۴) مرزا غلام احمد کا نکاح محمدی بیگم سے ہو جاتا ہے تو یہ اس کے مامور من اللہ ہونے کا نشان ہوگا اور وہ اپنے دعویٰ میں سچا سمجھا جائے گا اور اگر محترمہ مرزا غلام احمد کی بیوی نہ بن سکی تو مرزا غلام احمد بقلم خود کذاب ملعون دجال ذلیل کور باطن ہوگا۔ اور اس کا چہرہ سوروں اور بندروں کی طرح سمجھا جائے گا اس کے پاؤں اور گلے میں رسی ڈال کر اسے نامرادی اور ذلت کے ساتھ کھینچا جائے گا۔ اب ہم مرزا طاہر اور تمام قادیانیوں سے ایک سادہ سا سوال کرنا چاہتے ہیں کہ:

(۱) محمدی بیگم کا نکاح مرزا غلام احمد کے ساتھ کب ہوا تھا؟

(۲) محمدی بیگم کے شوہر نکاح کے ڈھائی سال کے اندر فوت ہو گئے تھے؟

(۳) مرزا غلام احمد کے خدا نے سچ کہا تھا یا اس کا خدا بھی اس کی طرح جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا؟

(۴) مرزا غلام احمد بقلم خود کذاب دجال ملعون ذلیل اور کور باطن ہوا یا نہیں؟

ہمیں یقین ہے کہ مرزا طاہر کبھی بھی اس بات پر مباہلہ کے لیے تیار نہ ہوگا کہ مرزا غلام احمد کا نکاح محمدی بیگم سے ہوا تھا؟ اس لیے کہ یہ حقیقت ہے کہ مرزا غلام احمد محترمہ محمدی بیگم کی طلب میں دن رات تڑپتا رہا اور اسے پانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتا رہا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی ہر تدبیر کو الٹ کر دیا اور وہ اپنے مقصد میں بری طرح ذلیل و رسوا ہوا اور پھر ذلت ناک موت سے دوچار ہوا۔

قادیانی علماء کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے خدا نے محمدی بیگم کا نکاح آسمان پر پڑھایا تھا مگر جب محمدی بیگم اور اس کے شوہر نے توبہ کر لی تو اللہ نے یہ نکاح فسخ کر دیا اب وہ مرزا غلام احمد کی بیوی نہ رہی اس لیے یہ پیش گوئی کیسے پوری ہو سکتی ہے؟

الجواب: قادیانی علماء محمدی بیگم والی پیش گوئی کو جس توبہ کے نام سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں سب سے پہلے اس کی حقیقت معلوم کریں۔ توبہ کی اس شرط کا ذکر سب

سے پہلے مرزا غلام احمد کرتا ہے۔

اس نکاح کے ظہور کے لیے جو آسمان پر پڑھا گیا خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک شرط تھی جو اسی وقت شائع کی گئی تھی اور وہ یہ کہ (ایتھا المرئة توبی توبی فان البلاء عقبك) پس ان لوگوں نے شرط کو پورا کردیا تو نکاح فسخ ہو گیا یا تاخیر میں پڑ گیا۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۱۳۲۔ ج۔ ۲۲۔ ص ۵۷۰)

مرزا غلام احمد نے اپنے اس بیان میں جس شرط کا ذکر کیا ہے وہ شرط اس سے پہلے کہیں بھی نظر نہیں آتی تقریباً اٹھارہ انیس سال سے محمدی بیگم کا قصہ چلا آرہا ہے اور یہ شرط ۱۹۰۷ء میں سامنے کردی گئی۔

اگر یہ شرط بفرض محال موجود تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شرط کے پورا ہو جانے کی اطلاع مرزا غلام احمد کو کیوں نہ دی؟۔ اور وہ بھی ایک دو دن نہیں سالہا سال تک خدا نے اسے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے توبہ کرلی ہے اس لیے اب یہ عورت تمھیں نہیں مل سکے گی بلکہ اس کے برعکس اسے یہی وحی آتی رہی کہ خدا نے اس کا نکاح باقی رکھا ہے وہ تمھارے پاس آکر رہے گی۔ مرزا صاحب کا خدا نے مرزا صاحب کے ساتھ اتنا سنگین مذاق کیوں کر رہا تھا۔؟

غلام احمد ایک اشتہار میں لکھتا ہے:

توبی توبی فان البلاء علی عقبك میں صاف توبہ کی شرط تھی اور یہ الہام احمد بیگ اور اس کے داماد دونوں کے لیے تھا کیوں کہ عقب لڑکی اور لڑکی کی اولاد کو کہتے ہیں اور یہ احمد بیگ کی بیوی کی والدہ (محمدی بیگم کی نانی) کو خطاب تھا تیری لڑکی اور لڑکی کی لڑکی پر خاوند مرنے کی بلا ہے اگر توبہ کروگی تو تاخیر مدت کی جائے گی۔ (اشتہار ذب المفترین ص ۱۱)

مرزا غلام احمد کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ توبہ محمدی بیگم کی نانی نے کی تھی اس لیے یہ نکاح منسوخ ہو گیا۔ مرزا طاہر ہمیں بتائے کہ کسی کی نانی اگر کسی گناہ سے توبہ کرے تو کیا اس کی نواسی کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے؟ مرزا غلام احمد کی شریعت ہی نرالی ہے کہ ان کے ہاں نانی کی توبہ سے نواسی کا نکاح جاتا رہتا ہے۔ قادیانی نانیوں اور نواسیوں کو یہ مسئلہ یاد رکھنا چاہیے اور نواسی کا گھر برباد کرتا ہو تو اپنے کسی گناہ سے توبہ کرلینی چاہیے۔ جب خدا

کا پڑھایا ہوا نکاح نانی کی توبہ سے ٹوٹ سکتا ہے تو ایک عام قادیانی مولوی کا پڑھایا ہوا نکاح کیسے ٹوٹ نہیں سکتا۔

رہی یہ بات کہ محمدی بیگم کی نانی جو بقول مرزا غلام احمد صاحب اس کے نکاح میں بڑی رکاوٹ تھی اس نے توبہ کی یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ نہ اس نے کوئی توبہ کی نہ وہ مرزا غلام احمد پر ایمان لائی نہ اپنی نواسی کو مرزا غلام احمد کے نکاح میں دینے کے لیے راضی ہوئی۔ رہا محمدی بیگم اور ان کے شوہر کا توبہ کرنا تو یہ بھی قادیانیوں کا جھوٹ ہے نہ سلطان محمد نے مرزا غلام احمد کو تسلیم کیا نہ محمدی بیگم نے اسے مانا۔ یہ دونوں میاں بیوی مرزا غلام احمد کے دعویٰ کے منکر تھے۔ اور اس کے آسمانی نکاح کے جھوٹ ہونے کے کھلے گواہ تھے۔ جب قادیانیوں نے ان کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا کہ وہ مرزا صاحب کی پیش گوئی سے ڈر کر ان کے حلقہ عقیدت میں داخل ہو چکے ہیں تو انہوں نے اعلان کیا کہ یہ جھوٹ ہے۔ موصوف نے ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو یہ تحریر لکھی:

جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جو میری موت کی پیشگوئی کی تھی میں نے اس میں اس کی تصدیق کبھی نہیں کی نہ میں اس پیشگوئی سے کبھی ڈرا میں ہمیشہ سے اور اب بھی اپنے بزرگان اسلام کا پیرو رہا ہوں۔

موصوف کی یہ تحریر اخبار اہلحدیث امرتسر کے ۱۴ر مارچ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اخبار کے مدیر نے اس پر چیلنج بھی شائع کیا کہ اگر کوئی شخص اس بیان کو غلط ثابت کر دے تو اسے انعام بھی دیا جائے گا۔

محترمہ محمدی بیگم کے شوہر سلطان محمد کا یہ خط بھی دیکھئے جو انہوں نے سید محمد شریف گھڑیالوی مرحوم کے نام لکھا تھا جسے اخبار اہل حدیث امرتسر نے اپنی ۱۴ر نومبر ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سلطان محمد صاحب اسلام پر پوری طرح ثابت قدم رہے ہیں اور وہ مرزا غلام احمد کو جھوٹا اور قادیانیوں کو برا سمجھتے تھے ان کا خط ملاحظہ کیجئے:

مکرم جناب شاہ صاحب۔ السلام علیکم۔ میں تادم تحریر تندرست اور بفضل خدا

زندہ ہوں میں خدا کے فضل سے ملازمت کے وقت بھی تندرست رہا ہوں میں اس وقت بعہدہ رسالداری پنشن پر ہوں گورنمنٹ کی طرف سے مجھے پانچ مربعہ اراضی عطا ہوئی ہے میری جدی زمین بھی قصبہ پٹی میں میرے حصہ میں قریباً ۱۰۰ بیگھ آئی ہے اور ضلع شیخوپورہ میں بھی میری اراضی قریباً تین مربعہ اراضی کے لیے ہے...... میں خدا کے فضل سے اہل سنت والجماعت ہوں میں احمدی مذہب کو برا سمجھتا ہوں میں اس کا پیرو نہیں ہوں اس کا دین جھوٹا سمجھتا ہوں۔ والسلام

تابعدار سلطان محمد بیگ پنشنر از پٹی ضلع لاہور

آپ ہی سوچیں کہ اگر سلطان محمد مرزا غلام احمد کی پیش گوئی سے ڈر گیا ہوتا اور اس نے توبہ کرلی ہوتی تو اس کا نتیجہ محمدی بیگم کی طلاق کی صورت میں کیا نہ نکلتا؟۔ دنیا گواہ ہے کہ محمدی بیگم آخر تک سلطان محمد کی اہلیہ محترمہ رہیں اور وہ کبھی مرزا غلام احمد کے نکاح میں نہ آئیں۔

کیا یہ بات کسی لطیفہ سے کم ہے کہ اللہ نے محمدی بیگم کا آسمان پر نکاح پڑھایا۔ محمدی بیگم کا باپ اسے مرزا غلام احمد کے بجائے سلطان محمد کے حوالہ کررہا ہے۔ فضل احمد اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے۔ مرزا غلام احمد اپنی بیویوں کو فارغ کررہا ہے اور اپنے بیٹوں کو وراثت سے محروم کرتا ہے۔ مگر محمدی بیگم کی نانی توبہ کررہی ہے اور اللہ میاں فوراً اس نکاح کو فسخ کردیتے ہیں۔ عجیب کہانی ہے۔ کیا قادیانیوں میں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں جو اس گتھی کو سلجھا سکے۔

پھر مذکورہ عبارت کے یہ الفاظ بھی قابل غور ہیں کہ ان لوگوں نے توبہ کی۔ شرط میں نانی کا ذکر کرتا تھا یہ ان لوگوں کا ذکر کہاں سے آگیا۔ یعنی نانی سے کہا گیا تھا کہ توبہ کر۔ اور توبہ کس نے کی؟ ان لوگوں نے۔ عجب تماشہ ہے

پھر یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اگر نکاح فسخ ہوگیا تھا تو پھر لفظ۔ یا۔ کیا کی ضرورت باقی رہ گئی تھی۔ اور اگر نکاح تاخیر میں پڑگیا تھا تو یہ فسخ کیسے ہوگیا۔ اگر فسخ ہوگا تو خدا نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ اب تمہیں تڑپنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم خود ہی اسے فارغ کرچکے

م

مدا نے اس غریب کو آخر تک اتنا کیوں تنگ کیا۔ خدا تعالیٰ تو سب جانتے تھے۔ اس نے
شہ کس لیے دکھایا اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے کہ:
یہ پیش گوئی کسی خبیث مفتری کا کاروبار نہیں۔

(ضمیمہ انجام آتھم ص ۵۴ ر۔ خ۔ ج ۱۱ ص ۳۳۸)

یہ جملہ اس صورت میں درست ہے جب یہ پیشگوئی پوری ہو جاتی اور محمدی بیگم
غلام احمد کے حبالۂ عقد میں آجاتی۔ لیکن وہ نہ آئی اور قادیانیوں کو تسلیم کرنا کہ مرزا
احمد کی یہ پیشگوئی پوری نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کا خدا تو چاہتا تھا کہ اس کا آخری سفر
ت کا سفر نہ ہو۔ (مجموعہ اشتہارات ج ۳ ص ۳۹۳)

مگر افسوس کہ مرزا صاحب کا آخری سفر حسرت کا سفر ہوا اور وہ محمدی بیگم کو اپنی
ں نہ بنا سکا اور اسی حسرت میں قادیان کے گڑھے میں دبا دیے گئے۔ مگر مرزا بشیر احمد کی
شرمی کی انتہا ہے کہ وہ اب بھی اس پیشگوئی کا پورا ہونا بتلاتا ہے۔ اس نے لکھا: پیشگوئی کا
صہ بھی کمال صفائی سے پورا ہوا۔

(سلسلہ احمدیہ ص ۷۴ مطبوعہ قادیان ۱۹۳۹ء)

مرزا بشیر احمد اگر مرزا غلام احمد کے قریبی ساتھی اور لاہوری قادیانیوں کے
راہ محمد علی لاہوری کا اعتراف دیکھ لیتے تو انھیں اتنا بڑا جھوٹ بولتے کچھ تو حیا
تی۔ محمد علی لکھتا ہے:

یہ سچ ہے کہ مرزا صاحب نے کہا تھا نکاح ہوگا اور یہ بھی سچ ہے کہ نکاح نہیں
اب ایک بات کو لے کر سب باتوں کو چھوڑ دینا ٹھیک نہیں کسی امر کا مجموعی طور پر
کرنا چاہیے جب تک سب کو نہ لیا جائے ہم نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے صرف ایک پیش گوئی
لر بیٹھ جانا اور باقی کو چھوڑ دینا یہ طریق انصاف اور راہ صواب نہیں ہے۔

(لاہوری جماعت کا اخبار پیغام صلح ۱۶ جنوری ۱۹۲۱ء)

مسٹر محمد علی نے تسلیم کیا ہے کہ مرزا غلام احمد کی یہ پیش گوئی غلط نکلی۔ رہی یہ
کہ مرزا غلام احمد کی دوسری پیش گوئیاں پوری ہوئیں ہم انشاء اللہ آگے چل کر

بتائیں گے کہ مرزا غلام احمد کی اہم پیش گوئیاں کس قدر غلط ثابت ہوئیں ہیں اور اسے کس طرح رسوائی ہوتی رہی ہے۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب مرحوم نے مسٹر محمد علی کے مذکورہ بیان پر جو جاندار تبصرہ کیا ہے قادیانی علماء اس کے جواب سے آج تک عاجز ہیں آپ بھی دیکھئے۔

قادیانی معذرت یہ ہے کہ بعض پیش گوئیاں پوری ہو جانے کی صورت میں بعض پیش گوئیاں پوری نہ ہونے میں چنداں مضائقہ نہیں مگر قابل لحاظ امر یہ ہے کہ سب پیشگوئیاں اپنی قوت اہمیت اور صراحت میں یکساں نہیں ہوتیں یہ شادی کی پیش گوئی بہر صورت پوری ہو جاتی کہ اس کی تکمیل آسمان پر اور تشہیر زمین پر بخوبی ہو چکی تھی اور خود مرزا غلام احمد صاحب نے اس کو اپنے صدق وکذب کا معیار قرار دیا تھا مزید بر آں اس کی دھن میں گھر برباد ہوا قدیم بیوی کو طلاق ملی جوان لڑکے عاق ہوئے گھر میں کنبے میں نفاق پڑا علالت میں حالت مرگ تک پہنچی تو بھی پیش گوئی دل سے جدا نہ ہو سکی لیکن وائے قسمت پوری ہونی تھی نہ ہوئی ۔

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد تو آتا ہے
وہ ہر ایک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(قادیانی مذہب ص ۴۷۸)

مرزا غلام احمد کی موت تک کوشش رہی کہ کسی طرح بھی محمدی بیگم کا شوہر مرے اور وہ اسے نکاح میں لا سکے مگر یہ حسرت دل میں ہی رہ گئی اور موت کے طاقت ور ہاتھ نے ۲۶ رمئی ۱۹۰۸ء کو مرزا غلام احمد کی شہ رگ کاٹ دی اس کے اپنے خسر میر ناصر کے بقول وہ وبائی ہیضہ میں مرگیا (حیات ناصر ص ۱۴) جب کہ محترمہ محمدی بیگم اور ان کے شوہر نامدار خیر و عافیت اور صحت و سلامت کے ساتھ رہے۔ محمدی بیگم کا نکاح ۷راپریل ۱۸۹۲ء کو ہوا تھا مرزا غلام احمد نے پیش گوئی کی تھی محمدی بیگم کے شوہر نکاح والے دن سے ڈھائی سال کے اندر مر جائے گا اس حساب سے سلطان محمد کی زندگی زیادہ سے زیادہ ۶ راکتوبر ۱۸۹۴ء تک تھی مگر سلطان محمد ۱۹۱۴ء کی جنگ میں بھی شریک ہوئے

تھے انہوں نے مرزا غلام احمد کی موت کے تقریباً ۵۰ سال بعد وفات پائی۔ جب کہ محمدی بیگم نے ۱۹ر نومبر ۱۹۶۶ء میں وفات پائی۔

اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا غلام احمد نے ایک کم سن بچی (محمدی بیگم) سے بیاہ رچانے کے لیے خدا پر افتراء کیا اور گھر میں بیٹھے بیٹھے پیش گوئیاں بناتا رہا۔ اور اسے پورا کرنے کے لیے طرح طرح کے مکر اور فریب کے جال بنتا رہا۔ مگر افسوس کہ وہ اپنے ہی جال میں پھنستا چلا گیا۔ اگر یہ پیش گوئیاں خدا کی طرف سے ہوتیں تو ضرور اس کا اثر ہوتا اور محمدی بیگم آخر کار اس کے نکاح میں آتی۔ اب جو لوگ گھر بیٹھے اس قسم کی پیش گوئیاں کرتے ہیں انھیں کیا سمجھنا چاہیے۔ اس باب میں ہم کچھ نہیں کہتے مرزا غلام احمد کی اپنی ہی ایک تحریر پیش کرتے ہیں تاکہ ہر قادیانی اپنے نبی کو اس کی اپنی تحریر میں بآسانی دیکھ سکے۔

مرزا غلام احمد کا فیصلہ دیکھئے:

ہم ایسے مرشد کو اور ساتھ ہی ایسے مرید کو کتوں سے بدتر نہایت ناپاک زندگی والا خیال کرتے ہیں کہ جو اپنے گھر سے پیش گوئیاں بنا کر پھر اپنے ہاتھ سے۔ اپنے مکر سے۔ اپنے فریب سے ان کے پورے ہونے کے لیے کوشش کرے اور کراوے۔

(سراج منیر ص ۲۳۔ ر۔ خ۔ ج ۱۲۔ ص ۲۷)

اب اس تحریر کی روشنی میں اگر کوئی شخص مرزا غلام احمد اور اس کے مریدوں کو ایسا ہی سمجھے تو اس پر قادیانیوں کو ناراض نہ ہونا چاہیے۔ واقعات خود اس کے اپنے تیار کردہ ہیں اور فیصلہ بھی اس کا اپنا ہے۔ ہم نے تو صرف اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ قادیانیوں کے لیے مقام غور ہے کہ وہ جس شخص کو مامور من اللہ سمجھتے ہیں اور آنکھ بند کر کے اس پر ایمان لے آئے ہیں کیا اسے ایک شریف انسان بھی کہا جا سکتا ہے۔ آپ ہی سوچیں کہ جو شخص نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اخلاقی طور پر اتنا گر چکا ہو اسے مامور من اللہ سمجھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

فاعتبروا یا اولی الابصار

• • •

اسلام، عورت اور مغربیت

از: محمد فرقان قاسمی - علیگ

طلاق کے تین طریقے:

جہاں تک خاوند سے علاحدگی یا طلاق کا تعلق ہے جس کے ذریعہ عورت شوہر کے قید سے آزاد ہو کر اپنی تمام ازدواجی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کرلیتی ہے اس کے حصول کے تین طریقے ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۱- نکاح کے وقت عورت اپنے ہونے والے خاوند سے طلاق کا حق حاصل کرلے اسلامی قانون کی رو سے اگر مرد چاہے تو اس طرح سے وہ طلاق کا اپنا حق اپنی بیوی کو دے سکتا ہے۔ مگر عملاً بہت کم عورتیں اپنے اس حق کا استعمال کرتی ہیں۔ بہر حال اسلامی قانون میں ان کا یہ حق موجود ہے وہ جب چاہیں اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

۲- عورت عدالت میں اس بناء پر بھی اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہے کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی گذارنا نہیں چاہتی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی

فقہ اسلامی کا ایک جز ہے۔ جب عورت خود طلاق کا مطالبہ کرے تو اسلام اس پر صرف ایک پابندی لگاتا ہے وہ یہ کہ عورت خاوند سے ملنے والے تمام سامانِ جہیز کو واپس کردے۔ یہ انصاف کے عین مطابق ہے کیوں کہ اگر خاوند، بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اس کو بھی اسی طرح تمام بیوی کے سامان واپس کرنے پڑیں گے۔ گویا قید نکاح سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مرد اور عورت، دونوں کو یکساں طور پر کچھ مادی نقصان برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

- بیوی کے سامنے تیسری راہ یہ ہے کہ وہ عدالت کے ذریعہ اپنے خاوند سے طلاق لینے کے ساتھ ساتھ اس سے اپنا سامانِ جہیز اور نان و نفقہ بھی وصول کرلے بشرطیکہ وہ عدالت کو ضروری ثبوت کے ذریعہ مطمئن کردے کہ اس کے خاوند نے اس سے بدسلوکی کی ہے اور نکاح کے وقت اس نے جو نان نفقہ دینے کا وعدہ کیا تھا اس کو پورا نہیں کیا۔ اگر عدالت اس کے دعوے کو صحیح تسلیم کرلے تو وہ ان کے نکاح کو فسخ کرنے کے احکام جاری کرسکتی ہے۔

یہ ہیں وہ حقوق جو اسلام عورت کو دیتا ہے۔ جب ضرورت ہو وہ ان سے کام لے تی ہے عورت کے ان حقوق کے بعد مرد اور عورت کے حقوق میں ایک توازن پیدا جاتا ہے۔ اگر مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے تو عورت کو بھی اس کے مقابلے میں کچھ توق حاصل ہیں۔

اندانی الجھنیں:

طلاق کے نتیجے میں بے شمار گھرانے مصائب و آلام میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ررت اور بچوں کو گوناگوں تکالیف کا تختۂ مشق بننا پڑتا ہے۔ طلاق سے پیدا ہونے والے اندانی جھگڑوں کی عدالتوں میں اس قدر بھرمار ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ کبھی ختم ہی نہ ہوں گے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت ہشاش بشاش اور وفادار بیوی کی حیثیت سے اپنے شیر

خوار بچے کی پرورش میں دل و جان سے مصروف ہے اور مزید اولاد کی تمنا لیے ہے کہ یکایک کوئی قاصد خاوند کی طرف سے کاغذ کا ایک پرزہ یعنی طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں تھمادیتا ہے اور اس کی پرسکون زندگی کو تہہ وبالا کرکے چلا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے خاوند کی اس حرکت کا سبب اس کا کوئی وقتی جذبہ یا خیال ہو یا اس کو کوئی ایسی عورت مل گئی ہو جو اس کی بیوی سے زیادہ حسین ہو اور اب وہ اس سے شادی کرنے کا خواہاں ہو یا اس کی وجہ محض یہ ہو کہ وہ اپنی بیوی سے اکتا گیا ہو اور تنوع چاہتا ہو اسی طرح بیوی کی تھکاوٹ و اضمحلال بھی طلاق کا باعث بن سکتا ہے۔ جس بناء پر اس نے خاوند کی ہم بستری کی خواہش کو ٹھکرادیا ہو اور اس نے رد عمل کے طور پر اس کو طلاق دے ڈالی ہو۔

ان سب باتوں کے پیش نظر آزادیٔ نسواں کے حامی پوچھتے ہیں، کیا مناسب نہیں کہ طلاق کا یہ خطرناک ہتھیار مرد سے چھین لیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے اس حق کا غلط استعمال کرکے کسی کو نقصان ہی نہ پہنچاسکے۔ کسی وقتی جذبے کے تحت طلاق کے ذریعہ وہ کسی وقت بھی ایک معصوم اور صابر عورت کی زندگی کو تباہ اور اپنے بچوں کے مستقبل کو تاریک بناسکتا ہے۔

رومن کیتھولک ممالک کی مثال:

جہاں تک بیوی اور بچوں پر ٹوٹنے والے مصائب و آلام کا تعلق ہے تو طلاق ہی ان سب کا باعث ہے مگر سوال یہ ہے کہ ان کا علاج کیا ہے؟ کیا مرد سے طلاق کا حق لے لیا جائے؟ اگر جواب ہاں میں ہو، تو پھر مرد کو طلاق کے حق سے محروم کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اس بھیانک صورت حال کا کیا تدارک ہوگا جس کی ایک مثال ہمیں ان رومن کیتھولک ممالک میں ملتی ہے جہاں طلاق قطعاً ممنوع ہے؟ اگر شادی کو ایک دائمی اور ناقابل انقطاع رشتہ بنادیا جائے تو ذرا ان میاں بیویوں کے حشر کا تصور کیجیے جو ایک دوسرے سے متنفر ہیں اور ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں مگر علاحدگی و جدائی ناممکن ہے؟ کیا ایسی صورت میں اخلاقی جرائم کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملے گا؟ کیا خاوند اور بیوی

گھر سے باہر داشتائیں اور آشنا نہیں ڈھونڈیں گے تاکہ جنسی آسودگی حاصل کر سکیں؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تاریک، گندے اور بیمار ماحول میں بچوں کی صحیح پرورش ہونی بھی ناممکن ہے کیوں کہ اس کے لیے والدین کی شفقت و محبت سے زیادہ خوش گوار ماحول اور معاشرتی وابستگی کی ضرورت ہے۔ یہیں سے لوگوں کی زندگیوں میں نفسیاتی الجھنیں اور پریشانیاں جنم لیتی ہیں۔ ان کی اصل وجہ اسی قسم کے مجبور، جھگڑالو والدین ہوتے ہیں۔

عدالت اور عائلی جھگڑے:

بعض حلقوں کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ مرد کو طلاق دینے کا جو حق حاصل ہے اس پر پابندی عائد کر کے اس کو محدود کر دیا جائے تاکہ اس کا انحصار صرف مرد کی خواہش پر ہی نہ رہے بلکہ یہ اختیار صرف عدالت کو حاصل ہو کہ وہ فریقین میں ثالث بٹھا کر آپس میں مصالحت کرائے اور اگر اس میں ناکام رہے تو طلاق کی ڈگری جاری کر دے۔ مگر طلاق کی ڈگری کے اجراء سے پہلے ثالثوں کو معاملات کی پوری چھان بین کر لینی چاہیے اور خاوند کو طلاق واپس لینے اور بیوی سے مصالحت کرنے پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ جب یہ ساری تدابیر ناکام رہیں تو صرف اسی وقت طلاق دی جائے اور اس کے اعلان کا اختیار خاوند کو نہیں بلکہ صرف عدالت کو ہو۔

ہمارے خیال میں میاں بیوی میں مصالحت کی غرض سے اس طرح کی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں اور ان پر اسلامی قانون کے اعتبار سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا مگر مناسب یہ ہے کہ اس معاملے میں عدالت کو مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ فقہ اسلامی میں اس مسئلہ کا جو حل موجود ہے وہ کافی شافی ہے اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور حل کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک مصالحت کی ضرورت کا تعلق ہے اس کا زیادہ تر انحصار خود میاں بیوی پر ہے اور وہ دونوں خلوص سے صلح کے خواہاں ہیں تو ان کے رشتہ دار، خاندانی افراد اور دوست واحباب زیادہ مفید ہو سکتے ہیں بہ نسبت عدالت کے کیوں کہ رشتہ دار اور دوست واحباب ان کے مزاج، معاشرے اور معاملہ کی نوعیت سے جتنا بہتر

واقف ہوں گے عدالت اتنا بہتر واقف نہیں ہوسکتی۔ یہ لوگ شب و روز کے ملنے جلنے والے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہیں۔ اگر ان کے دلوں میں مصالحت کی کوئی خواہش ہی موجود نہ ہو تو دنیا کی کوئی بڑی سی بڑی عدالت بھی ان میں مصالحت نہیں کراسکتی۔ اب بھی دنیا میں ایسے ممالک موجود ہیں جہاں انہام و تفہیم کے سارے ذرائع ناکام ہو جاتے ہیں تو عدالتیں ہی طلاق نامے جاری کرتی ہیں مگر اس کے باوجود ان ممالک میں ہر سال بے شمار طلاقیں واقع ہوتی ہیں صرف امریکہ میں طلاق کی سالانہ شرح ۴۰٪ فیصد ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ مہذب و تہذیب یافتہ ملک مانتا ہے اور یہاں طلاق کی سالانہ شرح بھی سب سے زیادہ ہے۔

عدالت کی مداخلت کا تاریک پہلو:

جہاں تک عدالت کے مداخلت کے خیال کا تعلق ہے تو طلاق صرف اسی وقت عدالت کی طرف دی جائے جب خاوند عدالت کو باقاعدہ ثبوت کے ذریعہ بالکل مطمئن کردے کہ سارا قصور بیوی ہی کا ہے اور وہ اب اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے عورت کا بھی کچھ بھلا ہوگا۔ اگر شوہر اپنے ثبوت سے عدالت کو مطمئن نہ کرسکا تو آخر شوہر اس کے گھر میں رہنے میں عورت کی کیا عزت ہے جہاں دن رات اٹھتے بیٹھتے اس کو یہ جتلایا جاتا ہو کہ اس کا خاوند اس سے بیزار ہے اور اس کے لیے اس کی حیثیت ایک بوجھ سے زیادہ نہیں۔ کیا ایسے گھر میں رہنے پر عورت کو زور زبردستی یا اصرار کرنا چاہیے تاکہ موقع پاکر وہ خاوند کو دھوکا دے سکے؟ یقیناً کوئی قانون اس طرح کے طرز عمل کو پسندیدہ قرار نہیں دے سکتا اور نہ وہ یہ برداشت کرسکتا ہے کہ نفرت کے اس گھر میں عورت مہر بہ لب کڑھتی اور ہر طرح کی ذلت برداشت کرتی رہے کیا اپنے بچوں کی محبت میں یا تعلیم و تربیت کی خاطر اسے ایسے گھر میں ٹھہرا رہنا چاہیے؟ لیکن جس گھر میں ایسی تاریک فضا قائم ہو وہاں وہ بچوں کی تربیت و تعلیم کی ذمہ داریوں سے کیوں کر عہدہ برآ ہوسکتی ہے؟

کسی انسان پر اس کی قوت واستطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ کیوں کہ حالات کا سامنا کرنا زیادہ حقیقت پسند رویہ ہے اس دکھاوے کی شرافت سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہے جس کے پردے میں ہر طرح کی برائیوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے جیسا کہ ان اقوام میں نظر آتا ہے جن میں تعدد ازواج ممنوع ہے۔

اس بارے میں ہمیں وہ حالات بھی پیش نظر رکھنے چاہئیں جن میں خاوند مجبور ہوتا ہے اور وہ بیوی کو نہ محبت دے سکتا ہے اور نہ طلاق دیکر اسے آزاد ہی کر سکتا ہے ایسے تمام حالات میں تعدد ازواج ہی مسئلے کا واحد حل ہے۔

مسئلے کے کچھ اور پہلو:

اب ہم چاہتے ہیں کہ مسئلہ ان کے بعض دیگر پہلوؤں کا بھی جائزہ لیتے چلیں جن کے بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔

نقل وحرکت کا حق:

سب سے پہلے گھر سے باہر محنت ومزدوری کرنے اور نقل وحرکت کرنے کے حق کا مسئلہ ہے۔ اسلام عورت کو محنت ومزدوری اور نقل وحرکت کرنے کا مکمل حق دیتا ہے۔ اسلام کے شروع ادوار میں جب کبھی کوئی حقیقی ضرورت ہوتی تھی تو مسلمان عورتیں گھروں سے باہر کام کرتی تھیں۔ اسی طرح اسلام عورتوں کو سماجی نسواں اداروں مثلاً تعلیم نسواں کے ادارے، نرسنگ ہوم اور عورتوں کی طبی امداد کے مراکز میں کام کرنے سے بھی نہیں روکتا بلکہ اگر ضرورت ہو تو جس طرح ہنگامی حالات میں مردوں کی خدمات حکومت مستعار لے لیتی ہے۔ اسی طرح عورتوں کی خدمات بھی مذکورہ مقاصد میں مستعار لی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح اگر عورت بالکل ہی بے سہارا ہو اور کوئی مرد موجود نہ ہو تو عورت روزی کمانے کے لیے بھی گھر سے باہر نکل سکتی ہے مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام عورت کو اپنا گھر چھوڑنے کی اجازت صرف اسی صورت میں دیتا ہے جب کوئی واقعی ضرورت یا مجبوری لاحق ہو کہ اس کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا۔

عام حالات میں جب کوئی خاص مجبوری نہ ہو، اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ عورت خواہ مخواہ گھر سے باہر نکلے جیسا کہ مغربی واشتراکی ممالک میں دکھائی دیتا ہے۔ ایسا کرنا اسلام کی نگاہ میں محض حماقت ہے کیوں کہ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی غرض سے عورت جب اپنے گھر کو خیر باد کہتی ہے تو اس سے اس کے اصل اور بنیادی وظیفہ حیات پر مضر اثر پڑنا ناگزیر ہے جس کو وہ گھر کی چہار دیواری کے اندر رہ کر ہی بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب بلا ضرورت وہ گھر چھوڑتی ہے تو معاشرے میں بہت سی نفسیاتی، سماجی اور اخلاقی الجھنیں پیدا کردیتی ہے۔ عورت جہاں گھر سے باہر نکلی کہ شیطان اس کے ساتھ ہو لیتا ہے جو لوگوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔

خسارے کا سودا:

عورت جسمانی، ذہنی اور وجدانی اعتبار سے اپنے اصل مقصدِ حیات یعنی ماں بننے کے لیے بہترین صلاحیتوں سے آراستہ ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر اس کی توجہ دوسری غیر ضروری سرگرمیوں کی جانب مبذول ہو جائے اور وہ اپنے اصل فریضے سے غافل ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے خود اس کو اور اس کے ساتھ پوری انسانیت کو نقصان پہنچے گا اور وہ شریف ماں بننے کے بجائے مردوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا، انکی دل لگی کا سامان اور تفریح کا ایک مشغلہ بن جائے گی۔ اور اس کی متاعِ حیات عیاشی اور ہوسناکی کی نذر ہو جائے گی۔ اسلام اس صورتِ حال کو بھی برداشت نہیں کرتا کیوں کہ اس کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ وہ انسانیت کو ایک ایسی مربوط وحدت سمجھتا ہے جو وقت کے ساتھ تبدیل اور تغیر پذیر نہیں ہو سکتی۔

ایک بے بنیاد خیال:

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بچوں کو اناؤں کے سپرد کر کے اگر عورت گھر سے باہر کوئی ملازمت کرلے تو آخر اس میں حرج ہی کیا ہے اس طرح وہ کما بھی سکتی ہے اور ماں کی حیثیت سے اپنا بنیادی فریضہ بھی ادا کر سکتی ہے مگر یہ ایک بے بنیاد اور نامعقول خیال ہے کیوں کہ

کوئی انآ خواہ وہ کتنی ہی اچھی ہو اور بچوں کی جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی نشو و نما میں دلچسپی لیتی ہو مگر ایک معاملے میں معذور ہے کہ وہ اس بچے کی ماں بہر حال نہیں ہو سکتی اور نہ ماں کی جگہ لے سکتی ہے اور نہ بچوں کو ماں کی وہ محبت و شفقت دے سکتی ہے جس کے بغیر گلستانِ حیات ویران اور اخلاق انسانی پژمردگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مغربی تہذیب کے فرزند ہوں یا شکست خوردہ اشتراکی نظام کے دلدادہ علم بردار، ان کی بے معنی چیخ و پکار فطرت انسانی میں ہرگز کوئی تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کے ابتدائی دو برس میں تو بچوں کو ماں کی ہمہ وقتی اور ہمہ جہتی شفقت و محبت، توجہ و التفات کی اتنی شدید احتیاج ہوتی ہے کہ اس میں وہ کسی اور کی شرکت گوارہ نہیں کرتا چاہے وہ اس کا بھائی یا بہن ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی انآ یا نرس بچوں کو ماں کی یہ شفقت توجہ کیسے دے سکتی ہے؟ بالعموم ایک انآ کو بیک وقت دس۔ دس اور بیس۔ بیس بچوں کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے اور وہ اس بارے میں مجبور ہے کیوں کہ یہ اس کا کاروبار اور ذریعۂ آمدنی ہے جس میں وہ اضافہ ہی چاہتی ہے۔ اس طرح کی کرائے کی ماں کے زیر سایہ پلنے والے بچے ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کے کھلونوں پر قبضہ کرنے کے لیے اور کبھی اس مصنوعی ماں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے چناں چہ رفتہ رفتہ یہ لڑائی جھگڑے ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتے ہیں اور بڑے ہوتے ہیں تو ان کے دل محبت و شفقت کی گرمی سے ناآشنا اور لطیف جذبات سے محروم ہوتے ہیں۔

مسلمان خاوندوں، باپوں اور بھائیوں سے ایک سوال:

اگر کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو تو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے نجی طور پر کوئی انآ رکھی جا سکتی ہے مگر اس قسم کی کسی ضرورت کے بغیر ایسا کرنا دانشمندی نہیں ہے ممکن ہے اہل مغرب اپنے بعض مخصوص تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور معاشی حالات کی بناء پر ایسا کرنے پر اپنے کو مجبور سمجھتے ہوں مگر مشرق کے مسلمانوں کے لیے تو ایسا کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں۔ کیا ہمارے یہاں مردوں کی تعداد میں واقعی اس قدر کمی ہو گئی ہے کہ گھر سے

باہر کی دنیا کا نظام چلانے کے لیے اب ہمیں عورتوں کی مدد کی ضرورت ناگزیر ہے؟ یا مسلمان مردوں، باپوں، بھائیوں، خاوندوں اور رشتہ داروں کے دلوں سے ساری حمیت وغیرت رخصت ہوچکی ہے اور اب اپنی بہن، بیٹیاں اور بیویاں ان پر بوجھ ہیں۔ اس لیے وہ بیچاری مجبور ہیں کہ اپنا بوجھ خود اٹھائیں اور دفتروں وکارخانوں میں جاجاکر ملازمتیں کریں؟

دنیائے اسلام کی غربت:

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملازمت کرنے سے عورت کو معاشی آزادی حاصل ہوتی ہے جس سے معاشرے میں اس کی قدر ومنزلت بڑھتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام نے عورت کی آزاد معاشی حیثیت سے کب انکار کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اسلامی دنیا کو جو مسائل درپیش ہیں وہ اسلام کے نظام حیات کی خرابی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ اس ہمہ گیر غربت وافلاس کی پیداوار ہیں جس کی وجہ سے کیا مرد اور کیا عورتیں، سبھی پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی کی سہولتوں سے محروم کردیئے گئے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے ہم اپنی مادی پیداوار کو بڑھائیں تاکہ ساری قوم خوش حال ہوجائے اور ہم میں کوئی غریب یا محتاج نہ رہے۔ انفرادی اور اجتماعی ترقی کی فکر کریں۔ اپنی صلاحیتیں تخریبی وسازشی کارروائیوں سے بچاکر تعمیر و تنظیم نو پر صرف کریں۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے جذبہ سے بچ کر تعاون واشتراک کا ہمہ گیر جذبہ پیدا کریں تب ساری قوم باعزت وخوش حال ہوسکتی ہے ورنہ نہیں۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ ذرائع پیداوار وآمدنی کے اضافہ کے بارے میں اس وقت مرد وعورت میں جو دوڑ ومسابقت جاری ہے وہ ہرگز اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔

• • •

مسائل کے حل کی واحد راہ:

واقعہ یہ ہے کہ ان تمام مسائل کا حل بحیثیتِ مجموعی پورے معاشرے کی اخلاقی، ثقافتی، دینی اور روحانی تعلیم وتربیت میں مضمر ہے۔ جس کے لیے ذہنی تطہیر کے ایک طویل عمل سے گذرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر نیکی اور بھلائی کو غلبہ نصیب ہوتا ہے اور معاشرتی زندگی کے لیے ایک صحت مندانہ اساس میسر ہوتی ہے۔ ایک ایسے پاکیزہ معاشرے ہی میں خاوند کے دل میں یہ احساس بیدار ہو سکتا ہے کہ ازدواج کا رشتہ ایک مقدس رشتہ ہے جس کو کسی وقتی جذبے کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔

زندگی کی تعمیر نو:

اخلاقی اور روحانی ارتقاء کا یہ عمل بہت سست اور طویل ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی قانون کی روشنی میں قوم کی تعمیر اور تنظیم نو کی جائے اور اس مقصد کے لیے تمام اجتماعی ادارے مثلاً گھر، مدرسہ، کالج، یونیورسٹی، پریس، ادب، میڈیا، علماء دینی پیشوا اور عوام وخواص سبھی مل جل کر کوشش کریں تب یہ کام پائے انجام کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ بہت مشکل کام ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اس کے لیے بہت طویل مدت درکار ہے۔ مگر پائیدار معاشرتی انقلاب لانا مقصود ہو تو اسے اپنائے بغیر چارۂ کار بھی نہیں۔ پائیدار انقلاب کی یہی واحد راہ ہے۔

قانون کا بنیادی مقصد:

اس کے برعکس ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عائلی قانون کا بنیادی مقصد عدل وانصاف کے ایسے نظام کا قیام ہے جو طرفین یعنی میاں بیوی دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے اور انھیں بے انصافی سے بچانے کے قابل ہو۔ طلاق اسی معاشرتی انصاف کے ایک تقاضے کو پورا کرتی ہے۔ جو میاں بیوی کے لیے یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ اگر وہ امن وسکون سے زندگی نہ گذار سکیں تو ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جائیں۔ اس ضمن میں

ہمیں اسلامی فقہ کا یہ اصول بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حلال چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز ہے۔

ایک ہنگامی قانون:

جہاں تک تعدد ازواج کا تعلق ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ محض ایک ہنگامی اور بشری ضرورت کو پورا کرنے والا قانون ہے تاکہ معاشرہ صاف ستھرا برائیوں سے محفوظ اور پاکیزہ رہ سکے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً. (سورت ۴ آیت ۳)

ترجمہ: تو عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔ دو۔ دو عورتوں سے، تین۔ تین عورتوں سے اور چار۔ چار عورتوں سے۔ ہاں اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کرو۔

جیسا کہ آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک سے زائد شادیاں کرنے کی صورت میں مرد اس امر کا پابند ہے کہ وہ ان سب کے ساتھ یکساں سلوک اور انصاف کا برتاؤ کرے اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ ایسا نہ کرسکنے کی حالت میں مرد کو صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ گویا جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے، اسلام تعدد ازواج کے مقابلے میں یک زوجگی کے حق میں ہے۔ مگر بعض حالات میں یک زوجگی بھی انصاف کے بجائے بے انصافی کی علامت بن جاتی ہے۔ غیر معمولی حالات کے لیے اسلامی قانون تعدد ازواج کی راہ کھلی رکھتا ہے تاکہ ایسے حالات میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس کے ذریعہ ان کو ختم کیا جاسکے۔ چند غیر معمولی حالات مندرجہ ذیل ہیں۔

جنگیں:

مثال کے طور پر جنگوں ہی کو لیجیے۔ ان میں مردوں کی بہت بڑی تعداد ختم ہو جاتی

ہے جس سے عورتوں اور مردوں کا توازن بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ایسے حالات میں تو تعدد ازواج ناگزیر معاشرتی ضرورت بن جاتی ہے۔ اس سے معاشرہ اس صنفی انارکی کے خطرہ سے بچ جاتا ہے جس کی وبا جنگوں کے بعد بالعموم پھوٹ پڑتی ہے کیوں کہ مردوں کی تعداد کم ہو جانے کے باعث بے شمار عورتیں بے سہارا رہ جاتی ہیں۔ایسی بے سہارا عورتوں کی روزی، روٹی کا انتظام تو ہو سکتا ہے مگر ان کی جذباتی اور صنفی تسکین مشکل ہو جاتی ہے چناں چہ ان حالات میں شدید خطرہ ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں کی ہوس رانی کا شکار بن جائیں مگر حقیقی جذباتی تسکین سے پھر بھی نا آشنا رہیں گی۔ ساتھ ہی وہ بچوں اور ان سے فطری محبت و لگاؤ کو عمر بھر ترستی رہیں گی جس کے بغیر انسان کی زندگی میں کوئی حسن و رنگینی باقی نہیں رہتی۔جنگ عظیم کے بعد یورپ آج تک ان ہی خرابیوں کا شکار ہے۔

فرانس کی عبرت ناک مثال:

کیا اسی طرح کے ہنگامی اور غیر معمولی حالات میں یہ مناسب ہے کہ ان بیواؤں کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے کہ وہ معاشرتی اخلاقیات کو پس پشت ڈال کر جائز و ناجائز جیسے بھی ممکن ہو اپنی جنسی تسکین حاصل کرتی رہیں۔ فرانسیسی قوم کو ایسی ہی صورت حال سے سابقہ پڑا تھا جس کے نتیجے میں وہاں معاشرتی نظام کی چولیں ہل گئیں بالآخر فرانسیسی قوم اپنی تمام تاریخی عظمت و وقار کو کھو بیٹھی۔ اس طرح کے معاشرتی انتشار کے خطرے سے بچنے کی صرف یہی راہ ہے کہ قانون میں مرد کو واضح اور صریح الفاظ میں یہ اجازت ہو کہ وہ ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کر سکے بشرطیکہ وہ ان میں عدل ملحوظ رکھے۔ عدل کی اس شرط میں وہ جذباتی لگاؤ یا وابستگی شامل نہیں جو خاوند کو اپنی کسی خاص بیوی سے ہوتی ہے۔ یہ فطری، قدرتی، استثنائی معاملہ ہے جس میں مساوات اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ چاہے بھی تو اس معاملہ میں عدل کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا۔

کچھ اور ناگزیر حالات:

اسی طرح کے بعض اور ہنگامی حالات ہیں جن میں تعدد ازواج ایک معاشرتی

ضرورت بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بعض مرد، دوسروں سے زیادہ قوتِ شہوانی رکھتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے صرف ایک بیوی پر اکتفا کرلینا بہت مشکل ہے کیوں کہ وہ چاہنے کے باوجود بھی اپنی زائد قوتِ شہوانی کو دبا نہیں سکتے۔ ایسے لوگوں کو بھی قانوناً ایک سے زائد شادی کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ بصورتِ دیگر یہ لوگ گھروں سے باہر اپنی گرل فرینڈ یعنی دوست لڑکی کے پاس جاکر سامانِ تسکین تلاش کریں گے اور معاشرے کو ایک ایسے کوڑھ میں مبتلا کردیں گے جس کی اجازت کوئی صحت مند معاشرہ نہیں دے سکتا۔

بیوی کا بانجھ پن:

مزید برآں بعض اور حالات بھی پیش آسکتے ہیں جن میں تعدد ازواج ہی بہت سے مسائل کا واحد حل ہے مثلاً بیوی کا بانجھ پن، یا اس کا کسی ایسے دائمی مرض میں مبتلا ہونا جس کی وجہ سے وہ زن و شو کے تعلق کے قابل ہی نہ رہے۔ پہلی صورت میں یعنی اگر بیوی بانجھ ہے تو بلاشبہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں کہ اس کو ملامت کا ہدف بنایا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ خاوند اس کی وجہ سے اولاد کی نعمت سے محروم کیوں ہے حالاں کہ اولاد کی خواہش انسانی دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ اس صورتِ حال کا معقول علاج دوسری شادی ہے۔ پہلی بیوی چاہے تو اپنے خاوند اور اس کی دوسری بیوی کے ساتھ رہے اور چاہے تو طلاق لے کر الگ ہو جائے۔ رہ گئی وہ بیوی جو کسی ناقابلِ مباشرت مرض میں مبتلا ہے تو اس کے معاملے پر غور کرتے وقت یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ صنفی تعلق ایک پست جذبے کی پیداوار ہے اور محض اس کی خاطر خاوند کو اپنی معصوم بیوی کی خوشی و اطمینان کو پامال نہیں کرنا چاہیے اور خاوند کو قربانی کا جذبہ رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہاں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ جنسی جذبہ اعلیٰ و ارفع ہے یا گھٹیا و پست۔ بلکہ اصل مسئلہ انسان کی عملی ضرورت کا ہے جس کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر معاملے میں خاوند اپنی مرضی اور خوشی سے بیوی کی خاطر ایثار و قربانی پر آمادہ ہو اور جنسی لطف سے محرومی کو گوارا کرلے تو اس کا یہ جذبہ نہایت پاکیزہ اور اس کی فیاضی کا اظہار ہوگا جس میں اس کی تحسین کی جائے گی مگر اللہ تعالیٰ

کارروائی اجلاس تحفظ ختم نبوت

منعقدہ ۱۹/ جون بروز شنبہ بعد نماز عشاء

از: اقبال احمد صاحب استاذ مدرسہ مظہر العلوم کانپور

کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کی نگرانی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کانپور نے اکتوبر ۹۸ء میں جامع العلوم پٹکاپور کانپور میں سہ روزہ تربیتی کیمپ لگایا تھا اور ۱۱/ اکتوبر ۹۸ء کو حلیم مسلم کالج کانپور کے وسیع وعریض میدان میں تحفظ ختم نبوت کانفرنس منعقد کی تھی ان پروگراموں سے علاقہ بھر میں قادیانی فتنہ کے خلاف علماء کرام اور عامۃ المسلمین کے طبقہ میں زبردست بیداری آئی۔ متعدد قادیانی افراد کانفرنس کے موقع پر اور اس کے بعد تائب ہوکر دوبارہ مشرف باسلام ہوئے۔ دیگر مسلم تنظیموں نے بھی رد قادیانیت کے موضوع کی اہمیت کو محسوس کیا۔ چنانچہ امسال ۱۹/ جون ۹۹ء انجمن فروغ سنت کانپور نے حلیم کالج روڈ پر ایک عظیم اجلاس تحفظ ختم نبوت کا اہتمام کیا۔ اور کل ہند مجلس کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند سے تاریخ کی منظوری لیکر اجلاس کی تیاری بہترین انداز پر شروع کی بفضلہ تعالیٰ شاندار طریقہ پر یہ اجلاس کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

ناظم نشر واشاعت اجلاس جناب مفتی اقبال احمد صاحب کی ارسال کردہ رپورٹ شریک اشاعت کی جارہی ہے۔

محمد عثمان منصورپوری
ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت
دارالعلوم دیوبند

کارروائی اجلاس تحفظ ختم نبوت

منعقدہ: ۱۹ر جون ۱۹۹۹ء مطابق ۵ر ربیع الاول ۱۴۲۰ھ بروز شنبہ بعد نماز عشاء بمقام حلیم کالج کانپور

۲۰ر جون انجمن فروغ سنت کانپور کے زیر اہتمام انجمن حلیم کالج روڈ پر کل گذشتہ شب ایک اہم اجلاس بعنوان تحفظ ختم نبوت منعقد ہوا تھا، جلسہ کو سماعت کرنے کے لئے کانپور و اطراف کے غیور مسلمان ہزاروں کی تعداد میں وقت مقررہ پر (بعد عشاء) جمع ہوگئے تھے۔ اجلاس کی اہمیت کے پیش نظر سامعین کی کثرت تعداد توقع کے مطابق [illegible] کر لیے تھے، لیکن اس کے باوجود فرش و فروش اور کرسیوں پر مجمع نہ سماسکا اور مجمع کی ایک بڑی تعداد کھڑے ہی کھڑے پروگرام سنتی رہی۔ اجلاس کے کنوینر جناب الحاج قمر الدین انصاری بڑی فکرمندی سے اجلاس کے نظم و نسق میں ہمہ تن مصروف تھے بنا بھائی جناب نواب بھیا و بابو اکرم و منشی اظہر صاحب وغیرہ بھی پیش پیش تھے۔ جلسہ کی صدارت حضرت مولانا الحاج مفتی منظور احمد صاحب مظاہری قاضی شہر کانپور انجام دے رہے تھے۔ جبکہ جلسہ کی نظامت کے فرائض مولانا محمد سمیع اللہ قاسمی مدرس مدرسہ اسلامیہ عربیہ مظہر العلوم (مسجد گھنٹوشاہ) نے انجام دیئے۔ جلسہ کا باضابطہ آغاز حضرت مولانا قاری عبدالباری صاحب امام مسجد خیر (زیر تعمیر مسجد بروہیم چوراہا) کی سوز و گداز سے بھری ہوئی قرأت سے ہوا۔ تلاوت کلام اللہ کے بعد عزیزم آئیل سلمہ متعلم مدرسہ جامع العلوم نے عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی نعت رسول سے سامعین کو محظوظ کیا۔

حضرت مولانا محمد یامین صاحب کی تقریر

بعدہ اجلاس کو خطاب کرنے کے لئے حضرت مولانا محمد یامین صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند کو دعوت دی گئی، موصوف نے ایک گھنٹہ کی اپنی تقریر میں سامعین کے سامنے ختم نبوت کی پوری تشریح کے ساتھ ساتھ قادیانیت کو پوری طرح بے نقاب کردیا۔ آپ نے فرمایا کہ سارے انبیاء کے سلسلہ میں تو صرف یہی عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ وہ اللہ

تعالیٰ کے نبی ہیں لیکن سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس
عقیدہ کے ساتھ کہ وہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں یہ بھی عقیدہ رکھنا فرض ہے کہ وہ خاتم النبیین
بھی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اب کوئی نبی پیدا نہیں
ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے نبی گذرے ہیں وہ
قیامت کے قریب آسمان سے بحیثیت امتی تشریف لائیں گے یعنی آپ اپنی شریعت کی
دعوت نہیں دیں گے بلکہ دین اسلام کے خود بھی تابع ہوں گے اور دوسروں کو بھی اسی
شریعت اسلامیہ پر چلائیں گے اسی کے مطابق فیصلے فرمائیں گے۔ اس مسئلہ کی پوری
وضاحت کے بعد نبوت کے دعوے دار مرزا غلام احمد قادیانی کے مختلف دعاوی اور متضاد
حالات اور دجل کا تذکرہ کرکے بتایا کہ قادیانی فتنہ انگریزی سازش کا نتیجہ ہے جو ہندوستان
میں پھر سے اپنے بال و پر نکال رہا ہے اہل اسلام کو باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا مفتی منظور احمد صاحب کا وضاحتی بیان

آپ کے خطاب کے بعد درمیان میں صدر انجمن و صدر جلسہ حضرت مولانا
الحاج مفتی منظور احمد مظاہری قاضی شہر کانپور نے اجلاس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے
ہوئے ایک اصولی گفتگو فرمائی آپ نے فرمایا کہ ہندوستان جو سیکولر اسٹیٹ ہے اس میں ہر
شخص کو مذہبی آزادی ہے لیکن دوسرے مذہب کی آڑ میں کسی مذہب کی غلط تشریح کرنا اور
مذہب کو اپنے باطل عقائد کے پرچار کے لئے استعمال کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔
ہندوستان میں بہت سے مذہب کے ماننے والے ہیں ہم کسی کے خلاف مجلسیں نہیں منعقد
کرتے لیکن قادیانیت جو درحقیقت اسلام کے مقابل ایک مستقل مذہب ہے اور یہ
چیز اسلام کے مقابلہ میں انکے یہاں مسلم ہے۔ لیکن چونکہ وہ اپنے مذہب کا پرچار اپنے
مذہب کے نام سے نہیں کرتے بلکہ اپنے مذہب کو اسلام کے نام سے ہی پھیلاتے ہیں اور
اسی کو حقیقی اسلام کا نام دیتے ہیں اسلام کا کلمہ پڑھکر اس کا مطلب یعنی محمد رسول اللہ کا
مصداق وہ قادیانی ملعون کو قرار دیتے ہیں اس طرح سیدھے سادھے مسلمانوں کو اسلام کے
نام پر قادیانیت کی طرف لے جاتے ہیں اسلئے ہم کو اپنے مسلمان بھائیوں کے اسلام کے

تحفظ کی خاطر یہ اجلاس وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے اگر وہ کھلم کھلا اپنے نئے مذہب کا اعلان کردیں۔ اسلام کا لیبل اپنے باطل عقائد پر لگانا چھوڑ دیں تو ہمارا ان سے کوئی لینا دینا نہیں وہ آزادی سے اپنی باتیں پھیلائیں۔ آپ نے ۱۱/ اکتوبر ۹۸ء کے موقع پر کانپور میں تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے جو مہم چلی تھی اس کی مفید کارگزاری اور بہتر نتائج کی طرف بھی اشارہ کیا اور بتایا کہ گزشتہ سال ۱۱/ اکتوبر کو حلیم کالج گراؤنڈ کے اجلاس تحفظ ختم نبوت کے نتیجہ میں ہمارے کئی مسلمان بھائی جو قادیانیوں کے چنگل میں چلے گئے تھے وہ اس مسئلہ کو جب سمجھ گئے تو انہوں نے سچی پکی توبہ کرکے اور دوبارہ اسلام میں داخل ہوگئے اس قسم کے متعدد واقعات پیش آئے۔ "اور آپ نے بتایا کہ آئے دن اس قسم کے مسائل ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ہم کو اس مسئلہ کا احساس ہے" آپنے قادیانیوں کو کچھوے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ جب ان کو مسلمانوں کی طرف سے سرگرمی کی بھنک لگتی ہے تو وہ اپنے ہاتھ پاؤں چہرہ سمیٹ لیتے ہیں اور جب سناٹا محسوس کرتے ہیں تو اپنے بال و پر نکال لیتے ہیں آپنے قادیانیوں کو متنبہ کیا کہ وہ تائب ہو جائیں اور اپنی مذموم حرکات سے باز آجائیں اور یہ سمجھ لیں کہ انشاءاللہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب کا پر مغز علمی خطاب:

صدر محترم کی صدارتی تقریر کے بعد اس اجلاس کے خصوصی مقرر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند و ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت نے حاضرین کو مفصل خطاب فرمایا۔ آپنے خطاب میں ابتداءً اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کی ایسی علمی تشریح فرمائی جس سے وحدانیت کا بھی ثبوت ہوگیا ساتھ ہی نبوت و رسالت کی بھی انسانیت کو ضرورت ہونا واضح ہوگیا اور سلسلۂ انبیاء پر کلام کرتے ہوئے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ میں رسالت و نبوت کے سلسلہ کے سمٹ آنے کو علمی لیکن عام فہم انداز میں حل فرمایا پھر آپنے کسی نئے نبی کی ضرورت نہ ہونے کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جب قیامت تک کے لئے خاتم النبیین کا آفتاب نبوت

جگمگا رہا ہے تو اب نیا نبی اپنا چھوٹا سا چراغ لیکر اس آفتاب کے ہوتے ہوئے کیا کرے گا اس لئے عقلی اعتبار سے بھی کسی نئے نبی کی ضرورت کا سوال ہی نہیں اٹھتا پھر آپ نے قادیانی وسوسوں کا بھی جواب دیا اور بتایا کہ آپ کی نبوت کا پیغام قرآن وحدیث کو لیکر صحابہ اور آپ کے جانشین نے سارے عالم میں پھیلا دیا ہے اور قیامت تک یہ دین محفوظ رہے گا اس لئے بھی نئے نبی کا تصور ہی بے معنی ہے آپنے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انبیاء کی عصمت اور صحابہ کی عظمت وحفاظت کا بھی ذکر کیا اور صحابیت کے تئیں شیعوں کے باطل عقائد اور مودودی حضرات کی صحابہ کے بارے میں غلط روش کی نشاندہی فرمائی آپ کی پوری تقریر انتہائی علمی جامع اور پر مغز تھی آپنے مفصل خطاب کے آخر میں قادیانی فتنہ کے مقابلہ کو پوری امتِ مسلمہ کی ذمہ داری بتایا۔ آپ کی تقریر ۱۲ر بجے سے ڈھائی بجے تک جاری رہی اور آپ کے بیان کے بعد آپ ہی کی دعاء پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

اس اہم اجلاس میں کثیر تعداد میں مقامی علماء کرام شریک تھے بعض اہم علماء کرام کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت مولانا افتخار احمد صاحب قاسمی۔ حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب مظاہری۔ حضرت مولانا وکیل احمد صاحب قاسمی۔ مولانا فرید آئب صاحب لکھنوی۔ مولانا فخر الدین قاسمی۔ مولانا سید مختار احسن جامعی۔ مولانا مفتی اقبال احمد قاسمی۔ مولانا محمد انعام اللہ قاسمی وغیرہ۔ اس اجلاس کے دوران بعض اہم لوگوں کو تحفظ ختم نبوت کے عنوان پر دارالعلوم دیوبند کا مطبوعہ لٹریچر بھی مفت تقسیم کیا گیا۔

ہندوستانی آئین نمبر ۲۵ کی تشریح ووضاحت:

از جناب سید شکیل احمد صاحب ایڈوکیٹ سپریم کورٹ دہلی

قادیانی لوگ عام طور پر علماء کرام پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارے خلاف تحریک چلاکر ہمیں اپنے مذہب کے پرچار سے روکتے ہیں جبکہ ہندوستانی آئین سیکولر وجمہوری ہے۔ یہاں پر ہر شخص کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ مسلمانوں کو ان کے مغالطے میں نہیں آنا چاہیے۔ بیشک ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے۔ یہاں ہر ایک فرد کو مذہبی آزادی

سے بنیادی حقوق کی ضمانت آئین ہند کی دفعہ ۲۵ میں دی گئی ہے لیکن یہ آزادی غیر مشروط نہیں ہے بلکہ امن عامہ، اخلاقیات اور آئین کے حصہ ۳ میں دی گئی شرائط کے تابع ہے۔ مذہبی آزادی میں اس بات کی قطعی اجازت نہیں ہے کہ کسی دوسرے فرقہ کے جذبات کو مجروح کیا جائے جس سے عوام میں فساد پیدا ہو۔ مذہبی آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ کسی ایک خاص مذہب کا نام لے کر اس مذہب کے بنیادی عقائد یا ارکان کی غلط تشریح کرے اور توڑ مروڑ کر عوام کو گمراہ کرے۔ جس طرح قادیانی خود کو مسلمان بتا کر دھوکہ دیتے رہے ہیں۔ ایسا کرنا آئین میں دی گئی مذہبی چھوٹ کے ضمن میں ہرگز نہیں آتا بلکہ سراسر غیر آئینی عمل ہے۔ اس لیے قادیانی نام نہاد احمدی گروہ اپنے آپ کو قانونی یا آئینی طور پر مسلمان کہلانے کے مجاز یا اہل نہیں ہے کیوں کہ ان کا عقیدہ اسلام کی خاص بنیاد کہ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں" کے خلاف ہے اس لیے کہ یہ لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کو آخری نبی مانتے ہیں اور دھوکہ دینے کے لیے اس کو سچا اسلام کہتے ہیں۔

ان آئینی وضاحت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ قادیانیوں کا خود کو عوام میں بحیثیت مسلمان پیش کرنا غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غیر آئینی ہے جس کے خلاف احتجاج کرنا اور اس تحریک قادیانیت کے خلاف عوام میں بیداری پیدا کرنے کی مہم چلانا مسلمانوں کا مذہبی حق اور فریضہ ہے۔

• • • •

مکتبی تعلیم کا اجرا اور اس کی اہمیت

اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے بچوں کو سب سے پہلے لا الہ الا اللہ سکھاؤ اور موت کے وقت بھی لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو حضرات صحابہ وتابعین بچوں کے لئے قرآن اور ضروریات دین کی تعلیم کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ اور سات سے دس سال کی عمر تک بچوں کو قرآن اور دعا وغیرہ کی اتنی تعلیم دیدیا کرتے تھے کہ وہ اس عمر میں باقاعدہ نماز ادا کریں۔ حضور ﷺ نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ تم سات سال کے بچوں کو نماز کا حکم دو اور دس سال کے بچوں کو نماز نہ پڑھنے پر تنبیہی مار مارو (ابوداؤد) حضور ﷺ نے فرمایا ایما ناشئ نشأ فی طلب العلم والعبادة حتی یکبر وهو علی ذالك كتب الله له اجر اربعین صدیقاً

(جامع بیان العلم ج ۱ ص ۸۲)

جو شخص علم کی طلب اور عبادت میں پرورش پاتا ہے یہاں تک کہ اسی حالت میں بڑا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو چالیس صدیقین کا ثواب دیتا ہے۔

عہد رسالت میں مکاتب کی نوعیت

عہد رسالت تک بچوں کی تعلیم کے لئے علاحدہ اور مستقل مکتب نہیں تھا بلکہ

اور اطراف کے جوان اور بچے مجلس نبوی میں شریک ہو کر علم دین حاصل کرتے تھے آپ ان نو خیزوں اور نوجوانوں کو تعلیم دیتے اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز کرتے تھے اور ان کے حق میں دعا فرماتے تھے۔ آپ نے معاذ بن جبل کو یمن کا حاکم بنایا۔ عتاب بن اسید کو مکہ کی امارت دی۔ عثمان بن ابوالعاص ثقفی کو طائف کی امارت پر رکھا حالانکہ یہ حضرات کم سن اور کم عمر تھے۔ ایک مرتبہ ابن عباس کو سینے سے لگا کر دعا دی اللھم علمه الكتاب (بخاری کتاب العلم)۔ امام بخاری نے باب تعلیم الصبیان القرآن" میں ابن عباس کے بچپن میں قرآن یاد کرنے کا ذکر کیا ہے۔ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں ایک مرتبہ حضور ﷺ نے پوچھا کہ وہ کونسا درخت ہے جو مسلمان کے مانند ہے اور اس کے پتے نہیں جھڑتے ہیں میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے مگر میں اس لیے خاموش رہا کہ و انا عاشر عشرۃ و انا احدثهم میں ان میں دسواں شخص تھا اور سب سے کم عمر تھا۔ ابن عباس کہتے ہیں حضور ﷺ کی وفات کے وقت میری عمر دس سال کی تھی اور میں محکم پڑھ چکا تھا۔ سعید بن جبیر نے پوچھا محکم کیا ہے؟ تو بتایا (مفصل بخاری فضائل القرآن) سمرہ بن جندب کہتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کے زمانہ میں لڑکا تھا آپ کے اقوال واحادیث کو یاد کرتا تھا۔ مجلس نبوی میں مجھ سے زیادہ عمر والے لوگ ہوتے تھے اس لئے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ (بخاری و مسلم بحوالہ ریاض الصالحین ص ۱۱۴) ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ایک مہم روانہ کی جس میں کئی حضرات شامل تھے آپ نے ہر ایک فرد سے قرآن پڑھوا کر سنا اس کے بعد فاتی علی رجل من احد ثهم سناً۔ ایک آدمی کے پاس آئے جو ان میں سب سے کمسن تھا اور اس سے پوچھا کہ تم نے قرآن کتنا یاد کیا ہے؟ اس نے سورتوں کا نام لیتے ہوئے کہا کہ یہ۔ یہ اور سورہ بقرہ۔ آپ نے پوچھا کیا تم کو سورہ بقرہ یاد ہے؟ اس نے اقرار کیا تو فرمایا کہ چلو تب تم اس سریہ کے امیر ہو۔ (ترمذی بحوالہ جمع الفوائد ص ۱۶۸ ج ۱)۔ مجلس نبوی میں صرف مدینہ اور اطراف کے جوان اور بچے ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ دور دراز مقامات اور مختلف قبائل کے طلبہ یعنی وفود کے ساتھ ان کے بچے بھی ضد کر کے بڑے شوق سے مدینہ آتے تھے۔ حضور ﷺ اور دوسرے حضرات سے قرآن اور دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے

۔ چنانچہ بنی تمیم کے وفد میں تیں لڑکے بھی شامل تھے۔ وفد فزارہ کے ارکان میں حد بن حصن بن قیس بھی تھے جن کے بارے میں تصریح ہے کہ وھو اصغرھم وہ ارکانِ وفد میں سب سے چھوٹے تھے (طبقات بن سعد ص ۲۹۵۔۲۹۷ ج ۱) وفد ابن بکا میں ایک بزرگ معاویہ بن ثور بن عبادہ بھی تھے ان کی عمر سو سال کی تھی ان کے ساتھ ان کا لڑکا بشر بھی تھا ۔ معاویہ بن ثور نے حضور ﷺ سے عرض کیا انی اتبرك بمسك وقد كبرت وابنى هذا بربى فامسح وجهه یعنی میں آپ کو چھو کر برکت حاصل کروں گا میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میرا یہ لڑکا میرے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے آپ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر دیں۔ اس گذارش پر حضور ﷺ نے بشر بن معایہ کے چہرے پر دست مبارک پھیرا۔ (طبقات ابن سعد ص ۳۰۴ ج ۱) وفد ثقیف میں عثمان بن ابوالعاص ثقفی سب سے کم عمر تھے۔ ارکان وفد ان کو اپنی قیام گاہ پر سامان کی حفاظت کیلئے چھوڑ کر خدمت نبوی میں حاضر ہوتے تھے۔ اور جب دوپہر میں حضور ﷺ کے یہاں سے واپس آکر سو جاتے تو عثمان بن ابوالعاص چپکے سے ان سے چھپ چھپا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر دین کی باتیں معلوم کرتے اور آپ سے قرآن پڑھتے۔ اس طرح حضورؐ کی زبان مبارک سے سن کر کئی سورتیں یاد کرلیں اور اگر حضورؐ کو آرام فرماتے ہوئے دیکھتے تو حضرت ابو بکر اور ابی بن کعب کے پاس جاکر دینی باتیں معلوم کرتے اور ان سے قرآن پڑھتے تھے۔ ان کے اس دینی و علمی شوق اور محنت سے حضور بہت خوش ہوئے اور ان سے اظہار محبت فرما کر ان ہی کو اہل طائف کا امیر بنایا۔ حالانکہ وہ ان لوگوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

(طبقات بن سعد ص ۵۰۸ ج ۵)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عہد رسالت میں مستقل اور علیحدہ مکاتب تو نہ تھے بلکہ طلبہ مجلس نبوی میں شریک ہو کر قرآن اور دین کی تعلیم حاصل کرتے۔ مدینہ میں گھر گھر قرآن کی تعلیم کا رواج تھا۔ خانگی مکاتب جاری تھے جن کی وجہ سے صحابہ اور ان کے لڑکے پوتے اور بیویاں تک قرآن کی تعلیم سے بہرہ ور ہوگئیں تھیں ایک مرتبہ حضور ﷺ نے علم دین اٹھ جانے کی بات کہی تو حضرت زیادہ بن بسید انصاری نے آپ

سے عرض کیا۔ کیف یختلس هنا وقد قرأنا القران الخ یعنی علم ہم میں سے کیسے اٹھالیا جائے گا حالانکہ ہم نے قرآن پڑھ لیا۔ خدا کی قسم ہم اس کو پڑھتے ہیں ہماری عورتیں اس کو پڑھتی ہیں ہمارے لڑکے اس کو پڑھتے ہیں۔ (ترمذی ابواب العلم ص ۵۴ ج ۲)

یعنی عہد رسالت میں قرآن اور دین کی تعلیم کیلئے خانگی مکاتب کی کثرت تھی۔

دور فاروقی میں مکاتب کا اجراء

حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں سب سے پہلے بچوں کی تعلیم کے لیے مکتب جاری کر کے اس میں معلم مقرر کیا۔ بعض لوگوں نے اس کو حضرت عمر کی اولیات میں شمار کیا ہے۔ان اول من جمع الأولاد فی المکتب لتعلیم القرآن عمر بن الخطاب۔ یعنی عمر بن خطاب نے سب سے پہلے قرآن کی تعلیم کے لیے بچوں کو مکتب میں جمع کیا۔ محلی ابن حزم اور کنزالعمال میں وضین بن عطا کی روایت ہے۔ کان بالمدینة ثلاثة معلمین یعلمون الصبیان فکان عمر یرزق کل واحد منهم خمسة عشر کل شهر۔

(محلی ابن حزم ص ۱۹۵ ج ۸ کنزالعمال ص ۱۹۲ ج ۲ قدیم)

مدینہ میں تین معلم بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور حضرت عمران میں سے ہر ایک کو ماہوار پندرہ درہم برائے خورد و نوش دیا کرتے تھے حضرت عمر اپنے آل اولاد کو قرآن کی تعلیم حکم دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم لوگ ابتداء میں طوال مفصل کی سورتیں پڑھو وہ آسان ہیں۔ (مصنف ابن عبدالرزاق ص ۳۸۰ ج ۳)

حضرت عبداللہ بن عباس کہا کرتے تھے کہ تین چیزیں لوگوں کے لیے ضروری ہیں ایک حاکم و امیر۔ ورنہ لوگ ایک دوسرے کو تباہ کردیں گے۔ دوسری مصحف کی لین دین ورنہ کتاب اللہ کا پڑھنا پڑھانا بند ہو جائے گا اور تیسری بات یہ ہے کہ۔ و لابد للناس من معلم یعلم اولادهم و یأخذ علی ذالك اجراً ولو لا ذالك لكان الناس امیین

(تربیت الاولاد فی الاسلام ج ا ص ۲۹۱)

یعنی عوام کی اولاد کو تعلیم دینے سے لیے معلم ضروری ہے۔ جو اجرت لے ورنہ لوگ جاہل رہ جائیں گے۔

حضرت عمر نے قرآن کی تعلیم کے لئے عالم، فاضل، اور قابل معلموں کو مقرر کیا۔ اور آپ نے اپنی خلافت میں مستقل مکتب جاری کر کے اپنے امراء کو بھی اس بارے میں حکم دیا۔ قرآن کی کتابت کا انتظام کیا اور کثیر تعداد میں قرآن لکھوا کر تقسیم کرایا۔ آپ کے دور خلافت میں پورے عالم اسلام میں مکاتب کی کثرت، قرآن کی کتابت واشاعت اور اس کے پڑھنے پڑھانے کی سرگرمی کا اندازہ ابن حزم کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو فارس شام جزیرہ اور مصر کے تمام شہر فتح کر لئے گئے۔ ان ملکوں کے ہر شہر اور ہر بستی میں مسجدیں تعمیر کی گئیں ۔ مصاحف لکھے گئے۔ مشرق سے مغرب تک ائمہ مساجد نے قرآن پڑھا اور مکاتب کے بچوں کو پڑھایا۔ دس سال سے زائد مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت عمر کی شہادت کے وقت مصر، عراق، شام، یمن کی حدود میں اگر ایک لاکھ قرآن کے نسخے نہیں تھے تو اس سے کم بھی نہیں تھے۔ اس کے بعد حضرت عثمان کے دور خلافت میں غزوات وفتوحات کا دروازہ اور وسیع ہوا۔ اس دور میں تو عالم اسلام میں قرآن کا شمار ہو ہی نہیں سکتا۔ (الملل والنحل ص ۸۰) اس کے بعد حضرت عثمان نے بھی اپنے بارہ سالہ دور خلافت میں مکاتب میں قرآن کی تعلیم اور ان کے معلموں پر خاص توجہ کی۔ اور حضرت عمر کی طرح مؤذنوں، اماموں اور معلموں کے وظائف مقرر کئے۔

مکتب کے بچوں کی اہمیت :

بڑوں کی نظر میں مکتب کے بچوں کی بڑی اہمیت تھی۔ مشہور تابعی سعید بن حبیب کے بارے میں لکھا ہے کہ کان إذا مر بالمكتب قال للصبيان هؤلاء الناس بعدنا (طبقات بن سعد ج ۵ ص ۱۴۱) یعنی جب وہ مکتب کے پاس سے گزرتے تو فرماتے کہ یہی بچے ہمارے بعد مرجع ہوں گے۔ حضرت سفیان بن عیینہ ایک مرتبہ ایک مکتب کے پاس سے گزر رہے تھے۔ بچوں کے قرآن پڑھنے کی آواز سن کر دھوپ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بچوں کی آواز سے قرآن سن کر کیف وسرور حاصل ہو رہا ہے۔ محدث اسماعیل بن رجاء

مکتب کے بچوں کو جمع کر کے ان کو حدیث سناتے تھے تاکہ یاد ہو جائے۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ سمنون نے محبت الٰہی سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔ فلیس لی فی سواك حظ. فکیف ماشئت فامتحن. اے اللہ! تیرے سوا میرا کسی سے تعلق نہیں تو جیسے چاہے میرا امتحان لے۔ اس کے بعد پیشاب کے قطروں کی بیماری میں ڈال دیئے گئے۔ خواب میں ایک بزرگ سے اس بیماری کی شکایت کی تو انھوں نے کہا کہ علیك بدعاء الکتاتیب یعنی تم مکاتب کے بچوں سے دعا کراؤ۔ اسکے بعد وہ پیشاب کا قارورہ ہاتھ میں لے کر مکتبوں کا چکر لگاتے تھے اور بچوں سے کہتے تھے کہ زبان کی وجہ سے اپنے بیمار چچا کے لئے دعا کرو (تاریخ بغداد ج۹ ص ۲۳۵) (والمنتظم ج۶ ص ۱۰۸) (ملخصاً خیر القرون کی درسگاہیں)

بچوں کے مکاتب کی افادیت واہمیت کے پیش نظر ہر زمانہ اور ہر مقام میں اس کا انتظام کیا گیا۔ اور الحمد للہ آج بھی جب کہ بڑے بڑے دینی مدارس جاری ہیں مسلمانوں کی بستیوں میں ان کا سلسلہ جاری ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے۔ کیوں کہ بچوں کو قرآن اور دینی تعلیم دینا افضل ترین عمل ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم لوگوں میں سب سے اچھا وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کی پرورش پرداخت، تعلیم وتربیت اسی لائن پر کریں جو اسلام کی بچھائی ہوئی ہے۔ اس کے لیے چھوٹی بڑی ہر مسلم آبادیوں میں خصوصاً پسماندہ علاقوں اور طبقوں میں مکاتب کا بہترین نظم ہو تاکہ نونہالانِ قوم کی پرورش وپرداخت صحیح نہج پر ہو اور ان میں عقائد کی پختگی، اخلاق کی درستی، اعمال کی پاکیزگی اسقدر رچ بس جائے کہ انھیں غیروں کا ماحول کبھی بھی متاثر نہ کر سکے۔ اگر خدانخواستہ ہم مکاتب کی بنیادی تعلیم کو سرسری نظر سے دیکھ کر اس کی طرف سے توجہ ہٹالیں اور پھر یہ نونہالانِ قوم لچے لفنگے بچوں کے ساتھ رہ کر غلط لائنوں پر پڑجائیں تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ یہی قوم کی تباہی اور بربادی کا سبب نہ بنیں گے۔

●●●●●●

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ جمادی الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳ شمارہ ۹ فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند	استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۴۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰
ہندوستان سے ۔/۶۰

Tel : 01336 - 22429

FAX : 01336 - 22768

Tel. : 01336 - 24034 (EDITER)

REGD NO. SHN/L-13/NP-111/98

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ

☆☆ ختم خریداری کی اطلاع ☆☆

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہو گا۔

پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبد الستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند کی معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

مولانا حبیب الرحمن قاسمی

علمائے دیوبند کا مسلک

محدثین دہلی کے چشمۂ علم و معرفت سے سیراب علمائے دیوبند اپنے مسلک اور دینی رخ کے لحاظ سے کلیۃً اہل سنت والجماعت ہیں پھر وہ خود روقسم کے اہل سنت نہیں بلکہ اوپر سے ان کا سندی سلسلہ جڑا ہوا ہے اس لئے مسلک کے اعتبار سے وہ نہ کوئی جدید فرقہ ہیں نہ بعد کی پیداوار ہیں بلکہ وہی قدیم اہل سنت والجماعت ہی کا مسلسل سلسلہ ہے جو اوپر سے سند متصل اور استمرار کے ساتھ کابراًعن کابرٍ چلا آرہا ہے۔

علمائے دیوبند کے اس جامع، افراط و تفریط سے پاک مسلک معتدل کو سمجھنے کے لئے خود لفظ اہل سنت والجماعت میں غور کرنا چاہئے جو دو اجزاء سے مرکب ہے، ایک "السنۃ" جس سے اصول، قانون اور طریق نمایاں ہیں اور دوسرا "الجماعۃ" جس سے شخصیات اور رفقاء طریق نمایاں ہیں۔ اسی ترکیب سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اس مسلک میں اصول و قوانین بغیر شخصیات کے اور شخصیات بغیر قوانین کے معتبر نہیں کیوں کہ قوانین ان شخصیات ہی کے راستے سے آئے ہیں اس لئے ماخوذ کو لیا جانا اور ماخذ کو چھوڑ دینا کوئی معقول مسلک نہیں ہو سکتا۔

اسی حدیث "ماانا علیہ واصحابی" میں بہتر فرقوں میں سے فرقہ ناجیہ کی نشاندھی فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے معیار حق ان ہی دونوں چیزوں کو قرار دیا ہے "ما" سے اشارہ اسی السنۃ یعنی طریق نبوی یا قانون دین کی طرف ہے اور "انا واصحابی" سے اشارہ "الجماعۃ" یعنی برگزیدہ شخصیات کی طرف ہے۔ بلکہ مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں

اصحابی کی جگہ "الجماعۃ" کا صریح لفظ موجود ہے۔ ان سب (صحابہ) تابعین، ائمہ مجتہدین اور علمائے راسخین کی عظمت و محبت، ادب واحترام اور متابعت و پیروی اس مسلک کا جوہر ہے۔ کیوں کہ ساری دینی شخصیتیں ذات نبوی سے انتساب کی بدولت وجود میں آئی ہیں۔ پھر مختلف علوم دینیہ میں کمال حذاقت و مہارت اور خداداد فراست و بصیرت کے لحاظ سے ہر شعبۂ علم میں ائمہ اور اولوالامر پیدا ہوئے۔ جنھیں اس شعبۂ علم میں اولوالامر مانا گیا اور امام و مجتہد کے نام سے انھیں یاد کیا گیا۔ مثلاً ائمۂ اجتہاد (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ وغیرہ) ائمۂ حدیث مثلاً (امام بخاریؒ امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ امام طحاویؒ وغیرہ) ائمۂ احسان واخلاص مثلاً (اویس قرنی، فضیل بن عیاض، جنید و شبلی، معروف کرخی وغیرہ) ائمۂ درایت و تفقہ مثلاً (ابویوسف محمد حسن مزنی، ابن رجب وغیرہ) ائمۂ حکمت و حقائق مثلاً (امام رازی، امام غزالی وغیرہ) ائمۂ کلام مثلاً (ابوالحسن اشعری ابو منصور ماتریدی وغیرہ) اور اسی قسم کی دین کی اور برگزیدہ شخصیتیں ہیں جنکی درجہ بدرجہ توقیر و عظمت مسلک دیوبند میں شامل ہے۔ پھر ان تمام دینی شعبوں کے اصول و قوانین کا خلاصہ دو ہی چیز ہیں، عقیدہ و عمل، عقیدے میں بنیادی اور تمام عقائد کی اساس عقیدۂ توحید ہے اور عمل میں سارے اعمال کی بنیاد اتباع سنت ہے۔

توحید :

مسلک دیوبند میں عقیدۂ توحید پر بطور خاص زور دیا جاتا ہے تاکہ اس کے ساتھ شرک یا موجبات شرک جمع نہ ہو سکے اور کسی بھی غیر اللہ کی اس میں شرکت نہ ہو۔ ساتھ ہی تعظیم اہل اللہ اور ارباب فضل و کمال کی توقیر کو عقیدۂ توحید کے منافی سمجھنا مسلک کا کوئی عنصر نہیں۔

خاتم الانبیاء سیدنا محمد ﷺ :

علمائے دیوبند کا یہ ایمان ہے کہ سیدنا محمد رسول ﷺ افضل البشر اور افضل الانبیاء

ہیں مگر ساتھ ہی آپ کی بشریت کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ وہ آپؐ کے علوِ درجات کو ثابت کرنے لئے حدودِ عبدیت کو توڑ کر حدودِ معبودیت میں پہنچادینے سے کلی احتراز کرتے ہیں۔ وہ آپ کی اطاعت کو فرض عین سمجھتے ہیں مگر آپ کی عبادت کو جائز نہیں سمجھتے۔ وہ برزخ میں آپ ﷺ کی حیات جسمانی کے قائل ہیں مگر وہاں معاشرت دنیوی کے قائل نہیں وہ آپؐ کے علم عظیم کو ساری کائنات کے علم سے بدرجہا زیادہ جانتے ہیں پھر بھی اس کے ذاتی و محیط ہونے کے قائل نہیں۔

صحابہ کرام :

علمائے دیوبند تمام صحابہ کی عظمت و جلالت کے قائل ہیں البتہ ان میں باہم فرق مراتب ہے تو عظمت مراتب میں بھی فرق ہے ۔ لیکن چونکہ نفسِ صحابیت میں کوئی فرق نہیں اس لئے محبت و عقیدت میں بھی فرق نہیں پڑسکتا۔ پس "الصحابة کلھم عدول" اس مسلک کا سنگ بنیاد ہے۔ صحابہ بحیثیت قرن خیر من حیث الطبقہ ہیں، پوری امت کے لئے معیار حق ہیں۔ علمائے دیوبند انھیں غیر معصوم کہنے کے باوجود ان کی شان میں بدگمانی بد زبانی کو جائز نہیں سمجھتے اور صحابہ کے حق میں اس قسم کا رویہ رکھنے والے کو حق سے منحرف سمجھتے ہیں علمائے دیوبند کے نزدیک ان کے باہمی مشاجرات میں خطا و صواب کا تقابل ہے حق و باطل یا طاعت و معصیت کا نہیں اس لئے ان میں سے کسی فریق کو تنقید و تبصرہ کا نشانہ بنانا جائز نہیں۔

صلحائے امت اور سلوک و احسان :

علمائے دیوبند تمام صلحاء امت و اولیاء اللہ کی محبت و عظمت کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن اس تعظیم و محبت کا یہ معنی نہیں لیتے کہ انہیں یا ان کی قبروں کو سجدہ و طواف اور نذر و قربانی کا محل بنالیا جائے۔ وہ اہل قبور سے فیض کے قائل ہیں استمداد کے نہیں، حاضری قبور کے قائل ہیں مگر ان کے عید گاہ بنانے کے قائل نہیں۔ وہ ایصال ثواب کو مستحسن اور

اموات کا حق سمجھتے ہیں، مگر اس کی نمائشی صورتیں بنانے کے قائل نہیں جنھیں مخصوص وضع کردہ اصطلاحات نیاز، فاتحہ وغیرہ عنوانات سے ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ تہذیب اخلاق تزکیۂ نفس اور عبادات میں قوت احسان پیدا کرنے کے لئے اہل اللہ کی بیعت وصحبت کو حق اور طریق احسانی کے اصول وہدایت کو تجربۃً مفید اور عوام کے حق میں ایک حد تک ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اسے شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے بلکہ شریعت ہی کا باطنی واخلاقی حصہ مانتے ہیں۔

فقہ اور فقہا:

علمائے دیوبند احکام شرعیہ، فرعیہ، اجتہادیہ میں فقہ حنفی کے مطابق عمل کرتے ہیں بلکہ برصغیر میں آباد لگ بھگ پچاس کروڑ مسلمانوں میں نوے فیصد کا یہی مسلک ہے۔ لیکن اپنے اس مذہب ومسلک کو آڑ بنا کر دوسرے فقہی مذاہب کو باطل ٹھرانے یا ائمہ مذاہب پر زبانِ طعن دراز کرنے کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ یہ حق وباطل کا مقابلہ نہیں ہے۔ دین کے بارے میں آزادی نفس سے بچنے اور خود رائی سے دور رہنے کے لئے کسی ایک امام کی تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہی امت کے سواد اعظم کا طریق مختار ہے۔ باب تقلید میں بھی علمائے دیوبند کا مسلک افراط وتفریط سے پاک ہے وہ کسی بھی امام مجتہد یا اس کے فقہ کی کسی جزئی کے بارے میں تمسخر، سوئے ادب یا رنگ ابطال وتردید سے پیش آنے کو خسران دنیا وآخرت سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ اجتہادات شرائع فرعیہ ہیں شرائع اصلیہ نہیں کہ اپنے فقہ کو موضوع بنا کر دوسروں کی تردید یا تضلیل کریں البتہ اپنے اختیار کردہ فقہ پر ترجیح کی حد تک مطمئن ہیں۔ مذکورہ امور میں علمائے دیوبند کا یہ مسلک اعتدال ان کی شروح حدیث وتفسیر اور فقہی وکلامی مؤلفات میں دلائل وبراہین کی روشنی میں پوری تفصیل کے ساتھ مرقوم ہیں اس مختصر تحریر میں ان ساری تفصیلات کے اعادے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی مناسب۔

اختر اسلم علائی مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف سمستی پور، بہار، الہند

خدا کا بھید خدا ہی جانے، جو جتنا اس سے قریب وہ اتنا ہی مشکلات سے دوچار، جس کے لیے سب کچھ بنایا گیا اسی کے لیے کچھ نہیں، جو ساری دنیا کو خوشیاں بانٹنے کے لیے آیا وہ خود ظاہری اسباب خوشی سے محروم، جس کے دم قدم سے سارے عالم کو جلا ملا خود اسی کا آشیانہ اجالوں سے خالی، جس کے نفس مسیحائی سے ہر بلا ٹل جاتی تھی، خود اس کے سر پر مصائب کے بادل منڈلاتے ہوئے، جو سارے عالم کے لیے گلدستہ رحمت بن کر آیا خود اس کا گرد و پیش کانٹوں سے لبریز، جس کا دل کسی کا دکھ درد دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا خود اس کے حق میں لوگوں کے دل پتھر، جس کو ایک عورت کی ماتا کا اتنا خیال کہ روتے بچے کی آواز سن کر اپنی نماز مختصر کر دے، اسی صنف نسواں کی ایک فرد ابولہب کی بیوی اس کے راستے میں کانٹے بچھاتی ہوئی، جس کو قوم کے بچوں سے اتنا پیار کہ راہ چلتے کوئی بچہ مل جاتا تو اس کو اٹھا کر گلے لگا لیتے، چومتا اور بوسہ دیتا، طائف میں اسی قوم کے بچوں نے اپنے بڑوں کے کسانے پر ایسی سنگباری کی کہ رحمت مجسم کا پورا وجود لہولہان ہو گیا۔

دنیا کی سب سے مظلوم شخصیت:

ایک موقعہ پر خود رحمت عالم نے اپنے ان صبر آزما حالات کی طرف اشارہ فرمایا،
حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
اللہ کے راستے میں مجھے اتنا ڈرایا دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ڈرایا گیا، اور اللہ کی راہ میں مجھے اتنا ستایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ستایا گیا۔ اور ایک دفعہ تیس رات دن مجھ پر اس حال میں گذرے کہ میرے اور بلال کے لیے کھانے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھاسکے، سوائے اس کے جو بلال نے اپنی بغل کے اندر چھپا رکھتا تھا۔ (شمائل ترمذی)

حضرت عائشہؓ کے ایک سوال پر آپ نے فرمایا:
"تیری قوم سے جو تکلیفیں پہنچیں وہ پہنچیں، لیکن میرے لیے سب سے زیادہ سخت دن وہ تھا جس دن میں نے اپنے آپ کو عبدیالیل کے بیٹے پر پیش کیا۔ اس نے میری بات کو قبول نہیں کیا، میں وہاں سے انتہائی غمگین اور رنجیدہ واپس ہوا،

(سیرۃ المصطفیٰ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ص ۸۷ ج ۱)

حضور کا غم:

عبداللہ بن شخیر سے روایت ہے کہ آپ برابر مغموم رہتے تھے، کسی وقت آپ کو چین نہ تھا، ۔ (اسوۂ رسول اکرم ص ۷۳)

اس کیفیت میں جہاں فکر آخرت، فکر امت، مشاہدۂ تجلیات اور ترقی درجات کا دخل تھا، وہیں قوم کی طرف سے پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات کا بھی حصہ تھا۔ اور یہ ایک فطری بات تھی، جس قوم کی دعوت وہدایت کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا اور یہاں تک تاکید کی گئی کہ

یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآاُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ. (مائدہ ۶۷)

اے پیغمبر! جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ اپنی قوم تک پہنچایئے، اور اگر آپ

نے ایسا نہیں کیا تو آپ کی تبلیغ رسالت کا عمل ناقص رہ جائے گا۔

اس لیے اس ذمہ داری سے بہر حال آپ کو سبکدوش ہونا تھا، مگر قوم کا حال یہ تھا کہ وہ ایک بات سننے کو تیار نہ تھی۔ جس قوم کو پیار ومحبت سے قریب لانے کا حکم تھا اس کے پاس رسولِ رحمت کے لیے سوائے نفرت وعداوت کے کچھ نہ تھا، اس کی تو کوشش تھی کہ

لَاتَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ. (حم سجدہ ۲۶)

اس قرآن پر کان نہ دھرو اور شور مچاؤ تاکہ تمھیں غلبہ حاصل ہو۔

اس صورت حال سے نبی رحمت کو کتنا صدمہ پہنچا ہوگا؟ اور آپ کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی؟ وہ اندازے سے باہر ہے۔

تلخ پس منظر:

حضور بے شمار بلند اقدار وکمالات کے مالک تھے، آپ نے اپنی حیات ہی میں عرب پر اخلاقی فتح کے ساتھ سیاسی فتح بھی حاصل کی۔ اور ایک شاندار اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے علاوہ آپ کو اور بھی بہت سی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن ان کے پیچھے کتنا طویل آزمائشی دور آپ پر گذرا ہے، اور کتنے سخت حالات کا آپ نے سامنا کیا۔ اور کتنی استقامت کے ساتھ آپ نے ان کا مقابلہ کیا وہ سیرت طیبہ کا اہم ترین باب ہے۔ آپ کی زندگی میں فتوحات کے مقابلے میں ناخوشگوار حادثاتی واقعات کی تعداد زیادہ ہے، ......اور حادثات بھی ہر طرح کے...... گھریلو نوعیت کے بھی، اور سیاسی وسماجی نوعیت کے بھی، اپنوں کی جانب سے بھی اور غیروں کی طرف سے بھی، جان پر بھی بنی اور اہل وعیال اور عزت وآبرو اور مال پر بھی۔

سامانِ تسکین:

ہمارے سامنے سیرت طیبہ کا یہ حصہ بھی رہنا ہے، اس میں قیامت تک کے لیے عبرت وموعظت اور تسلی وتشفی کا سامان موجود ہے، ہر انسان کی زندگی میں کم وبیش پریشانیاں آتی ہیں، پریشانی کے سخت ترین لمحات میں اگر انسان نے حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی پریشانیوں کا خیال کرتے اور ایک طرف حضور کی حقیقی عظمت کا تصور کرے اور دوسری طرف واقعات کی شدت وکرب کا، اور پھر اپنا ان سے موازنہ کرے تو اس کو اپنا غم غلط ہوتا ہوا محسوس ہوگا۔

سلام اس پر کہ جس نے زخم کھاکر بھی عطائیں کی
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دی

واقعات کی کمی نہیں ہے، کتبِ سیرت واقعات سے لبریز ہیں مگر عبرت کے لیے چند نمونے پیش کیے جارہے ہیں۔

یتیمی کا داغ:

۱- آپ کی ظاہری حیاتِ دنیوی کا آغاز یتیمی کے ساتھ ہوا۔ آپ بطن مادر ہی میں تھے کہ آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کا انتقال ہوگیا۔

(زرقانی ص ۱۰۹، مستدرک حاکم ص ۶۰۵ ج ۲)

اس دور میں یتیمی کو ایک بدنما داغ سمجھا جاتا تھا، اس طرح آپ کی زندگی کا آغاز ہی حادثاتی تھا جو اس دور کی روایت کے مطابق بہت سی المناکیاں اپنے ساتھ لایا تھا۔ جس سوسائٹی میں آپ نے جنم لیا تھا اس میں یتیم کا کوئی مقام نہ تھا اور نہ اس کا کوئی حق مانا جاتا تھا، ...... یوں تو پوری قوم ہی ناخواندہ تھی لیکن اگر اس کے یہاں بچوں کے پڑھنے پڑھانے کا مزاج بھی ہوتا تب بھی یتیم کے لیے جو صورت حال قائم تھی، اس میں کسی یتیم کی تعلیم وتربیت کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔

ان حالات میں ایک یتیم پر نبوت بلکہ ختم نبوت کا بوجھ ڈالنا، اور صرف مکہ یا عرب کو نہیں بلکہ سارے عالم کو دعوت دینے کی ذمہ داری دینا کس قدر آزمائشی مقام تھا............ مگر آپ نہ صرف اس آزمائش میں پورے اترے بلکہ یتیم کو دریتیم بنادیا۔ آپ نے اس بدنما داغ کو نشانِ محبت وافتخار سے بدل دیا۔ اور دنیا کے یتیموں کو وہ مقام دیا، جو انسانی تاریخ میں کسی قائد و پیشوا نے نہیں دیا تھا۔

یا رب صل و سلم دائما ابداً   علی حبیبك خیر الخلق كلهم

جس بچہ کو سب نے چھوڑ دیا:

۲- آپ کے بچپن کی وہ گھڑی بھی کتنی المناک ہے جب چند روز ماں کا اور پھر ثوبیہ کا دودھ پینے کے بعد شرفائے عرب کے دستور کے مطابق شیر خواری کے لیے قبائلی عورتوں کے حوالہ کرنے کا نمبر آیا، تو مکہ آئی ہوئی بنو سعد کی تمام عورتوں نے آپ کو لینے سے انکار کر دیا کہ یہ یتیم بچہ ہے اس کے گھر والوں سے کوئی معقول انعام ملنے کی توقع نہیں ہے، آپ ہر عورت کے سامنے پیش کیے گئے مگر آپ کی غربت و یتیمی آڑے آگئی۔

ایک حلیمہ سعدیہ ہی وہ خاتون بچ گئیں جن کے حصے میں اتفاق سے کوئی بچہ نہیں آیا، اور ان کو گوارا نہ تھا کہ ساری عورتیں ساتھ میں بچہ لیکر جائیں اور وہ خالی ہاتھ واپس ہوں، اپنی اس محرومی سے بچنے کے لیے مجبوراً یتیم بچے کو قبول کرنے پر تیار ہو گئیں،...... حالات کی مجبوری بھی تھی اور کچھ غیبی داعیہ بھی پیدا ہوا.......... انھوں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں اس یتیم بچے کو لانا چاہتی ہوں، شوہر نے کہا، حرج نہیں، شاید یہ ہمارے لیے باعث خیر و برکت ہو۔ (سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۵۶، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۲۱)

سوچنے کی بات ہے کہ جو بچہ مقصودِ کائنات تھا، بزم کون و مکاں کی ساری رونق جس کے دم سے قائم تھی اور جو نہ ہوتا تو دنیا کی کوئی عورت ایک بچہ بھی جنم نہ دے سکتی تھی۔ بلکہ زمین و آسمان کا یہ سلسلہ قائم نہ ہوتا۔

لولا محمد ماخلقت السموات و الارضین (مستدرک حاکم)

اگر محمدؐ نہ ہوتے تو میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا نہ کرتا۔

آج اسی بچے کو ٹھکرایا جا رہا تھا، جس کے لیے سب کچھ تھا اسی کو لینے کے لیے کوئی تیار نہ تھا، حلیمہ نے لیا بھی تو پوری خوشی سے نہیں، وہ تو قسمت نے ان کا ساتھ دیا، اور مقدر نے ان کی یاوری کی، اس لیے اس منزل پر پہنچ گئیں جہاں بظاہر بڑے بڑے نصیب والی عورتیں نہ پہنچ سکیں۔ جس کا احساس حلیمہ کے شوہر کو تھوڑی دیر کے بعد ہو گیا، وہ بول اٹھے۔

حلیمہ سمجھ لو! تم کو بہت مبارک بچہ مل گیا ہے۔ (سیرۃ ابن ھشام) ۔

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے نقش روئے محمد سجایا گیا
پھر اسی نقش سے روشنی مانگ کر بزمِ کون و مکاں کو سجایا گیا

ماں کی ممتا سے محرومی:

۳- باپ کا سایہ تو خیر ملا ہی نہیں، پیدائش سے قبل ہی والد ماجد جوانی کی موت دنیا سے جاچکے تھے۔ ایک ماں کی ممتا تھی چھ سال کی عمر میں وہ بھی چھن گئی، والدہ ماجدہ حضرت آمنہ ام ایمن کے ہمراہ مدینہ گئی تھیں، ایک ماہ کے قیام کے بعد مکہ سے واپس آرہی تھیں کہ راستہ میں مقام ابواء پر حالت مسافرت میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اور اپنے لاڈلے بیٹے کو اللہ کے حوالہ کرگئیں، اور یہ آغوش مادر وہیں کی آغوشِ خاک میں ہمیشہ ہمیش کے لیے دفن ہوگئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون (زرقانی ص ۱۶۴ج۱)

یعنی سارے سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے جارہے ہیں، دل دنیا سے اٹھتا جارہا ہے، محبت و اعتماد کے تمام ظاہری طلسم بکھرتے جارہے ہیں، اور خالص خدا کے ساتھ تعلق کا سامان کیا جارہا ہے، ...... لیکن ایک ننھے معصوم بچے کی حیثیت سے دیکھئے تو یہ کتنا بڑا سانحہ ہے؟ جس بچہ کا نہ باپ اور نہ ماں، سوسائٹی میں وہ بچہ کتنا قابل رحم ہو جاتا ہے؟

دادا کا سہارا بھی جاتا رہا:

۴- حالت غربت و مسافرت میں ماں بھی دنیا سے چلی گئیں، ساری زندگی کا سفر اپنی جگہ ابھی تو ابواء سے مکہ تک کا سفر سامنے ہے، ام ایمن نے آپ کو آپ کے دادا عبدالمطلب کے پاس پہنچادیا۔ جن کی عمر اس وقت اسی، تراسی، ترانوے، ایک سو سات، یا ایک سو سترہ سال تھی۔ (مختلف اقوال ہیں)

حضرت عبدالمطلب نے آپ کو پورا پیار دیا، اپنے بچوں سے زیادہ آپ کا خیال رکھا، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے، مسجد حرام جاتے تو یتیم پوتے کو بھی ساتھ لے جاتے اور کعبہ کی دیواروں کے سایے میں عبدالمطلب کے لیے ایک خاص فرش بچھایا جاتا جس پر کسی

کو بھی قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی، خود عبدالمطلب کی اولاد کو بھی نہیں.......... مگر یتیم پوتا اس پر بے تکلف بیٹھ سکتا تھا، عبدالمطلب کے لڑکے اس کو ہٹانا چاہتے تو عبدالمطلب روک دیتے اور کہتے کہ خدا کی قسم میرے اس بیٹے کی شان نرالی ہے۔ حضرت عبدالمطلب آپ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے تھے۔

کندیر بن سعید اپنے باپ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں اسلام سے قبل میں حج کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو دیکھا کہ ایک شخص طواف میں مصروف ہے، تو دیکھا کہ ایک شخص طواف میں مصرف ہے، اور یہ شعر گنگنا رہا ہے۔

یارب ردہ و اصطنع عندی یداً   ردّاً إلی راکبی مُحمداً

اے اللہ میرے سوار کو واپس بھیجدے، اور مجھ پر عظیم احسان فرما۔

میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے کہا یہ عبدالمطلب ہیں، اپنے پوتے "محمد" کو گمشدہ اونٹ کی تلاش میں بھیجا ہے، کیوں کہ ان کو جس کام کے لیے بھیجتے ہیں اس میں ضرور کامیابی ہوتی ہے، پوتے کو گئے ہوئے دیر ہو گئی ہے اس لیے بے چین ہو کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں، کچھ دیر گذری تھی کہ آپ واپس آگئے، اونٹ آپ کے ہمراہ تھا، دیکھتے ہی عبدالمطلب نے آپ کو گلے لگالیا اور کہا بیٹا! میں تمھاری وجہ سے بہت پریشان ہو گیا، اب میں تم کو کبھی اپنے سے الگ نہ ہونے دوں گا۔

(مستدرک رص ۶۰۲ ج ۲ سیرۃ المصطفیٰ ص ۸۷ / ج ۱)

مگر بوڑھے عبدالمطلب کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے، ابھی دادا جان کے زیر سایہ رہتے ہوئے دو سال ہی گذرے تھے کہ سب سے زیادہ چاہنے والے دادا جان بھی آپ کو دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ .

ام ایمن کہتی ہیں کہ جب عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو دیکھا گیا کہ آپ جنازے کے پیچھے پیچھے روتے جارہے تھے۔ (طبقات ابن سعد ص ۷۴—۷۵ / ج ۱)

آٹھ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، مگر اتنی ہی عمر میں آپ کو داغ پر داغ سہنے پڑے

...... بھروسے کے کتنے بندھن ٹوٹتے چلے گئے........... فانی بدایونی نے اپنی سطح سے اپنی کیفیات کی ترجمانی کی ہے، در یتیم کا تو کہنا ہی کیا،

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

بکریوں کی چرواہی:

۵- حضرت حلیمہ کے یہاں قیام کے دوران ہمارے حضورؐ نے اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ بکریاں بھی چرائی ہیں، بلکہ جوان ہونے کے بعد بھی چرائی ہیں،...... حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ مقام الظہر ان میں ہم نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ تھے کہ وہاں پیلو کے پھل چننے لگے، آپ نے فرمایا کہ سیاہ دیکھ کر چنو وہ زیادہ خوش ذائقہ اور لذیذ ہوتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپ بکریاں چرایا کرتے تھے؟ (جس سے آپ کو یہ معلوم ہوا) آپ نے فرمایا ہاں! کوئی نبی نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ (بخاری کتاب الاطعمۃ)

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی ایسا نبی نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں، صحابہ نے عرض کیا۔ آپؐ نے بھی؟ آپ نے ارشاد فرمایا، ہاں میں بھی اہل مکہ کی بکریاں چند قیراط پر چرایا کرتا تھا۔

(بخاری شریف کتاب الاجارہ ص ۳۰۱/ ج ۱)

نسائی نے نصر بن حزن سے روایت کیا ہے کہ ایک بار اونٹ والے اور بکریاں والے آپس میں فخر کرنے لگے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰ نبی بناکر بھیجے گئے اور بکریوں کے چرانے والے تھے، داؤد نبی بناکر بھیجے گئے اور وہ بھی بکریاں چرانے والے تھے، اور میں نبی بناکر بھیجا گیا اور میں بھی اپنے گھر والوں کی بکریاں مقام اجیاد میں چرایا کرتا تھا۔ (فتح الباری ص ۴۶۴/ ج ۴)

بکریاں چرانے کا عمل مقصد کے لحاظ سے معمولی نہیں، یہ امت کی گلہ بانی کا دیباچہ

اور پیش خیمہ بھی بنتا ہے، اسی لیے یہ تمام انبیاء کی سنت رہی ہے۔...... لیکن اس نقطہ نظر سے دیکھئے کہ مستقبل کا ایک عظیم الشان نبی کسب معاش کے لیے چند قیراط پر اہل مکہ کی بکریاں چرا رہا ہے۔ اور وہ بکریوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے جس کے پیچھے ساری دنیا کو بھاگنا چاہیے.......... اللہ کا بھید اللہ ہی جانے۔

جائے پناہ:

۶- یہ تو اس دور کی باتیں ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم باقاعدہ مبعوث نہیں ہوئے تھے، بعثت کے بعد تو طوفانوں کا جیسے منہ ہی کھل گیا، اسی آسمان کے نیچے ستم انگیزیوں کے وہ وہ مناظر سامنے آئے کہ ظلم و ستم کی پچھلی تمام داستانیں پیچھے رہ گئیں، بعثت کے بعد مسلسل تین سال تک دعوت و تبلیغ کی تمام تر کارروائی خفیہ طور پر انجام دی جاتی رہی، کوہِ صفا کے دامن میں ارقم بن ارقم کا مکان مسلمانوں کی واحد جائے پناہ، عبادت گاہ، پیغمبر اعظم کی قیام گاہ اور اسلامی دار الصدر رہا، یہ بجائے خود ایک المیہ تھا، کہ جو بات سب سے زیادہ سچی تھی اور جس کو سب سے زیادہ کھل کر کہا جانا چاہیے تھا، وہ مشرکین کے خوف سے دبے دبے طور پر کہی جا رہی تھی اور جو ساری انسانیت کا پیغمبر مطلق تھا، وہ خود انسانوں کے خوف سے الگ ایک پہاڑی مکان میں روپوش تھا.......... ابھی خدا کا حکم یہی تھا اور مصلحت بھی یہی تھی کہ اسلام کے چاہنے والوں کی خفیہ تنظیم قائم ہو،.......... جس کا صدر دفتر ارقم کا مکان ہو، خود ارقم ساتویں نمبر کے مسلمان تھے، اس دار ارقم میں مسلمان ہونے والوں کی فہرست کے آخری فرد حضرت عمر فاروق تھے۔ (الاصابۃ ص ۲۸)

کوہِ صفا سے پہلی دعوت کا حشر:

۷- تین سال کے بعد اعلانیہ دعوتِ اسلام کا حکم نازل ہوا،

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ.

جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اس کا صاف صاف اعلان کیجیے، اور مشرکین کی پرواہ نہ کیجیے۔

وَ قُلْ اِنِّیْ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ.

اور یہ اعلان کر دیجیے کہ میں کھلا ڈرانے والا ہوں۔

چناں چہ آپ پوری قوم کو مخاطب کرنے کے لیے کوہِ صفا پر چڑھ گئے۔ اور بلند آواز سے ایک ایک قبیلہ کا نام لیکر بلانا شروع کیا۔ اس آواز سن کر ملک عرب کے دستور کے مطابق لوگ آآکر جمع ہونے لگے، جب تمام لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا اے قریش! اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ صبح کو یا شام کو تم پر دشمن حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم لوگ مجھ کو سچا جانو گے، سب نے یک زبان ہو کر کہا، ہاں! ہم نے ہمیشہ آپ کو سچا پایا ہے، آپ ہمارے درمیان امین صادق اور قابل اعتماد شخص ہیں.......... قریش کی طرف سے یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا کہ اچھا میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ اللہ کا عذاب نزدیک ہے، اللہ پر ایمان لاؤ تاکہ عذابِ الٰہی سے بچ جاؤ ... یہ سنتے ہی عام قریش ہنس پڑے اور ابولہب کو غصہ آگیا، جس ابولہب نے حضورؐ کی ولادت پر اپنی باندی ثوبیہ کو مارے خوشی کے آزاد کر دیا تھا۔ آج اس کو اپنے پاکباز اور راست باز بھتیجے کی سچی بات پر اتنا غصہ آیا کہ بھرے مجمع میں کہہ دیا کہ ہلاکت ہو تم پر کیا اسی کے لیے تم نے ہم کو جمع کیا تھا؟ اس کے بعد مجمع منتشر ہوگیا اور لوگ اپنے اپنے گھر باتیں بناتے ہوئے چلے گئے۔ (تاریخ اسلام ص ۱۰۳ ر ج ا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ کتنا سخت ترین لمحہ تھا اس کا اندازہ کسی بھی درجے میں وہی شخص کر سکتا ہے، جس کو کبھی اپنی قوم کی جانب سے اس طرح کا حادثہ پیش آیا ہو،...... ..... جن لوگوں کو حضورؐ کی صداقت، دیانت اور امانت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ بڑے سے بڑے معاملے میں بوڑھے بزرگوں کو چھوڑ کر آپ کو حکم بنانے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور اپنی امانتیں رکھوانے میں نہیں ہچکچاتے تھے، اور جو قوم آپ کو اس درجہ سچا مانتی تھی کہ آپ کی خبر پر مرنے مارنے پر تل سکتی تھی، اسی قوم کے سامنے جب آپ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور عذاب الٰہی کی پیش گوئی کی تو سب نے اس کو ہنسی میں اڑا دیا، اور خود رشتہ کے چچا نے سب کے سامنے کھری کھوٹی سنا دی، لعنت ملامت کر دی اور ذرا بھی عزت کا خیال نہ رکھا۔

حضورؐ کے اعتماد کو اس سے کیا صدمہ پہنچا ہوگا؟ اور آپ کے دل پر کیا بیتی ہوگی؟

دستر خوان کی بھی لاج نہ رکھی :

۸- چند روز کے بعد خدا کا یہ حکم نازل ہوا کہ

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ.

پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کو کفر و شرک سے ڈرائیے!

اس حکم کی تعمیل کے لیے آپ نے دعوتِ طعام کا پروگرام بنایا، کہ انسان، انسان کا حق نمک ادا کرتا ہے، اس کے علاوہ دعوت کے دستر خوان پر میزبان کو اپنے مہمانوں سے پوری یکسوئی کے ساتھ بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مہمان بھی اپنے میزبان کی بات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ غرض بہت کچھ سوچ کر آپ نے دعوتِ اسلام کے پروگرام کو دعوتِ طعام سے جوڑ دیا۔ حضرت علی کو آپ نے ضیافت کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی نے انتظام مکمل کر لیا اور وقت مقررہ پر دعوت کے مطابق حضورؐ کے تقریباً چالیس قریبی رشتہ دار جمع ہوگئے، دستر خوان چن دیا گیا۔ لیکن کھانا کھانے کے بعد آپ نے تقریر کرنی چاہی تو ابولہب نے ایسی بیہودہ باتیں شروع کر دیں کہ آپ کو تقریر کا موقعہ ہی نہ ملا، اور لوگ منتشر ہوگئے، دوسرے روز آپ نے پھر ضیافت کا انتظام فرمایا اور اپنے رشتہ داروں کو بلایا، جب سب کھانا کھا چکے تو آپ نے ان کو اس طرح مخاطب کیا :

"دیکھو! میں تمھاری طرف وہ بات لیکر آیا ہوں جس سے زیادہ اچھی بات کوئی شخص اپنے قبیلے کی طرف نہیں لایا۔ میں تمھارے واسطے دنیا اور آخرت کی خیر لیکر آیا ہوں بتاؤ اس کام میں کون میرا مددگار ہوگا؟ یہ سن کر سب پر گویا موت کا سناٹا چھا گیا، کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، حضرت علی سے رہا نہ گیا وہ اٹھے اور کہا کہ "اگرچہ میں کمزور اور سب سے چھوٹا ہوں مگر میں آپ کا ساتھ دوں گا" یہ سن کر سب ہنس پڑے اور مذاق اڑاتے ہوئے چلے گئے۔ (الخصائص الکبریٰ ص ۱۲۳، ج ۱)

قریش کی اس حرکت کی المناکی کا تصور کیجیے تو صدیوں بعد بھی آج دل پارہ پارہ

ہونے لگتا ہے۔

صاحبزادیوں کو طلاق پڑی :

۹- ابولہب جس نے مرحوم بھائی عبداللہ کے گھر میں بچہ کی ولادت پر سب سے زیادہ خوشی منائی تھی، ظہور اسلام کے بعد وہی آپ کا سب سے بڑا دشمن بن گیا، دشمنی میں اس نے سماجی، تہذیبی، اور خاندانی کسی بھی روایت کا لحاظ نہیں کیا۔ حضور ﷺ کو طرح طرح سے صدمہ پہنچانا اس نے اپنا نصب العین بنالیا، اس کی دشمنی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حضور ﷺ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم ابولہب کے دونوں بیٹے عتبہ اور عتیبہ سے منسوب تھیں ظہور اسلام کے بعد اس نے اپنے دونوں بیٹوں سے طلاق دلوادی، تاکہ حضور کو اس سے صدمہ پہنچے۔ (سیرۃ المصطفیٰ ص ۱۷۶/ ج۱)

کفر نے نہ معلوم اس طرح کے کتنے صدمات پہنچائے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کو جھیل گئے۔

ماننے والوں کو سزائیں دی گئیں :

۱۰- ایمان لانے اور مسلمان ہوجانے والوں میں کچھ لوگ غلام تھے اور کچھ ایسے تھے جو قبیلے کی طاقت اور رشتہ داروں کی جماعت نہ رکھنے کی وجہ سے بہت کمزور سمجھے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کو اسلام سے مرتد بنانے کے لیے جسمانی ایذائیں دی گئیں، جو لوگ کسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو عام لوگوں کے ایذا پہنچانے میں خدشہ تھا کہ کہیں ان کے قبیلے والے حمایت میں نہ اٹھ کھڑے ہوں، ان کے رشتہ داروں کو آمادہ کیا گیا، کہ وہ خود اپنے مسلمان ہوجانے والے رشتہ دار کو سزا دے کر مرتد بنائیں.......... مسلمانوں کے تمسخر و استہزاء اور سب و شتم کے لیے عام طور پر تیاری کی گئی، کہ دوسروں کو اسلام میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہو، اِدھر آنحضرت ﷺ نے اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کی، اُدھر قریش نے پوری سرگرمی کے ساتھ مخالفت پر کمر باندھ لی،

حضرت بلال، امیہ بن خلف کے غلام تھے، ان کے اسلام لانے کا حال معلوم ہوا تو

امیہ بن خلف نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دینی شروع کیں، گرم ریت پر لٹاکر چھاتی کے اوپر گرم پتھر رکھدیا جاتا، مشکیں باندھ کر کوڑوں سے پیٹا جاتا، بھوکا رکھا جاتا، گلے میں رسی باندھ کر لڑکوں کے سپرد کردیا جاتا، وہ شہر مکہ کے گلی کوچوں میں شہر کے باہر پہاڑیوں میں لیے لیے پھرتے اور مارتے پیٹتے تھے۔ ان تمام ایذاء رسانیوں کو حضرت بلال برداشت کرتے، اور احد احد کا نعرہ لگاتے جاتے تھے، حضرت عمار اپنے والد یاسر اور والدہ سمیہ کے ہمراہ مسلمان ہوگئے تھے، ابوجہل نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، حضرت سمیہ کو ظالم ابوجہل نے نہایت بے دردی سے نیزہ مار کر شہید کردیا، حضرت زہرہ رضی اللہ عنہا کو ابوجہل نے اس قدر مارا کہ مارتے مارتے اندھا کردیا، غرض بہت سے غلام اور لونڈیاں تھیں جن کو ایسی ایسی سخت سزائیں دی گئیں، کہ ان کے تصور سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، مگر اسلام ایسی زبردست طاقت کا نام ہے کہ سنگ دل کسی کو بھی مرتد بنانے میں کامیاب نہ ہوئے۔

حضرت عثمان بن عفان قبیلہ بنو امیہ کے ایک امیر آدمی تھے مسلمان ہوجانے کے سبب ان کے چچا نے ان کو رسیوں سے باندھ کر خوب مارا اور طرح طرح کی جسمانی ایذائیں پہنچائیں، حضرت زبیر بن العوام کو ان کا چچا چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیا کرتا تھا۔ قریب تھا کہ وہ ان کو جان سے مار ڈالتے، مگر حضرت عباس بن عبدالمطلب نے قریش کو یہ کہہ کر روکا کہ اس شخص کا قبیلہ بنو غفار تمھارے تجارتی قافلوں کے راستے میں آباد ہے وہ تمھارے ناک میں دم کردیں گے۔ ...... حضرت عبداللہ بن مسعود کو بھی اسی طرح صحن کعبہ میں مارتے مارتے بے ہوش کردیا۔ حضرت خباب بن حارث کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک مرتبہ خوب دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھا کر ان کو ان انگاروں پر چت لٹادیا، اور ایک شخص ان کی چھاتی پر بیٹھ گیا کہ کروٹ نہ بدل سکیں، ان کی کمر کی تمام کھال اور گوشت جل کر کباب ہوگئے، بعض صحابہ کو گائے یا اونٹ کے کچے چمڑے میں لپیٹ کر اور باندھ کر ڈالدیتے۔ بعض کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلتی ہوئی آگ اور جلتے ہوئے انگاروں پر ڈالدیتے، وغیرہ (تبلیغ اسلام ص ۵،۸ج ۱)

اپنے ماننے والوں کا یہ حشر دیکھ کر حضورؐ پر کیا گذرتا ہوگا؟ وہ بھی اس احساس کے بعد کہ ان مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان سے کسی ذاتی دشمنی کی بنا پر نہیں، بلکہ محض مجھ سے دشمنی اور میرے ساتھ ان کے تعلق کی بنا پر .... یہ احساس بھی کتنا اذیت ناک ہوگا؟ اس کا پورا حال حضورؐ کے سوا کس کو معلوم؟ کسی شاعر کی قوتِ ترسیل، کسی ماہر زبان کی لسانی، اور کسی مصور کی مصوری ان کیفیات کی ترجمانی سے عاجز ہے۔

اقبال اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

• • •

مبلغ دارالعلوم دیوبند کو صدمہ

مولانا محمد عرفان صاحب بہرائچی مبلغ دارالعلوم دیوبند کی اہلیہ محترمہ گذشتہ تین ماہ سے زیر علاج چل رہی تھیں مورخہ ۲۲ر ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ۴ر اگست ۹۹ء بروز بدھ بعد نماز عصر اپنے وطن مالوف بہرائچ میں رحلت فرماگئیں ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحومہ نیک صالح انتہائی دیندار متواضع منکسر المزاج علماء و حفاظ سے عقیدت رکھنے والی خاتون تھیں پسماندگان میں مولانا موصوف اور چار نابالغ بچے ہیں رفیقۂ حیات کی اس جوانی میں جدائی مبلغ صاحب کے لئے یقیناً انتہائی غم انگیز حادثہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومہ کو آخرت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

قارئین ماہنامہ دارالعلوم سے گزارش ہے کہ باہتمام ایصال ثواب فرمائیں۔

فقہی مسائل میں اعتدال کی راہ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

مولانا عبدالحی فاروقی شعبۂ مطالعات اسلامیہ جامعہ ہمدرد نئی دہلی

ہندوستان پہنچنے سے پہلے فقہ اسلامی کا مرکز بغداد تھا جہاں کے رہنے والے اپنا ایک مخصوص معاشرہ اور تمدن رکھتے تھے، یہ تمدن عربی و ایرانی تمدن کا ایک حسین امتزاج تھا، جس طرح وہاں عربی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی اسی طرح فارسی زبان کا بھی چلن تھا۔ زوالِ بغداد کے بعد عربی بولنے والوں نے قاہرہ کا رخ کیا اور فارسی بولنے والوں نے بخارا اور غزنی کا راستہ طے کرتے ہوئے ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں دہلی میں اپنی مرکزیت قائم کی۔ خلیفہ ہارون رشید (م ۱۹۳ھ) کے زمانے میں مملکت اسلامیہ میں فقہ اسلامی کا پرچم حضرت امام ابوحنیفہؒ متوفی ۱۵۰ھ کے شاگردوں کو تفویض ہوا، امام ابویوسف (م ۱۸۲ھ) قاضی القضاۃ بنائے گئے اور پھر ان کی تعلیم و تربیت سے بہت سے ایسے علماء و فقہاء پیدا ہوئے جن کا مرتبہ دنیائے اسلام میں بہت بلند تھا لیکن ان کی اکثریت زوال بغداد کے بعد عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں منتقل ہوگئی چناں چہ انھی میں سے اکثر فقہاء و اہل علم دہلی وارد ہوئے اور انھوں نے یہاں سلاطین ہند پر اپنا اثر قائم کر کے فقہ حنفی کو رواج دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جب سے اسلامی دائرۂ عمل میں آیا یہاں فقہ حنفی ہی

برسر اقتدار رہی۔ مسلمانانِ ہند کی اکثریت شروع سے ہی اسی فقہ کی پابند رہی ہے اور یہاں اسلام کو اِسی شکل میں جانا اور پہچانا گیا اور اسی لباس میں لوگوں نے اس کو دیکھا اور سمجھا اسی لیے یہاں جو بھی علمی، فقہی، اور تجدیدی کام انجام دیئے گئے وہ سب کے سب فقہ حنفی کی روشنی میں ہی وجود پذیر ہوئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳ تا ۱۷۶۲) نے ہندوستان میں رہتے ہوئے فقہ حنفی پر جو قابل قدر کام کیا ہے اس کی واضح مثالیں ان کی مختلف تصانیف مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات الٰہیہ اور فیوض الحرمین وغیرہ میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کوئی مستقل ایسی کتاب نہیں لکھی جو اصول فقہ کے تمام ابواب پر مشتمل ہو لیکن اجتہاد و تقلید کے موضوع پر ان کے دو رسالے "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" اور "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کے نام سے عام طور پر ایسے ملتے ہیں جن سے فقہ اسلامی پر آپ کے خیالات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے ہندوستان میں اس موضوع پر کسی دوسرے اہل علم نے کوئی تصنیفی کام نہیں کیا تھا اس لیے غالبًا انھوں نے ہی سب سے پہلے اجتہاد و تقلید پر یہاں خامہ فرسائی کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور پھر جب ایک بار یہ روش چل پڑی تو پھر آئندہ موافق و مخالف دونوں طرح سے کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے جن کا سلسلہ کم و بیش اب تک چلا آرہا ہے۔ ہم اپنے محدود وسائل اور کم سوادی کی بناء پر ان محدود صفحات میں حضرت شاہ صاحبؒ کے اس علمی پہلو پر کما حقہ اظہار خیال تو نہیں کرسکتے مگر پھر بھی کوشش یہ کریں گے کہ بعض بنیادی باتیں ضرور سامنے آجائیں۔

تقلید

ابتدائی سطور میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ اسلامیانِ ہند کے مزاج میں شروع ہی سے فقہی مسائل میں تقلید کی روش داخل رہی ہے، شاہ صاحبؒ کی تحریرات میں تقلید کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی تقلید کے قائل اور اس کے معتقد تھے اور یہ صرف نظریہ تک ہی نہ تھا بلکہ وہ اس پر عامل بھی تھے۔

بقول علامہ تاج الدین سبکیؒ (م ۷۷۱ھ) تقلید کی تعریف یہ ہے کہ کسی قول کو بغیر اس کی دلیل سمجھے قبول کرلیا جائے یعنی انسان کسی غیر حجت کے قول یا عمل کو صحیح مان کر اس کی دلیل پر غور و تامل کیے بغیر اس کا اتباع کرے۔

(جمع الجوامع، ج ۳، ص ۳۴۱، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۷ھ)

یہ اتباع عمل یا تقلید فی نفسہ بُری یا بھلی نہیں ہوتی بلکہ اس کی اچھائی یا برائی کا انحصار اس شخص پر ہوتا ہے جس کی تقلید کی جائے یعنی اگر وہ شخص فاسق و فاجر یا بے دین و بد مذہب ہے تو اس کی تقلید از روئے قرآن و حدیث ممنوع ہے لیکن اس کے برعکس اگر وہ شخص مطیع و فرماں بردار اور دیندار ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ فقہ میں امام و مجتہد کے درجہ پر بھی فائز ہے تو اس کی تقلید حَسَن اور بعض حالات میں واجب ہوگی چناں چہ تقلید کا یہی مفہوم امت میں رائج اور معروف ہے، اسی بات شاہ صاحبؒ ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

ان الامة اجتمعت علىٰ ان يعتمدوا على السلف فى معرفة الشريعة فالتابعون اعتمدوا فى ذلك على الصحابة وتبع التابعين اعتمدوا على التابعين و هكذا فى كل طبقة اعتمد العلماء على من قبلهم۔

امت نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے میں سلف پر اعتماد کریں مثلاً تابعین نے صحابہ پر اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا ہے اسی طرح ہر طبقہ کے علماء نے اپنے سے پہلے علماء پر اعتماد کیا ہے۔

(عقد الجید، شاہ ولی اللہؒ، ص ۳۱، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۰ھ)

اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صحابہ اور تابعین کے دور میں بھی تقلید کا وجود تھا اور وہ حضرات بھی بعض معاملات میں اپنے اسلاف کے اقوال و آراء پر اعتماد کیا کرتے تھے۔

تقلید کی اقسام:

علماء فقہ کے مطابق تقلید کی دو قسمیں ہیں۔ ۱- تقلیدِ شخصی اور ۲- تقلیدِ غیر شخصی۔ کسی شخص کا کسی خاص مجتہدِ مذہب کے تمام اقوال و آراء کو اپنے لیے کافی و وافی سمجھنا

تقلید شخصی کہلاتا ہے جیسے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام حنبل اور امام مالکؒ وغیرہ کا مسلک۔ لہٰذا ان چاروں مذاہب میں سے کسی ایک کے اقوال و آراء کو قبول کر کے اپنے عمل کے لیے کافی سمجھنا ہی تقلید شخصی ہے۔ اس کے علاوہ ایک سے زائد مذاہب یعنی حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی فقہ کے مجموعی مسائل کو اپنے لیے قابل عمل ٹھہرالینا تقلید غیر شخصی ہے یعنی ان چاروں مذاہب میں جہاں بھی کوئی مسئلہ اپنے مقصد کے مطابق مل جائے اس پر عمل کر لینا ہی تقلید غیر شخصی ہوگی۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب کی تدوین و تشہیر سے قبل دوسری صدی کے آخر تک تقلیدِ غیر شخصی کا رواج قائم رہا یہاں تک کہ صحابہ اور تابعین کے دور میں بھی اس کا عام چلن تھا۔

(حضرت شاہ ولی اللہ اور تقلید، مولانا خیر محمد جالندھری مشمولہ ماہنامہ الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر ص ۲۴۷، ۳ ذیقعدہ ۱۳۵۹ھ)

صحابہ اور تابعین کے عہد میں تقلید غیر شخصی:

صحابۂ کرام اور تابعین عظام کا زمانہ دور نبوت سے بہت قریب کا زمانہ تھا اسی وجہ سے اس میں خیر و برکت بہت تھی، اُس دور میں تقلید غیر شخصی کے اندر کسی مضرت و نقصان کا اندیشہ نہ تھا لہٰذا اس کا دائرۂ کار بہت وسیع تھا۔ اس وقت فقہی مسائل کو مدون کرنے کا خیال نہیں پیدا ہوا تھا لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور دور نبوت سے بعد ہوتا گیا لوگوں کی طبیعتیں پہلے سے مختلف ہوگئیں، مزاج بدلتے گئے، فسق و فجور اور ہوا و ہوس کا غلبہ بڑھتا گیا جس کی وجہ سے احکام شرعیہ میں لوگ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کاٹ چھانٹ کرنے لگے۔ ان حالات میں اصول فقہ کو مرتب و مدون کرنا ناگزیر ہوگیا چناں چہ تقلید غیر شخصی کو تقلید شخصی میں محدود کرنا ضروری سمجھا جانے لگا۔ اگر اس وقت ایسا نہ کیا جاتا تو فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا اور احکاماتِ شرعیہ ایک کھیل بن کر رہ جاتے۔ اس طرح دوسری صدی ہجری کے آخر میں ائمہ مجتہدین کی فقہ کتابی شکل میں مدون ہونا شروع ہوئی، جن جن لوگوں کو یہ مذاہبِ مدونہ دستیاب ہوتے گئے وہ قبول کرتے گئے اور جن مقامات پر یہ مذاہب مدونہ میسر نہیں آسکے انھوں نے مجبوراً تقلید غیر شخصی ہی کو قابل عمل سمجھا

یہاں تک کہ ان کو بھی کوئی نہ کوئی مذہبِ مدون میسر آ گیا، اسی بات کو شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

وبعد المأتين ظهر فيهم التمذهب للمجتهدين بأعيانهم وقل ما كان لايعتمد على مذهب مجتهد بعينه و كان هذا هو لواجب فى ذلك الزمان ۔	اور بعد دو صدیوں کے لوگوں میں یعنی معین مجتہدوں کا مذہب اختیار کرنا ظاہر ہوا اور ایسے کم لوگ تھے کہ مجتہد معین کے مذہب پر اعتماد نہ رکھتے ہوں اور یہی وہ وقت تھا جب کہ مذہب معین کی پابندی واجب ہو گئی۔

(وصاف ترجمہ الانصاف، شاہ ولی اللہؒ، ترجمہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ ص ر ۵۹ عمدۃ المطابع لکھنؤ)

تقلید شخصی کی ابتداء:

ائمہ اربعہ یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد حنبلؒ کے مذاہب جب کتابی شکل میں مدون ہو گئے اور غیر مجتہد لوگوں کو میسر ہو گئے تو انھوں نے تقلید شخصی کو اپنے عمل کے لیے کافی سمجھا اس طرح دوسری صدی ہجری کے بعد تقلید شخصی کا آغاز ہوا اور جب یہ چاروں مذاہب فقہیہ مرتب و مدون ہو کر تمام عالم اسلام میں مشہور ہو گئے تو چوتھی صدی ہجری میں انھی چاروں مذاہب میں تقلید شخصی منحصر ہو گئی اور کسی کو اس میں کوئی اختلاف نہ رہا۔ اس طرح تقلید شخصی کا اتباع سواد اعظم کا اتباع اور اس سے انحراف سواد اعظم سے انحراف تصور کیا جانے لگا چناں چہ اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

وثانيا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اتبعوا السواد الاعظم و لما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعاً للسواد الاعظم و الخروج عنها خروجاً عن السواد الاعظم.	اور دوسری وجہ پابندیٔ مذہب کی یہ ہے کہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پیروی کرو بڑے گروہ کی اور چوں کہ سچے مذہب سوائے ان چاروں مذہب کے نایاب ہو چکے تھے اس لیے ان کی پیروی کرنی بڑے گروہ کی پیروی کرنی ٹھہری اور ان سے باہر نکلنا بڑے گروہ سے باہر نکلنا قرار دیا گیا۔

(عقد الجید، شاہ ولی اللہؒ، ص ر ۳۳ ر ۳۴، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۰ھ)

آپ کے نزدیک مذاہب اربعہ میں تقلید شخصی کے منحصر ہو جانے میں اجماع امت ہے۔ آپ کے مطابق تمام امت نے اور امت کے قابل اعتبار افراد نے ان مذاہب اربعہ مشہورہ کی تقلید کے جواز پر آج تک اجماع کیا ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ، ج۱ص ر۱۶۱، ۳، اصح المطابع کراچی، سنہ ندارد)

تقلید شخصی اور شاہ صاحب:

شاہ صاحبؒ کے نزدیک ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کرنا دین کی حفاظت کے نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے اور اس میں ایک الہامی راز بھی پوشیدہ ہے چناں چہ فرماتے ہیں:

وبالجملة فالتمذهب للمجتهدين سرٌ الهمه الله تعالىٰ العلماء و جمعهم عليه من حيث يشعرون اولا يشعرون

الحاصل ان مجتہدین کا مذہب بمذہب ہونا اور لوگوں کا اس کو اختیار کرنا ایک راز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر الہام کیا اور انھیں اس پر مجتمع کر دیا چاہے وہ اس کو جانیں یا نہ جانیں۔

(انصاف، ترجمہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی ص ۶۲، عمدۃ المطابع لکھنو، سنہ ندارد)

حضرت شاہ صاحبؒ نے تقلید شخصی میں بہت سے دینی فوائد بھی بیان فرمائے ہیں جو آئندہ صفحات میں تحریر کئے جائیں گے، اس وقت ان کی تفصیل میں جائے بغیر یہاں ہم صرف ان کی ایک عبارت پیش کر رہے ہیں:

وفى ذلك (التقليد) من المصالح ما لا يخفى لا سيما فى هذه الايام التى قصرت فيها الهمم جداً و اشربت النفوس الهوىٰ و اعجب كل ذى رأى برايه. (حجة الله البالغه مترجم، ص۳٦١ ج١)

اس (تقلید شخصی) میں بہت سے فوائد ہیں جو مخفی نہیں بالخصوص اس موجودہ دور میں جب کہ (لوگوں میں) کم ہمتی بے اندازہ ہے اور نفوس خواہشات پرستی میں مستغرق ہیں اور ہر شخص اپنی رائے پر مغرور ہو رہا ہے۔

امام بغویؒ (م ۵۱۶ھ ۱۱۲۲ء) کے حوالہ سے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

جو شخص اجتہاد کے درجہ پر فائز نہ ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تقلید اختیار کرے:

ایجب علیٰ من لم یجمع هذه الشرائط تقلیده فیما یعنُّ له من الحوادث۔ (عقد الجید ص ۹)	اور اس شخص پر جو ان شرائط کا جامع نہیں ہے اس پر واجب ہے کہ پیش آنے والے حوادث میں (کسی) مجتہد کی تقلید کرے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک تقلید نہایت ضروری ہے، صحابہ کرام اور تابعین عظام کے دور میں بھی تقلید ہی کا راستہ زیادہ مستحسن سمجھا جاتا تھا، ان کے نزدیک اس عمل میں اللہ تعالیٰ کا ایک الہامی راز پوشیدہ ہے جس میں سراسر خیر و برکت ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک تقلید میں اجماع امت ہے اور اجماع امت سے گریز کرنا سواد اعظم سے گریز کرنے کے مترادف ہے لہٰذا ہر اس شخص پر تقلید واجب ہے جس میں مجتہد ہونے کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں۔

عہد صحابہ میں تقلید:

حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان کے مطابق حضرات صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جب انھیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا اور وہ از خود اس کا کوئی فیصلہ نہ کرپاتے تو کسی صاحبِ بصیرت عالم کی طرف رجوع کرتے اور پھر اس کے فیصلہ پر عمل کرتے۔ وہ لکھتے ہیں:

لان الناس لم یزالوا من زمن الصحابة الی ان ظهرت المذاهب الاربعة یقلدون من اتفق من العلماء من غیر نکیر من احد یعتبر انکاره و لوکان ذلك باطلاً لانکروه۔ (عقد الجید ص ۲۹)	کیوں کہ صحابہ کے وقت سے ظہور مذاہب اربعہ تک لوگ ہمیشہ ان علماء کی تقلید کرتے رہے جو ان کو ملتے، اس امر پر کسی ایسے شخص نے انکار نہیں کیا جس کے انکار کا اعتبار ہو۔ اگر یہ بات باطل ہوتی تو وہ ضرور انکار کرتے۔

آگے چل کر مزید اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی مقلد کے

لیے اپنے امام کو سارے ائمہ پر فضیلت دینا تقلید کے لیے کوئی ضروری نہیں ہے کیوں کہ صحابہ کرام کی رائے اس معاملہ میں مختلف تھی :

وَرُدّ بان اعتقاد افضلية الامام على سائر الائمة مطلقاً غير لازم فى صحة التقليد اجماعاً لان الصحابة والتابعين كانوا يعتقدون ان خير هذه الامة ابوبكرؓ ثم عمرؓ و كانوا يقلدون فى كثير من المسائل بخلاف قولهما ولن ينكر على ذلك احد فكان اجماعاً على ماقلناه۔

اور یہ تردید کی گئی ہے کہ (کسی مخصوص) امام کے افضل ہونے کا اعتقاد مطلقاً تمام اماموں پر تقلید کے درست ہونے میں بالاتفاق ضروری نہیں ہے اس لیے کہ صحابہ اور تابعین یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اس امت میں سب سے افضل (حضرت) ابو بکر صدیقؓ پھر (حضرت) عمر فاروقؓ ہیں حالانکہ بہت سے مسائل میں وہ ان دونوں کے قول کے خلاف دوسروں کے قول کی تقلید کرتے تھے اور اس عمل پر کسی نے انکار نہیں کیا لہٰذا جو ہم نے بیان کیا ہے اس پر اجماع ثابت ہوا۔

اس طرح تقلید کے بارے میں شاہ صاحبؒ کے مختلف مثبت خیالات کا اندازہ ہو گیا۔ ان کے نتائج ہم مضمون کے آخر میں بیان کریں گے۔ (باقی)

● ● ●

ابتدائے اسلام ہی سے اہل اسلام کو اس کا حکم دیا گیا کہ "لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ اپنے رب کی طرف بلاؤ اور ان سے بہتر طریقے سے حجت کرو" (۱) اشاعت اسلام کے سلسلے میں سب سے بڑا افترا یہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام بزور شمشیر پھیلا، اور مسلم حکمرانوں نے بجبر ہندو رعایا کو مسلمان بنایا۔ اس طرح کی جھوٹی باتوں کے ذریعہ برادران وطن کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسلام جبر و تشدد کا مذہب ہے مسلمان وحشی اور ظالم ہیں۔ اسلام پھیلانے کی غرض سے ہندوستان پر حملہ کیا، اور جدال و قتال کا بازار گرم رکھا جس کے نتیجے میں اسلامی سلطنت کا وجود عمل میں آیا۔

اسلام کی تعلیم آفاقی اور ابدی ہے۔ وہ دوسرے مذہبوں کے متبعین کی دل آزاری کی اجازت نہیں دیتا، یہاں تک کہ اس کے ساتھ سختی اور زبردستی کرنے والوں کی پرزور مذمت کرتا ہے " اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی، اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے" (۲) اور کسی بھی مذہب کے پیروؤں کے ساتھ زبردستی کرنے والے کے متعلق فرمایا: "جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے کفر کرے وہ بارادہ اور بااختیار

ہے"(۳) نیز یہ بھی ارشاد ہوا"دین کے معاملے میں کوئی زور وزبردستی نہیں"(۴) اور نبی کریمؐ نے فرمایا: "خبردار جس نے کسی ذمی پر ظلم کیایا اسے نقصان پہنچایایا اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لیا، یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے احتجاج کروں گا، ان (ذمیوں) کے خون تمہارے (مسلمانوں) کے خون کی طرح ہیں"۔ (۵)

اسلام کا خدا صرف رب المسلمین نہیں بلکہ رب العالمین بھی ہے، اور اس کا رسول رحمۃ للمسلمین ہی نہیں بلکہ رحمۃ للعالمین بھی ہے اس لئے اسلامی نظام میں ہر مسلم کی طرح غیر مسلم کی بھی چند شرائط کے ساتھ جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی جاتی ہے، اسلام کے نزدیک تمام انسان ایک خاندان اور کنبہ ہیں جہاں کوئی زور وزبردستی نہیں۔

اشاعت اسلام کے سلسلے میں برادران وطن (ہندوؤں) کو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشیں کرنے کی ضرورت ہے کہ ہندوستان میں اسلام نہ تلوار کے ذریعہ پھیلا اور نہ ہی مسلمان حکمراں کے جبر وتشدد سے بلکہ اسلام ہندوپاک میں صوفیائے کرام کے ذریعہ پھیلا، جن کے پاک نفوس اور خلوص وللٰہیت نے ہندوستان کے کونے کونے سے کفر والحاد کا قلع قمع کیا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے پرچم کو بلند کیا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے دلوں میں بھی ان کی تبلیغ نے نمایاں اثر کیا۔ باوجود اس کے صوفیائے کرام کو ایک ہندو کے قبول اسلام سے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا کہ ایک مسلمان کے ترک گناہ سے خوشی ہوتی تھی۔(۶) اور سلطان الہند حضرت خواجہ اجمیری نے ایک دومرتبہ ہندوؤں کے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ظاہر کیا تو اس سے زیادہ مرتبہ مسلمانوں کے حق مسلمانی کو پورا نہ کرنے اور انسانیت کو معراج پر نہ پہنچنے پر غم کے آنسوں بہائے۔(۷)

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام اور قبول اسلام کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ شق القمر کے وقت سے ہی شروع ہو جاتا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ سراندیپ کا راجہ (رموزان سامری) اس معجزہ کو دیکھ کر مداح اسلام ہو گیا۔ اور زیارت رسول کا قصد کیا یہاں تک کہ راستے ہی میں اس کی موت واقع ہو گئی۔(۸) اس کے قبول اسلام کے سلسلے

میں صراحت نہیں ملتی کہ کب اسلام قبول کیا۔ تاہم قرین قیاس یہی ہے کہ راجہ نے بنوامیہ کے دور حکومت میں اسلام قبول کیا۔(۹) اس وقت تک ہندوستان میں اشاعت اسلام کا کام بڑے پیمانے پر شروع نہیں ہوا تھا۔ جس کو بعد میں عرب تاجر اور صوفیائے کرام نے بڑھایا۔ اور اس راہ میں انہیں غیر معمولی کامیابی بھی ملی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آریہ سماج کے آغاز سے پہلے ہندوؤں کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ غیر اقوام میں اپنا مذہب نہ پھیلائیں بلکہ سچے مذہب کی نسبت ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ صرف خواص کا مذہب ہے اور اسی کا حق ہے، ہر کوئی اس کا مستحق نہیں ہے۔ منو کے دھرم شاستر میں برہمن، چھتری، ویش اور شدر ہر ایک کے لیے حسب مراتب جداگانہ قوانین ہیں۔ برہمن تمام انسانوں کے مخدوم اور ہر خراج و محصول سے مستثنیٰ تھے۔ دنیا میں جو کچھ ہے وہ برہموں کے لیے ہے۔ برہمن قاتل کے لیے سزائے موت نہیں۔ شدر یعنی چنڈال اور اچھوت کا سایہ برہمن کو ناپاک کر دیتا ہے۔، شدر تمام انسانی اور شہری حقوق سے محروم ہے، اسے مذہبی کتاب پڑھنے کی اجازت نہیں، اگر وہ وید کا کوئی اشلوک سن لے تو اس کے کانوں میں پگھلایا ہوا شیشہ ڈال دینا چاہیے۔ وہ صرف برہموں کی خدمت کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اگر کوئی برہمن اسے نہ ملے تو چھتری کی اور چھتری نہ ملے تو ویش کی خدمت کرے۔(۱۰) ظاہر ہے اس طرح کے سخت قوانین اور نقطہ نظر کے ہوتے ہوئے صوفیائے کرام اور مبلغین اسلام کو اس راہ میں کامیابی حاصل کرنا بالخصوص ان لوگوں میں دین پھیلانا جو کسی دین و مذہب کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے چنداں دشوار نہ تھا۔ چناں چہ ان لوگوں میں سے جو شخص بزرگوں کی کرامات کو دیکھتا وہ ان کا اور ان کے مذہب کا قائل ہو جاتا صوفیائے کرام بھی اسے اپنے دامن میں جگہ دینے کے لیے ہر وقت تیار تھے۔ بقول آرنلڈ: ”نیچی جاتیوں کا اونچی جات کے وحشیانہ برتاؤ سے نجات پانے کا واحد ذریعہ قبول اسلام ہے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں۔(۱۱)

دکن کے مغربی اضلاع میں جاتیوں کا نظام بہت ظالمانہ تھا، مثلاً ”تراونکور“ میں بعض نیچی جاتیوں والے کے لیے برہمن سے کم از کم چوہتر قدم دور رہنا لازمی تھا، اور

سڑک پر چلتے ہوئے انہیں خراٹے کی آواز نکالنی پڑتی تھی تاکہ برہمن ان کی آمد سے آگاہ ہو جائے، ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ نیچی جاتیوں کے لوگوں نے اس ذلت سے نجات پانے اور معاشرہ میں اپنی حیثیت بڑھانے کے لیے اسلام قبول کیا ہوگا۔(۱۲)

ممالک ہند کے قدیم باشندوں پر مسلمانوں کی آمد اور طویل اقامت کا بھی گہرا اثر پڑا۔ خصوصاً وہ پیشہ ور اور اہل حرفہ جنھیں برہمنی مذہب نے صدیوں سے ذلیل اور رنیچ بنا رکھا تھا۔ جب ان کا مسلمانوں سے واسطہ پڑا تو ان کی ذہنی مساوات اور نیکی کا برتاؤ دیکھ کر یہ لوگ بتدریج اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔ یہ بے چارے خاندان اور برادری کی زنجیروں میں ایسے بندھے ہوئے تھے کہ فرداً فرداً مسلمان ہونے سے ڈرتے تھے اور ہچکچاتے تھے لیکن جہاں کہیں یہ پھندے ٹوٹتے خاندان کے خاندان اور گروہ کے گروہ برہمن کے ظلم سے نکل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔

اسلام تلوار سے نہیں بلکہ اپنے نظریۂ مساوات کی بدولت پھیلا، اونچی جاتیوں کے لوگ پس ماندہ اور اچھوت طبقوں پر ظلم کرتے تھے، بدھ مت نے کسی حد تک اس ظلم کا انسداد کیا۔ بدھ مت کے زوال کے بعد اونچی جاتیوں کے ہندو پھر سے نیچی جاتیوں کے ہندو پر ظلم کرنے لگے۔ اس کشاکش کے دوران اسلام عالمی مساوات اور اخوت کا پیغام لایا اور اس نے اچھوتوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک اچھوت اسلام قبول کرتے ہی تمام حقوق میں بڑے سے بڑے مسلمانوں کا ہمسر بن جاتا، جس کے نتیجے میں گاؤں کے گاؤں مسلمان ہو گئے۔ اور جن مقامات پر اونچی جاتیوں کے ہندو نیچی جاتیوں کے لوگوں پر ظلم و زیادتی کرتے تھے وہیں اسلام تیزی سے پھیلا۔

بنگالے میں اولیاء اللہ اور غازیوں کے اتنی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی کہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ صورت حال ضرور سلاطین دہلی کے بنگالے کے متعلق سوچی ہوئی پالیسی کا نتیجہ ہوگا۔(۱۳) یہ وہ زمانہ تھا جب اولیائے کرام نے جو برہمنوں اور ہندو سادھوؤں سے علمی پارسائی، قوت عمل اور دوراندیشی میں بڑھ کر تھے۔ وسیع پیمانے پر تبلیغ شروع کی ان کی کامیابی

کا باعث طاقت نہ تھی بلکہ ان کی مذہبی اور علمی زندگی تھی وہ نیچے طبقے کے ہندوؤں میں رہتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے، جو اس وقت قوم پرستی اور معاشرتی دباؤ کے پنجے میں گرفتار تھے، رفتہ رفتہ دیہاتی علاقوں کے یہ باشندے مسلمان ہو کر اسلامی حکومت کے لیے ایک نئی تقویت کا ذریعہ بن گئے۔

اسلام روئے زمین کے تمام انسانوں کو امت واحدہ قرار دے کر اس کے لیے مساوی حقوق متعین کرتا ہے۔ اس نے عقائد کا جو نظام پیش کیا وہ بڑا واضح اور سہل ہے، اس کی معاشرتی تنظیم جمہوری بنیادوں پر قائم ہے۔ اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک قانونی اور معاشرتی نظام بھی ہے جو اخوت و بھائی چارگی پر قائم ہے، اس کے اندر رنگ و نسل اور طبقے کی تفریق کو ختم کر کے انسان کو متحد کیا جاتا ہے۔ (۱۴) برخلاف اس کے ہندو دھرم پیدائش ہی سے اونچ و نیچ کا قائل ہے، اور ادنیٰ جاتیوں کو انسانی حقوق سے بھی محروم کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہندو سماجی آزادی سے نجات پانے کے لیے اسلام کا ہمیشہ خیر مقدم کیا۔

اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا جاتا تو آج ہندوستان میں ہندوؤں کی اتنی بڑی تعداد نظر نہ آتی۔ اسلامی قوانین کا پاس و لحاظ کر کے تمام مسلم حکمراں زبردستی اور سختی کے ذریعہ اسلام قبول کرانے کو ظلم عظیم سمجھتے تھے۔ مسلماں فرماں روا دنیا کے اور فرماں رواؤں کی طرح آن بان سے حکومت کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے، تبلیغ دین ان کا نصب العین نہ تھا۔ (۱۵) چناں چہ اس مقدس کام کو سلطان محمود غزنوی اور بعد کے سلاطین اور شاہان مغلیہ نے صوفیائے کرام ہی کے سپرد کر دیا۔ (۱۶) یہ مقدس لوگ مختلف ممالک سے برابر ہندوستان آتے رہے اور اپنے انفاس قدسیہ اور محبت و شفقت کے ذریعہ ہندی لوگوں کے قلوب میں اسلام کے اثرات کو راسخ کرتے رہے۔ ابو حفص ربیع بن صاحب الاسدی بصری، منصور حلاج، عاپار شاہ، فرید الدین عطار، بابا ریحان، نورالدین گجراتی، سید علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شیخ جلال الدین تبریزی، خواجہ بختیار کاکی، صابر کلیری، سید جلال الدین بخاری، بابا فرید شکر گنج، نظام الدین اولیاء، سید محمد گیسو دراز، پیر

صدر الدین، شیخ علی ہمدانی اور نہ جانے کتنے اولیاء و اصفیاء رحمہم اللہ ہیں جنھوں نے ملک کے گوشے گوشے میں خدمت اسلام کا فریضہ انجام دیا، جن کے نام آج بھی ستاروں کی طرح روشن اور تابناک ہیں، انھیں نائبین رسول کے پاک نفوس کی بدولت کفر و شرک اور الحاد کا قلع قمع ہوا، اور قندیل اسلام کو روشن کر کے بالخصوص اہل ہند کے قلوب کو ایمان کی روشنی سے منور کیا، جس میں ہندو مسلم سب شامل تھے۔

اسلام کی حقانیت اور عالم گیر مساوات کا یہ عالم ہے کہ جب کوئی غیر مسلم حکومت اسلامی کے اصول و قوانین کے مطابق ذمی قرار پا جاتا ہے تو گویا اسلامی حکومت سے اس کی جان و مال کی حفاظت کا ایک معاہدہ ہو جاتا ہے، اب شریعت اسلامی اس کے معاملہ میں کوئی امتیاز نہیں کرتی، مسلم اور غیر مسلم کے لیے یکساں تعزیرات متعین کیے جاتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے مذہب یا منصب کی بنا پر رعایت کی توقع نہیں کر سکتا۔ غیر مسلم رعایا پر اسلامی شریعت کی پابندی لازم نہیں، ان کو اپنے اپنے مذہب کی پیروی کی کھلی اجازت ہے، مگر تاریخ ہند کا یہ المناک باب ہے کہ پوری رعایت اور رواداری برتنے کے باوجود برادران وطن مسلمانوں کو ہی ظالم قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے رعایا پروری کا جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حکومت اسلامی کے نفاذ کے بعد بھی شاہانِ ہند نے غیر مسلموں کو اپنے اپنے مذہب اور اطوار کے مطابق پوجا پاٹ اور مذہبی رسوم ادا کرنے کی کھلی اجازت دے رکھی تھی۔ چناں چہ محمد بن قاسم نے جب راجہ داہر کو شکست دی، تو اس کی موت کے بعد برہمن اور ہندوؤں نے محمد بن قاسم کی خدمت میں آکر اسلام قبول کر لیا۔ اس واقعہ کے دوسرے دن بعد محمد بن قاسم نے عام اعلان کیا: "جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے کسی سے تعرض نہ کیا جائے گا، ہماری حکومت میں ہر شخص مذہبی معاملات میں آزاد رہے گا" (۱۷) یہی وہ رواداری اور رعایا پروری کا نتیجہ تھا کہ جب محمد بن قاسم سندھ سے رخصت ہونے لگا تو مسلمانوں کی طرح ہندو بھی فراق غم میں آنسوں بہانے لگے اور برملا یہ کہا کہ ہمیں آپ جیسا فاتح کبھی نصیب نہ ہوا۔ آپ کے محاسن و محامد

کو ہم لوگ ہمیشہ یادرکھیں گے۔ چناں چہ محمد بن قاسم کی یاد میں ایک دھرم شالہ بنایا جس کانام ''محمد بن قاسم دھرم شالہ'' رکھا گیا۔ یہاں تک کہ بعض ہندوؤں اور بدھوں نے محمد بن قاسم کا بت بناکر رکھااور اس کی پرستش کی۔(۱۸)

امپیریل گزنیٹر لکھتا ہے کہ: ''بالعموم اسلام لوگوں کے تبدیل مذہب سے اتنا نہیں بڑھا جتنا اپنی قدرت نمو سے، مسلمانوں کی کثریت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ اور قوموں کی بہ نسبت بہتر طور پر خراب آب وہوا کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ مسلمان گوشت خور ہے۔ اور اپنے ہندو ہمسایوں کے مقابلہ میں زیادہ مقوی غذا کھاتا ہے، وہ بیواؤں کا حامی اور کم عمر بچوں کی شادی کا مخالف ہے، نتیجہ یہ کہ اس کا کنبہ بڑا ہوتا ہے۔ اور اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں تک جبراً مسلمان کرنے کا تعلق ہے ابتدائی مسلمان بادشاہوں کی اپنی حالت اتنی غیر مستحکم تھی کہ وہ مذہب کی عام اشاعت نہ کرسکتے تھے۔ شروع شروع میں مغل بادشاہ بھی مذہبی معاملات سے بے تعلق تھے۔ اور اپنی لڑائیوں اور انتظامی معاملات میں اتنے مشغول تھے کہ اشاعت مذہب پر اچھی طرح توجہ مبذول نہ کرسکتے تھے۔ ان کی حکومت بہت حد تک راجپوت راجاؤں کے تعلقات پر قائم تھی۔ اور ان راج کماریوں نے جن سے انھوں نے شادیاں کیں، شاہی خاندان میں ہندو اثرات داخل کردیئے اور ہندو مذہب کے متعلق رواداری بڑھادی'' (۱۹)

اسلامی رواداری کی اس سے بڑی شہادت برادران وطن کے لیے کیا ہوسکتی ہے کہ ہندوؤں کے سب سے بڑے سیاسی رہنما گاندھی جی نے ہندو قائدین کو مسلمانوں کا طرز حکومت اختیار کرنے کی نصیحت کی حالاں کہ ہندوستان میں اشوک، بکرماجیت وغیرہ جیسے عادل بادشاہ اور رواداراجہ گزرے ہیں جن پر ہندوؤں کو ناز ہے۔ ''اسلام اپنے عروج کے زمانے میں عدم رواداری کا دین نہیں تھا، اس نے دنیا سے خراج تحسین وصول کیا، اگر کوئی ہندو صحیح طور پر اس کا مطالعہ کرے تو وہ اس سے اس طرح محبت کرے گا جس طرح میں کرتا ہوں''(۲۰) ٹیپو سلطان کو انگریز مورخوں نے ایسے ظالم مذہبی حکمراں کے روپ میں دکھایا ہے جس نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں تھا، اپنی ہندو رعایا

سے اس کے نہایت رواداری اور باہمی یگانگت کے مراسم تھے۔ (۲۱)

ڈاکٹر ہنٹر ہندوستان میں اشاعت اسلام، مسلم حکمراں کی رواداری کی تعریف اور غیر مسلموں کی دروغ گوئی اور بہتان تراشی کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''بنگال کے ہندوؤں کے لیے جو مفلس، ماہی گیر، شکاری، قزائن اور جوادنیٰ قوم کے کاشت کار تھے اسلام ان کے لیے ایک اوتار تھا، جو آکاش سے نازل ہوا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا، اسلام حکمراں قوم کا مذہب تھا اس کے پھیلانے والے باخدا لوگ تھے، جنھوں نے توحید و مساوات کا مژدہ ایسی قوم کو سنایا جس کو سب ذلیل و خوار سمجھتے تھے، اس کی تعلیم نے خدا اور اسلامی اخوت کا بلند تخیل پیدا کر دیا، اور بنگال کی کثرت سے بڑھنے والی قوموں کو جو صدیوں سے ہندوؤں کے طبقے سے تقریباً خارج ہو کر بڑی ذلت و خواری کے دن کاٹ رہی تھیں اسلام نے بلا تامل اپنی اخوت کے دائرہ میں شامل کر لیا''۔ (۲۲)

مسلمان ہندوستان میں غیر اقوام کے اعتراضات کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ انگریز اور اسلام دشمن عناصر جماعتوں نے ارباب وطن کے درمیان ہمارا اور ہمارے دین کا، ہمارے عائلی مسائل کا جیسا شرمناک اور ڈراؤنا تعارف پیش کیا ہے جس کی وجہ سے ہم صرف غیروں کے اعتماد و اعزاز سے محروم نہیں رہے بلکہ خطرہ یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ خود ہمارے مسلم نونہال اور روشن خیال نوجوان اس گمراہ کن پروپیگنڈہ کا شکار ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''مسلمانوں نے صدیوں سے ہندو برادری میں اپنا صحیح تعارف نہیں پیش کیا۔ چناں چہ موقع غنیمت جان کر اس خلا کو ہمارے دشمنوں نے پر کیا، اور ہمارا تعارف عوام الناس کے سامنے پیش کیا۔ اور دشمن جب تعارف کراتا ہے تو وہ کیسا تعارف کرائے گا معلوم ہی ہے''۔ (۲۳)

• • •

مصادر و مراجع

۱ القرآن

۲ سورۃ المائدہ

۳ سورۃ الکہف

۴ سورۃ البقرہ : ۲۵۶

۵ ابوداؤد شریف

۶ آب کوثر، شیخ محمد اکرام الحق: ص ۱۹۱، ادبی دنیا ٹیا محل دہلی، ۱۹۹۱ء

۷ فوائد الفوائد: ص ۱۸۴ بحوالہ آب کوثر

۸ آئینۂ حقیقت نما، اکبر شاہ نجیب آبادی، ص ۷۱، نفیس اکیڈمی، کراچی پاکستان، دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء

۹ ہندوستان پر اسلامی حکومت، شوکت علی فہمی، ص ۷۰۔ دین و دنیا پبلشنگ کمپنی جامع مسجد دہلی۔ سولہواں ایڈیشن ۱۹۹۲ء

۱۰ ویدک انڈیا، زیداے رگوزین: ص ۲۷۶-۲۷۹ امراء ہنود، منشی محمد سعید احمد، ص ۱-۴ بحوالہ مسلم حکومتوں کی رواداری ص ۴۵ مولانا احمد صاحب ادارہ تاج المعارف دیوبند۔ ۱۹۶۴ء

۱۱ آرنلڈ: ص ۲۴ بحوالہ مسلم حکومتوں کی رواداری

۱۲ آرنلڈ: ص ۲۲۰ بحوالہ مسلم حکومتوں کی رواداری ص ۱۰۱

۱۳ رود کوثر: ص ۳۲۵

۱۴ القرآن

۱۵ اردوادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین، ص ۱۴ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ ۱۹۸۳ء پہلاایڈیشن

۱۶ مسلم ثقافت: عبدالحمید سالک، ص ۴۹۱ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور ۱۹۵۷ء

۱۷ ہندوستان پر اسلامی حکومت، ص ۸۹ آئینۂ حقیقت نما

۱۸ غازی محمد بن قاسم، ص ۵۵ آئینۂ حقیقت نما، ص ۱۰۱، جلد ۱، بحوالہ مسلم حکومتوں کی رواداری، ص ۱۲۱

۱۹ آب کوثر، ص ۳۸۵

۲۰ ویدک انڈیا: گاندھی جی کا بیان، ص ۲۲

۲۱ مہاتما گاندھی۔ اخبار ینگ انڈیا، مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۹۳۰ء

۲۲ آب کوثر، ص۔ مسلم حکومتوں کی رواداری

۲۳ فسادات کا حل دعوت الی الاسلام، انوار الاسلام، ص ۷، حیدرآباد ۱۹۹۴ء
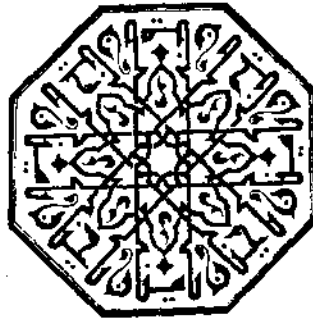
بقلم شیخ محمد عطیہ سالم حفظہ اللہ ورعاہ
ترجمہ وتلخیص: محمد عارف جمیل المبارک فوری

اولاً : عہد نبوی :

بلاشبہ شریعت کی اصل اور آغاز، رسول اللہ علیہ کی ذات ہے، آپ کا عہد ہی، عہد تشریع ہے کیوں کہ فرمان باری ہے :

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (سورہ حشر ۷)۔ اور جو دے تم کو رسول سو لے لو، اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو۔ نیز: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۲۱) تمہارے لیے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال۔

ان کے علاوہ اور دوسری نصوص اس کی دلیل ہیں، خلفائے راشدین کا عہد اسی کے ساتھ لاحق ہے کیوں کہ فرمان نبوی ہے :

میری سنت، اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت کا التزام کرو۔ تراویح رمضان المبارک کے ساتھ ہے، تاہم یہ قیام لیل، کے عموم میں آتی ہے، عموماً قیام لیل، اور خصوصاً تراویح کے تعلق سے بہت سی نصوص وارد ہیں۔

تہجد (قیام لیل) کے تعلق سے عمومی نصوص میں سے یہ فرمان باری ہے :

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (بنی اسرائیل ۷۹) اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ، یہ زیادتی ہے تیرے لیے ۔ اور يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيْلًا (مزمل ۲۱) اے کپڑے میں لپٹنے والے! کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات۔ قیام رمضان

(تراویح) اوقات کے لحاظ سے تو خاص ہے لیکن مطلوب ہونے کے لحاظ سے عام ہے۔

تراویح کی مشروعیت بالتدریج :

تراویح کی بابت روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہ بتدریج ترقی ہوتی گئی ہے۔ جو حسب ذیل ہے :

(ا) مطلقاً ترغیب : مسلم شریف اور بیہقی (۲؍۴۹۲) میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"جس نے ایمان کے ساتھ، بہ نیت ثواب قیامِ رمضان کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف ہوگئے"

امام بیہقی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرمایا : اس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں بروایت یحیٰ بن یحیٰ، اور امام بخاری نے بروایت عبداللہ بن یوسف بن مالک نقل کیا ہے۔

بیہقی میں یہی روایت حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے۔ امام بیہقی نے اس کو نقل کرنے کے بعد کہا : اس کو امام بخاری نے بروایت یحیٰ بن بکر نقل کیا ہے۔

بہرکیف اس روایت سے مطلقاً ترغیب معلوم ہوتی ہے، کسی تعداد یا کیفیت کی تعیین نہیں۔ اسی وجہ سے بیہقی میں حضرت ابوہریرہؓ کا یہ قول منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں قیامِ رمضان کی ترغیب دیتے تھے، لیکن عزیمت کے طور پر حکم نہیں دیتے تھے، آپ یہ فرمایا کرتے تھے۔ "جس نے ایمان کے ساتھ، بہ نیت ثواب قیام رمضان کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف ہوگئے"

(ب) ۔ اس کے بعد رمضان کے روزے کی فرضیت کے ساتھ، قیامِ رمضان کے مسنون ہونے کی تصریح آئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ رمضان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

"اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے کو فرض قرار دیا ہے، اور میں نے مسلمانوں کے لیے اس کے قیام کو مسنون کیا، لہٰذا جس نے ایمان کے ساتھ بہ نیت ثواب رمضان کے روزے رکھے، اور قیام کیا، وہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہوگیا، جیسا کہ اس دن تھا۔

جب اس کی ماں نے اس کو جنم دیا" (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تراویح مطلقاً مطلوب ہونے کے بعد ترقی کر کے سنت ہو گئی، روزہ کی فرضیت کے ساتھ اس کے تذکرے سے اس میں مزید قوت پیدا ہو گئی ہے، جیسا کہ اصول فقہ میں دلالت اقترانی کا حاصل اور مفاد یہی ہوتا ہے۔

اس ترغیب کا نتیجہ :

اس ترغیب کے نتیجہ میں، انفرادی اور اجتماعی طور پر، قیام رمضان کے لیے سبقت ہوئی، جس کے ساتھ بھی کچھ قرآن ہوتا، لوگ اس کی اقتداء میں، قیام رمضان کرنے لگے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں : "لوگ مسجد نبوی میں، رمضان میں، بوقت رات، متفرق طور پر قیام رمضان کرتے تھے، کسی کو کچھ بھی قرآن یاد ہوتا تو اس کے پیچھے پانچ یا چھ افراد یا کم و بیش کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں : ایک رات مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اپنے حجرہ کے دروازے پر چٹائی ڈال دوں۔ عشاء پڑھنے کے بعد، رسول اللہ ﷺ اس جگہ تشریف لے گئے، مسجد میں جو لوگ موجود تھے، وہ آپ کے پاس جمع ہو گئے، آپ نے دیر رات تک ان کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ لوٹ کر اندر آ گئے، میں نے چٹائی اسی حالت میں چھوڑ دی، صبح کو لوگوں میں چرچا ہوا کہ جو لوگ مسجد میں تھے رات میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو نماز پڑھائی ہے، تو پھر کیا تھا، شام کو مسجد بھر گئی، رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی، اور اندر تشریف لائے، لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا : کیا بات ہے؟ میں نے بتایا کہ رات کی نماز کا لوگوں میں چرچا ہوا تو آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے یہ بھیڑ لگی ہے۔ آپ نے فرمایا: عائشہ! چٹائی لپیٹ دو۔ میں نے لپیٹ دی۔ رسول اللہ ﷺ نے رات بے خبری میں نہیں گزاری (بلکہ عبادت میں)، لوگ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح کے لیے تشریف لے

---

(۱) مسند احمد ۳ ر ۱۲۸ مطبوعہ دارالمعارف احمد شاکر میں ہے :ابو سلمہ بن عبدالرحمن نے کہا کہ میرے والد نے مجھ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بیان کیا کہ اللہ عزوجل نے رمضان کا روزہ فرض کیا، اور میں نے اس کے قیام کو مسنون کیا۔ لہذا جس نے ایمان کے ساتھ بہ نیت ثواب روزہ رکھا اور قیام کیا، وہ گناہوں سے اس طرح پاک وصاف ہو گیا، جیسا کہ اس دن، جس دن اس کی ماں نے اس کو جنم دیا تھا"

گیے تو فرمایا: لوگو! بخدا! میں نے رات بے خبری میں نہیں گزاری والحمد للہ۔ تمہاری موجودگی کا علم مجھے تھا، لیکن مجھے یہ اندیشہ تھا کہ تم پر فرض ہو جائے۔ بہ قدر طاقت عمل کرو کہ اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا، بلکہ تم اکتا جاؤ گے"

مروزی (کی کتاب قیام اللیل) کے الفاظ یہی ہیں، اس روایت کو امام بیہقی نے بھی نقل کیا ہے، انہوں نے راتوں کی تعداد: تین یا چار لکھی ہے۔ مجمع الزوائد میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے ہمیں رمضان میں آٹھ رکعات اور وتر پڑھائی، اگلی رات ہم مسجد میں اس امید سے جمع ہوئے کہ رسول ﷺ تشریف لائیں گے لیکن آپ تشریف نہ لائے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ پھر ہم داخل ہو گئے "الحدیث" اصل حدیث بخاری و مسلم میں ہے۔

مجمع الزوائد اور بیہقی میں ہے :

"رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں بیس رکعتیں پڑھائیں۔ یہ روایت ابوشیبہ کے سبب ضعیف ہے۔ مروزی کی روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کو کچھ بھی قرآن یاد ہوتا لوگ اس کے پیچھے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ یعنی ترغیب سے ترقی کر کے، فرضیت صوم سے متصل سنیت کا مرحلہ، پھر بالفعل مسجد نبوی میں معمولی حافظ قرآن کے پیچھے قیام، پھر اگلا مرحلہ خود رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قیام، اور آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنا، گو کہ (صحیح روایت کے مطابق) آپ کو احساس نہیں ہوا تھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پڑھ رہے ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے آپ کے یہ دریافت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیا بات ہے؟ اور پھر آپ کا یہ فرمانا کہ چٹائی لپیٹ دو"

اس سے زیادہ صریح روایت، مروزی کے یہاں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ "رسول اللہ ﷺ رمضان میں نماز پڑھ رہے تھے، میں آکر آپ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا، پھر دوسرے پھر تیسرے صاحب آگئے، اور پھر ایک جماعت بن گئی، جب آپ اپنے پیچھے ہماری موجودگی کا حضور ﷺ کو احساس ہوا تو آپ نے نماز مختصر کی، اور گھر میں چلے گئے۔

صبح ہم نے عرض کیا : اے اللہ کے رسول !رات ہماری موجودگی کا احساس آپ ہو گیا تھا ؟ آپ نے فرمایا، ہاں، پھر میں نے جو کچھ کیا، اسی وجہ سے کیا تھا" اس حدیث سے معلوم ہوا تا ہے کہ اولاً آپ کو احساس نہیں ہوا تھا، کیوں کہ حضرت انس نے کہا : جب اپنے پیچھے ہماری موجودگی کا آپ کو احساس ہوا، اسی طرح اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ نماز مسجد ہی میں شروع فرمائی تھی، کیوں کہ حضرت انس نے کہا : آپ نے نماز مختصر کی اور گھر میں چلے گئے۔ نیز اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ان کی نماز کا علم ہوا، اور آپ نے ان پر نکیر نہیں فرمائی۔

حضور نے یہ نماز مسجد میں پڑھی تھی، اس کی مزید صریح دلیل، بیہقی میں حضرت عروہ بن زبیر کی روایت ہے کہ ان کو حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ ایک بار آدھی رات کو رسول اللہ ﷺ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے نکلے، تو کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی، صبح کو لوگوں میں اس کا چرچا ہوا۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے چوتھی رات تک آپ کی نماز کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا : مسجد تنگ پڑ گئی، آپ باہر نہیں نکلے۔ اس روایت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لیے آپ مسجد میں تشریف لے گئے تھے، نیز معلوم ہوتا ہے کہ مسجد بھر گئی تھی۔

یہ اگلا قوم تھا، یعنی پہلے لوگ ادھر ادھر متفرق طور پر پڑھتے تھے، اب مسجد بھر گئی، اور تنگ پڑ گئی، لیکن حضور ﷺ فرضیت کے اندیشہ سے باہر تشریف نہ لائے۔

حضور ﷺ کے لیے نکلنا ممکن تھا، اگر یہ علت (فرضیت کا اندیشہ) نہ ہوتی، معلوم ہوا کہ لوگوں کو یہ نماز پڑھانا، اور اس کے لیے لوگوں کا اجتماع جائز ہے۔ لیکن حضور ﷺ نے شفقت کے سبب، اور اس اندیشہ سے کہ ان پر فرض ہو جائے اور وہ اس کو پورا نہ کر سکیں، آپ نے پھر ان کو نماز نہیں پڑھائی۔ گھروں میں اور مسجد میں کسی جگہ عام لوگوں کے لیے جماعت سے تراویح کی حضور نے تائید فرمائی ہے، گھروں سے متعلق مروزی کے یہاں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ ابی بن کعب، رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے، اور عرض کیا : اے اللہ کے رسول !میرے ساتھ رات ایک معاملہ پیش آگیا" آپ نے فرمایا: کیا ہوا ؟ انہوں نے کہا: میرے گھر کی عورتوں نے کہا : ہمیں

قرآن پڑھنا نہیں آتا، آپ پڑھیں تو ہم آپ کے پیچھے نماز پڑھ لیں، میں نے ان کو آٹھ رکعات پڑھائی" حضور ﷺ خاموش رہے۔ جو گویا آپ کی رضامندی ہے۔ مسجد سے متعلق، مروزی ہی کے یہاں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے : "رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے تو کیا دیکھتے ہیں، رمضان میں کچھ لوگ مسجد کے ایک گوشہ میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ حضور نے دریافت فرمایا : یہ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو قرآن یاد نہیں، ابی بن کعب ان کی امامت کر رہے ہیں اور وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "انہوں نے اچھا کیایا (فرمایا :) انہوں نے کیا خوب کیا"

اس کے بعد اخیر سے قبل کا مرحلہ ہے، جس کا ذکر مروزی کے یہاں حضرت انس کی روایت میں ہے :

"رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کو اکیسویں رمضان کی شب میں جمع کرتے اور ان کو تہائی رات تک نماز پڑھاتے، پھر بائیسویں کی رات جمع کرتے اور نصف شب تک ان کو نماز پڑھاتے، پھر تیسویں رات کی شب کو جمع کرتے اور تہائی رات تک نماز پڑھاتے، پھر چوبیسویں رات ان کو غسل کرنے کا حکم دیتے، اور صبح تک ان کو نماز پڑھاتے، اس کے بعد ان کو جمع نہیں کرتے تھے"

اس روایت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے گھر والوں کے ساتھ تین راتوں کو قیام کرتے جس کی مدت مختلف تھی، بہ تدریج اول کو تہائی رات، دوم کو نصف شب اور سوم کو دو تہائی شب تک۔ مستبعد نہیں کہ آپ کے اس عمل سے یہ سمجھا جائے کہ آپ نے رغبت خیر اور اندیشۂ فرضیت کے درمیان عمل کیا ہے کیوں کہ یہ عمل عشرۂ اخیر کا ہے جو مزید رغبت کا محل ہے۔ اسی طرح بہ تدریج مدت قیام کو بڑھانا اسی رغبت پر عمل کرنا ہے۔ اسی طرح اخیر رمضان تک اس کو جاری نہ رکھنے سے، فرضیت کا اندیشہ سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے بعد تدریج کا آخری مرحلہ آیا، جس کا ذکر حضرت ابوذرؓ کی روایت میں ہے اس روایت کے متعلق "المنتقی" میں ہے اس کو خمسہ نے روایت کیا، اور ترمذی نے اس کی تصحیح کی ہے۔ نیز اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے، سنن میں اس کے الفاظ یہ ہیں :

"ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان کا روزہ رکھا، لیکن کسی رات آپ

نے ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا، جب تیئس کی رات آئی تو آپ نے ہمارے ساتھ قیام کیا، جو تقریباً تہائی رات تک جاری رہا، چوبیس کی رات کو آپ نے ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا، پھر پچیس کی رات کو ہمارے ساتھ قیام کیا، جو نصف شب تک جاری رہا۔ ہم نے عرض کیا : اے اللہ کے رسول! کاش بقیہ رات بھی آپ نفل پڑھاتے رہتے۔ تو آپ نے فرمایا: اگر انسان امام کے ساتھ قیام کرکے لوٹ جائے تو بقیہ رات کا ثواب اس کے لیے لکھ دیا جائے گا چھبیس رمضان کی رات کو آپ نے ہمارے ساتھ قیام نہیں فرمایا، اور ستائیس کی رات کو قیام کیا، اور اپنے گھر والوں کو کہلا بھیجا، لوگ جمع ہوگئے اور یہ قیام اتنی دیر تک رہا کہ ہمیں سحری چھوٹنے کا اندیشہ ہونے لگا"

امام بیہقی نے کہا : اس روایت کو وہب نے داؤد سے روایت کیا۔ انھوں نے کہا: چوبیسویں رات کو بقیہ کا ساتواں، اور کہا : چوبیسویں رات کو باقی کا پانچواں، اور اٹھائیسویں رات کو باقی کا تیسرا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تراویح اس حد تک پہنچ گئی کہ اس کے لیے اجتماع ہوا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی تقریر و تائید فرمائی، کیوں کہ صحابہ نے حضور سے عرض کیا تھا کہ کاش بقیہ رات بھی آپ نفل پڑھاتے رہتے۔ اس سے دو چیزیں سمجھ میں آتی ہیں :

اول:

مسجد میں لوگوں کے اجتماع کا حضور کو علم ہوا اور آپ نے تقریر فرمائی، جیسا کہ ستائیسویں رات کو اپنے گھر والوں کو کہلوا بھیجنے کا ذکر ہے، اس کی تائید صحیح روایت سے ہوتی ہے : اخیر عشرہ میں حضور مضبوطی سے تہبند باندھ لیتے، بستر لپیٹ دیتے، اور اپنے گھر والوں کو بیدار کرتے۔

دوم :

آپ نے تعداد رکعات کی تحدید نہیں فرمائی، اور جب لوگوں نے رات کے بقیہ حصہ میں مزید پڑھانے کی درخواست کی تو آپ نے اس مطالبہ کی تائید و تقریر کی، اس پر

نکیر نہیں کی۔ ہاں آپ نے لوگوں کو اس سے بہتر کی رہنمائی فرمائی کہ امام کے ساتھ قیام کرنے کے بعد لوٹ جائے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ حضرت جویریہ (۱) کے واقعہ میں ہے کہ حضور کا ان کے پاس سے گزر ہوا۔ وہ کنکری یا گٹھلی پر تسبیح پڑھ رہی ہیں، حضور واپس آتے تو پھر ان کو اسی حالت میں دیکھا تو فرمایا: میں نے ایسے کلمات کہے ہیں جو تمہاری تسبیح کے برابر ہیں، وہ یہ ہیں، "سبحان الله وبحمده عدد خلقه ورضا نفسه وزنة عرشه ومداد كلماته" حضور ﷺ نے ان کے عمل پر نکیر نہیں فرمائی، ہاں ان کو اس سے بہتر کی رہنمائی کر دی۔ اسی طرح یہاں پر بھی حضور ﷺ نے مزید پڑھانے کی صحابہ کے مطالبہ پر نکیر نہیں فرمائی، ہاں اس سے بہتر، بلکہ اس کے مساوی عمل کی رہنمائی فرمادی۔

الحاصل اس سے مسجد میں امام و مقتدیوں کے ساتھ باجماعت نماز کا ثبوت ہے۔ اور اس سے جماعت کے ساتھ حضور ﷺ کی امامت میں تراویح کا اعلیٰ درجہ کا ثبوت ہوتا ہے۔

ستائیسویں رات کو یہ جماعت عمومی تھی، جس میں عام لوگوں کے ساتھ حضور کے اہل خانہ بھی شریک ہوئے۔ اس دور میں رکعتوں کی تعداد:

۱- بروایت جابر: چار رکعات۔

۲- بعض روایات میں: آپ نے آٹھ رکعات پڑھیں۔

۳- ایک ضعیف روایت میں: بیس رکعت۔

۴- علی الاطلاق، رکعات کی کوئی تحدید نہیں، نیز رات کے بقیہ حصہ میں مزید پڑھانے کے مطالبہ کی تقریر و تائید۔

۵- بہ تدریج تہائی رات پھر نصف شب پھر دو تہائی رات۔ لیکن اس کے ساتھ تینوں راتوں میں رکعات کی تعداد میں اضافہ کیا گیا تھا یا قرأت ہی لمبی ہوگئی، رکعات کی تعداد وہی تھی۔ پھر قرأت و قیام کو کس حد تک طویل کیا تھا۔؟!

---

(۱) یہ جویریہ ام المؤمنین ہیں (صحیح مسلم)

نماز تراویح کا طریقہ:

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے : "حضور ﷺ نے رمضان میں ایک رات نماز پڑھی، رکوع کیا، اور رکوع میں بقدر قیام سبحان ربی العظیم کہتے رہے۔ پھر سجدہ کیا، اور سجدہ میں بقدر قیام سبحان ربی الاعلی کہتے رہے۔ پھر سجدہ سے اٹھ کر بیٹھے تو بقدر قیام ربی اغفرلی کہتے رہے۔ پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں قیام کے بقدر سبحان ربی الاعلیٰ کہتے رہے۔ آپ نے صرف چار رکعت پڑھی تھی کہ یہاں تک کہ حضرت بلال صبح کی نماز کے لیے بلانے آگئے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے صرف چار رکعتیں نہایت طویل پڑھیں، اور یہ خاص رمضان کا واقعہ ہے۔ رہا عام ایام میں حضور کا معمول تو اس کے بارے میں امام بخاری نے یہ باب قائم کیا ہے : "حضور کی نماز کا طریقہ، اور رات میں حضور کتنی نماز پڑھتے تھے" اس کے تحت امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ روایت نقل کی ہے :ایک شخص نے حضور سے دریافت کیا : رات کی نماز کیسے ہے؟ آپ نے فرمایا : دو دو رکعت پڑھو، اور جب صبح کا اندیشہ ہونے لگے تو ایک رکعت وتر پڑھ لو۔

اس روایت سے نہایت وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک صبح ہونے کا اندیشہ نہ ہو، دو دو رکعت پڑھے گا۔

امام بخاری ہی نے حضرت ابن عباس کی یہ روایت نقل کی ہے : "حضور ﷺ کی نماز تیرہ رکعت تھی"۔ یعنی رات میں۔ حضرت مسروق نے حضرت عائشہؓ سے رات میں حضور کی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا۔ سنت فجر کے علاوہ سات، نو، گیارہ رکعتیں"

امام بخاری ہی نے یہ بات قائم کیا ہے: "رمضان وغیرہ میں حضور ﷺ کا قیام لیل۔ اس کے تحت حضرت عائشہؓ کی یہ روایت درج کی ہے :

"حضور ﷺ رمضان یا غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعات ایسی پڑھتے کہ ان کی خوبی، اور طوالت کو مت پوچھو۔ پھر چار رکعات ایسے خوب اور طویل پڑھتے کہ مت پوچھو۔ پھر تین رکعت پڑھتے، حضرت عائشہؓ نے کہا : میں

نے عرض کیا: کیا آپ سونے سے قبل وتر پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سوتا"

حضرت عائشہؓ حضور کی نماز کو نہایت اچھی، اور طویل بتایا، اور یہ کہ ان کی تعداد گیارہ رکعات تھی۔ لیکن صحیح مسلم میں حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ ایک رات انہوں نے حضور کے ساتھ نماز پڑھی آپ نے: سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، اور سورہ نساء پڑھی، آیت تسبیح پر پہونچتے تو تسبیح کرتے، دعاء وطلب کی آیت پر پہونچتے تو دعاء کرتے، اور پناہ مانگنے کی آیت پر پہونچتے تو پناہ مانگتے۔ پھر بقدر قیام رکوع میں رہے، پھر رکوع کے بقدر، قیام میں رہے، پھر قیام کے بقدر سجدہ میں رہے۔ ابن حجرؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہا: "یہ تقریباً دو گھنٹوں میں پورا ہوگا، شاید آپ نے پوری رات نماز پڑھی" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام اس قدر ہوتا تھا کہ ایک ہی رکعت میں دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔

بخاری میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے: "میں نے حضور کے ساتھ ایک رات نماز پڑھی، حضور اتنی دیر تک کھڑے رہے کہ میرا ارادہ برا ہوگیا۔ ہم نے کہا: کیا ارادہ تھا؟ انہوں نے کہا: میں نے ارادہ کیا کہ حضور کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤں"

الحاصل تراویح عہد نبوی میں تھی، اس کا ثبوت و مشروعیت خود حضور ﷺ سے ہے۔ البتہ مرحلہ وار اس میں تبدیلی آتی گئی۔ جو حسب ذیل ہے:

۱- ابتداءً اس کی ترغیب دی گئی، عزیمت کے ساتھ اس کا حکم نہ تھا۔

۲- پھر فرضیت صوم کے ساتھ متصل ہو کر سنت ومندوب ہوئی۔

۳- عملی طور پر اس کو ادا کیا گیا، لوگوں نے اس کو متفرق طور پر ادا کیا۔

۴- آہستہ سے لوگ حضور کی جائے نماز تک آگئے، آپ کی اقتداء میں اس کو ادا کیا، آپ کو احساس نہ ہوا، حضور ﷺ غلط وباطل پر برقرار نہیں رکھ سکتے۔

۵- جو لوگ دوسروں کو مسجد یا گھروں میں نماز تراویح پڑھاتے تھے، حضور نے ان کو برقرار رکھا۔

۶- بذات خود آپ نے اہل خانہ کے ساتھ اس کو ادا کیا۔

۷- بذات خو آپ نے اہل خانہ اور دوسرے لوگوں کو، چند متفرق راتوں کو نماز

تراویح پڑھائی۔ رہی تعداد رکعات تو اس کے بارے میں یہ ہے :

ا - آپ نے چار رکعت پڑھی جو پوری رات میں ختم ہوئی۔

(ب)۔ آٹھ رکعات پڑھی۔

(ج)۔ گیارہ رکعت پڑھی، لیکن ان کی خوبی اور طوالت کو نہ پوچھو!!

(د)۔ دس رکعات پڑھی۔

بعض متاخرین صرف انہی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اس کا بھی ثبوت ہے :

ا- علی الاطلاق بلا تحدید ذکر آیا ہے: "جس نے ایمان کے ساتھ بہ نیت ثواب قیام رمضان کیا"

۲- صحابہ نے کہا کہ رات کے بقیہ حصہ میں نفل پڑھادیں، اس کو آپ نے تقریر وتثبیت کی۔ (نکیر نہیں فرمائی)

۳- یہاں پر ایک اور مسئلہ ہے، جس کو ہمارے علم میں کسی نے نہیں چھیڑا وہ یہ ہے:
حضرت عائشہؓ نے فرمایا : حضور ﷺ جب بھی عشاء پڑھ کر میرے گھر آتے، چار یا چھ رکعات پڑھتے۔ حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ آپ رات کی نماز، دو ہلکی رکعتوں سے شروع فرماتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کی تیرہ رکعات، حضرت عائشہ کی بعد عشاء چھ رکعت، اور ابتدائی دو رکعات، ان سب کو اگر جمع کیا جائے (۱۳/ ۶/ ۲/ ۲۱) تو مجموعہ ۲۱/ رکعات ہوگا۔ اور یہی وہ تعداد رکعات ہے ، جس پر حضرت عمر نے لوگوں کو ابی بن کعب کی امامت میں جمع کیا تھا۔ لہذا اس تعداد کا ثبوت سنت نبوی ہو جاتا ہے ۔ محض حضرت عمرؓ کا ذاتی اختیار وانتخاب تک نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اب کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مسروق عن عائشہ کی روایت پر اکتفاء کرتے ہوئے آٹھ سے زیادہ کو ممنوع قرار دے یا حضرت عمرؓ کو سنت کی مخالفت کا الزام دے۔ حاشا وکلا۔

• • •

علماء دیوبند کون اور کیا؟

مورخہ ۲؍اگست ۱۹۹۹ء کو طلبہ مرکز المعارف ممبئی برانچ نے ۱۴؍ممالک سے آئے ہوئے اسکالرس کے استقبال میں ایک تعارفی جلسہ منعقد کیا اس موقع پر حضرت مولانا بدر الدین اجمل القاسمی صدر مرکز المعارف ورکن شوری دارالعلوم دیوبند صاحب نے علمائے دیوبند کی مختلف دینی وملی خدمات کا مختصر اور جامع تذکرہ کیا جسے بغرض افادیت پیش کیا جارہا ہے۔

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على سيد نا محمد خاتم النبيين وعلى آله واصحابه الطيّبين الطاهرين اما بعد : اعوذ بالله من الشيطان الرجيم قال الله تعالى "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" (سورة آل عمران آية ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو لوگوں کے نفع کے لئے نکالے گئے ہو تم بھلی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ وقال تعالی "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ" آپ اپنے رب کی راہ یعنی دین اسلام کی طرف لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلایئے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجیے آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہو گیا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ (سورة النحل آية ۱۲۵)

معزز سامعین کرام! مذہب اسلام دین فطرت ہے اس کے اصول زندگی کے

تمام شعبوں کو حاوی ہیں۔ روئے زمین پر صرف اور صرف یہی نجات اور ابدی فلاح کا راستہ ہے اس سے منحرف ہو کر اگر کوئی الگ دین اختیار کرتا ہے تو وہ عند اللہ مقبول نہیں ہے جیسا کہ اللہ پاک نے سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۹ کے اندر ارشاد فرمایا ہے "إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَام" اللہ پاک کا پسندیدہ دین تو صرف اسلام ہے اور اسی سورہ میں آیت نمبر ۸۵ کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے بالکل کھلے لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے "وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ "جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ دین اس سے مقبول نہ ہوگا۔ اسلام کی اسی صداقت اور خوب صورت اصولوں نے اسے جزیرہ عرب سے باہر بھی قبول عام بخشا اور ہندوستان، روس، جاپان، امریکہ، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصہ پر اس کا ایک گہرا اثر ہے اور آج دنیا کی ایک تہائی آبادی اسلام کو اپنا مذہب، اپنا آئڈیل تسلیم کرتی ہے۔ صرف ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۳۰ کروڑ ہے جو دنیا کے کسی مسلم ممالک کے سو فیصد مسلمانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

معزز سامعین! آج ہندوستان میں جو کچھ بھی دینی ماحول اور اسلام کا وسیع جال، قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں اور اسلامی تشخص نظر آرہا ہے یہ سب کچھ کس کی بدولت ہے اور اس کے پیچھے اللہ کے داعیوں اور علمائے کرام کی کتنی قربانیاں ہیں؟ غیر منقسم ہندوستان میں مسلم حکومت کا آفتاب غروب ہونے کے بعد اسلام گہن آلود ہو گیا تھا انگریز حکمرانوں نے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا۔ اسلامی افکار پر غیر اسلامی افکار اور مشرکانہ عقائد وخیالات کی تہ اتنی دبیز ہو گئی کہ اسلام کی اصل شناخت ختم ہوتی جارہی تھی اس سلسلے میں داخلی اور خارجی دونوں طرح کے فتنے مصروف کار تھے اسلام کو ان دشمن طاقتوں سے بچانا علماء کا سب سے اہم فریضہ تھا اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے صرف علماء دیوبند کا مقدس طبقہ تھا جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا فتویٰ دیا اور مختلف محاذ پر انگریزوں سے برسرپیکار ہو کر دار و رسن کا استقبال کیا اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کیا مورخین نے لکھا ہے کہ دہلی سے سہارنپور تک کوئی ایسا درخت نہیں تھا جس پر علماء کی لاش نہ لٹکتی تھی صرف لال قلعہ سے چاندنی چوک تک شہید ملت علماء کرام کی تعداد

تین لاکھ بتلائی گئی ہے۔ اسی طرح شاملی میدان اور جلیانوالہ کی زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو ان علماء کے خون سے لبریز نہ ہو۔ ۱۸۵۷ء کی خون آشام جنگ میں لاکھوں علماء شہید ہوگئے ایسے نازک حالات میں حجۃ اسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے ۱۸٦٦ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی تاکہ مسلمانوں کے ایمان وعقائد کی حفاظت کی جاسکے۔ الحمد اللہ دارالعلوم دیوبند "شَجَرَةٌ طَيِّبَةٌ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ" کا مصداق ثابت ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں پر انگریزوں کا ظلم اپنے تمام حدود سے تجاوز کر چکا تھا صرف شہر دہلی میں بے شمار ممتاز سربرآوردہ علماء اور مسلمانوں کو تماشائیوں کے ہجوم کے سامنے پھانسی دی جارہی تھی مسلمانوں کے دینی، مذہبی اور تہذیبی وجود کو مٹادینے کا لندن پارلیمنٹ نے فیصلہ کردیا تھا اور طے کیا گیا کہ پورے ہندوستان کو بجبر واکراہ عیسائی بنادیا جائے اس فیصلے کے بعد پادریوں کا ایک لشکر جرار ہندوستان بھیج دیا گیا جو پورے ملک میں پھیل کر عیسائیت کی تبلیغ کرنے، اسلام پر اعتراضات کرنے میں جٹ گیا اور اس طرح مسلمانوں کے تہذیبی اور مذہبی وجود کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ علمائے دیوبند نے عیسائی مشنریوں کا بروقت تعاقب کیا اور فتنہ عیسائیت کے ابطال کے لئے کمربستہ ہوگئے عیسائی پادریوں کے چیلنجوں کا دندان شکن جواب دینے کے لئے میدان مناظرہ میں اتر پڑے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے عیسائی پادریوں سے مناظرہ کیا اور تمام میں عیسائیت کو شکست دے کر انھیں ذلت ورسوائی کی خاک چٹوائی مولانا نے ہی سب سے پہلے رد عیسائیت میں معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کیں آپ نے ایک مبسوط کتاب "اظہار الحق" کے نام سے عربی زبان میں تصنیف کی جس میں پادریوں کے اسلام پر تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے عیسائیت کے منسوخ ہونے اور انجیل کے محرف ہونے کو ثابت کیا ہے آج بھی دنیا اس کتاب کو رد عیسائیت میں حرف آخر سمجھتی ہے اس کے انگریزی ایڈیشن پر ٹائمز آف لندن نے تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا "لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائیت کی ترقی کے لئے میدان باقی نہیں رہے گا" اس کے علاوہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے بھی عیسائی پادریوں سے متعدد کامیاب مناظرے کئے اور دنیائے عیسائیت میں زلزلہ پیدا کردیا ۱۸۷٦ء اور ۱۸۷۷ء میں شاہ جہاں پور میں عظیم الشان مناظرے ہوئے جن میں حضرت نانوتویؒ

نے عیسائی پادیوں کو اتنی بری طرح شکست دی کہ بڑے پیانے پہ پادریوں نے مناظروں کا سلسلہ بند کردیا آپؒ نے دو بڑی عالمانہ کتابیں تحریر فرمائی ایک ''الابحاث الضروریۃ'' دوسری ''حجۃ الاسلام'' یہ دونوں کتابیں اپنے زور استدلال کی بناپر بے مثال شاہ کار ہیں اس طرح علمائے دیوبند نے عیسائیت کے اس پھیلتے ہوئے سیلاب پر بند لگائی۔

جمعیۃ علماء ہند بھی در حقیقت دارالعلوم دیوبند ہی کی ایک شاخ اور علمائے دیوبند کا ایک عظیم کارنامہ ہے جس نے الحمد للہ علمائے دیوبند کی زیر سرپرستی میں نہ صرف آزادی کے حصول میں اہم رول ادا کیا ہے بلکہ آزادی کے بعد آج بھی ملک کے مختلف صوبوں میں دینی وملی خدمات انجام دے رہی ہے۔ نسلی خانہ جنگی، فرقہ ورانہ تشدد کے وقت یہی وہ جمعیت ہے جو سب سے پہلے زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور فساد زدہ انسانوں تک اپنی امداد پہونچاتی ہے۔ مسلمانوں کے دینی وملی تشخص کی حفاظت میں اس تحریک کا جو رول ہے اسے دوست ودشمن ہر ایک نے سراہا ہے۔ بہر کیف علمائے دیوبند کی اس برگزیدہ جماعت نے ہر دور اور ہر زمانہ میں امت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے اور ہر قسم کے فتنوں سے امت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مثلاً فتنۂ عیسائیت کے علاوہ کئی داخلی فتنے نمودار ہوئے ان سب میں سب سے خطرناک فتنہ قادیانیت کا تھا۔ اس فتنہ کا بانی مرزا غلام احمد قادیانی پنجاب کے شہر قادیان میں ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوا اس نے انگریزوں کی اسلام دشمن حکومت کی حمایت میں اپنی پوری زندگی صرف کردی اور ۱۸۹۱ء میں نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا ہزاروں مسلمانوں کو اپنے حلقۂ اطاعت میں لے کر انھیں مرتد بناڈالا اس فتنے کی سرکوبی میں بھی علمائے دیوبند نے کارہائے نمایاں انجام دیا اور کم از کم برصغیر میں اس فتنہ کو نیم جان بنادیا چناں چہ اسی وجہ سے قادیانیت نے برصغیر سے بھاگ کر یورپی ممالک میں پناہ لے رکھی ہے دیوبند کے علماء کرام حضرت شیخ الہند، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، شاہ عطاء اللہ بخاری، مولانا بدر عالم میرٹھی اور ان کے علاوہ بہت سارے علمائے دیوبند قادیانیت کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے کمربستہ ہوگئے متعدد مناظرے کئے جن میں قادیانیت کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا علمائے دیوبند نے قرآن وسنت کی روشنی میں رد قادیانیت میں لٹریچر کا ایک بڑا ذخیرہ تیار کرڈالا پاکستان میں آئینی طور پر قادیانیوں کو غیر

مسلم ہونے کا ایکٹ پاس کرایا، علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے رد قایانیت میں "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلامؑ" "تحیۃ الاسلام" "اکفار الملحدین" مولانا بدر عالم میرٹھی نے "الجواب الفصیح لمنکر حیاۃ المسیح" مولانا ادریس رحمہ اللہ نے "مسلک الختام فی ختم نبوۃ سید الانام" اور حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ نے ختم نبوت کے نام سے ایک مبسوط کتاب تصنیف کی جس میں قرآن کریم کی سو آیات کریمہ اور دو سو احادیث سے عقیدۂ ختم نبوت ثابت کیا انکے علاوہ سیکڑوں کتابیں رد قایانیت میں علمائے دیوبند نے تصنیف کرکے ایک بڑے فتنے سے ہندوستاں کے مسلمانوں کو بچایا اور اسی سلسلے میں دارالعلوم دیوبند نے "کل ہند تحفظ ختم نبوت" کے نام سے ایک مستقل ڈپارٹمنٹ قائم کیا جہاں سے شب و روز رد قایانیت پر کتابیں اور پمفلٹ شائع کی جاتی ہیں اور اس فتنہ کو کچلنے کی اسکیمیں تیار ہوتی ہیں۔

ایک دوسرا داخلی فتنہ رضاخانیت کا نمودار ہوا جس کو بہت سے مقام پر بریلویت کے نام سے جانا جاتا ہے اس فتنہ کے بانی علمائے سوء نے توحید و سنت کے بجائے بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد و خیالات مسلمانوں میں پھیلانا شروع کیا۔ حب رسول اور حب اولیاء کے نام پر انھیں الوہیت کے مقام پر کھڑا کر دیا نبی اکرم ﷺ کی بشریت کا انکار کرکے آپ ﷺ کو نوری مخلوق کہنا شروع کیا ہندوستان کے ہزاروں مزاروں کو خانہ کعبہ سے بڑھکر مقدس بناڈالا، قبروں اور مزاروں کو سجدہ کرنا عرس قوالی وغیرہ بدعات و خرافات سے مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ زنی کیا علمائے دیوبند نے ان فتنہ گروں اور بدعتیوں کا جم کر مقابلہ کیا عوام کو توحید و سنت قرآن و حدیث کے مصادر کی روشنی میں سمجھایا اور ان فتنوں سے لاکھوں کو تائب کرایا۔ در اصل علمائے دیوبند کا مسلک "مسلك اهل السنة والجماعة" ہی ہے جس کی توثیق علمائے عرب کی تصدیقات سے کی جا سکتی ہے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی کتاب "المهند على المفند" اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی مایۂ ناز کتاب "الشهاب الثاقب" مولانا سرفراز خاں صفدر کی کتاب "المنهاج الواضح" تبرید النواظر اور علم غیب رد بریلویت میں اپنی مثال آپ ہے۔

الغرض دیوبند کی تاسیس کا مقصد وحید ہندوستان میں اسلام کو قرآن و سنت کی

روشنی میں پیش کرنا، اسلام کو خرافات و بدعات سے علیحدہ کرنا اس پر ہونے والے حملوں کا جواب دینا اور لوگوں کی اصلاح اور دعوت الی اللہ ہے۔ چناں چہ حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ کی جاری کردہ اصلاحی جماعت جو علمائے دیوبند کی زیر نگرانی چل رہی ہے آج پوری دنیا کی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری ہے اس کا کام براہ راست مسلمانوں تک پہونچ کر فرداً فرداً انتہائی تواضع کے ساتھ ان سے دین کی راہوں پر لگ جانے کی درخواست کرنا، کلمہ نماز سکھانا، اللہ کی راہ میں وقت اور مال خرچ کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ آج یہ اللہ والی جماعت دنیا کی ڈیڑھ سو سے زائد ملکوں میں پھیل چکی ہے اور اس کی بدولت کروڑوں مسلمان اللہ کے راستہ پر لگ گئے ہیں اور ہزاروں غیر مسلم اسلام سے مشرف ہوچکے ہیں مولانا منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی امارت میں بھی متعدد بار جماعتیں عرب ممالک پہونچیں اور اس کے بڑے اچھے اثرات وہاں ظاہر ہوے الحمدللہ یہ تمام حضرات دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ ہیں۔ موخرالذکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے گھر قیام فرماکر علم حدیث حاصل کیا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ذات گرامی کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے مسلسل ۱۸ سال تک مسجد نبوی میں درس حدیث دیا ہے۔ عرب ممالک میں آج بھی حضرتؒ کے تلامذہ ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے دعوتی میدانوں کے علاوہ علمی میدانوں میں بھی دنیائے اسلام کو قیمتی ذخیرہ دیا ہے دارالعلوم دیوبند کا شیوہ شروع سے ہی قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس رہا ہے اور اس ادارے کے فارغین نے فن حدیث و تفسیر میں بڑی وقیع کتابیں تصنیف کی ہیں ان سب کے تذکرہ کے لئے ہفتوں درکار ہیں اسوقت صرف چند ناموں پر اکتفاء کرنا مناسب سمجھتا ہوں علم تفسیر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی "بیان القرآن "مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کی ۸ ضخیم جلدوں میں "معارف القرآن " اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی تفسیر مع ترجمہ "شیخ الہند "جو سعودی حکومت اردو دنیا کے لئے چھاپ رہی ہے۔ علم حدیث پر عربی زبان میں "التعلیق الصبیح فی شرح مشکوۃ المصابیح "مولانا ادریس کاندھلوی "بذل المجہود " شرح ابوداؤد علامہ خلیل

احمد السہارنپوری، معارف السنن شرح جامع الترمذی ۶ ضخیم جلدوں میں علامہ محمد یوسف البنوری رحمہ اللہ،فیض الباری شرح صحیح البخاری، العرف الشذی علی جامع الترمذی علامہ انورشاہ الکشمیری رحمہ اللہ، "للورد الشذعلی الترمذی" شیخ الہند محمود الحسن،لامع الدرای شرح البخاری فقیہ کبیر محمد زکریاؒ شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور المعارف المدینہ مولانا السید حسین احمد المدنی، فتح الملہم شرح صحیح مسلم علامہ شبیر احمد العثمانی رحمہ اللہ، اعلاء السنن ۲۱ ضخیم جلدوں میں علامہ ظفر احمد التھانوی رحمہ اللہ، آثار السنن علامہ ظہیر الحسن شوق، اوجزالمسالک شرح موطاللامام مالکؒ شیخ محمد زکریا وغیرہ کتابیں عم تفسیر وعلم حدیث میں نہایت قیمتی خزانہ ہیں جن کی اہمیت وعظمت اور افادیت کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

الحاصل دارالعلوم دیوبند کا شیوہ دعوت الی اللہ قال اللہ و قال الرسول، اصلاح المسلمین، فرقہ ضالہ اور مختلف فتنوں کی سرکوبی کے ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مرکز المعارف انڈیا ہے جس کا مقصد باصلاحیت علماء کو انگریزی زبان وادب سے لیس کرنا ہے تاکہ شیطان رشدی، تسلیمہ نسرین ارون شوری جیسے دشمنانِ اسلام کا تعاقب کرتے ہوئے وقت کی زبانِ انگریزی میں دین اسلام کی صحیح توضیح وتشریح کی جاسکے۔ الحمد للہ نوجوان فارغین دیوبند کی ایک باصلاحیت کھیپ انگریزی زبان کے ذریعے اسلام کے پیغام کو عام کرنے لے لئے مرکز المعارف بمبئی برانچ میں خیمہ زن ہے۔

اور اخیر میں یہ بتلادینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف تقریر اور تحریر اور کہنے سے نہیں پھیلا ہے اسلام ایک عملی دین اور نظام زندگی کا نام ہے ہمارا ماضی ہمیں بتاتا ہے کہ ہزاروں۔ لاکھوں لوگوں نے حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام اور تابعین عظام کی عملی زندگی کو دیکھ کر اسلام کو گلے لگایا ہے۔ اگر ہماری زندگی نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق اور اسلام کا عملی نمونہ بن جاتے تو ہماری تقریر و تحریر کو چار چاند لگ سکتا ہے۔ اللہ پاک سے دعاء کرتے ہیں کہ اللہ پاک ہم سب کے اندر دعوت کی تڑپ پیدا کردے اور ہمیں چلتا پھرتا داعی نمونہ بنادے۔ آمین

وآخردعوانا الحمد للہ رب العالمین۔

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم

ماہ رجب ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳ شمارہ ۱۰ فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دار العلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ دار العلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپے

پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/

ہندوستان سے ۶۰/

Tel : 01336-22429
Fax : 01336-22768
Tel : 01336-24034 (EDITOR)

REGD NO.SHN/L-13/NP-111/98

فہرست مضامین

☆☆ ختم خریداری کی اطلاع ☆☆

● یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی۔ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہو گا۔

پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤدوالا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند کی معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

گزشتہ شمارہ میں عرض کیا جاچکا ہے کہ علماء دیوبند احکام شرعیہ فرعیہ اجتہادیہ میں فقہ حنفی کے مطابق عمل کرتے ہیں بلکہ برصغیر میں آباد کم و بیش پچاس کروڑ مسلمانوں میں نوے فیصد سے زائد اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے۔ لیکن اپنے اس مذہب و مسلک کو آڑ بناکر دوسرے فقہی مذاہب کو باطل ٹھہرانے یا ائمہ مذاہب پر زبان طعن دراز کرنے کو جائز نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ حق و باطل کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ صواب و خطا کا تقابل ہے۔ مسائل فرعیہ اجتہادیہ میں ائمہ اجتہاد کی تحقیقات میں اختلاف کا ہو جانا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اور شریعت کی نظر میں یہ اختلاف صحیح معنوں میں اختلاف ہے ہی نہیں۔ قرآن حکیم ناطق ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ)

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ کے دور تک شریعتوں اور منہاج کا کھلا ہوا اختلاف رہا پھر بھی قرآن حکیم اس کو ایک ہی دین قرار دے رہا ہے اور شریعتوں کے باہمی فروعی اختلاف کو وحدت دین کے معارض نہیں سمجھا۔ اگر یہ فروعی اختلاف بھی افتراق و اختلاف کی حد میں آسکتے تو پھر "وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ" کا خطاب کیوں کر درست ہوتا۔

لہذا جس طرح شرائع سماویہ فروعی اختلاف کے باوجود ایک ہی دین کہلائیں اور ان کے ماننے والے سب ایک ہی رشتہ اتحاد و اخوت میں منسلک رہے۔ تحزب و تعصب کی کوئی شان ان میں پیدا نہیں ہوئی۔ اسی لئے وہ "کانوا شیعاً" کی حد میں نہیں آتے۔ ٹھیک

اسی طرح ایک دین حنیف کے اندر فروعی اختلافات اسکی شان اجتماعیت ووحدت میں خلل انداز نہیں ہو سکتے مواقع اجتہاد میں اہل اجتہاد کا اجتہاد ہی دین کا مقرر کردہ اصول ہے اسے دین میں اختلاف کیسے کہا جاسکتا ہے رہا جماعت مجتہدین میں سے کسی ایک کی پیروی و تقلید کو خاص کرلینا تو دین کے بارے میں آزادی نفس سے بچنے اور خود رائی سے دور رہنے کے لئے امت کے سواد اعظم کا طریق مختار یہی ہے۔ جس کی افادیت وضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ جماعت غیر مقلدین کے ایک بڑے عالم اور ترجمان اس ذہنی آزادی کے نتیجہ بد پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "اے حضرات یہ مذہب سے آزادی اور خود سری وخود اجتہادی کی تیز ہوا یورپ سے چلی ہے اور ہندوستان کے ہر شہر وبستی وکوچہ وگلی میں پھیل گئی ہے جس نے غالباً ہندوؤں کو ہندو اور مسلمانوں کو مسلمان نہیں رہنے دیا حنفی وشافعی مذہب کا تو کیا پوچھنا ہے" (الاعتصام ۹ر ستمبر ۱۹۸۸)

تفسیر: اب رہا مسئلہ احکام اجتہادیہ میں ان کی ترجیحات اور طریق عمل کا تو کتاب وسنت اور امت میں متوارث قواعد نصوص کی روشنی میں ان پر بحث وگفتگو کی جاسکتی ہے جس کا دروازہ ہمیشہ سے کھلا ہے، عہد صحابہ سے یہ تعامل چلا آرہا ہے کہ اس نوع کے مسائل میں اہل نظر علماء قواعد واصول کے تحت صواب وخطا اور راجح ومرجوح کی حد تک بحث ونظر کرتے رہے ہیں۔

اس طرح کے اجتہادی ومختلف فیہ مسائل کو آڑ بنا کر ملت واحدہ میں انتشار اور تفرقہ پیدا کرنا اور انہیں حق وباطل کا معیار ٹھرا کر جماعت مسلمین کو ہدایت وضلالت کے متضاد خانوں میں تقسیم کردینا تو یہ بہت خطرناک رویہ ہے جس سے اہل سنت والجماعت کے سلف وخلف کا دامن پاک وصاف رہا ہے۔ بلکہ اس غیر معقول ناروا روش کے دروازے کو بند کرنے کے لئے تاکہ امت مسلمہ کی وحدت برقرار رہے سلف صالحین وعلمائے راسخین نے نصوص فہمی اور تاویل واجتہاد کے سلسلے میں ایک علمی دستور اور منہاج مقرر کردیا جس کے ذریعہ انھوں نے نصوص وآراء میں جمع وتطبیق کی راہیں ہموار کیں اور امت کو "مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ" کا مصداق بننے سے بچالیا۔

حیف صد حیف کہ عصر حاضر کے اہل ظواہر (جو موحد، اہل حدیث، سلفی، اثری، وغیرہ حسب موقع و محل مختلف ناموں سے اپنا تعارف کراتے ہیں) نے سواد اعظم کے اس مسلمہ علمی دستور و منہاج کو پس پشت ڈال کر اور اپنے علم و فہم کو حق کا معیار قرار دے کر ان اجتہادی مختلف فیہ مسائل کو حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کے درجہ میں پہنچادیا ہے اور ہر وہ فرد اور جماعت جو ان کی فکر و نظریہ سے ہم آہنگ نہیں وہ ان کے نزدیک ہدایت سے عاری مبتدع، ضال و مضل اور فرقہ ناجیہ سے خارج ہے۔ بطور مثال چند حوالے پیش کیے جارہے ہیں۔

اس جماعت کے سرخیل اور سب سے بڑے مصنف و محقق مولانا نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی جو اعتدال پسندی میں مشہور ہیں اپنے ایک رسالہ "ترجمان وہابیہ" میں رقم طراز ہیں "سرچشمہ سارے جھوٹے حیلوں اور مکروں کا اور ان تمام فریبوں اور دغابازیوں کی علم رائے ہے جو مسلمانوں میں بعد پیغمبر بر حق کے پھیلا ہے اور مہا جال ان سب خرابیوں کا بول چال فقہا اور مقلدوں کی ہے اور ساری خرابی ڈالی ہوئی ان ملاؤں کی ہے جو دام تقلید میں گرفتار ہیں اور بدعت اور شرک کے نشہ میں سرشار ہیں" (ص ۲۴ طبع لاہور)

اسی رسالہ میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

سو محمد بن عبد الوہاب خود مقلد مذہب حنبلی منجملہ انھیں چار مذاہب کے ہے جو بالفعل عامۃ رائج ہیں اور فرقہ موحدین (یہ اہل ظواہر عامۃ المسلمین مقلدین فقہا، کو مشرک سمجھتے ہیں اس لئے ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں زمانہ ماضی میں ایک عرصہ تک وہ اپنا تعارف اسی لقب سے کراتے تھے (از ناقل) کسی ایک مذہب خاص کے ان مذاہب میں سے پیرو اور مقلدین نہیں ہیں کیوں کہ یہ سب مذاہب بعد از زمانہ نبوت اسلام کے حادث ہوئے، فرق درمیان مقلد مذاہب اور فرقہ موحدین کے فقط اتنا ہے کہ موحدین نرے قرآن وحدیث صحیح کو ہی مانتے ہیں اور باقی مذاہب اہل الرائے ہیں جو مخالف سنت اور طریقہ شریعت ہے" ص ۱۶۲ اسی جماعت کے ایک اور بڑے عالم و مصنف مولانا محمد جونا گڑھی اپنی کتاب طریق محمدی میں لکھتے ہیں "جس طرح باپ دادوں کی تقلید موجب گمراہی ہے اسی طرح سادات بزرگوں کی اور اسی طرح علمائے کرام اور خداوالوں کی بھی وہ بزرگ حق پر

ہوں اور راہ یافتہ ہوں لیکن ان کی تقلید پھر بھی موجب ضلالت رہے گی۔ (ص ۱۱)

اسی کتاب میں ایک موقع پر جوناگڑھی صاحب نے یوں خامہ فرسائی کی ہے۔

''الغرض اتباع رسول ﷺ کو پرے پھینکنے کا آلہ جو ہر زمانہ میں مخالف رسول لوگ اپنے کام میں لاتے رہے ہیں یہی تقلید ہے، تقلید ہی وہ چیز ہے جو اصل اسلام سے دنیا کو روکتی ہے'' (ص ۱۵)

اسی فرقہ کے ایک اور مقتدر عالم ابوالشکور عبدالقادر حصاروی اپنی مشہور زمانہ کتاب ''سیاحۃ الجنان'' میں لکھتے ہیں: جب یہ امر روشن ہوچکا کہ مذہب حق اہل حدیث ہے اور باقی جھوٹے اور جہنمی ہیں تو اہل حدیثوں پر یہ واجب ہے کہ ان تمام گمراہ فرقوں سے بچیں اور ان سے خلاء ملاء، میل جول دینی تعلقات نہ رکھیں یعنی باطل مذہب والوں کے پیچھے نماز نہ پڑھیں اور ان کے جنازہ میں شامل نہ ہوں، ان سے سلام نہ لیں ان سے مناکحت نہ کریں۔ (ص ۴)

اسی کتاب کے ص ۵ پر یہ صاف لفظوں میں لکھتے ہیں۔

موجودہ حنفیوں میں تقلید شخصی پائی جاتی ہے جو سراسر حرام اور ناجائز ہے اور فرقہ بندیوں کا ذریعہ'' نیز لکھتے ہیں: مقلدین حنفیہ کے ہر دو فرقے دیوبندی اور بریلوی گمراہ ہیں (ص ۵)

باب تقلید سے متعلق اس فرقہ کے اعاظم علماء کی یہ عبارتیں اپنے مفہوم میں بالکل واضح وروشن ہیں اور کسی توضیح وتشریح کی محتاج نہیں جن روکی دو سے ائمہ مجتہدین امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے مدونہ مذاہب بدعت طریقۂ شریعت کے خلاف، ان کی تقلید موجب ضلالت وگمراہی ہے اور یہ مقلدین اس تقلید کو رسول خدا ﷺ کی مخالفت کے لئے بطور آلہ وحربہ کے استعمال کرتے ہیں، یہ سارے مقلدین فرقہ ناجیہ سے خارج، جہنمی ہیں (العیاذ باللہ) نہ ان کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے اور نہ ہی ان کے جنازوں میں شرکت کرنی اور نہ ان سے رشتہ مناکحت قائم کرنا درست ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دنیا میں موجود مسلمانوں کی نوے فی صد سے زائد تعداد ائمہ مجتہدین کی تقلید کرتی چلی آرہی ہے۔ اوران موجودہ اہل ظواہر کے نزدیک یہ سب کے سب گمراہ، دین سے خارج ہیں اگر صحیح مؤمن ہیں تو بس یہی شرذمۂ قلیلۃ نبی صادق ومصدوق ﷺ الف الوف تو فرمارہے ہیں علیکم بالسواد الاعظم ید اللہ علی

الجماعة اور من شذ شذ فی النار ، اور اسی نبی رحمت ﷺ کی اداؤں کی جانب اپنے آپ کو منسوب کرنے والوں کا دعویٰ اس کے بالکل برعکس ہے (یاللعجب)

بغرض اختصار اس موقع پر انھیں مذکورہ بالا حوالوں پر اکتفاء کیا جارہا ہے ورنہ ان کے تکفیر سازی کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور تقلید ائمہ کے علاوہ دیگر مسائل اجتہادیہ میں بھی یہ اپنے مخالفین کو مبتدع ومشرک سے کم نہیں سمجھتے ان کی کتابوں میں یہ مواد اس کثرت سے موجود ہے کہ اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کردیا جائے تو ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے مشہور شارح حدیث امام خطابی۔ لکھتے ہیں "الاختلاف فی الدین ثلاثة اقسام الاول فی اثبات الصانع ووحدانیته ، وانکاره کفر، والثانی فی صفاته ومشیئته وانکارهما بدعة ، والثالث فی احکام الفروع المحتملة وجوها فهذا جعل الله رحمة وکرامة للعلماء (کشف الخفاء للعجلونی ج ۲ ص ٦٧)

کس قدر افسوس وحسرت کا مقام ہے کہ جو چیز امت کے لئے باعث رحمت اور علماء کے واسطے باعث کرامت تھی آج اسی رحمت وکرامت کو علم وفہم سے مخول کرنے والے کچھ لوگ سبب شقاوت وضلالت باور کرانے پر تلے ہیں برصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں چوں کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت فروعی مسائل میں فقہ حنفی پر عامل ہے پھر ان میں دیوبندی مکتبہ فکر سے متعلق علمی ، دینی ، سماجی سرگرمیوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اس لئے ایک خاص ذہنیت کے تحت قادیانیوں ، رافضیوں وغیرہ فرقہ مکفرہ وضالہ کے بجائے بطور خاص علمائے دیوبند کو ان ظاہر پرستوں کرنے اپنے تضلیلی وتکفیری مشن کا ہدف بنار کھا ہے۔

چنانچہ ابھی حال میں اس جماعت کے علماء ہندوپاک کی مشترکہ کوششوں سے ایک کتاب "الدیوبندیة" کے نام سے عربی زبان میں شائع کرائی گئی ہے جسے ایک مہم بناکر علمائے عرب ، شیوخ حجاز ونجد اور ممالک اسلامیہ کے سرکاری دفتروں وسربراہان مملکت تک

پہنچانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں علمی امانت و دیانت کی پروا کئے بغیر اس بات کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح علمائے دیوبند کو بدعقیدہ، صحیح دین سے منحرف اور کافر و مشرک ثابت کردیا جائے۔ (فالی اللہ المشتکی)

اس من گھڑت اور غیر معقول کتاب کے اثر بد سے امت کو بچانے کی غرض سے عرب و عجم کے جانے پہچانے عالم دین اور صاحب تصنیف محقق و مفکر مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ علماء نے صحیح صورت حال سے ملت اسلامیہ کو روشناس کرانے کی غرض سے عربی و اردو میں رسائل اور کتابیں تصنیف کیں جن میں علمائے دیوبند کے صحیح مسلک اور ان کی گرانقدر علمی و دینی خدمات کو مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا ذکر تو بطور مثال کے کیا گیا ہے ورنہ اس قسم کی کتابیں تو آئے دن ان کی جانب سے شائع ہوتی رہتی ہیں جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اہل ظواہر کا نصب العین ہی یہ ہے کہ اس طرح کے مختلف فیہ فروعی مسائل کو تشہیر کرکے اور اس کی آڑ میں علمائے مقلدین کو بدعتی و گمراہ بتاکر امت کا رابطہ ان سے ختم کردیا جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کی وحدت اور اس کا ملی اتحاد پارہ پارہ ہوکر رہ جائے گا۔

ان کی اس منفی روش کے اثرات بد نہ صرف برصغیر میں بلکہ دیگر ممالک مثلاً برطانیہ، کناڈا، روس، امریکہ، افریقہ، وغیرہ جہاں ایشیائی مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں کہ اسلام کے ان نادان ٹھیکداروں کے غلط رویہ کی بدولت خود اہل اسلام باہم دست و گریباں ہیں اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے مقابلے میں کفر و اسلام کی جنگ لڑ رہا ہے امت مسلمہ کے اس انتشار و اختلال اور باہمی مذہبی جنگ سے اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے خلاف کیا کیا اور کس قدر فوائد حاصل کررہی ہیں یہ اہل نظر و بینش سے مخفی نہیں ہے۔

☆☆☆

الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفی اما بعد :

آنحضرت ﷺ نے دور آخر میں اٹھنے والے بہت سے فتنوں کی خبر دی ہے حدیث کی کتابوں میں ابواب الفتن اور کتاب الفتن کے تحت بہت سی احادیث مروی ہیں جن میں آنحضرت نے آئندہ پیش آنے والے فتنوں کا پتہ دیا ہے اس امت میں سب سے پہلا اعتقادی فتنہ خوارج سے چلا پھر صحابہ کے خلاف اہل تشیع اٹھے معتزلہ اور قدریہ کے اختلافات بھی ابھرے لیکن دور اول میں حدیث کے نام سے اس امت میں کوئی فرقہ بندی نہ ہوئی تھی۔

تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں دو تحریکیں حدیث کے موضوع پر اٹھیں (۱) منکرین حدیث کی اور (۲) دوسری عام عاملین بالحدیث کی۔ منکرین حدیث کی تحریک تیرھویں صدی میں زیادہ نہ کھلی اس وقت انکار حدیث اسی درجہ میں رہا جس درجہ میں معتزلہ کے ہاں اخبار احاد کا ہو تا رہا لیکن چودھویں صدی میں مولوی عبداللہ چکڑالوی حافظ اسلم جیر اجپوری تمنا عمادی اور غلام احمد پرویز کی مساعی بام عروج پر پہنچیں اور جو کچھ ان کے بس میں تھا یہ حضرات کر گزرے مگر دنیا گواہ ہے کہ مدارس و مساجد میں دورہ حدیث کے چراغ برابر اسی طرح روشن رہے جس طرح اکابر اہل سنت نے انہیں سنن و آثار کے پیرایہ میں روشن رکھا تھا ۔

اگر گیتی سراپا باد گیرد — چراغ مقبلاں ہر گز نہ میرد

حدیث کے نام پر اس امت میں جو دوسرا فتنہ اٹھا وہ براہ راست حدیث پر عمل کا ہے یہ عاملین بالحدیث طے شدہ مذاہب کی پیروی سے ہٹ کر ہر خاص وعام کو علم بالحدیث کی دعوت دینے لگے اور حدیث جاننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے صرف اتنی سی بات کافی سمجھی کہ کوئی بات حدیث کے نام سے سامنے آجائے وہ عمل کے لئے کافی ہے انکا عقیدہ ہے کہ جب کوئی حدیث پختہ راویوں سے انہیں کسی کتاب میں نظر آجائے انہیں اتنی تکلیف گوارا کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ اس روایت پر پہلوں کے عمل کو بھی دیکھیں یا اس باب میں ناسخ ومنسوخ کے کسی فرق کو پہنچا نیں یا وہ ان راویوں کے درجہ قبولیت میں کسی اختلاف کو پہچانتے ہوں۔ بس حدیث سنتے ہی اس پر عمل کرنا ان لوگوں کے ہاں واجب ہو جاتا ہے۔ انہیں یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس حدیث پر پہلوں کا عمل بھی رہا ہے یا نہیں اور اس حدیث کے ہوتے ہوئے پہلوں نے اسے لائق عمل جانا ہے یا نہیں۔ انہیں یہ بھی دیکھنا گوارا نہیں ہوتا کہ ترمذی شریف میں امام ترمذی نے حدیث روایت کرنے کے بعد اس پر امت کا عمل کیا پیش کیا ہے یہ انکا فہم حدیث کے لئے پہلے مذاہب کو سامنے لانا ہے سو فہم حدیث میں ان مذاہب کا تقابلی مطالعہ از بس ضروری ہے۔

اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان کے نزدیک حدیث کی کتابوں میں صرف صحیح بخاری صحیح مسلم ہی قابل عمل سمجھی گئی ہیں زیادہ سے زیادہ صحاح ستہ کی کوئی رایت بیان کردیتے ہیں اس کے علاوہ دیگر کتب احادیث ان کے نزدیک لائق التفات نہیں اور نہ ہی یہ لوگ ان میں موجود احادیث کو کسی طبقہ کے ہاں قابل عمل سمجھتے ہیں گویا ان کے نزدیک سوائے صحیحین یا صحاح ستہ کے اور کوئی حدیث کی کتاب موجود ہی نہیں۔ ان کا یہ نظریہ امت میں پہلے بھی فتنہ پیدا کرنے کا باعث بنا رہا ہے۔ اور آج بھی ایک گروہ اس قسم کے خیالات لئے ہوئے ہے۔ شیخ الحاج مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ کہتے ہیں:

چونکہ بنائے دین اسلام احادیث پر ہے اور یہ لوگ سوائے صحاح ستہ کے حدیث کی کتابوں سے ناواقف ہیں اور جس سے واقف بھی ہیں تو اس کی اکثر احادیث ضعیف اور موضوع کہتے ہیں اور اس کے عامل کو ضال اور مضل بتلاتے ہیں تو اس اوہام سے اور جہل سے جزو دین میں خرابی واقع ہوتی ہے۔ (مکتوبات امدادیہ مکتوب نمبر ۵)

مولوی عبداللہ چکڑالوں نے پہلے صحیحین کے سوا باقی چاروں کتابوں کا انکار کیا تھا پھر صحیح مسلم کا انکار کیا اور پھر صحیح بخاری کا بھی۔ سوچ کا یہ انداز وہم بیجا اور سر تاپا جہل پر مبنی ہے۔ اس دور آخر میں حدیث کے نام پر یہ دو تحریکیں چلی ہیں ایک منکرین حدیث کی اور دوسری عام عاملین بالحدیث کی۔ یہاں سوال ابھرتا ہے کہ مندرجہ ذیل حدیث میں کن لوگوں کی طرف اشارہ ہے منکرین حدیث کی طرف یا عام عاملین بالحدیث کی طرف۔ سو آیئے ہم اس حدیث کے الفاظ پر غور کریں۔

عن ابی ہریرۃؓ عن رسول اللہ ﷺ انه قال سیکون فی آخر امتی اناس یحدثونکم بمالم تسمعوا انتم ولا آبائکم فایاکم وایاھم (رواہ مسلم)

(ترجمہ) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے آخری حصے میں کچھ ایسے لوگ اٹھیں گے جو تمہیں وہ حدیثیں پیش کریں گے جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے نہ سنی ہونگی سوان سے اپنے آپ کو بچانا۔ اس حدیث میں یہ الفاظ قابل غور ہیں۔

۱- یحدثونکم (تمہیں وہ حدیثیں پیش کریں گے) ان الفاظ سے عمل بالحدیث کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کسی مجتہد کی تحقیق پر چلنے والے نہ ہوں گے غیر مقلد ہوں گے اور عمل بالحدیث کے مدعی ہوں گے سو اس پیشگوئی میں منکرین حدیث کی طرف اشارہ نہیں ہے اس لئے کہ وہ حجیت حدیث ہی کے منکر ہیں۔

۲- لم تسمعوا انتم سے مراد یہ ہے کہ ان کی پیش کردہ احادیث زیادہ تر وہ ہوں گی جو تمہارے پہلے لوگوں میں زیادہ معروف نہ رہی ہوں (یعنی تمہارے پہلے لوگوں کا ان پر عمل نہ ہوگا) جیسے تم نے مذاہب اربعہ میں سے کسی پر عمل کیا تو اس کی تائید میں احادیث موجود تھیں لیکن انہوں نے دوسرے مسلک کی احادیث تمہارے سامنے لاکر رکھ دیں جو تمہارے پہلوں نے نہ سنی تھیں اور نہ تمہارے ہاں رائج تھیں۔

۳- اس حدیث میں لفظ آبائکم (تمہارے [illegible]) [illegible]

ذکر پسندیدہ معنوں میں ہے ناپسندیدہ معنوں میں بھی [illegible]

[illegible] کین کا کہنا وجدنا علیہ آباءنا (ہم نے [illegible])

ان کے وہ باپ دادا سمجھ اور ہدایت کے نور سے خالی تھے جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے اولو کان آبائھم لایعقلون شیئا ولایھتدون میں اسی طرف اشارہ ہے لیکن مسلم کی اس حدیث میں آباء سے مراد پہلے اہل عمل ہیں اور وہ اس لائق ہیں کہ ان کی پیروی راہ حق کا پتہ دیتی ہے۔

٤- اس حدیث میں اشارہ دیا گیا ہے کہ وہ آباء (باپ دادا) جو علم وہدایت رکھتے ہوں ان کے فیصلوں پر چلنے اور ان کے علم وسماع کا اعتبار کرنا ہرگز کوئی بری بات نہیں ہے پہلے اہل علم پر اگر اعتماد نہ کیا جاتا ہوتا تو حضور ﷺ دور آخر کے لوگوں کو اپنے آباء علمی کی پیروی (تقلید) میں چلنے کا اشارہ نہ دیتے مشرکین عرب اپنے آباء صلبی کی پیروی میں چلنے کے مدعی تھے۔

راہ آبار رو کہ ایں جمعیت است معنی تقلید ضبط ملت است

٥- لفظ یحدثونکم (اپنے اصطلاحی معنوں میں نہیں صیغہ تحدیث سے حدیث بیان کرنا روایت ہو باور نہیں ہوتا۔ پس یحدثونکم یہاں یا تونکم بالحادیث کے معنی میں ہے کہ یہ لوگ عام لوگوں میں حدیثیں لئے پھریں گے۔

٦- پھر یہ بھی بتلایا کہ یہ عاملین بالحدیث ایسی حدیثیں لانے میں جو تمہارے پہلوں نے نہ سنی ہوں گی نہ صرف کذاب ہونگے بلکہ دجال بھی ہوں گے صحیح مسلم میں ایک دوسری جگہ ان کے لئے یہ الفاظ بھی وارد ہیں۔

یکون فی آخر الزمان دجالون کذابون یاتونکم من الاحادیث بمالم تسمعوا انتم ولا آبائکم

کذاب کا معنی تو ظاہر ہے کہ وہ غلط روایتیں لئے پھریں گے لیکن دجالون کا لفظ غور طلب ہے دجال اسے کہتے ہیں جو باطل کو حق کے ساتھ ملا کر بیان کرے اس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ حدیث تو پہلی کتابوں میں موجود ہو لیکن ان سے استدلال کرنے میں یہ لوگ دجل اور فریب کی راہ پر چلنے والے ہوں گے مثلاً۔

۱- حضرت ابن عباس کی اس روایت کو کہ تین طلاق عہد رسالت اور خلافت میں ایک شمار ہوتی تھی حضرت عمر ہیں جنہوں نے اسے تین ٹھہرایا اسلام کی پہلی چھ صدیوں میں

کسی نے اسے گھر بسی عورت پر محمول نہ کیا تھا خود حضرت ابن عباس بھی ایک وقت کی تین طلاق کو تین ہی سمجھتے تھے کسی امام متبوع فی الفروع نے اس عورت کی تین طلاق کو جو اپنے خانوند کے گھر بس چکی ہو ایک نہیں کہا۔ مگر دور آخر کے عمل بالحدیث کے مدعی اسے ایک کہتے ہیں اور اس پر روایت دکھا دیتے ہیں۔ یاد رکھئے یہ ایک صحیح روایت سے دجل وفریب کا مظاہرہ ہے اور حدیث میں ایسے ہی لوگوں سے بچنے کی تاکید ہے ہاں کوئی مجتہد درجے کا شخص ایسی بات کہدے تو اسے تفرد کے نام سے درگزر کیا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ محدثین کی قبروں کو نور سے بھرے وہ حضرت ابن عباس کی اس حدیث پر یہ باب باندھ کرامت کو فہم حدیث کی صحیح لائن دے گئے ہیں۔

باب الطلاق الثلاث المتفرقة قبل الدخول بالزوجة (سنن نسائی ج ۲ص ۱۰۰)

یعنی یہ روایت اس بیوی سے متعلق ہے جو ابھی گھر نہ لائی گئی ہو۔

۲- رمضان میں تراویح کی نماز اہل سنت والجماعت کا امتیازی شان ہے یہ نماز صرف رمضان میں پڑھی جاتی ہے غیر رمضان میں نہیں امام ترمذی (۲۷۹) جو اختلاف مذاہب کو بیان کرنے میں کسی مشہور بات کو نظرانداز نہیں کرتے انہوں نے باب ماجاء فی قیام شهر رمضان میں اس مسئلہ میں اختلاف امت میں اہل مدینہ کا عمل اکتالیس رکعت بتایا ہے اور آگے لکھتے ہیں۔

واکثر اهل العلم علی ماروی عن علی وعمر وغیرهما من اصحاب النبی عشرین رکعة وهو قول سفیان الثوری وابن المبارك والشافعی وقال الشافعی ادرکت ببلدنا مکة یصلون عشرین رکعة۔ (جامع الترمذی ص۹۹ج۱)

اس میں آٹھ رکعت تراویح کسی امام کا مسلک اور مکہ ومدینہ میں کسی جگہ کا عمل نہیں بتایا گیا رمضان میں نماز تراویح کا اضافہ کافی تھا اس لئے حضور ﷺ نے رمضان میں اپنی تہجد کی نماز میں کوئی اضافہ نہ فرمایا صحیح بخاری کتاب التہجد میں ہے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔

ماکان رسول الله ﷺ یزید فی رمضان ولافی غیره (صحیح بخاری ج ۱ ص۱۵۴)

سلف صالحین میں جس نے بھی اس موضوع پر اختلاف امت کو بیان کیا اس نے کہیں اس حدیث سے کسی طبقے کے آٹھ رکعت تراویح پڑھنے پر استدلال نہیں کیا یہ ان عام عاملین بالحدیث کی کاروائی ہے کہ اس حدیث سے تراویح کا آٹھ رکعت ہونا معین کرتے ہیں اور تراویح و تہجد کو ایک قرار دے کر حضور ﷺ سے رمضان میں نماز میں کسی اضافے کا اقرار نہیں کرتے ہیں یہ تراویح کی نماز سے اصولاً انکار ہے اور اس میں اس دور کے اہل حدیث شیعہ کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ صحیح حدیث سے غلط استدلال کرنے کی یہ بدترین مثال ہے اور یہ تراویح کے انکار کے لئے ایک دجل کی راہ ہے اس قسم کی مثالیں اور بھی بیان ہوسکتی ہیں لیکن ہم یہاں صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے آنحضرت ﷺ کی یہ پیشگوئی کہ اس امت کے دور آخر میں حدیث کے نام پر ایک فتنہ اٹھے گا کس صفائی سے عصر حاضر کے غیر مقلدین پر پوری اترتی ہے۔اعاذ نااللہ من فتنۃ المسیح الدجال

عصر حاضر کے غیر مقلدین واقعی ایک نوزائیدہ فرقہ ہے :

اب آیئے آپ کو اس گروہ کی تاریخی حیثیت سے بھی مطلع کریں کہ یہ کب کی پیداوار ہے۔

تاریخ کے طلبہ پر یہ حقیقت مخفی نہیں کہ اہل حدیث (باصطلاح جدید) کے نام سے غیر مقلدین نے پہلی بارہ صدیوں میں کبھی کسی گروہ یا تنظیم کی صورت اختیار نہیں کی اکا دکا لوگ اس آزاد طریقے میں کبھی ترک تقلید کے مدعی ہوئے ہوں یہ امر دیگر ہے جماعت بندی کے لحاظ سے یہ اس امت کے دور آخر میں واقعی ایک نیا فرقہ ہے جو حدیث کے نام پر اٹھا ہے انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے ہمیں کہیں اس فرقے کی خدوخال نظر نہیں آتے ہم اس پر اس آخری دور کی ہی چند شہادتیں پیش کرتے ہیں جو واضح طور پر بتلاتی ہیں کہ اس درو کے غیر مقلدین گو وہ کسی نام سے انھیں تاریخ اسلام میں واقعی ایک نیا فرقہ ہے۔حضرت مولانا کرامت اللہ جونپوری (۱۲۶۹ھ خلیفہ حضرت سید احمد شہید کھل کر غیر مقلدین کو ایک نیا فرقہ بتلاتے ہیں آپ لکھتے ہیں : حق یہ ہے کہ وہابی لوگوں کا مذہب قدیم میں نہ تھا اور نہ ان کی کوئی کتاب نظر پڑی جو ان کے مذہب کا حال معلوم ہوتا۔

(مکاشفات رحمت ص ۱۷)

ان غیر مقلدوں کا نام وہابی رکھنا درست نہیں وہابی شیخ محمد بن عبد الوہاب کے
ڑں کو کہتے ہیں اور پیروی خود ایک تقلید ہے شیخ محمد بن عبد الوہاب خود بھی مقلد تھے اور
الی المذہب تھے یہاں غیر مقلدوں کو وہابی صرف اس لئے کہا گیا ہے کہ اس نئے فرقے
لئے کوئی نام نہ ملتا تھا چونکہ یہ مشرک نہ تھے موحد تھے اس لئے خدا کے نام وہاب پر
ں یہ نام دے دیا گیا ہوگا۔ یہ کون لوگ تھے جو نئے نئے اٹھے تھے۔ آپ ان کے تعارف
یہ بھی لکھتے ہیں: لامذہبوں میں سے ایک سید (احمد شہید) صاحب کو بد کہتے ہیں اور تقلید
نے اور مرید ہونے کو نادرست کہتے ہیں۔ (ایضاً ۱۸)

غیر مقلدوں کو شروع سے لامذہب کے نام سے پکارا گیا ہے اور یہی انکا حقیقی نام
عرب ممالک میں وقفة مع اللامذهبية کے نام سے ایک کتاب عام ملتی ہے جس میں
کے عقائد و مذہب پر بحث کی گئی ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرقہ بالکل نیا
اور یہ واقعی ایک لامذہب گروہ ہے۔

مولانا نذیر حسین دہلوی کے خسر مولانا عبد الخالق (م ۱۲۶۴ھ) فرماتے ہیں۔

سو بانی مبانی اس فرقہ نواحداث (نیا فرقہ) کا عبد الحق ہے جو چند روز سے بنارس
رہتا ہے حضرت امیر المومنین (سید احمد شہیدؒ) نے حرکات ناشائستہ کے باعث اپنی
ںت سے اس کو نکال دیا تھا (تنبیہ الضالین ص ۱۴ الحیات بعد الممات ص ۳۷)

جناب نواب صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ) بھی اسے اسی دور کی پیداوار کہتے ہیں:

فقد نبتت في هذا الزمان فرقه ذات سمعة ورياء تدعى لأنفسها علم
لدیث والقرآن والعمل والعرفان (الحطہ ص ۶۷)

اس دور میں ابھی ابھی نمائش اور دکھاوے والا ایک فرقہ اگا ہے جو علم قرآن
یث کا مدعی ہے اور عمل و عرفان کا بھی۔

آیئے اب ایک جدید تعلیم یافتہ دانشور کی شہادت بھی لیتے چلیں۔ ڈاکٹر اشتیاق
ن قریشی بھی اس فرقے کو نیا فرقہ مانتے ہیں آپ لکھتے ہیں: ملت اسلامیہ میں جو تفرقے
ہی سے تعداد کثیر میں پڑے ہوئے تھے ان میں ایک فرقے کا اضافہ اور ہو گیا ابتدائی ایام

میں تصادم بھی ہوئے اور مقدمہ بازی کی نوبت بھی آگئی جس سے اہل حدیث اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان تعلقات خراب ہوگئے مگر اب خوش قسمتی سے ناروا داری بہت کم ہوگئی ہے۔ (علماء میدان سیاست میں ص ۲۱۴)

معلوم نہیں اتنی جلی شہادتوں کے باوجود اہل حدیث (باصطلاح جدید) کیوں اپنے آپ کو انگریزی دور کی پیداوار نہیں مانتے حالانکہ وہ جانتے ہوتے ہیں کہ ان کی مساجد ہر شہر میں وہاں کی دیگر مساجد کے بعد بنی ہوتی ہیں۔

معروف غیر مقلد عالم مولانا محمد شاہجہانپوری کو اللہ تعالیٰ اس حق بات کے تسلیم کرنے کی جزا دے کہ اسلام کی پچھلی بارہ صدیوں میں کہیں غیر مقلد بطور جماعت کے موجود نہ تھے آپ لکھتے ہیں۔

پچھلے زمانہ میں شاذونادر اس خیال کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے بلکہ ان کا نام ابھی تھوڑے دنوں سے سنا ہے اپنے آپ کو تو وہ اہلحدیث یا محمدی یا موحد کہتے ہیں مگر مخالف فریق میں انکا نام غیر مقلد یا وہابی یا لامذہب لیا جاتا ہے۔ (الارشاد الی سبیل الرشاد ص ۱۳)

ان حوالوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی بارہ صدیوں میں کہیں بھی غیر مقلدیوں کا کوئی گروہ نظر نہیں آتا یہ اگر کبھی پیدا ہوئے تو وہ انگریزوں کا دور تھا جس میں یہ عام مدعیان عمل بالحدیث نظر آئے ہیں اور پھر انہوں نے عمل بالحدیث کے عنوان پر جگہ جگہ جھگڑے کھڑے کئے ان کی پیشگوئی حضور ﷺ نے کردی تھی اور اپنی امت کو آگاہ کردیا تھا اب یہ امت کی ذمہ داری ہے کہ ان لوگوں سے اپنے آپ کو فاصلے پر رکھیں۔

ان مختلف تحریرات میں اس نوزائیدہ فرقے کے مختلف نام ملے ہیں :

(۱) لامذہب (۲) وہابی (۳) اہلحدیث (۴) محمدی (۵) موحد (۶) غیر مقلدین۔ یہ ناموں کا تعدد کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ فرقہ نوزائیدہ تھا پہلے کہیں آبادی ہوتی ہے پھر اس قصبہ یا بستی کو کوئی نام دیا جاتا ہے پہلے بچہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کا نام رکھتے ہیں ابتداء میں کئی

کئی نام لئے جاتے ہیں پھر میونسپلٹی میں ایک نام لکھا جاتا ہے۔ اس نوزائیدہ فرقے کے نام بھی پہلے مختلف تھے سرکاری ریکارڈ میں مسلمانوں کے جو فرقے مغلیہ دور سے چلے آرہے ہیں اس میں اس فرقے کا کہیں وجود نہ تھا اس فرقہ کے جتنے علماء ہیں سب مولانا نذیر حسین دہلوی کے بعد کے ہیں اسی لئے انھیں ان کے ہاں شیخ الکل کہا جاتا ہے اس سے بھی یہی متبادر ہوتا ہے کہ ان سے پہلے ہندوستان میں اس نوزائیدہ فرقے کا کہیں کوئی عالم نہیں گزرا جب ان لوگوں (غیر مقلدوں) نے ہندوستان میں اپنے پروبازو پھیلائے تو یہ مختلف جگہوں میں مختلف ناموں سے جانے جاتے تھے پھر مولانا نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولانا محمد حسین بٹالوی نے سرکار انگلیشیہ کو درخواست دی کہ ان کے فرقے کو اہلحدیث کا نام دیا جائے۔ اس درخواست کے آخری الفاظ ملاحظہ کریں۔ استعمال لفظ وہابی کی مخالفت اور اجراء نام اہلحدیث کا حکم پنجاب میں نافذ کیا جائے۔

(اشاعت السنہ ج ۱۱ شمارہ ۲ ص ۲۶)

مولانا عبدالمجید سوہدری لکھتے ہیں:

لفظ وہابی آپ ہی کی کوششوں سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا گیا (سیرت ثنائی ص ۳۷۲)

یہ درخواست بتلاتی ہیکہ ہندوستان میں اس وقت تک سرکاری ریکارڈ میں اہل حدیث نام سے کوئی فرقہ موجود نہ تھا۔ یہ نام تب دیا گیا جب لفظ وہابی منسوخ ہوا منسوخ وہی چیز ہوتی ہے جسے پہلے آئینی حیثیت حاصل ہوتی ہے غیر مقلدین شروع میں اس نام سے اس لئے موسوم تھے کہ یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید لے کر اٹھے تھے ورنہ انہیں شیخ محمد بن عبدالوہاب سے تلمذ یا مسلکا کوئی نسبت حاصل نہ تھی شیخ حنبلی تھے لامذہب اور غیر مقلد نہ تھے ان کی شیخ کی طرف نسبت گو کسی تاویل سے ہو یہ بھی بتلاتی ہے کہ یہ ایک نوزائیدہ فرقہ ہے جو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بعد کسی وقت وجود میں آیا تیرھویں صدی کے شروع میں یہ کہیں موجود نہ تھا۔

اہل حدیث کی دینی آزادی کے خطرناک اثرات:

اہلحدیث کی اس نئی دینی آزادی نے کیا کیا گل کھلائے؟ مولانا بٹالوی کے دوستوں میں قادیان کے مولوی غلام احمد اور بھیرہ کے مولوی نور الدین بھی تھے مرزا غلام احمد چلتے چلتے نبوت کے کنارے پر آنکلے مولوی نور الدین ان کے دعوؤں میں اس کے مشیر تھے مولوی غلام احمد کے لئے اپنے دوست کو چھوڑنا خاصا مشکل کام تھا کیوں کہ اس کا نکاح ان کے استاد شیخ الکل مولانا نذیر حسین نے پڑھایا تھا تاہم اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے ان کی ایمانی رگ پھڑکی اور انہوں نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ میں بڑی جرات سے یہ بیان جاری کیا پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔ گروہ اہلحدیث میں جو بے علم ہو کر یا کم علم ہو کر ترک تقلید کے مدعی ہیں وہ ان نتائج سے ڈریں اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہوئے جاتے ہیں (اشاعت السنہ ج ۱۱ نمبر ۴)

مولانا بٹالوی کے اس بیان سے اس جدید فرقہ میں اور عام مسلمانوں میں جو ناروادار ی تھی قدرے کم ہوئی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا یہ بیان آپ پڑھ آئے ہیں۔

اہلحدیث اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان تعلقات خراب ہوگئے مگر اب خوش۔ مگر اب خوش قسمتی سے ناروداری بہت کم ہوگئی ہے۔

افسوس کہ بعض اہلحدیث پھر بھی سخت آزاد رو ہیں اور اسلام کے بعض قطعی عقائد کا انہوں نے کھلے بندوں انکار کیا ان میں حافظ عنایت اللہ اثری جا گجراتی اسی پرانی ڈگر پر رہے ان کے یہ چند عقائد ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہوں۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں۔

دوسرے رسالہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی بے پدری پیدائش پر پوری بحث و تحقیق ہے اور دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ موصوف (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کا باپ تھا اور وہ معلوم النسب اور شریف النسب تھے بے پدری کا خیال خطرناک خیال ہے۔

(العطر البلیغ ص ۱۷۵)

موصوف اپنے ایک اور رسالہ میں لکھتے ہیں :

افسوس کہ مریم بیچاری کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے کہ دوسروں کے لئے نکاح کے بعد بھی چھ ماہ تک کوئی کرامت قبول نہیں کی گئی اور اس (یعنی حضرت مریم) کے لئے نکاح کئے بغیر ہی خلاف شرع کرامتاً بچہ پیدا کرالیا گیا خوب ہے (عیون زمزم ص ۱۹

اس کی کتاب میں یہ اہل حدیث عالم لکھتے ہیں:

صدیوں بعد لوگوں نے انہیں بے پدر اور آپ کی والدہ کو بے شو بتایا۔ کیا خوب ہے۔ (ایضاً ص ۱۰)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اہل حدیث کو فرقہ ناجیہ اہل سنت میں جگہ نہیں د جاسکتی جب کوئی قوم اپنے اسلاف سے بیگانہ ہونے پر فخر کرے اور فہم کتاب وسنت : سلف کی راہ پر نہ آئے اس گروہ کے لوگ افراد تو ہیں مگر قوم نہیں۔ قطرے تو ہیں مگر د نہیں۔ وہ ذرات تو ہیں لیکن صحرا نہیں ۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

امام فخر الدین رازی نے حضرت عیسیٰ بن مریم کے بلا باپ پیدا ہونے اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ قرار دیا ہے یہ نہیں کہ جیسے اس اہل حدیث عالم نے ا۔ صدیوں بعد کی بات بتایا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کو آخری دور میں حدیث کے نام پر اٹھنے وا۔ فتنے کی جو خبر دی تھی تجربات نے بتایا کہ وہ اس عہد کے جدید فرقہ پر خواہ اسے لامذہ کہیں یا اہلحدیث کہیں یا موحد کہیں یا غیر مقلد کہیں پوری طرح صادق آتی ہے اور ا آخری دور میں عمل بالحدیث کے عنوان سے یہی لوگ اٹھے ہیں اور ان میں جتنے ان پڑھ : سب اہلحدیث ہیں اور یہ اصطلاح جدید ہے اصطلاح قدیم میں اہلحدیث محدثین کو کہتے : جس طرح اہل تفسیر مفسرین کو۔ نہ کہ ان پڑھ عوام کو۔ ان پڑھ عوام کو اہلحدیہ (محدثین) کے مقابلے پر لانا اور ان کی صف میں بٹھانا محدثین کی ایک کھلی توہین ہے۔

مسلک کے نام پر اہلحدیث کہلانا کیوں خطرناک ہے :

اختلاف مسلک میں اہلحدیث کہلانا خود حدیث کو اختلافی بناتا ہے اس عنوان سے علامۃ الناس کی سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اسلام میں حدیث کو ماننا ایک ایک اختلافی مسئلہ ہے کچھ مسلمان مانتے ہیں اور باقی کل مسلمان اپنے لئے اسے حدیث کو حجت اور سند نہیں مانتے گویا حجیت حدیث اسلام کی کوئی متفق علیہ بات نہیں حدیث نہ ماننے والے بھی مسلمان ہیں اوران کے پیچھے نماز پڑھنا بالکل جائز ہے (معاذ اللہ)

قرآن کریم کی رو سے حضور ﷺ کی اطاعت کرنا فرض ہے اور آپ کی ہر بات اور آپ کا ہر عمل سب مسلمانوں کے لئے حجت اور سند ہے یہ کیسے اہلحدیث (باصطلاح جدید) ہیں جو ان سب کو جن کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ حدیث نہیں مانتے اہلحدیث نہیں ہیں مسلمان مانتے ہیں ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں اور ان کی نماز جنازہ (جس میں امام بھی سورہ فاتحہ نہیں پڑھتا) پڑھتے ہیں کیا یہ لوگ اپنے جماعتی وجود اور اہل حدیث کے نام سے یہ تاثر نہیں دیتے کہ اسلام میں حدیث کو ماننا ایک اختلافی مسئلہ ہے اور اسے مانے بغیر بھی مسلمان رہ سکتے ہیں اور ان کی نماز جنازہ پڑھنا درست ہے۔

ہم صرف ایک گروہ کا نام ہی منکرین حدیث رکھتے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو گوان سے کتنے ہی علمی اختلافات کیوں نہ ہو منکرین حدیث نہیں کہتے ہمارے نزدیک حضور ﷺ کی بات کو ماننا اسی طرح ضروری ہے جس طرح ختم نبوت کو ماننا یا صحت قرآن کو ماننا۔ جس طرح ختم نبوت یا صحت قرآن کو نہ ماننے والا مسلمان نہیں حدیث کو نہ ماننے والا بھی مسلمان نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ مسلمان (اہلحدیث باصطلاح جدید) تو حدیث کو ماننے والے سمجھے جائیں اور جو لفظی معنی کے پہلو سے اہلحدیث نہیں وہ بھی مسلمان شمار ہوں۔ مسلمانوں کے ایک طبقے کو اہلحدیث کہنا عام مسلمانوں میں انکار حدیث کی ایک کھلی دعوت ہے۔

مولانا محمد حسین بٹالوی نے اس نئے فرقے کے جو مختلف نام انگریز گورنر کے سامنے رکھے تھے انگریزوں نے ان کے لئے لامذہب نام منظور کرنے کے بجائے اہلحدیث کا

نام صرف اس لئے پسند کیا تھا کہ اس سے حدیث کو ماننا مسلمانوں میں ایک اختلافی مسئلہ سمجھا جائے گا انگریزوں نے ایک جماعت اس لئے کھڑی کردی کہ ختم نبوت کو اختلافی مسئلہ بنادیا جائے اور ایک جماعت کو اہل حدیث کا نام دے دیا تاکہ حدیث مسلمانوں میں ایک اختلافی مسئلہ بن جائے۔ ملا مقبول دہلوی سے اردو ترجمہ قرآن اس لئے کرایا گیا تھا کہ موجودہ قرآن بھی اخلافی مسئلہ بن جائے۔ حق یہ ہے کہ مسلمان ختم نبوت اور قرآن وحدیث میں سے کسی کو اختلافی مسئلہ نہیں سمجھتے ان کے مانے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا سو حدیث نہ ماننے والے کیسے مسلمان سمجھے جاسکتے ہیں۔

انگریزوں کی سیاسی سوچ صحیح نکلی کہ جوں ہی مسلمان کا ایک گروہ اہل حدیث کے نام سے موسوم ہوا اس کے جلد ہی بعد ہندوستان میں انکار حدیث کی تحریک اٹھ گئی اور اس میں بھی پیش قدمی اہلحدیث (باصطلاح جدید) کے ایک عالم چکڑالہ کے مولوی غلام نبی نے کی یہ وہی شخص ہے جو مولوی عبداللہ چکڑالوی کے نام سے موسوم ہوا اس نے اپنا نام غلام نبی اس لئے بدلا کہ اس کے نام سے بھی پتہ نہ چلے کہ یہ شخص پہلے اہلحدیث (باصطلاح جدید) تھا اور نبی کے غلام ہونے کا مدعی تھا مسلمانوں میں دور اول میں جو اعتقادی فتنے اٹھے وہ خوارج قدریہ معتزلہ جہمیہ کرامیہ اور روافض وغیرہ تھے اور اس آخری دور میں جو فتنے اٹھے ان میں وہ قادیانی اور اہلحدیث (باصطلاح جدید) اور پرویزی تحریکیں ہیں اور ان کے بارے میں آنحضرت ﷺ پہلے سے پیشگوئیاں فرماگئے کہ ان مدعیان نبوت اور عام مدعیان عمل بالحدیث سے بچنا۔ اور کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

دارالعلوم دیوبند کی طرف سے نئے سال کا کلینڈر

حضور ﷺ کو جسمانی اذیتوں کا سامنا :

۱۱- خود حضورؐ کے ساتھ کیا کیا ہوا وہ ایک طویل داستان ہے، کس کی مجال ہے کہ اس پوری داستان کو دہرا سکے۔

طویل عمر ہے درکار اسکے پڑھنے کو
ہماری داستاں اوراق مختصر میں نہیں

صرف چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے مین چادر ڈال کراس قدر اینٹھا کہ آپ کا دم گھٹنے لگا، حضرت ابو بکر صدیق کو خبر ہوئی تو آپ دوڑے ہوئے آئے اور آپ کو اس کے شر سے بچایا، اور قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ (اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ) کیا تم ایک شخص کو اس لئے قتل کرتے ہو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟ کافر حضور کو چھوڑ کر حضرت ابو بکر سے لپٹ پڑے اور خوب زدو کوب کیا۔

ایک مرتبہ صحن کعبہ میں قریش نے آپ کو گھیر لیا اور آپ کی شان میں گستاخی سے پیش آنا چاہا حضرت حارث بن ابی ہالہ کو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے آئے اور آپ کو اشرار کے ہجوم و شرارت سے بچانا چاہا، کافروں نے حضرت حارث بن ابی ہالہ کو وہیں شہید کر دیا۔ آپ کی خاطر آپ کا چاہنے والا آپ کی نگاہ کے سامنے شہید کر دیا گیا۔ اللہ اللہ صدمہ کا اندازہ کیجئے،

جس راستے سے آپ رات کے وقت گذرنے والے ہوتے کانٹے بچھا دیئے جاتے کہ آپ کو اذیت پہونچے، ایک مرتبہ حضور ﷺ صحن کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے قریش بھی وہاں بیٹھے تھے، ابو جہل نے کہا کہ فلاں مقام پر اونٹ ذبح ہوا ہے اسکی اوجھڑی پڑی ہوئی ہے کوئی اسکو اٹھا کر لائے اور محمد (ﷺ) پر ڈالدے، یہ سن کر عقبہ بن ابی محیط اٹھا اور وہ اوجھڑی اٹھالایا، جب آپ سجدہ میں گئے تو آپ کی پشت پر رکھدی، حضور ﷺ تو اللہ کے ساتھ مصروف تھے آپ کو خبر نہ ہوئی، مگر کفار ہنسیکے مارے ٹوٹے جاتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود بھی وہاں موجود تھے مگر کافروں کا ہجوم دیکھ کر ان کو ہمت نہ ہوئی، اتفاق سے حضرت فاطمہ زہراؓ جو بچی تھیں آگئیں اور انہوں نے آگے بڑھ کر باپ کی پشت پر سے اس اوجھڑی کو ہٹایا اور کفار کو بھی برا بھلا کہا۔

آنحضرت ﷺ کے مکان پر پتھر پھینکے جاتے تھے، گندگی وغیرہ بھی آپ کے گھر میں پھینک دیتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اے بنو عبد مناف! یہ ہمسائیگی کا اچھا حق ادا کر رہے ہو؟ کبھی آپ کا نام شاعر رکھا جاتا تھا، کبھی آپ کو ساحر کہہ کر پکارا جاتا تھا، کبھی آپ کو کاہن کہتے اور کبھی مجنون کا خطاب دیتے، غرض کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ اور آپ کی جماعت کو تکلیف پہونچانے اور آپ کے کام میں رکاوٹیں پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، (تاریخ اسلام ص ۱۰۶ ج۱)

طواف کعبہ کے وقت بھی چین نہ ملا :

۱۲۔ حضرت عثمان بن عفانؓ سے مروی ہے کہ ایک بار میں نے نبی کریم ﷺ کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا، آپ طواف فرما رہے تھے، اور عقبہ بن ابی معیط، ابو جہل اور امیہ بن خلف حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے جب آپ سامنے سے گذرے تو کچھ نازیبا کلمات آپ کو سنا کر کہے، آپ دوسری بار ادھر سے گذرے تب بھی ایسا ہی کہا، جب آپ تیسری بار گذرے تو پھر اسی قسم کے بیہودہ کلمات کہے، آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا، آپ ٹھہر گئے اور فرمایا، خدا کی قسم تم باز نہ آؤ گے یہاں تک کہ تم پر اللہ کا عذاب جلد نازل ہو، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو کانپ نہ رہا ہو آپ یہ فرما کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے (عیون الاثر ص ۱۰۴ ج ۱)

چہرہ انور پر تھوکا گیا اور خاک ڈالی گئی :

۱۳۔ معجم طبرانی میں مغیث غامدی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا لوگوں سے یہ فرماتے تھے کہ اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے، مگر بعض بدنصیب آپ کو گالیاں دیتے تھے، بعض آپ پر تھوکتے اور بعض آپ پر خاک ڈالتے، پھر ایک لڑکی پانی لے کر آئی اور آپ کے چہرہ انور اور دست مبارک کو دھویا، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ آپ کی صاحبزادی زینب ہیں، بعض روایات میں ہے کہ آپ نے حضرت زینب سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا، بیٹی! تو اپنے باپ کے مغضوب اور ذلیل ہونے کا خوف مت کر۔

(کنز العمال ص ۳۰۶ ج ٦)

سر بازار پتھر مارے گئے :

۱۴۔ طارق بن عبد اللہ المحاربیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بازار ذی المجاز میں دیکھا کہ یہ فرماتے جا رہے تھے کہ اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہو فلاح پاؤ گے، اور ایک شخص آپ کے پیچھے پتھر مارتا جاتا تھا، جس سے جسم مبارک خون آلود ہو گیا اور ساتھ ساتھ کہتا جاتا تھا، لوگو! اس کی بات نہ سننا یہ جھوٹا ہے (کنز العمال ص ۳۰۲ ج ٦)

بنی کنانہ کے ایک شیخ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو بازار ذی المجاز میں دیکھا فرما رہے تھے لوگو! لا الہ الا اللہ کہو فلاح پاؤ گے اور ابو جہل آپ پر مٹی پھینکتا تھا اور کہتا تھا کہ لوگو! اس کے دھوکہ میں نہ آنا، یہ تم کو لات و عزیٰ سے چھڑانا چاہتا ہے، اور حضور ﷺ اس جانب ذرا بھی التفات نہ فرماتے تھے۔ (مسند احمد ص ٦۳ ج ۴)

مار کر بیہوش کر دیا گیا :

۱۵۔ مسند ابی یعلی اور مسند بزار میں حضرت انسؓ سے سند صحیح کے ساتھ مروی ہے کہ ایک دفعہ قریش نے آپ کو اس قدر مارا کہ آپ بیہوش ہو گئے، حضرت ابو بکر حمایت کے لئے آئے تو آپ کو چھوڑ کر ابو بکر سے لپٹ گئے، اور اتنا مارا کہ پورا سر زخمی ہو گیا

،حضرت ابو بکرؓ زخموں کی شدت کیوجہ سے سر کو ہاتھ نہ لگا سکتے تھے (فتح الباری ص۱۲۹ ج ۷)

ایک عورت آپ پر پتھر لیکر دوڑی :

۱۶ ۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب ابو لہب کی بیوی ام جمیل کو خبر ہوئی کہ میرے اور میرے شوہر کے بارے میں سورہ تبت یدا نازل ہوئی ہے تو ایک پتھر لیکر آپ کو مارنے کیلیئے دوڑی، آپ اور ابو بکر صدیق اس وقت مسجد حرام میں تشریف فرما تھے، ام جمیل جس وقت وہاں پہونچی تو اللہ تعالیٰ نے اسکی آنکھ پر پردہ ڈالدیا، اور اسکو صرف ابو بکر نظر آئے، حضور نظر نہ آئے ام جمیل نے ابو بکر سے پوچھا کہ تمہارے ساتھی کہاں ہیں ؟ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ میری مذمت اور ہجو کرتے ہیں، خدا کی قسم اس وقت ان کو پاتی تو اس پتھر سے مارتی، خدا کی قسم میں بڑی شاعرہ ہوں اور اسکے بعد یہ کہا

مذ مما عصينا - وامره ابينا - ودينه قلينا

یعنی ہم نے مذمم (جس کی برائی کی جائے) کی نافرمانی کی اور اسکا حکم ماننے سے انکار کیا، اور اسکے دین کو ناپسند کیا، یہ کہکر واپس ہوگئی، جب ام جمیل چلی گئی تو ابو بکر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ غالباً ام جمیل نے آپ کو دیکھا نہیں، آپ نے فرمایا اسکے جانے تک ایک فرشتہ مجھکو چھپائے رہا۔ (فتح الباری ص ۵٦٧ ج ۸)

اللہ نے رخ پھیر دیا :

۱۷ ۔ قریش حضور ﷺ کو بجائے "محمد" کے "مذمم" کہتے تھے "محمد" کے معنی ہیں جس کی تعریف کی جائے، اور "مذمم" کے معنی ہیں مذموم اور برا، حضور ﷺ فرماتے کہ اے لوگو! تم تعجب نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کے سب و شتم کا رخ مجھ سے پھیر دیا، وہ مذمم کو "برا" کہتے ہیں اور میں "محمد" ہوں۔ (ابن هشام ص۳۸۶ ج ۱)

دوست کی خاطر رسول اللہ ﷺ کے چہرہ پر تھوک دیا :

۱۸۔ عقبہ بن ابی معیط، ابی بن خلف کا گہرا دوست تھا، ایک روز عقبہ آنحضرت

ﷺ کے پاس آکر کچھ دیر بیٹھا اور آپ کا کلام سنا، ابی کو جب خبر ہوئی تو فوراً عقبہ کے پاس آیا اور کہا مجھ کو یہ خبر ملی ہے کہ تو محمد کے پاس جاکر بیٹھا ہے اور ان کا کلام سنا ہے، خدا کی قسم جب تک محمد کے منہ پر جاکر تھوک نہ آئے تجھ سے بات کرنا اور تیری صورت دیکھنا مجھ پر حرام ہے، چنانچہ بدنصیب عقبہ اٹھا اور چہرہ انور پر تھوک آیا (ابن الاثر ص ۷۲ ج ۲)

کافر توہین و تذلیل کی آخری حد تک اتر چکے تھے، آج اسکا تصور بھی ہمارے لئے سوہان روح ہے خداتعالی کو آپ کی تسلی واطمینان کے لئے یہ آیت اتارنی پڑی، ویوم یعض الظالم علی یدیه یقول یلیتنی اتخذت مع الرسول سبیلا یا ویلتی لیتنی لم اتخذ فلاناً خلیلا ،لقدا ضلنی عن الذکر بعد اذجاء نی وکان الشیطن للانسان خذ ولا وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذ وا هذا القرآن مهجورا وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین وکفی بربک هادیا ونصیرا ۔(الفرقان ۲۷)

ترجمہ! اور اس دن کو یاد کرو جس دن ظالم حسرت و ندامت سے اپنے ہاتھ منہ میں کاٹے گا اور کہے گا کہ کاش میں رسول کے ساتھ اپنی راہ بناتا اور کاش فلانے کو اپنا دوست نہ بناتا اس کمبخت نے مجھکو اللہ کی نصیحت سے گمراہ کیا اور رسول اللہ کہیں گے کہ اے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو نظرانداز کر دیا تھا، اے ہمارے نبی آپ رنجیدہ نہ ہوں ہر نبی کیلئے اسی طرح مجرمین میں سے دشمن پیدا کئے ہیں اور تیرا رب ہدایت ونصرت کے لئے کافی ہے۔

اظہار حیرت :

۱۹۔ ولید ابن مغیرہ کہا کرتا تھا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ محمد پر تو وحی نازل ہو اور میں اور ابو مسعود ثقفی چھوڑ دیئے جائیں، حالانکہ ہم دونوں اپنے اپنے شہر کے بڑے معزز ہیں، میں قریش کا سردار ہوں اور ابو مسعود قبیلہ ثقیف کا سردار ہے۔(ابن ہشام ص ۱۲۶ ج ۱)

قرآن کے مقابلے میں عجمی داستانیں لائی گئیں

۲۰۔ نضر بن حارث قریش کا ایک سردار تھا، تجارت کے لئے فارس جاتا تھا اور

وہاں سے شاہان عجم کے قصے اور داستانیں خرید کر لاتا اور قریش کو سناتا اور کہتا کہ محمد تو تم کو عاد اور ثمود کے قصے سناتے ہیں، اور میں تم کو رستم و اسفند یار اور شاہان فارس کے قصے سناتا ہوں لوگوں کو یہ افسانے دلچسپ معلوم ہوتے تھے،

ایک گانے والی لونڈی بھی خرید رکھی تھی، لوگوں کو اس کے گانے سنواتا اور جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا کہ وہ اسلام کی طرف راغب ہے اس کے پاس اس لونڈی کو لے جاتا اور کہتا کہ اسکو کھلا پلا اور گانا سنا، پھر اس سے کہتا کہ بتا یہ بہتر ہے یا وہ چیز بہتر ہے جس کی طرف محمد بلاتے ہیں کہ نماز پڑھو اور روزہ رکھو اور جنگ کرو ۔ (روح المعانی ص ٦٩ ج ١٧)

اولاد کی موت پر طعن و تشنیع":

۲۱۔ انہی دنوں جب ہر طرف سے کفار مکہ طنز کے نشتر چھوڑ رہے تھے اور لعنت وملامت کا طوفان اٹھائے ہوئے تھے 'اللہ کی حکمت حضور کے صاحبزادے کا انتقال ہو گیا 'اور خدا کی شان بے نیازی کہ حضور کی ساری اولاد نرینہ بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی' خوب دل کھول کر اس کا مذاق اڑایا گیا' خوشیاں منائی گئیں۔ آوازے کسے گئے 'اور تالیاں بجائی گئیں' مولانا عبدالماجد دریابادی نے خوب لکھا ہے'

"اللہ اللہ کیا شان بے نیازی 'اور کیا جلوۂ حکمت آرائی ہے کہ باغیوں اور سرکشوں کی اولاد اور اولاد در اولاد پھل پھول رہی ہے 'اور جو اپنے رب کا نام جپنے والا ہے اسے اس نعمت سے بھی محروم کیا جارہا ہے 'اس کے پاس نہ دولت تھی نہ حکومت 'نہ اسکی کوئی بڑی پارٹی تھی 'نہ اس کے معتقدین کا کوئی وسیع حلقہ 'ہر طرف سے مخالفت کا ہجوم 'ہر سعئی اصلاح میں ناکامی 'ہر دعوتِ حق میں بے اثری 'غرض ہر دنیوی نعمت سے محرومی چشم ظاہر کو پہلے ہی سے نظر آرہی تھی' لے دے کے یہ جو آخری نعمت تھی اب یہ بھی چھن کر رہ گئی' دنیا ایسے مواقع پر کیا رائے قائم کرتی؟ اس نے وہی رائے قائم کی جو اندھوں اور بے بصروں نے ہمیشہ قائم کی ہے 'وہ ہنسی 'وہ مسکرائی وہ خوشی سے اچھلی اور کودی. عاص بن وائل منکروں کا ایک سردار 'اور ناہنجاروں کا پیشوا تھا 'اس نے چمک چمک کر اور مٹک مٹک کر اپنے

ساتھیوں سے کہا کہ چلو چھٹی ہوگئی محمد کی نسل ختم ہوئی اور آگے نہ اس کے کام کو چلانے والا باقی رہا نہ اس کے نام کا لینے والا' دیکھا ہمارے دیوتاؤں سے بے ادبی کرنے کا یہ انجام' جنہوں نے محمد کو محض گوشت پوست کا مجموعہ سمجھ رکھا تھا' وہ اس طنز میں شاید معذور بھی تھے' کوئی کس طرح دکھادیتا کہ کس جسم عنصری کا لفافہ اپنے اندر کس روح مطہر کو ڈھانپے اور چھپائے ہوئے ہے'۔

حضور کو تو صدمہ پہونچا ہی' خدا کو بھی ناگوار گذرا اور آپ کی تسلی کے لئے سورۂ کوثر نازل فرمائی کہ یہ بے خبر اور بے بصر' یہ غافل اور جاہل تیرے اوپر طعنہ زن ہیں' ان بد بختوں کو کیا خبر کہ ہم نے تجھے خیر کثیر دے رکھی ہے' بھلائیوں کے خزانے در خزانے تجھے عطا۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰاکَ الْکَوْثَر ''۔ کر رکھیں ہیں ساری اچھائیوں' ساری خوبیوں' ساری محبوبیوں کا مالک تجھے بنا رکھا ہے، تیرے لئے کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے، دنیا میں بھی، عقبیٰ میں بھی، جسے دینے والے ہم ہوں اسکی دولتمندی کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے، جسے بخشنے والے ہم ہوں اسکی نعمت اندوزیاں کس کے شمار میں آسکتی ہیں، جس پر مہربان ہم ہوں اسکے جاہ و جلال، اسکے عز و کمال، اسکے حسن و جمال، اسکے مال و منال اور اسکے اوج و اقبال کا احاطہ کرنا کس کے بس کی تات ہے۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰاکَ الْکَوْثَرَ۔

یہ خبیث طعنہ زن ہیں کہ تیری نسل ختم ہو رہی ہے، اور تیرا سلسلہ منقطع ہو رہا ہے، تیری نسل بھلا کبھی ختم ہونے والی ہے اور تیرا سلسلہ کبھی قطع ہونے والا ہے؟ یہ بدباطن دیکھنے کو زندہ نہ رہیں گے لیکن ان کے جانشین دیکھیں گے، زمین و آسمان دیکھیں گے، جن و بشر دیکھیں گے، آفتاب و ماہتاب دیکھیں گے کہ تیری نسل قائم اور تیرا سلسلہ دائم ہے، بادشاہتیں بنیں گی اور بگڑیں گی، حکومتیں قائم ہوں گی اور مٹیں گی، شہر بسیں گے اور اجڑیں گے قومیں ابھریں گی اور فناں ہوگی۔ لیکن تیرا نام زندہ اور تیرا کام پائندہ، قیامت تک قائم، اور قیامت کے بعد بھی قائم، دنیا میں تیرے نام کی وہ عزت ہوگی،

جو نہ آج تک کسی بندہ کی ہوئی اور نہ ہو گی، اونچے میناروں سے تیرا نام ہمارے نام کے ساتھ پکارا جائے گا، دشت و جبل، صحرا و دریا، بحر و بر، شہروں اور دیہاتوں، آبادیوں اور ویرانوں، سمندروں اور پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں سب کہیں تیرے نام کی منادی ہو گی، حجاز و عراق، یمن و شام، حبش و مصر ایران و توران، بخارا و ہندوستان، چین و جاپان، روس و افغانستان، جرمنی و انگلستان، فرانس و امریکہ، دنیا کا گوشہ گوشہ اور ہماری وسیع زمین کا چپہ چپہ تیرے نام کی پکار سے گونجے گا۔ (ذکر رسول ص ۳۷-۳۹)

آنکھیں مٹکائی گئیں، سیٹیاں اور تالیاں بجائی گئیں :

اسود بن مطلب اور اسود بن عبد یغوث اور ان کے ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو دیکھ کر آنکھیں مٹکاتے اور کہتے تھے کہ یہی ہیں وہ لوگ جو روئے زمین کے بادشاہ ہوں گے، اور قیصر و کسریٰ کے خزانوں پر قبضہ کریں گے۔ اور خوب سیٹیاں اور تالیاں بجاتے۔ (ابن اثیر ص ۲۶-۲۷ ج ۲)

صبر کی انتہا :

آخر استہزاء و تمسخر کی بھی کوئی حد ہو سکتی ہے۔ پانچ بد بختوں کا نصیب، پیغمبر کا پیمانہ صبر اور وہ جلال نبوت کی زد میں آگئے۔

ایک بار آپ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے کہ جبرئیل امین آگئے، آپ نے جبرئیل امین سے ان لوگوں کے استہزاء و تمسخر کی شکایت کی۔ اتنے میں ولید سامنے سے گذرا، آپ نے بتلایا کہ یہ ولید ہے، جبرئیل نے ولید کی شہ رگ کی طرف اشارہ فرمایا، آپ نے پوچھا یہ کیا کیا؟ جبرئیل نے کہا اس کے لیے آپ بے فکر رہیں۔ اللہ کافی ہے۔ اس کے بعد اسود بن مطلب گذرا، آپ نے بتایا کہ یہ اسود بن مطلب ہے، جبرئیل نے آنکھوں کی طرف اشارہ کیا، آپ نے دریافت کیا، اے جبرئیل یہ کیا کیا؟ جبریل نے کہا، اسود بن مطلب کے لیے بھی آپ بے فکر رہیں، اس کے بعد اسود بن عبد یغوث ادھر سے گذرا،

جبریل نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔ اور حضور کے سوال پر جبریل نے وہی جواب دہرایا، اس کے بعد حارث گذرا جبریل نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد عاص بن وائل ادھر سے گذرا، جبریل نے اس کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا۔ اور سب میں وہی جواب دہرایا کہ آپ کی طرف سے اللہ کافی ہے۔

چناں چہ ولید کا قصہ یہ ہوا کہ ولید ایک مرتبہ قبیلۂ خزاعہ کے ایک شخص کے پاس سے گذرا جو تیر بنا رہا تھا۔ اتفاق سے اس کے کسی تیر پر ولید کا پاؤں پڑ گیا۔ جس سے ہلکا زخم ہو گیا۔ اس زخم کی طرف اشارہ کرنا تھا، کہ زخم جاری ہو گیا۔ اور اس میں مر گیا۔ اسود بن مطلب کا قصہ یہ ہوا کہ ایک کیکر کے درخت کے نیچے جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اپنے لڑکوں کو آواز دی، بچاؤ مجھ کو بچاؤ۔ میری آنکھوں میں کوئی شخص کانٹا چبھا رہا ہے۔ لڑکوں نے کہا کہ ہمیں تو کوئی نظر نہیں آتا۔ اسی طرح کہتے کہتے اندھا ہو گیا۔ اسود بن عبد یغوث کا قصہ یہ ہوا کہ جبریل امین کے اشارہ کرتے ہی اس کے تمام سر میں پھوڑے اور پھنسیاں نکل آئیں۔ اور اسی تکلیف میں وہ مر گیا۔ حارث کے پیٹ میں اچانک ایسی بیماری پیدا ہوئی کہ منہ سے پاخانہ آنے لگا۔ اور اسی میں وہ مر گیا۔ عاص بن وائل کا یہ حشر ہوا کہ گدھے پر سوار ہو کر طائف جا رہا تھا، راستہ میں گدھے سے گرا اور کسی خاردار گھاس پر جا کر پڑا، جس سے پاؤں میں ایک معمولی سا کانٹا لگا، مگر اس معمولی کانٹے کا زخم اس قدر شدید ہوا کہ جاں بر نہ ہو سکا۔ اور اسی میں مر گیا۔

(خصائص کبریٰ ص ۱۳۶ ج ۱، تفسیر ابن کثیر سورۂ الحجر ص ۳۳۶ ج ۵، روح المعانی ص ۷۲ ج ۱۴، سیرۃ المصطفیٰ ص ۲۲۳ ج ۱)

☆☆☆☆☆

اجتہاد:

شاہ صاحبؒ کے فقہی نظریات کو سمجھنے اور انکے تجدیدی کاموں کا مزید جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اسلام میں اجتہاد اور تفقہ کا کیا مقام ہے۔ آپ نے غلط اجتہاد کے دروازے کو بند کر کے ایک مجتہد کے صحیح دائرۂ کار کو متعین طور پر کردیا ہے اور اجتہاد کی شرائط اور مجتہدین کے درمیان فرق مراتب قائم کر کے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ کون سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے اور کون سا کھلا ہے۔
عقد الجید، ۵۸/۵۹

اجتہاد کی تعریف :

اجتہاد کے لغوی معنی مقصد کو حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کرنا، زحمت برداشت کرنا اور مشقت اٹھانا ہے، عربی زبان میں یہ لفظ اسی قسم کی جدوجہد کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس میں خوب محنت شاقہ برداشت کرنی پڑے۔ اصطلاحاً علماء کے بقول اجتہاد عبارت ہے اس کوشش سے جو کسی قضیہ یا حکم شرعی کے بارے میں

بحدِ امکان ذاتی رائے قایم کرنے کے لئے کی جائے (۱) کشاف اصطلاحات الفنون، قاضی محمد اعلی تھانوی (م ۱۱۹۹ھ) ص ۱۹۸، جزء الثانی، (۲) عقد الجید۔

اس تعریف کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوئی کہ جو عالم کتاب وسنت اور اجماع وقیاس کو سامنے رکھتے ہوئے شریعت اسلامیہ کے دائرے میں مختلف فیہ مسائل کا حل تلاش کرے وہ مجتہد ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کی تکمیل میں اجتہاد کی ضرورت کب اور کیوں پیش آتی ہے؟اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے گردو پیش کے سماج اور معاشرے کا پابند ہے،اس کی فطرت میں تہذیب وتمدن کا عنصر غالب ہے لیکن تہذیب وتمدن کوئی جامد شئے نہیں ہے بلکہ ہمہ وقت اسمیں ارتقاء اور تبدل ہوتا رہتا ہے۔یہ ترقی اور تبدیلی جن احوال واسباب کی مرہون منت ہے ان احوال واسباب کے تغیر سے بسااوقات یہ ارتقاء تنزل میں تبدیل ہوجاتا ہے،اس کے علاوہ انسانی زندگی ہر آن اور ہر لحہ تغیر پزیر حالات سے گزرتی رہتی ہے اور ہر ہر قدم پر نئے مسائل سے سامنا کرنا پڑتا ہے لہذا ان حالات میں شریعت کی مطابقت بھی ضروری ہوتی ہے اس سے کبھی اور کسی کو بھی مضر نہیں ہے۔

اجتہاد کی قسمیں اور مجتہد مستقل کی خصوصیات :

شاہ صاحبؒ نے اجتہاد کی بنیادی دو قسمیں (۱) بتلائی ہیں جس میں ایک اجتہاد مطلق (مستقل) اور دوسری اجتہاد مقید (منتسب) ہے۔ مجتہد مستقل دوسروں سے تین باتوں میں ممتاز ہوتا ہے۔ (وصاف ترجمہ الانصاف ص ۵۶ مطبوعہ لکھنؤ)

اول۔اس کو ان قواعد میں تصرف کرنے کا حق ہے جن پر اس کے اجتہادی مسائل کی بنیاد ہے۔

دوم۔ان احادیث وآیات وآثار کو تلاش کرنا اور ان کی مدد سے ان احکام کو پہنچانا جن کا جواب پہلے ہوچکا ہے،مزید برآں متعارض دلیلوں میں سے کسی ایک کو دوسری کے مقابلہ میں اختیار کرنا اور ان کے جتنے معانی ہوسکتے ہیں ان میں سے راجح کو بیان کردینا اور ان

دلیلوں کی روشنی میں احکام فقہی کے مآخذ پر مطلع ہونا۔

سوم۔ ان مسائل کا جواب دینا جن کا حل پہلے نہیں ہوا ہے، یہ حل انہی دلیلوں سے نکال کر دینا جن سے پہلوں نے نکالا تھا۔ (۲) عقد الجید ص ۱۰ مطبوعہ دہلی۔

مذکورہ بالا امتیازات کے علاوہ الانصاف، میں ایک جگہ آپ نے ایک چوتھا امتیاز بھی تحریر کیا ہے وہ یہ کہ مجتہد مذکور کو قبولیت عامہ اور تائید ربانی بھی حاصل ہو اور علماء، مفسرین، محدثین، اصولیین اور حفاظ کتب فقہ بھی اس کی طرف مائل ہوں اور اس کی یہ قبولیت زمانہ ہائے دراز تک جاری رہے۔ (۱) وصاف ص ۴۳۔

مجتہد مقید (منتسب) یعنی منسوب یہ مستقل وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے امام کے قواعد و ضوابط کو تسلیم کرے اور دلیلوں کی تلاش اور مآخذ کی واقفیت میں اس کے کلام سے مدد لے کر مسائل و معاملات کے حل نکالنے پر قادر ہو۔ استنباط کی یہ قوت خواہ اس میں کم ہو یا زیادہ بہر حال وہ مجتہد منتسب کہلانے کا مستحق ہوگا۔ (۲) عقد الجید ص ۱۰۔

اجتہاد کی مذکورہ بالا دو قسموں کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے اس کی چند قسمیں اور بھی بیان کی ہیں منجملہ ان کے تیسری قسم وہ ہے جو مجتہد منتسب سے مرتبہ میں کم ہو جس کو مجتہد فی المذہب کہتے ہیں۔ ایسا شخص اپنے امام کی تقلید ان تمام مسائل میں کرتا ہے جن کی تصریح امام سے ظاہر ہو چکی ہے۔ یہ بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے امام کے قواعد اور ان تمام باتوں کو جانتا ہو جن پر اس کے امام نے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی ہے لہذا مجتہد فی المذہب کو جب کسی ایسے مسائل سے سابقہ پڑتا ہے جن کے بارے میں امام کا کوئی صریح قول نہیں ملتا تو وہ اپنے امام کے مذہب کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلہ کا حل تلاش کریگا۔ (۱) (عقد الجید ص ۱۱)

جو عالم مجتہد فی المذہب سے بھی مرتبہ میں کم ہو وہ مجتہد فی الفتویٰ، کہلاتا ہے، ایسا شخص اپنے امام کے مذہب میں پوری واقفیت رکھتا ہے اور اپنے امام کے قول کو اسی کے دوسرے قول پر ترجیح دینے کی خاطر خواہ صلاحیت رکھتا ہے۔ (۲) (عقد الجید)

مذکورہ بالا مجتہدین کی اقسام کے علاوہ مختلف فقہاء نے ان اقسام کی بھی کچھ قسمیں

تحریر کی ہیں مثلاً مجتہد منتسب مطلق، مجتہد منتسب مقید، مجتہد مطلق مستقل وغیر مستقل، مجتہد فی الشرع، مجتہد فی المسائل، مجتہد صاحب تخریج اور مجتہد صاحب ترجیح، وغیرہ، ہم ان سب کی تفصیل میں جانے کی ضرورت خیال نہیں کرتے کیوں کہ اس سے مضمون کے طویل ہونے کا اندیشہ ہے۔

اجتہاد کے نسبت شاہ صاحبؒ کی ایک وضاحت :

بعض حضرات کا خیال تھا کہ اجتہاد کا باب بند ہو چکا ہے حالانکہ حقیقت امر یہ ہے کہ یہ باب ایک دن کے لئے بھی بند نہیں ہوا۔ اجتہاد ہر دور و ہر زمانہ میں کیا جاتا رہا ہے فرق صرف اجتہاد مطلق اور اجتہاد مقید میں رہا ہے لہذا یہ اجتہاد مطلق ہے جس کے بند ہونے پر امت کا اتفاق ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ، علامہ جلال الدین سیوطیؒ، (م ۹۱۱ھ) کا قول نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وان المطلق کما قررہ فی بکتابه 'اداب الفتیا' والنووی فی شرح المذهب نوعان 'مستقل' وقد فقد من رأس الأربع مأة فلم یکن وجودہ 'ومنسب' وھو باقٍ الیٰ ان یاتی اشراط الساعة الکبریٰ ولایجوز انقطاعه شرعاً لانه فرض کفایة (۱)	اور (جتہاد) مطلق جیسا کہ خود (ابن صلاح نے) اپنی کتاب آداب الفتیا میں اور نووی نے شرح المذہب میں ثابت کیا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں جس میں ایک "مستقل" ہے جو چوتھی صدی ہجری سے مفقود ہو گئی اس لئے اس کا وجود ممکن نہیں ہے اور (دوسری قسم) منتسب ہے وہ قیامت کی بڑی نشانیوں کے آنے تک باقی رہی گی اور شرعاً اس کا منقطع ہونا جائز نہیں کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے۔

مذکورہ بالا عبارت میں شاہ صاحبؒ نے یہ بات بالکل صاف ظاہر کر دی ہے کہ اجتہاد مطلق کا باب تو بند ہو چکا ہے مگر منتسب (مقید) کا باب کھلا ہوا ہے اور تا قیام قیامت کھلا رہے گا، مزید یہ کہ اسکا انقطاع شرعاً جائز بھی نہیں ہے۔ اس طرح اجتہاد مقید ہر دور میں ہوتا رہیگا اور یہ ساری امت پر ایک فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی بات تقریباً امام

شاطبیؒ (م ۷۹۰ھ) جیسے محقق اور شارح فقہ مالکی بھی اپنی بلند پایہ کتاب "الموافقات" میں تحریر کرتے ہیں :

الاجتهاد على ضربين ، احدهما لايمكن ان ينقطع اصل التكليف وذلك عند قيام الساعة والثانی يمكن ان ينقطع قبل فناء الدنيا، فاما الاول فهو الاجتهاد المطلق (بتحقيق المناط) وهو الذی لاخلاف بين الامة فی قبوله (۱)

الموافقات فی اصول الاحکام ، ج ٤ ص ٤٧، امام ابو اسحاق ابراهيم بن موسى الشاطبی اللخمی الغرناطی ، مطبع سلفيه مصر ، ١٣٤١ھ

اجتہاد کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا انقطاع ممکن نہیں یہاں تک کہ انسان کی مسئولیت ہی ختم ہو جائے اور یہ بات قیامت سے قبل ممکن نہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس کا انقطاع دنیا کے فناء ہونے سے قبل ممکن ہے۔ پہلا اجتہاد 'مطلق' ہے جس کی قبولیت کے بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں

مجتہد کا وجود ضروری ہے :

اجتہاد اور مجتہد کی ضرورت کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ شوافع کے مذہب کے موافق ہیں، ان کے نزدیک ہر زمانہ میں مجتہد (مطلق منتسب) کا وجود ضروری ہے چنانچہ وہ اپنی معروف کتاب 'تفہیمات الٰہیہ' میں اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

امت را ہیچ وقت از عرض مجتہد بہر کتاب وسنت استغناء حاصل نیست۔(۲)

تفہیمات الٰہیہ جلد ثانی ص ۲۴۰، مدینہ پریس بجنوریوپی ۱۳۵۵ھ

امت کو کسی وقت بھی کتاب وسنت پر اجتہادات کو پیش کرنے سے استغناء حاصل نہیں ہے

اسی موضوع پر اپنی مشہور شرح مؤطا مصفیٰ، (فارسی) میں بھی اس طرح تحریر فرماتے ہیں :

تفصیل ایں مجمل آنست کہ اجتہاد در ہر عصر فرض بالکفایہ است و مراد ایں جا نہ اجتہاد مستقل است مثلا اجتہاد شافعی مسائل کثیر الوقوع غیر محصور اند و معرفت احکام الٰہی در آنہا واجب وانچہ مسطور و مدون شدہ است غیر کافی

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اجتہاد ہر زمانے میں فرض کفایہ ہے لیکن یہاں اجتہاد مستقل مثل اجتہاد شافعی مراد نہیں ہے۔
مسائل کثیر الوقوع بے شمار ہیں اور ان کے بارے میں احکام الٰہی کی معرفت واجب ہے، (ابتک) اس سلسلہ میں جو کچھ مدون و مرتب ہو چکا ہے وہ ناکافی ہے۔

•(۱) مصفیٰ (فارسی) شرح موطاء (عربی)، شاہ ولی اللہؒ، ص ۱۴ ج ۱، مطبع فاروقی دہلی ۱۲۹۳ھ

مذکورہ خیالات کی روشنی میں شاہ صاحبؒ ہر زمانہ میں مجتہد منتسب کا وجود فرض کفایہ مانتے ہیں جس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی زمانہ میں تمام لوگ اجتہاد کو ترک کردیں تو سب گناہ گار ہوں گے جیسا کہ ہر فرض کفایہ کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا فیصلہ ہے۔ اس کے فرض کفایہ ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب تو یہ ہے کہ مسائل فقہیہ کثیرۃ الوقوع اور غیر محصور ہیں، ان میں احکام الٰہی کی معرفت واجب ہے اور جو مدون ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے بھی تو وہ ناکافی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اس مدون ذخیرہ میں بھی بڑے اختلافات ہیں اور ان دلائل کی طرف رجوع کئے بغیر انھیں حل نہیں کیا جاسکتا اور یہ ظاہر ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل کا شرعی حل دریافت کرنا اور اختلافات کی صورت میں ادلہ کی طرف رجوع کرکے ان کا حل دریافت کرنا کسی مجتہد ہی کا کام ہے۔

اجتہاد مطلق کے بند ہونے کے اسباب :

'الانصاف' میں شاہ صاحبؒ نے یہ بات بالکل صاف کردی ہے کہ اجتہاد مطلق کا باب تو بند ہو چکا ہے مگر منتسب (مقید) کا باب کھلا ہوا ہے اور تا قیام قیامت کھلا رہیگا اور مزید یہ کہ اس کا انقطاع بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس بات پر امت کا اتفاق ہو چکا ہے۔ اجتہاد

مطلق کے منقطع ہونے کی وجہ یہی ہے کہ شریعت الٰہیہ کے دائمی اصول وکلیات مدون ومرتب ہو چکے تھے اور ان کی بنیادوں پر مختلف مذاہب کی کتابیں بھی مدون ہو چکی تھیں لہذا اصول وکلیات میں کسی نئے اجتہاد کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ اسی طرح اجتہاد کے متعلقہ علوم میں جس مجتہدانہ بصیرت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے اب اس سے لوگ دور ہو چکے ہیں۔ ان امور یا ان کی کسی شق سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر شاہ صاحبؒ کی رائے یہی تھی۔

اجتہاد و منتسب مقید :

اجتہاد مقید کا جہاں تک سوال ہے اس کا باب ہر دور میں کھلا رہا ہے اور آج بھی بند نہیں ہے مثلاً پانچویں صدی ہجری میں سود کی شکلوں سے بچنے کے لئے بیع الوفا کے احکامات وغیرہ وضع کئے گئے، اسی طرح تمام متاخرین فقہا نے قرض خواہوں کی رضامندی کے بغیر قرضدار کے تمام تصرفات مثلاً وقف اور ہبہ وغیرہ ممنوع قرار دیئے، ٹھیک اسی طرح ہر دور میں جو اجتہادات کئے گئے ہیں ان سب کے نظائر موجود ہیں۔ اس موجودہ دور میں بھی اجتہاد کے نظائر نہ صرف یہ کہ ملتے ہیں بلکہ بکثرت موجود ہیں مثلاً نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال، رویت ہلال سے متعلق شریعت کے مقاصد کی توضیح، عورت کی امارت وقضا کے استثناء کا مسئلہ، برتھ کنٹرول کے بارے میں شرعی احکامات، بینکنگ اور بیمہ اور ان جیسے دوسرے مالی معاملات میں شریعت کی تشریح اور اسی طرح مفقود الخبر شوہر کی عدت وانتظار کے بارے میں فتوے کی تبدیلی وغیرہ جیسی مثالیں باب اجتہاد، قضا وفتوی ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

اجتہاد منتسب مقید کے بارے میں شاہ صاحبؒ اور دوسرے فقہاء محدثین نے اپنی فہم وفراست کے مطابق مختلف قسمیں بیان کی ہیں۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے اس کی قسمیں خواہ کتنی ہی ہوں بہر حال سب میں ہمت وصلاحیت کے بقدر اجتہاد کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے :

ومتی قصر اهل عصر حتی ترکوه أثموا کلهم وعصوا باسرهم۔

اور جب کسی زمانہ کے لوگ اس میں کوتاہی کریں یہاں تک کہ اس (اجتہاد) کو بالکل ہی چھوڑ بیٹھیں تو وہ سب کے سب گناہ گار ہوں گے اور نافرمان متصور کئے جائیں گے۔

اب اتنا کچھ لکھ دینے کے بعد مزید کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

عہد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

بقلم: شیخ عطیہ محمد سالم حفظ اللہ جج ہائی کورٹ مدینہ منورہ ومدرس حرم نبوی
ترجمہ و تلخیص: محمد عارف جمیل السبارک فوری

حضرت ابو بکرؓ کا عہد، مختصر رہا ہے، لوگ عہد رسالت سے قریب تھے، اس لیے تراویح میں کسی تبدیلی کے محرکات نہیں ملتے، یہی وجہ ہے کہ کسی نے عہد صدیقی میں تراویح کے تعلق سے کسی تبدیلی کا ذکر نہیں کیا، کیوں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور علیہ ہم کو قیام رمضان کی ترغیب دیتے، لیکن عزیمت کے ساتھ حکم نہیں تھا، آپ فرمایا کرتے تھے۔

جس نے ایمان کے ساتھ، بہ نیت ثواب قیام رمضان کیا اس کے پچھلے گنا ہ معاف ہوگئے، رسول اللہ علیہ کی وفات تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ امام بیہقی نے کہا: احمد بن منصور رمادی کی روایت میں یہ اضافہ ہے ''حضرت ابو بکرؓ خلافت کے دور میں، اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں'' اس روایت کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ اور اس کو امام مالک نے ابن شہاب تک اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ علیہ کی رحلت کے وقت یہی سلسلہ جاری تھا، اور یہی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں باقی رہا۔

بیہقی میں حضرت عائشہؓ کا قول مذکور ہے:

''ہم مکتب سے بچوں کو پکڑ کر لاتے تھے تاکہ ہمیں ماہ رمضان میں قیام لیل کرائیں۔ اور اسکے عوض ہم ان کے لیے قلیہ (شوربہ) اور ''خشکنانج'' تیار کرتے تھے۔ مروزی کے الفاظ یہ ہیں: ہم ان کے لئے ''قلیہ'' اور ''خشکار'' تیار کرتے تھے۔ ''خشکار'' گیہوں کی روٹی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی امامت میں تراویح ہوتی تھی۔ اور یہ عہد رسالت میں نہیں ہوا، لہذا یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں ہوا جو ایک تبدیلی مانی جائی گی، یا عہد فاروقی میں ہوا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد صدیقی میں پیش آیا ہے کیوں کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مردوں کے لیے چند ائمہ، اور عورتوں کے لیے ایک امام کی تعیین کا واقعہ پیش آیا ہے، جیساکہ آئے گا، بہرکیف یہ تبدیلی کا عکاس ہے اگر یہ واقعہ حضرت عمر کے دور میں پیش آیا ہے تو غالب گمان ہے کہ ایسا گھروں کے اندر ہوا ہوگا، اس لئے کہ جب حضرت عمر نے عورتوں کے لئے امام مقرر کردیا تو پھر عورتیں مکتب سے بچوں کو پکڑ لائیں ایسا نہیں ہو سکتا، اور خصوصاً حضرت عائشہؓ سے ایسی امید نہیں، وہ تو اپنے گھر میں تراویح پڑھتی رہیں ہوں گی، اور کچھ عورتیں جمع ہو جاتی رہی ہوں گی۔

عہد صدیقی میں قرأت :

عہد صدیقی میں بھی قرأت لمبی ہوتی ہے، حضرت ابوبکر صدیق کے صاحب زادے عبداللہ بن ابوبکر سے امام مالک کی روایت میں ہے، "میں نے اپنے والد کو یہ فرماتے سنا کہ ہم رمضان میں قیام لیل (تراویح) سے لوٹتے تو جلدی جلدی خدام سے کھانا مانگتے کہ کہیں فجر طلوع نہ ہو جائے"

عہد صدیقی میں قرأت کے درمیان ایک طرح کا موازنہ شروع ہوگیا جس قاری کی آواز اچھی ہوتی، لوگ اس کی طرف مائل ہوتے تھے۔ اس کی وضاحت ان شاءاللہ عہد فاروقی پر بحث کے ضمن میں آئے گی۔

عہد عمر فاروقی رضی اللہ عنہ :

حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو یہی سابقہ نوعیت جاری تھی، لوگ متفرق طور پر اکیلے، اور باجماعت مسجد اور گھروں میں تراویح پڑھتے تھے۔ اس کی مکمل تصویر، ان دو آثار سے سامنے آتی ہے : یاس ہذلی کا اثر، اور عبدالرحمٰن بن عبد کا اثر۔

اثرِ اول :

بروایت نوفل، ایاس ہذلی نے کہا : "لوگ رمضان میں مسجد میں قیام لیل کرتے

تھے، اگر کسی اچھی قرأت والے قاری کو سنتے تو اسکی طرف مائل ہو جاتے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: لوگوں نے قرآن کو غناء بنالیا ہے، خدا کی قسم! اگر مجھ سے ہو سکا تو میں اس کو بدل کر رہوں گا، اس کے بعد تین راتیں نہیں گزری تھیں کہ انہوں کو سب لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے جمع کر دیا، اور حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر یہ بدعت (نئی چیز) ہے، کیا خوب بدعت ہے" رواہ المروزی۔

اثر دوم :

عبد الرحمٰن بن عبد قاریؒ کا اثر، جو یہ ہے: "میں حضرت عمر بن خطاب کے ساتھ رمضان میں مسجد میں آیا، تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ متفرق طور پر نماز پڑھ رہے ہیں، کوئی تنہا پڑھ رہا ہے، تو کسی کے پیچھے ایک جماعت پڑھ رہی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں ان سب کو کسی ایک قاری کے پیچھے جمع کر دوں تو بہتر ہوگا، اور پھر اس کا عزم کر کے، سب کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے جمع کر دیا، اس کے بعد میں ان کے ساتھ ایک رات اور نکلا، لوگ اپنے قاری کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ بدعت تو اچھی ہوئی۔ رات کا وہ حصہ جس میں تم سوتے رہے ہو (یعنی آخیر رات) وہ اس حصہ سے افضل ہے، جس میں نماز پڑھتے ہو، لوگ شروع ہی رات میں تراویح پڑھ لیتے۔ (رواہ البخاری)

ایک تبدیلی :

ان دونوں آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر ایک تبدیلی ہوئی، یعنی انہوں نے متفرق لوگوں کو ایک قاری کے پیچھے لگا دیا۔ اس تبدیلی کے اسباب متعدد ہوں، لیکن اس میں کئی مصلحتیں تھیں۔

پہلے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب حسن قرأت تھا، جو قرأت کے لئے منافسہ و مسابقہ کے لئے، اور عام لوگوں کی سبقت کا ایک بڑا میدان تھا، اگر یہی سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری رہتا تو اسکی وجہ سے مصلیان کے درمیان بعد پیدا ہو جاتا، لہذا انہوں نے قرأت کو ایک کرنے کے لئے ایک قاری مقرر کر دیا۔ اس سے یہ ضابطہ اخذ کیا جاسکتا ہے

کہ دفع فساد، تحصیل مصلحت سے مقدم ہے، اس لئے کہ اگر مصلی، سب سے اچھی آواز والے کو تلاش کرنے لگیں تو اس سے تحسین صوت کی راہ ہموار ہوگی، تحسین صوت بذات خود مرغوب ہے، لیکن یہ غناء کی حد تک غلو کرنے کا سبب بن سکتا ہے، جب کہ حضرت عمرؓ اس کی طرف اشارہ کرچکے تھے۔ لہذا اسی کی سد باب کے لئے، اور دفع فساد کے مقصد سے سب کو ایک قاری کے پیچھے جمع کردیا۔

دوسرے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اکیلے، اور باجماعت نماز تراویح پڑھتے تھے، آپس میں کوئی ربط نہ تھا۔ اگر کچھ دنوں تک یہی سلسلہ جاری رہتا تو اتحاد واتفاق کے اسباب کا فقدان ہو جاتا، اور اجتماعیت کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا، لہذا انہوں نے الگ الگ اماموں کو ختم کرکے ایک امام کے پیچھے تمام لوگوں کو جمع کردیا، جس کی وجہ سے مقتدیوں میں بھی اتحاد پیدا ہو گیا۔ اور ان دونوں لحاظ سے یہ بہت بھلی "بدعت" ثابت ہوئی، اور اب ایک امام (ابی بن کعبؓ) کے پیچھے تمام لوگ تراویح پڑھنے لگے۔

تعدد ائمہ :

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مردوں کے لئے دو امام مقرر کئے تھے، حضرت ابی بن کعبؓ اور تمیم داری۔ اور یہ دونوں حضرات باری باری تراویح پڑھاتے تھے، پہلا امام جہاں پہونچ کر ٹھہرا ہوتا، دوسرا وہیں سے شروع کرتا تھا۔ سائب بن یزید کہتے ہیں : "حضرت عمر بن خطابؓ نے، ابی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا کہ گیارہ رکعت پڑھائیں" اس کے ساتھ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں طول قرأت کی پابندی کی جاتی تھی حضرت سائب کہتے ہیں : "ہم لوگ حضرت عمرؓ کے دور میں ۱۳؍ رکعات پڑھتے تھے لیکن بخدا! صبح ہوتے ہوتے مسجد سے نکلتے تھے قاری صاحب ہر رکعت میں پچاس یا ساٹھ آیتیں پڑھتے تھے"

حضرت سائب ہی کی روایت ہے :

"وہ مئین" پڑھتے تھے، لوگ لاٹھیوں کے سہارے کھڑے رہتے تھے، یہ حضرت عمر بن خطاب کے عہد کا واقعہ ہے"

ان دو آثار میں نئی بات یہ ہے:

پہلے ایک امام ہوا کرتے تھے، اب متعدد ائمہ ہوگئے، خواہ اسکا مقصد امام کے لئے نائب مقرر کرکے سہولت پیدا کرنا ہو یا مقتدیوں کی سہولت اور آرام مدنظر ہو، تاکہ اس وقفہ میں نشاط پیدا ہو جائے، خصوصاً جب کہ ابھی حال تک انفرادی طور پر پڑھتے تھے، اور متعدد ائمہ ہوتے تھے۔

بلکہ حضرت عمرؓ نے اس سے آگے بڑھ کر عورتوں کے لئے الگ امام مقرر کردیا، اور تراویح کے لئے کئی ایک ائمہ کا انتخاب کیا، عورتوں کے امام: سلیمان بن ابوحثمہ ہوا کرتے تھے۔ مروزی میں ہے کہ ہشام اپنے والد عروہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دو قاری مقرر کئے: ابی بن کعب مردوں کو، اور سلیمان بن ابوحثمہ عورتوں کو پڑھاتے تھے" اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت ابی مردوں کو تراویح پڑھاتے تھے: اسی وقت حضرت سلیمان بن ابوحثمہ عورتوں کو تراویح پڑھایا کرتے تھے یعنی دونوں حضرات ایک ساتھ تراویح پڑھاتے تھے حضرت ابی بن کعب مردوں اور حضرت سلیمان عوتوں کو، نشاط، صبر، طول قیام، اور کثرت قرأت کے لحاظ سے یہ تراویح کی سب سے اعلیٰ حد تھی۔ اب اس کے بعد بہ تدریج سہل ہوتی گئی، متعدد ائمہ ہوگئے، قرأت میں تخفیف کردی گئی، اور رکعات کی تعداد بڑھ گئی۔ ائمہ کی تعداد میں مزید اضافہ کا ثبوت عاصم کی روایت میں ہے کہ ابوعثمان رحمہ اللہ نے کہا "حضرت عمرؓ نے رمضان میں قراء کو جمع کیا، سب سے تیز پڑھنے والے کو تیس آیت، اور سط درجہ والے کو ۲۵ آیت اور سب سے آہستہ پڑھنے والے کو ۲۰/ آیت پڑھنے کا حکم دیا"

اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد ائمہ مقرر تھے، جس میں خود امام کے لئے اور مقتدیوں کے لئے زیادہ راحت وسہولت تھی، اسی طرح قرأت میں بھی تخفیف کردی گئی، پہلے ساٹھ آیات اور "مئین" پڑھا کرتے تھے، اب زیادہ سے زیادہ تیس آیات مقرر کردی گئیں، بلکہ حضرت عمرؓ کے ایک دوسرے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت ابی تراویح کی امامت کرتے تھے، چوتھائی رات تک لوگ سوتے، چوتھائی رات تراویح پڑھتے، اور بقیہ چوتھائی حصہ سحری اور دوسری ضروریات کے لئے خالی رکھتے تھے۔

حضرت ابی ہر رکعت میں پانچ چھ آیات پڑھتے تھے، دو دو کر کے آٹھ رکعت پڑھاتے تھے، ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔ اسکے بعد وضوء اور قضاء حاجت کے بقدر ترویحہ کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس حد تک کیفیت تراویح اور قرأت میں تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔

رکعات کی تعداد حسب ذیل ہے :

۱۔ گزر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت ابی لوگوں کو آٹھ رکعات پڑھاتے تھے، اور "مئین" پڑھتے تھے، لوگ صبح کے قریب گھر لوٹتے تھے۔

۲۔ گزر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابی اور تمیمؓ کو حکم دیا کہ ۱۳ر رکعت تراویح پڑھائیں۔ یہ آٹھ رکعات والی روایت کے تعلق سے ہے جس میں تین رکعت وتر ہوتی تھی۔

محمد بن سیرین کی روایت میں ہے کہ معاذ ابو حلیمہ قاری لوگوں کو ۱۴ر رکعت تراویح پڑھاتے تھے۔ معاذ ابو حلیمہ کے بارے میں التقریب میں ہے : یہ معاذ بن حارث انصاری بخاری قاری ہیں، ان کو بھی حضرت عمرؓ نے تراویح کے لئے مقرر کیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دوسرے ہیں، جن کی کنیت ابوالحارث تھی، صغار صحابہ میں سے تھے، واقعہ حرہ میں شہید ہوئے۔ واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا، اس تعداد کی تائید و تفصیل ابو زید کی روایت سے ہوتا ہے کہ "توأمہ" کے آزاد کردہ غلام صالح نے کہا :

میں نے واقعہ حرہ سے پہلے لوگوں کو ۴۱ر رکعات پڑھتے ہوئے پایا، جس میں پانچ وتر تھیں، لہذا ۴۱ر میں سے پانچ ساقط کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تراویح صرف ۳۶ر رکعت تھی۔ پانچ رکعت وتر ہوتی تھی۔

صالح کے بارے میں التقریب میں ہے : صالح بن نبہان مدنی، توأمہ (تاء پر فتح، واء ساکن اس کے بعد ہمزہ مفتوحہ ہے) کے آزاد کردہ غلام، صدوق ہیں، آخیر میں اختلاط ہوگیا تھا"

ابن عدی نے کہا : قدماء (مثلاً ابن ابوذئب اور ابن جریر) کی روایت میں کوئی حرج نہیں۔ یہ طبقہ چہارم میں سے ہیں ۱۲۵ھ میں انتقال ہوا۔ یہاں پر صالح سے روایت کرنے والے، قدماء میں سے ابن ابوذئب ہیں، جیسا کہ قدماء کی مثال میں ابن عدی نے ان کا

ذکر کیا ہے۔ صالح کہتے ہیں کہ واقعہ حرہ سے قبل میں نے لوگوں کو ۴۱؍رکعت پڑھتے ہوئے پایا، جن میں پانچ رکعات وتر تھی۔ صالح کی یہ روایت، محمد بن سیرین کے اس قول کے موافق ہے کہ معاذ ابو حلیمہ قاری لوگوں کو ۴۱؍رکعات پڑھاتے تھے، یعنی ۳۶؍تراویح اور ۵؍وتر کی۔

ا۔لہذا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تراویح ابتداء وتر کے ساتھ تیرہ رکعت تھی۔

ب۔پھر وتر کے ساتھ ۲۳؍رکعت ہوگئی۔

ج۔پھر ۳۶؍رکعت تراویح، اور ۵؍رکعت وتر کل ۴۱؍رکعت ہوگئی، لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے کہ رکعات کی کثرت کے ساتھ قرأت میں تخفیف واختصار ہوتا گیا اس لئے کہ

اولاً : آٹھ یا ۱۳؍رکعات تھیں مئین پڑھتے تھے اور صبح ہوتے ہوتے واپس لوٹتے تھے اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے کہ ۳۶؍رکعات میں مقدار قرأت، آٹھ یا ۱۳؍رکعات کی قرأت کے برابر ہوگی۔ بلکہ عملی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جب قراء کو جمع کیا تو تیز تر پڑھنے والے کو ۳۰؍آیات پڑھنے کا حکم دیا، جب کہ پچاس ساٹھ آیات پڑھا کرتے تھے۔لہذا حضرت عمرؓ کے دور میں رکعات تراویح کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات میں کوئی تعارض نہیں، جیسا کہ باجی نے موطا کی شرح (۱؍۲۰۸) میں کہا، جس کا خلاصہ یہ ہے :

"حضرت عمرؓ کے دور میں تعداد رکعات کے بارے میں مختلف روایات ہیں: سائب بن یزید کی روایت میں گیارہ، یزید بن رومان کی روایت میں تیئیس، اور حضرت ابن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام نافع کی روایت میں ہے کہ میں نے رمضان میں لوگوں کو ۳۹؍رکعات پڑھتے پایا، جن میں تین وتر ہیں۔لہذا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے آٹھ سے آغاز کیا ہو جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے حضور کا معمول معلوم ہوتا ہے، "رسول اللہ ﷺ نے رمضان اور غیر رمضان میں آٹھ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھا" اسی کے ساتھ حضرت عمرؓ نے لمبی قراءت کرنے کا حکم دیا ہو، چناں چہ قاری، "مئین" ایک رکعت میں پڑھتا تھا، لیکن جب لوگ اس کو ادا نہ کر سکے تو تیئیس رکعات کا حکم دیا، اور قیام میں تخفیف کردی، اور رکعات میں اضافہ کر کے، اس فضیلت کی کچھ تلافی کردی، اور قاری آٹھ یا بارہ رکعات میں سورہ بقرہ پڑھتا تھا۔ایک قول ہے کہ تیس سے بیس آیتیں پڑھتا تھا، واقعہ حرہ تک یہی سلسلہ جاری رہا، لکن جب لوگوں کے لئے قیام بھاری پڑ گیا تو انھوں نے

قرأت میں تخفیف اور عدد رکعات میں اضافہ کردیا، اس طرح ۳۶ رکعات تراویح، اور تین رکعت وتر ہوگئی، پھر یہی سلسلہ چل پڑا، اور ۳۶ رکعت کی تعیین، غالباً واقعہ حرہ سے قبل پیش آئی، جیساکہ محمد بن سیرین کی روایت میں ہے کہ معاذ ابو حلیمہ لوگوں کو ۴۱ رکعات پڑھاتے تھے، ابو حلیمہ کا انتقال، قطعی طور پر واقعہ حرہ میں ہوا ہے۔ ہمارے لئے قابل لحاظ امر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بتدریج قرأت میں تخفیف، اور عدد رکعات میں اضافہ ہوتا رہا، رکعات کم تھیں تو قرأت زیادہ تھی اور قراءت زیادہ تھی تو رکعات کم تھیں۔

”یہ اچھی بدعت ہے“ پر بحث :

عہد عمری سے عہد عثانی کی طرف جانے سے قبل، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو باجماعت ایک قاری کے پیچھے جمع کرنے کے بعد، حضرت عمر کے اس قول: ”یہ اچھی بدعت ہے“ کا جواب دے دیا جائے، اس سے مراد کیا ہے؟ اچھی ہونا، اور بدعت ہونا، ان دونوں کے درمیان موافقت کی کیا شکل ہے؟

اس کی تشریح کے لیے سب سے بہتر ہوگا کہ ہم شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتاب (اقتضاء الصراط المستقیم ص ۲۷۵) کی عبارت نقل کردیں۔ موصوف فرماتے ہیں۔

نماز تراویح، شریعت میں بدعت نہیں، بلکہ سنت ہے، رسول اللہ ﷺ کے قول وعمل سے اس کا ثبوت ہے، کیوں کہ حضور نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے، اور اس کے قیام کو میں نے تمہارے لیے مسنون کیا“ نماز تراویح جماعت سے پڑھنا بھی بدعت نہیں بلکہ سنت ہے، بلکہ خود حضور ﷺ نے باجماعت ابتداء رمضان میں دو یا تین راتوں کو، اور عشرہ آخرہ میں باجماعت کئی بار پڑھا ہے اور فرمایا: اگر آدمی امام کے ساتھ نماز پڑھ کر لوٹے تو اس کے لیے رات بھر کی قیام کا ثواب لکھا جائے گا۔ اور حضور ﷺ نے ان کے ساتھ قیام لیل اتنی دیر تک کیا کہ سحری چھوٹنے کا اندیشہ ہوگیا۔ رواہ اہل السنن۔ اس حدیث سے امام احمد وغیرہ نے استدلال کیا ہے کہ باجماعت تراویح پڑھنا، اکیلے پڑھنے سے افضل ہے۔ ان کے اس قول میں: امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کی ترغیب ہے۔ اور اس میں مطلق سنت سے زیادہ تاکید ہے۔ (۱) لوگ عہد نبوی میں مسجد نبوی میں باجماعت تراویح پڑھتے تھے، حضور ﷺ ان کو برقرار رکھتے، ارو آپ

(۱) خط کشیدہ عبارت سے بظاہر شیخ الاسلام کی مراد امام احمد کی مستدل حدیث ہے نہ کہ خود امام احمد کا قول۔

کا اقرار سنت ہے۔ رہا حضرت عمرؓ کا یہ قول: یہ اچھی بدعت ہے ۔ تو اس سے استدلال کرنے والے اکثر لوگ (اگر ہم حضرت عمر کے اس قول سے کوئی حکم ثابت کرنا چاہئیں، جس میں ان کا کوئی مخالف نہیں) کہیں گے کہ صحابی کا قول حجت نہیں، لہذا، رسول اللہ ﷺ کے قول کے خلاف یہ ان کے لیے کس طرح حجت بنے گا، اور جو لوگ صحابی کا قول حجت مانتے ہیں وہ بھی حدیث کے خلاف قول صحابی کو حجت نہیں مانتے۔

بہر دو صورت صحابی کے قول کو حدیث کے بالمقابل نہیں رکھا جاسکتا، ہاں عموم حدیث کی تخصیص، قول صحابی (جس میں اس کا کوئی مخالف نہ ہو) سے، ایک روایت کے مطابق ہو سکتی ہے، اس لحاظ سے یہ قول ان کے لیے ''اس بدعت کے بہتر ہونے'' کا فائدہ دے سکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو بدعت کہا اور یہ لغوی اعتبار سے ہے۔ شرعی اعتبار سے نہیں، کیوں کہ لغوی اعتبار سے لفظ ''بدعت'' ہر ایسے کام کو کہا جاتا ہے جو ابتداء کیا جائے، پہلے سے اس کی نظیر موجود نہ ہو، جب کہ شرعی اعتبار سے ''بدعت'' ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو۔

اگر رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے، آپ کی موت کے بعد کسی فعل کے استحباب یا وجوب کا علم ہو یا علی الاطلاق اس کا علم ہو، اور حضور ﷺ کی وفات کے بعد ہی اس پر عمل ہو سکا، جب کہ صدقات کے بارے میں حضور ﷺ کا گرامی نامہ، جس کو حضرت ابوبکرؓ نے نکالا تھا، اگر کوئی اس پر، آپ کی موت کے بعد عمل کرے تو اس کو لغوی اعتبار سے بدعت کہتے ہیں اس لیے کہ اس پر ابتداءً عمل ہوا ہے۔ جیسا کہ خود حضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کو لغوی لحاظ سے بدعت، اور ''محدث'' (نیا کہا جاتا ہے)۔ چناں چہ حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کے بارے میں، قریش کے قاصدوں نے، نجاشی کے دربار میں کہا تھا ''یہ لوگ اپنے آبائی دین سے نکل گئے اور بادشاہ کے دین میں داخل نہیں ہیں، یہ لوگ یہ ''محدث'' (نیا) دین لائے ہیں، جس کو کوئی نہیں جانتا'' پھر جس عمل کی کتاب و سنت سے دلیل ہو، اس کو شریعت میں بدعت نہیں کہتے۔ گو کہ لغوی اعتبار سے بدعت کہتے ہوں، لغوی اعتبار سے لفظ بدعت، شرعی لحاظ سے لفظ بدعت کے مقابلہ میں عام ہے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے قول: ''ہر بدعت گمراہی ہے'' سے مراد ہر

ابتدائی نیا کام نہیں، کیوں کہ دین اسلام بلکہ انبیاء کے لائے ہوئے سارا دین ''نیا عمل'' ہے، حدیث سے مراد صرف وہ اعمال ہیں جن کو حضور ﷺ نے نہیں بتایا، اور جب ایسا ہے تو حضور ﷺ کے عہد میں لوگ باجماعت اور انفرادی طور پر تراویح پڑھتے تھے۔

جب تیسری یا چوتھی رات میں لوگ جمع ہوئے تو حضور ﷺ نے ان سے یہی فرمایا تھا: 'ہاں میرے نہ نکلنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا یہ تمہارے ذمہ فرض ہو جائے، لہذا تم گھروں میں پڑھو، اس لیے کہ فرض کے علاوہ آدمی کی سب سے بہتر نماز، وہ ہے جو گھر میں ہو'' حضور نے نہ نکلنے کی وجہ: اندیشہ فرضیت قرار دیا، اور یہ اندیشہ آپ کی رحلت کے بعد ختم ہو گیا۔ لہذا اس کا معارض باقی نہ رہا۔

اس کے بعد موصوف نے بہت سے دوسرے دلائل ذکر کیے ہیں، مثلاً جمع قرآن، حضرت عمرؓ کے ہاتھوں یہود خیبر کو شہر بدر کرنا، اور حضرت ابو بکر کا، مانعین زکاۃ سے جنگ کرنا۔

اس کے بعد موصوف نے بدعت حسنہ، اور بدعت سیئہ کا ضابطہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: اس سلسلہ میں ضابطہ، واللہ اعلم یہ ہے کہ کہا جائے، لوگ کوئی چیز، مصلحت سمجھ کر ہی ایجاد کرتے ہیں، کیوں کہ اگر اس کو فاسد تصور کریں تو ایجاد نہ کریں، کیوں کہ نہ یہ عقل کا تقاضا ہے نہ دین کا۔ لہذا جس کو مسلمان مصلحت سمجھیں اس پر غور کیا جائے گا کہ اس کا داعیہ اور سبب کیا ہے؟ اگر اس کا داعیہ و سبب: حضور ﷺ کے بعد وجود میں آنے والا کوئی امر ہو تو اس صورت میں حسب حاجت ایجاد کا جواز ہے۔ (اس کے بعد موصوف نے ایک عبارت لکھی ہے، جس کا حاصل یہ ہے: حضور کا اس عمل کو ترک کرنا، کوتاہی کے سبب نہ تھا) اسی طرح اگر اس فعل کا داعیہ حضور کے زمانہ میں رہا ہو لیکن کسی معارض کے سبب حضور نے اس کو ترک کر دیا۔ اور وہ معارض حضور کی وفات کے بعد زائل ہو گیا ہو۔

حضرت عمرؓ کے کلام ''بدعت اچھی ہے'' کی تشریح میں یہ موصوف کا حرف بحرف کلام ہے، میرا خیال ہے کہ جو لوگ باجماعت تراویح کو، اور حضرت عمرؓ سے منقول ۲۱ر کی تعداد رکعات کو بدعت کہتے ہیں، ان کی تردید کے لیے یہ بالکل واضح ہے۔ ہاں یہ بحث کہ یہ عدد حضرت عمر سے ثابت ہے یا نہیں تو اس کے لیے مؤطا مالک کی روایات کافی ہیں، واللہ اعلم۔

☆☆☆

بقلم مولانا عبدالرزاق القاسمی گریڈیہوی استاذ مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیر آباد، مئو

ع "نازاں ہے جن پر تاریخ آدم"

امام حسن بصریؒ کا شمار کبار تابعین اور ائمہ میں ہوتا ہے، ان کے دور کے تمام علماء وفقہا نے ان کے علو شان اور رفعت مکان کا اعتراف کیا ہے اور علوم القرآن وعلوم الحدیث، فقہ، ادب اور فن بلاغت وفصاحت میں ان کی امامت کے قائل ہیں اور حقیقت واقعہ یہی ہے کہ امام حسن بصریؒ ورع وتقوی، زہد وصلاح، ہی میں نہیں بلکہ علم وادب میں بھی فرید العصر تھے اس لئے کہ انہوں نے ام المومنین سیدہ ام سلمہؓ کی آغوش شفقت اور دولت کدہ رسول عربی ﷺ میں نشو ونما پائی ہے جہاں پہ رحمت کی گھٹائیں جھوم کر برستی تھیں اور نزول وحی کا روحانی سلسلہ جاری رہتا تھا۔

نام ونسب:

ابو سعید بن یسار والدہ کا نام خیرہ تھا باپ یسار اگر سیدنا زید بن ثابت انصاریؓ کے

آزاد کردہ غلام تھے تو والدہ خیرہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی باندی تھیں یہ کبھی کبھی کسی ضرورت کے تحت کہیں چلی جاتی تھیں اور حسن بھوک کیوجہ سے رونے لگتے تھے تو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ انتہائی محبت کے ساتھ اپنا پستان مبارک ان کے منھ میں دیدیا کرتی تھیں جب خیرہ واپس آتی تھیں تو اپنے بچے کو سنبھال لیتی تھیں، امام حصن بصری کی حکمت و فصاحت اسی برکت کا ثمرہ تھا، عمر فاروقؓ کی خلافت کے دو سال باقی تھے کہ آپ کی ولادت ہوئی حجاج بن یوسف ثقفی امام حسن بصری کا ہمعصر تھا قادر الکلامی اور طلاقت لسانی میں یکتائے روزگار مانا جاتا تھا باوجود اس کے انتہائی ظالم و جابر ہونے کے لوگ حجاج کی اس صفت کے مداح تھے لیکن اس کے مقابلہ میں امام حسن بصری کی شان بلاغت کے بارے میں حضرت ابو عمرو بن العلاء فرماتے ہیں کہ:

مارایت افصح من الحسن البصری ومن الحجاج بن یوسف ثقفی، فقیل له فأیهما کان افصح؟ قال الحسن
(وفیات الاعیان ج ۲ ص ۷۰)

میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف ثقفی سے زیادہ فصیح کسی کو نہیں دیکھا تو ان سے پوچھا گیا کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ فصیح تھا؟ انہوں نے کہا کہ حسن سب سے زیادہ فصیح تھے۔

امام حسن بصری کے کلام میں نبوی رنگ کی جھلک صاف نظر آتی ہے کلام اللہ کے بعد کلام رسولؐ سب سے زیادہ بلیغ کلام ہے جو عام سطح کے کسی انسان سے ممکن نہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جن کی تربیت و اصلاح، تربیت گاہ رسول عربیؐ میں ہوئی تھی طبعی طور پر ہمہ وقت حاضر باش اور منہاج نبوت سے زیادہ قریب، صحابہ کرامؓ میں کاشانہ نبوت کی فصاحت و بلاغت کا نمایاں اثر تھا، حکمت و دانائی الفاظ و معانی، اور کمال و جمال میں حسب مراتب و استعداد ان حضرات نفوس قدسیہ نے کسب فیض کیا تھا اور خاندان نبوت سے جو جتنا قریب تھا اس میں اثر پذیری بھی اسی مناسبت سے تھی جیسا کہ سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے کلام میں نبوی ادب کی آمیزش سب سے زیادہ ملتی ہے اسی طرح امام حسن بصری کا جو تعلق اہل بیت سے تھا اس کے اثرات بہر صورت طاعت و عبادت اور علم و ادب پر پڑتے تھے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''تاریخ دعوت و

عزیمت" میں لکھتے ہیں۔

"حضرت حسن بصری میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں عطا فرمادی تھیں جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لیے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابہ کرام کا انہوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا۔ وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منھ سے پھول جھڑتے تھے"۔

(تاریخ دعوت و عزیمت ج۱ ص۵۵-۵۶)

اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ "احیاء العلوم" میں لکھتے ہیں کہ:

"اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طرز کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے ایسی مناسبت دوسرے لوگوں کے کلام میں نہیں دیکھی گئی اسی طرح ان کا طرز زندگی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرز زندگی سے بہت مشابہ تھا۔ (احیاء علوم الدین للغزالی ج۱ ص۱۶۸)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک جوامع الکلم سے، حسن بصریؒ کے کلام کا نمونہ اس موقع پر پیش کردیا جائے تاکہ پڑھنے والے ایک اندازہ کرسکیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات فائقہ میں سے ایک جوامع الکلم بھی ہے آپؐ نے فرمایا:

فضلت علی الأنبیاء بستّ أعطیت جوامع الکلم و نصرت بالرعب و أحلت لی الغنائم و جعلت لی الأرض سجداً و طهوراً و أرسلت الی الخلق کافة و ختم بی النبیون	میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر چھ چیزوں کی بناء پر فضیلت رکھتا ہوں مجھ کو جوامع الکلم عطا ہوا اور رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی اور میرے لیے مال غنیمت حلال کردیا گیا اور میرے لیے زمین کو مسجد و پاکی کا ذریعہ بنادیا گیا اور ساری مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہوں اور میرے ذریعہ انبیاء کا سلسلہ ختم کردیا گیا۔
(رواه مسلم)	

جوامع الکلم:

اما بعد فإن أصدق ألحديث كتاب الله و أوثق العرى كلمة التقوى، و خير الملل ملة ابراهيم وخير السنن سنة محمد صلى الله عليه و سلم و أشرف الحديث ذكر الله، و أحسن القصص هذا القرآن

(رواه البيهقى فى الدلائل)

بعد حمد و صلوۃ کے بیشک سب سے سچی بات اللہ کی کتاب ہے اور سب سے مضبوط حلقہ تقوی کا کلمہ ہے اور سب سے بہتر طریقہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور سب سے عمدہ سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور سب سے معزز بات اللہ کا ذکر ہے اور سب سے اچھا قصہ قرآن ہے۔

یہ مختصر مختصر سے جملے فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہیں جو اپنے معانی ومطالب اور مفاہیم کے اعتبار سے جامع ترین تشریح کرتے جایئے نئے نئے معانی کے دریچے کھلتے جائیں گے ایک ایک جملہ پر مکمل کتاب لکھی جائے تب بھی معانی کا سمندر خشک نہ ہوگا کیوں کہ معجزانہ کلام ہے۔

حسن بصری کے کلام کا نمونہ:

إن من أخلاق المومن قوة فى دين، و حزناً فى لين و إيماناً فى يقين و علما فى حلم وحلما فى علم و كيسا فى رفق وتحملا فى فاقة و قصداً فى غنى و شفقة فى نفقة و رحمة لمجهود و عطاء فى الحقوق و انصافا فى استقامة.

(سيرة الحسن البصرى لعبدالرحمن ابن الجوزى ماخوذ مختارات من ادب العرب ج ۱)

مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو صاحب ایمان و یقین ہو، اس کے علم کے لیے حلم اور اس کے حلم کے لیے علم ہو، باعث زینت ہو عقلمند ہو، لیکن نرم خو، اور ضبط اس کے فقر و افلاس کی پردہ داری کرے، دولت ہو تو اعتدال کا دامن اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، خرچ کرنے میں شفیق، خستہ حالوں کے حق میں رحیم و کریم ہو، حقوق کی ادائگی میں کشادہ دست و فراخ دل اور انصاف میں ثابت قدم ہو۔

ثابت بن قرۃ نے امام حسن بصریؒ کی جلالت شان کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

كان من دراري النجوم علما و تقوى و زهدا و ورعاً و عفة و رقة و فقها و معرفة يجمع مجلسه ضروبا من الناس هذا يا خذ عنه الحديث و هذا يلقن منه التاويل وهذا يسمع منه الحلال و الحرام وهذا يحكى له الفتيا و هذا يسمع الوعظ وهو في جميع ذالك كالبحر العجاج تدفقا و كالسراج الوهاج تالقا و لاتنس موافقه و مشاهده في الامر بالمعروف والنهى عن المنكر عندالأمراء و أشباه الامراء بالكلام الفضل و اللفظ الجزل

(تاریخ دعوت و عزیمت ج۱ ص۵۶–۵۷)

وہ اپنے علم و تقوی، زہد و ورع اور استغناء و عالی ہمتی، لطافت، ثقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درخشندہ ستارے تھے ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے تھے اور ہر ایک فیض پاتا تھا ایک حدیث حاصل کر رہا ہے تو دوسرا تفسیر سیکھ رہا ہے تیسرا فقہ کا درس لے رہا ہے تو کوئی فتوی پوچھ رہا ہے کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد معلوم کر رہا ہے کوئی وعظ سن رہا ہے۔ اور وہ ایک بحر زخار ہیں جو موجیں مار رہا ہے وہ ایک روشن چراغ ہیں جو ضو افشانی کر رہا ہے پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں ان کے کارنامے اور حکام اور امراء کے روبرو دوٹوک انداز اور پر شکوہ الفاظ میں اظہار حق کے واقعات ناقابل فراموش ہیں۔

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں کہ:

ان کی ان خصوصیات و جامعیات کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے اور ان کو امت محمدیہ کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے۔ (تاریخ دعوت و عزیمت ج۱ ص۵۶-۵۷)

سماجی بگاڑ پر نکیر:

حسن بصریؒ کو اپنے دور کے معاشرتی بگاڑ کا بہت شدید احساس تھا دین سے لوگوں کی بے رغبتی اور دنیا طلبی میں انہماک سے فکر مند رہتے تھے حالاں کہ وہ تابعین رحمہم اللہ کا پاکیزہ دور تھا جس کے خیر کی بشارت دی گئی تھی پھر عہد صحابہ کی وہ شان بھلا کہاں باقی رہ سکتی تھی۔ عہد رسولؐ سے تدریجی دوری اور دائرۂ اسلام میں عربوں کے علاوہ عجمیوں کے دخول کے سبب بہت کچھ خرابیاں در آئی تھیں دین و شریعت کا وہ پاس و لحاظ نہ رہ گیا تھا جس کے باعث عہدِ رسولؐ و عہد صحابہ ممتاز تھا لہذا امام حسن بصریؒ اسلام کی روح مجروح ہوتے دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں اور کہتے ہیں (ان کے کلام میں معاشرتی بگاڑ پر سخت نکیر کے ساتھ ہی زبان و ادب کی دلآویزی بھی ہے)

هيهات هيهات أهلك الناس الأماني، قول بلاعمل، ومعرفة بغير صبر، و إيمان بلا يقين، مالي ارئ رجالا و لاارئ عقولا، و اسمع حسيساً و لااری انيسا دخل القوم والله ثم خرجوا، وعرفوا ثم أنكروا و حرموا ثم لستحلوا انما دين احدكم لعقة على لسانه اذا سئل أمومن انت بيوم الحساب؟ قال نعم ! كذب ومالك يوم الدين،

(سيرة الحسن البصري لابن الجوزي)

افسوس کہ لوگوں کو تمناؤں نے ہلاک کردیا ہے، زبانی باتیں ہیں عمل نہیں، علم ومعرفت ہے مگر ضمیر نہیں، ایمان ہے لیکن یقین سے خالی، آدمی تو بہت دیکھتا ہوں مگر عقل وخرد نایاب، شور تو سنتا ہوں مگر کوئی غمگسار نہیں بخدا لوگ (اسلام میں) داخل ہوئے پھر نکل گئے انھوں نے سب کچھ جان لیا پھر مکر گئے انھوں نے پہلے حرام کیا پھر اسی کو حلال کرلیا، تمھارا دین تو زبان کا چٹخارہ بن گیا ہے اگر پوچھا جائے کہ کیا تم روز حساب پر یقین رکھتے ہو تو جواب ملے گا کہ ہاں کیوں نہیں؟ روز جزاء کے مالک کی قسم اس نے غلط کہا۔

امام حسن بصری کا یہ کلام فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہی نہیں حق گوئی و بیباکی کا شاہکار بھی ہے، غور کا مقام ہے کہ اتنی شدید مذمت، ان لوگوں کی کررہے ہیں جن کی اکثریت نے صحابہ کرام کا پاکیزہ دور دیکھا ہے یا کم از کم ان کے تربیت یافتہ تابعین کا دیدار کیا ہے، اگر امام ہمارے دور کے معاشرتی زوال کو دیکھ لیتے تو سرے سے ہمارے دور کے مسلمانوں کو مسلمان تسلیم کرنے سے انکار کردیتے، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی دامت برکاتہم ان کی حق گوئی و بیباکی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں :

"ان کے کمالات، فصاحت و بلاغت، تبحر علمی، اور تقریر و تاثیر ہی تک محدود نہ تھے بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بے باکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے انھوں نے خلیفہ وقت یزید بن عبدالملک پر برملا تنقید کی"۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ج ۱ ص ۶۳)

وفات :

حسن بصری کی دینی حمیت، علمی و روحانی کمالات، کلام کی دلآویزی و دل نشینی، ملت کا درد، امت کی فکر، دینی احکام کی بالادستی کی فکر کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کے فضل و کمال کا معترف، اور ان کی ذات کا گرویدہ تھا، ۱۱۰ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کی جنازہ میں شرکت کے لیے پورا شہر امنڈ پڑا یہاں تک کہ اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہ ہوسکی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی

جاء الحق وزهق الباطل

قادیانی مشن (دہلی) کے نمائندوں پر لرزا طاری ہو گیا۔
علماء اسلام کو چیلنج دے کر اور معاہدہ کرنے کے بعد قادیانی نمائندے طے شدہ مقام (غفار منزل) پر مرزا کی کتابیں لیکر آنے کی ہمت نہیں کر سکے۔

از : جناب مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری
ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

۲۹/جولائی ۱۹۹۹ء کو کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کو بذریعہ فون اطلاع ملی کہ "قادیانیت سے متاثر تنویر نامی ایک شخص جناب افراہیم و کوثر صاحبان کے ہمراہ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر آیا جس کے ساتھ قادیانی مشن (دہلی) کے انچارج کلیم الدین اور عبدالسلام بھی تھے تاکہ دونوں فریق کے بحث و مباحثہ سے مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ کر کوئی فیصلہ کر سکیں اتفاقیہ امر کہ حضرت مولانا اسماعیل صاحب کٹکی مدظلہ بھی دفتر میں قیام فرما تھے حضرت والا نے تنویر کے سامنے قادیانیت کی حقیقت کو واضح کیا اور مرزا غلام احمد قادیانی کی ہفوات و بکواس کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "مرزا غلام احمد قادیانی اپنے نہ ماننے والوں کو رنڈی کی اولاد کہتا ہے، اس پر عبدالسلام قادیانی نمائندہ نے چیلنج کر دیا کہ اگر یہ عبارت مرزا قادیانی کی کتاب میں دکھلادی جائے تو ہم پانچ لاکھ روپے انعام دیں گے حاضرین کی موجودگی میں طے کر لیا گیا کہ عبدالسلام مرزا قادیانی کی کتابیں لیکر ۳۱/جولائی کو جناب افراہیم صاحب کے مکان غفار منزل آجائیں وہاں دونوں فریق ۸/بجے صبح حاضر

ہو جائیں ہم یہ عبارت قادیانی کی کتاب میں دکھلائیں گے تاریخ، مقام اور وقت طے ہو جانے کے بعد یہ گفتگو ختم ہو گئی۔ حسب اطلاع دارالعلوم دیوبند سے ۷ر نفر پر مشتمل ایک وفد قادیانیوں کی اصل کتابیں لے کر دہلی پہنچ گیا۔ اور جناب کوثر اور ناہید صاحبان کے ذریعہ تنویر قادیانی سے ملاقات ہوئی۔ تنویر قادیانی نے بتایا کہ قادیانی مبلغ عبدالسلام جنھوں نے چیلنج کیا تھا وہ کل یہاں نہیں آئیں گے۔ تنویر صاحب پر زور ڈالا گیا کہ وہ عبدالسلام کو حسب وعدہ یہاں بلا کر لائیں بصورت دیگر قادیانیت کے باطل ہونے کا اعلان کر کے اپنا توبہ نامہ لکھ کر مسلمان ہو جائیں کئی گھنٹوں کی گفت وشنید کے بعد تنویر نے وعدہ کیا کہ ہم کل صبح خود عبدالسلام کے پاس جاکر ان کے ساتھ قادیانی کتابیں لیکر آئیں گے لیکن تنویر قادیانی رات کے کسی حصہ میں گھر چھوڑ کر فرار ہو گئے وعدہ کے باوجود صبح ۸ر بجے نہ وہ خود آئے اور نہ قادیانی مبلغین آئے قادیانی مشن سے رابطہ قائم کیا گیا مگر اپنے جھوٹے نبی کی وکالت کرنے کے لیے غفار منزل آنے کی ہمت نہیں کر سکے۔ حسب پروگرام کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے وفد نے تنویر صاحب ہی کے مکان پر غفار منزل کے باثر مسلمانوں کو بلا کر صورت حال سے باخبر کیا اور ساتھ ہی قادیانی کتاب کا حوالہ بھی دکھایا گیا جس میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے نہ ماننے والوں کو رنڈی کی اولاد کہا ہے۔

قادیانی چیلنج کی خبر شدہ شدہ دہلی کے متعدد علاقوں میں پہنچ گئی تھی چنانچہ اس پروگرام میں شرکت کے لیے سنگم وہار، تغلق آباد، دکشن پوری، جعفر آباد، سیلم پور، سیماپوری، آئی ٹی او، ذاکر نگر اور اوکھلا وغیرہ سے مسلمانوں کی کافی تعداد یہاں پر پہنچ گئی تھی جنھوں نے ذلیل ومکار قادیانی مبلغین اور ان کے جھوٹے نبی مرزا غلام احمد قادیانی کے کذاب ودجال ہونے کی تصدیق کی اور ان کے جھوٹے چیلنج کا عبرتناک انجام اور کھلی شکست بچشم خود دیکھا۔

یاد رہے کہ تنویر قادیانی کی ریشہ دوانیوں کی خبر اس سے پہلے بھی دفتر تحفظ ختم نبوت کو ملتی رہی ہے۔ متعدد بار مولانا محمد راشد صاحب امام مسجد ہدیٰ غفار منزل نے

بذریعہ فون دفتر کو مطلع کیا کہ تنویر نامی ایک شخص قادیانیت سے متعلق کچھ سمجھنا چاہتا ہے اسی طرح کی ایک خبر گذشتہ ماہ رمضان میں جناب محمد ثمامہ صاحب نے بھی دفتر کو دی تھی کہ غفار منزل میں تنویر نام کا ایک شخص قادیانی فتنہ سے متاثر ہے اگر اس فتنہ کی خطرناکیوں سے آگاہ کیا جائے تو اس کے تائب ہونے کی توقع ہے چنانچہ اس وقت بھی ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ کو مولانا شاہ عالم صاحب دارالعلوم سے تشریف لے گئے اور قادیانی کتابوں کے حوالوں کی روشنی میں سمجھایا گیا کہ اس وقت بھی اس شخص نے جناب حمزہ صاحب کے مکان پر جناب ثمامہ اور جناب ناہید صاحبان اور دیگر متعدد حضرات کی موجودگی میں یہی دعویٰ کیا تھا کہ وہ ان پیش کردہ حوالوں کی مراجعت کر کے خود بخود تائب ہو جائیں گے مگر وہ تائب نہیں ہوئے۔

مذکورہ حالات کی روشنی میں صاف ظاہر ہے کہ تنویر قادیانی انہام و تفہیم کا بہانہ بنا کر عوام کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اور اس طرح قادیانی ریشہ دوانیوں کو پھیلانا چاہتا ہے اور صحیح بات سمجھنے کی بات کرنا محض ایک ڈھونگ ہے۔ ۲۹ جولائی کے اس پروگرام میں تمام حاضرین اور علاقہ کے مسلمانوں نے اچھی طرح جان لیا کہ یہ شخص نہایت مکار اور چالباز ہے غفار منزل کے مسلمانوں نے اسی موقع پر یہ بھی طے کیا کہ یکم اگست بروز اتوار بعد مغرب مسجد ہدیٰ میں ایک وضاحتی پروگرام رکھ لیا جائے اور محلہ کی ہر گلی میں لاؤڈ اسپیکر لگا دیا جائے تاکہ قادیانیوں کے کفریہ عقائد اور مرزا قادیانی کے شرمناک کیریکٹر سے غفار منزل کے تمام مرد اور عورتیں واقف ہو جائیں کیونکہ عورتوں کے اندر بھی قادیانی فتنہ پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

☆☆☆☆☆

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماهنامه

دار العلوم

ماہ شعبان سنہ ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳ شمارہ ۱۱ فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

مدیر	نگراں
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
استاذ دار العلوم دیوبند	مہتمم دار العلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ دار العلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانه بدل اشتراك

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپئے

پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/

ہندوستان سے ۶۰/

Tel : 01336-22429

Fax :01336-22768

Tel : 01336-24034 *(EDITER)*

REGD NO.SHN/NP-111/98

فہرست مضامین

☆☆ ختم خریداری کی اطلاع ☆☆

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی۔ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند کی معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم الله الرحمن الرحیم

حرف آغاز

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

ہندوستان کی علمی تاریخ سے جولوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں تعلیم وتدریس کا تمام تر انحصار مسلم حکمرانوں، امرء اور نوابین کی علم پروری، علماء نوازی اور داد ودہش پر تھا، ہر شہر اور قصبات میں سلاطین اور امراء کی جانب سے مدرسے قائم تھے جن کے مصارف کی مکمل ذمہ داری شاہی خزانے پر ہوتی تھی، چنانچہ اجمیر، دہلی، پنجاب، آگرہ، اودھ، بنگال، بہار، دکن، مالوہ، ملتان، کشمیر، گجرات وغیرہ میں اس قسم کی ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں، ان باقاعدہ درسگاہوں کے علاوہ علماء شخصی طور پر بھی اپنے اپنے مستقر پر تعلیم وتعلم کی خدمات انجام دیا کرتے تھے، اور ان علماء کو معاش کی جانب سے بے فکر رکھنے کے لئے دربار شاہی سے مدد معاش کے عنوان سے جاگیریں اور وظائف مقرر تھے۔

مسلمانوں کا یہ نظام تعلیم ۱۸۵۷ء تک قائم رہا، اس نظام تعلیم میں عام طور پر صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث وغیرہ کے علوم وفنون پڑھے پڑھائے جاتے تھے، البتہ حدیث وتفسیر کا فن برائے نام تھا، زیادہ توجہ فقہ واصول فقہ اور پھر منطق وفلسفہ پر دی جاتی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہوگیا، اور مسلمانوں کے بجائے سیاسی اقتدار پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو یہاں کے عام باشندے اور بطور خاص مسلمان "ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة" (۱) کے فطری اصول کا تختۂ مشق بن گئے۔

اس سیاسی انقلاب نے مسلمانوں کے اقتصادی، تمدنی اور علمی ودینی نظام کو کس طرح پامال کیا اس کی تفصیل سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "آور انڈین مسلمانز" ہمارے ہندوستانی مسلمان میں کسی قدر بیان کی ہے، انھوں نے ایک جگہ مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی اور مشکلات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

حکومت نے ان کے لئے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کردیا ہے۔ دوسرے ایسا طریقۂ تعلیم جاری کردیا ہے جس میں ان کی قوم کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کردیا ہے، چوتھے ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہئے تھی غلط مصرفوں پر خرچ ہو رہی ہے۔ (موج کوثر۔ ص ۷۴،)

---

(۱) جب بادشاہ کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں، تو اس کو برباد اور وہاں کے باعزت باشندوں کو ذلیل کرڈالتے ہیں۔

تعلیم کے سلسلہ میں اس نئی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اس طرح کا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جسے پڑھ کر ہندوستانی ذہنی وفکری طور پر بالکل انگریز بن جائیں، یا کم از کم ایمان دار مخلص رعایا بن جائیں۔ چنانچہ مسٹر الفنسٹن اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں۔

میں علانیہ نہیں تو درپردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا۔ اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں، اگر تعلیم سے ان کی رایوں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایمان دار مخلص رعایا تو ضرور بن جائیں گے۔ (روشن مستقبل۔ ص ۹۵)

اس سلسلے کی تفصیلات کے لئے اسباب بغاوت ہند از سرسید مرحوم، روشن مستقبل از مولوی سید طفیل احمد مرحوم اور نقش حیات از شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ ملاحظہ کی جائیں۔

ان حالات میں مسلم مفکرین ومدبرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہوا کہ گورنمنٹ کا قائم کیا ہوا نظام تعلیم مسلمانوں کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا، بلکہ یہ اسلامی تہذیب اور کلچر کے لئے تباہ کن اور ان کے عقائد واخلاق کے واسطے مہلک ہے، مگر اسلامی نظام کی اصلاح کے سلسلے میں ان کی رائیں مختلف ہوگئیں، ایک جماعت نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج انگریزی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن میں تجویز کیا، بالفاظ دیگر اس جماعت کا اصل مقصد مسلمانوں کی اقتصادی اصلاح اور دنیوی پستی کا دور کرنا تھا، اس جماعت کے سربراہ اور قائد سرسید احمد مرحوم تھے، اور اس نظریہ کا اولین مظہر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے، سرسید احمد بھی اگرچہ مذہب کی ضرورت تسلیم کرتے تھے مگر دنیوی ترقی کو وہ اولیت دیتے تھے، انکا خیال یہ تھا کہ دنیوی ترقی کی راہ سے دینی مقاصد تک پہنچا جائے، مرحوم اپنے اس نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے تھے۔

فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا إله الا الله محمد رسول الله کا تاج سر پر۔

مگر وہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکے، چنانچہ تحریک علی گڑھ کے معقول وکیل اور سرسید مرحوم کے زبردست حامی شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں، وہ مغربی علوم کے ساتھ ایمان کامل اور صحیح مذہبی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے، لیکن اس میں انھیں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ (موج کوثر۔ ص ۱۳۶)

اس ناکامی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہی شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

جن لوگوں نے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم پائی، ان میں تو سر سید، محسن الملک اور وقار الملک جیسے مدبر اور منتظم پیدا ہوئے، جو لوگ انگریزی سے قریب ناواقف تھے اور جن کے لئے مغربی ادب ایک گنج سر بستہ تھا انھوں نے نیچرل شاعری اور ایک جدید ادب کی بنیاد ڈالی اور آب حیات، سخندان فارس، شعر و شاعری، مسدس حالی جیسی کتابیں تصنیف کر لیں، لیکن جن روشن خیالوں نے کالج کی عالیشان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی اور جن کی رسائی مغرب کے بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم و ادب تک تھی وہ مطمح نظر کی پستی اور کیرکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں۔ (موج کوثر۔ ص ۱۴۸)

مفکرین اسلام کی دوسری جماعت کا نقطہ نظریہ تھا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کا واحد ذریعہ اسلامی تعلیمات ہیں، لہذا برٹش گورنمنٹ کی تعلیمی امداد واعانت سے صرف نظر کر کے دینی درسگاہیں اور اسلامی ادارے قائم کئے جائیں، اس جماعت کے سامنے بھی مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی تھی مگر اس نے اولیت ایمانیات وروحانیات کو دی اس جماعت کے سرخیل اور میر کارواں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے، اور نقطہ نظر کا مظہر اولین دارالعلوم دیوبند ہے، شیخ اکرام ان دونوں نظریوں کے اختلاف کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”سر سید کا مقصد مسلمانوں کے دنیوی تنزل کو روکنا تھا اور ارباب دیوبند کی نظر دینی ضرورت پر تھی، پھر سر سید طبقہ امراء کے رکن تھے اور مولانا قاسم جمہور کے نمائندے“ (موج کوثر۔ ص ۲۰۱)

اس نظریہ اور طریقۂ کار پر پیام ندوہ میں ان الفاظ سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

”اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے، اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام وبقاواستحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلا شبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے جو دینی و دنیاوی ادارے اور تعلیم گاہیں موجود ہیں وہ انھیں دونوں نظریوں کی آئینہ دار ہیں اور اپنے اپنے نقطہ نظر سے ملت کی علمی و دینی اور دنیاوی تعمیر و ترقی کے لئے مصروف عمل ہیں تقسیم کار کے اصول پر دونوں طرح کے اداروں کا وجود ملت اسلامیہ ہند کے لئے ضروری ہے اس لئے مدارس دینیہ کو جو لوگ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور انھیں کالج میں تبدیل کر دینے کی تجویز پیش کرتے رہے ہیں وہ قطعی طور پر تہذیب مغرب کے فریب خوردہ ہیں اور ان کی یہ تجویزیں پیغام خودکشی کے مرادف ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کو صدمہ

حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ کے آخری فرزند، دارالعلوم دیوبند کے قدیم استاذ جناب مولانا حامد میاں صاحب کا طویل علالت کے بعد ۱۴؍رجب المرجب ۱۴۲۰ھ ۲۳؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ۸؍بجے شب میں بعمر ۷۱؍سال انتقال ہوگیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا موصوف نے دارالعلوم دیوبند ہی کی فضاؤں میں آنکھیں کھولیں، اسی کے علمی و دینی ماحول میں پروان چڑھے اور فراغت کے بعد ۱۳۷۳ھ میں اعزازی طور پر دارالعلوم میں درس و تدریس کا آغاز کیا اور ۱۳۷۸ھ کی مجلس شوریٰ ماہ رجب المرجب میں باقاعدہ شعبۂ تدریس میں آپ کا تقرر ہوا۔ اس وقت سے زندگی کی آخری سانس تک دارالعلوم سے متعلق رہے۔ ادھر دو تین سالوں سے علالت کی شدت کی وجہ سے تدریسی سلسلہ موقوف ہوگیا تھا مگر دارالعلوم سے ملازمت کا رسمی تعلق باقی تھا۔

مولانا موصوف نہایت متواضع، بردبار اور ملنسار تھے صاحبزادگی کی نخوت کا ان کے زندگی میں دور دور تک کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا تھا، اپنے تلامذہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیوں، لغزشوں اور تقصیرات کو معاف فرماکر ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔ اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل مرحمت فرمائے۔

نبی اکرمؐ کی زندگی کے حادثاتی لمحے

مولانا اختر امام عادل قاسمی

تیسری قسط

۲۵- حضورؐ کو اپنے ہم وطن مشرکین کی طرف سے جسمانی اذیتوں کے علاوہ مختلف مہمل اور بیہودہ سوالات کے ذریعہ روحانی اور دلی صدمے بھی بہت پہونچائے گئے۔ مثلاً جب حضورؐ نے قریش کی مذکورہ تجویز مسترد کردی تو ان لوگوں نے آپ سے یہ کہا کہ خیر اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے رکھتے ہیں، اس کو منظور کیجئے۔ وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی قوم انتہائی تنگ دست ہے اور یہ شہر مکہ بھی بہت تنگ ہے، ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں سبزہ و شادابی کا کہیں نام و نشان نہیں ہے لہذا آپ اپنے رب سے جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے کہئے کہ اس شہر کے پہاڑوں کو یہاں سے ہٹادے، تاکہ شہر وسیع ہوجائے۔ اور شام و عراق کی طرح اس شہر میں نہریں جاری کردے اور ہمارے اباء واجداد خصوصاً قصی بن کلاب کو زندہ فرمادے، تاکہ ہم ان سے تمہارے میں دریافت کرلیں کہ جو تم کہتے ہو وہ حق ہے یا باطل، اگر ہمارے آباء واجداد نے زندہ ہوکر تمہاری تصدیق کردی، تو ہم سمجھ لیں گے کہ تم اللہ کے رسول ہو اور ہم بھی تمہاری تصدیق کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں اس لئے نہیں بھیجا گیا، خدا نے جو پیام دیکر بھیجا تھا وہ تم تک پہونچا دیا، اگر تم اس کو قبول کرو تو تمہاری خوش نصیبی ہے، اور اگر نہ مانو تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرمادے، قریش نے کہا اچھا اگر آپ ہمارے لئے ایسا نہیں کرسکتے تو آپ خدا سے اپنے ہی لئے دعا کیجئے کہ اللہ آسمان سے ایک فرشتہ نازل فرمائے جو ہر جگہ آپ کی تائید کے لیے ساتھ ساتھ پھرے، نیز اللہ تعالی سے یہ بھی کہئے کہ وہ آپ کو باغات اور محلات اور سونا چاندی کے خزانے عطا فرمادے جس سے آپ کی عزت وعظمت ظاہر ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری طرح آپ بھی کسب معاش کے لئے بازاروں میں جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں خداوند ذوالجلال سے کبھی اس قسم کا سوال نہیں کروں گا، میں

اس لئے نہیں بھیجا گیا میں تو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا ہوں، قریش نے کہا اچھا اللہ سے دعاء کرو کہ ہم پر کوئی عذاب نازل فرمادے، آپ نے فرمایا، اللہ کو اختیار ہے کہ تم پر عذاب نازل فرمائے یا مہلت دے اس پر آپ کا پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن ابی امیہ برہم ہو کر کھڑا ہو گیا، اور کہا اے محمد آپ کی قوم نے اتنی باتیں آپ کے سامنے رکھیں لیکن آپ کو ایک بات بھی پسند نہ آئی، اے محمد! خدا کی قسم اگر تم سیڑھی لگا کر آسمان پر بھی چڑھ جاؤ اور وہاں سے تم اپنی نبوت و رسالت کا پروانہ لکھا لاؤ اور چار فرشتے بھی تمہارے ہمراہ آئیں اور تمہاری نبوت کی کھلی گواہی دیں، تب بھی میں تمہاری تصدیق نہ کروں گا، (یہ تھی ان کے دل کی اصل بات جو زبان پر آہی گئی وہ ماننے والے ہر گز نہیں تھے) لاچار حضور ﷺ مایوس ہو کر گھر تشریف لے آئے۔ (عیون الاثر ص ۱۰۸ ج ۱، البدایہ والنہایہ ص ۵۰ ج ۳)

ان کا ہر انداز توہین آمیز، ہر بات تکلیف دہ اور ہر سوال و جواب اشتعال انگیز، ان سوالات سے ان کا مقصد اطمینان و یقین حاصل کرنا نہ تھا، اور نہ وہ ایمان لانے کا ارادہ رکھتے تھے بلکہ محض حضور کو ستانے اور صدمہ پہونچانے کے لئے اس طرح کی باتیں کرتے تھے، ہر دور میں جو لوگ کردار کے نہیں ہوتے وہی لوگ تیر و نشتر زیادہ چھوڑتے ہیں،

ان کے بعض سوالات قرآن میں شامل ہو کر باطل پرستوں اور سچائی کے دشمنوں کے لئے ابدی داغ کی صورت میں ثبت ہو چکے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا، (بنی اسرائیل ۹۰-۹۳)

ترجمہ۔ اور بولے ہم نہ مانیں گے تیرا کہا جب تک تو نہ جاری کر دے ہمارے واسطے زمین سے ایک چشمہ، یا ہو جائے تیرے واسطے ایک باغ کھجور اور انگور کا، پھر بہائے تو اس کے بیچ نہریں چلا کر یا گرا دے آسمان ہم پر جیسا کہ تو کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے یا لے آ، اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے یا ہو جائے تیرے لئے ایک گھر سنہرا، یا چڑھ جائے تو آسمان میں

اور ہم نہ مانیں گے تیرے چڑھ جانے کو جب تک نہ اتار لائے ہم پر ایک کتاب جس کو ہم پڑھ لیں تو کہہ سبحان اللہ میں کون ہوں مگر ایک آدمی ہوں بھیجا ہوا،

چچا ابو طالب پر دباؤ :

۲۶۔ جب باہر کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو دشمنوں نے گھر کے اندر پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی، اور داخلی سطح سے حضور ﷺ اور آپ کے دین کو نقصان پہونچانے کا ارادہ کیا۔

حضور ﷺ کے پیارے چچا ابو طالب جن کو گھر کی سطح تک سرپرستی کا درجہ بھی حاصل تھا، اور حضور ﷺ کی یتیمی کا بڑا حصہ انہی کے زیر سایہ پروان چڑھا تھا، اس لئے بھی ان کو مرکزی اہمیت حاصل تھی، ان کے اثر و رسوخ کی بناء پر حضورؐ کو کافی تقویت حاصل تھی، قریش نے پروگرام بنایا کہ ابو طالب کو بھتیجے سے برگشتہ کر دیا جائے، چنانچہ ان کا ایک وفد ابو طالب کی خدمت میں پہونچا، اور شکایت کی کہ تمہارا بھتیجہ ہمارے بتوں کو برا کہنے سے باز نہیں آنا چاہتا، تم اس کو سمجھاؤ اور اس حرکت سے باز رکھو، ابو طالب نے ان کو معقول جوابات دیئے اور ان کو توجہ دلائی کہ تم لوگ بھی ایذا رسانیوں میں حد سے بڑھے جا رہے ہو، اس روز تو یہ لوگ ابو طالب کے پاس سے اٹھ کر چلے آئے لیکن دوسرے روز مشورہ کر کے پھر پہونچے ان کے آنے پر ابو طالب نے حضور ﷺ کو اپنے مکان پر ان کے سامنے بلوایا اور آپ کے سامنے گفتگو شروع ہوئی۔ قریش کے سرداروں نے وہی باتیں اس مجلس میں آپ سے کہیں جو اس سے قبل بھی مختلف طور پر وہ کہتے رہے تھے انہوں نے کہا اے محمد ﷺ ہم نے آپ کو اس وقت بعض ضروری باتوں کے لئے بلوایا ہے۔ بخدا کسی شخص نے اپنی قوم کو اتنی مشکلات میں نہیں ڈالا ہوگا۔ جس قدر مشکلات میں تم نے قوم کو مبتلا کر دیا ہے۔ اگر تم اپنے اس نئے دین کے ذریعہ مال و دولت جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم اتنے مال جمع کر دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کے پاس اتنا مال نہ ہو، اگر شرف و عزت کی خواہش ہے تو ہم ابھی تم کو اپنا سردار تسلیم کرتے ہیں، اگر حکومت و سلطنت کی تمنا ہے تو ہم تم کو ملک عرب کا بادشاہ بنانے کے لئے تیار ہیں، اگر تم کو کوئی جن یا آسیب نظر آتا ہے اور اس کے اثر سے تم ایسی باتیں کرتے ہو تو ہم اپنے کاہنوں اور حکیموں سے علاج کرانے کو تیار ہیں۔

آپنے یہ باتیں سنکر جواباً قرآن کریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھکو تمہاری طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ میں نے خدا کے احکام تم تک پہنچا دیئے اگر تم میری تعلیمات قبول کرلوگے تو تمہارے لئے دین و دنیا کی بہتری کا موجب ہوگا اور اگر انکار پر اصرار کروگے تو میں خدا کے حکم کا انتظار کروں گا، کہ تمہارے لئے کیا حکم صادر فرماتا ہے یہ سنکر کفار نے کہا کہ اچھا اگر تم خدا کے رسول ہو تو ان پہاڑوں کو ملک عرب سے ہٹادو، اور ریگستان کو سرسبز بنادو ہمارے باپ دادا کو زندہ کردو اور ان میں قصی بن کلاب کو ضرور زندہ کرو اگر قصی بن کلاب نے زندہ ہو کر تم کو سچا مان لیا اور تمہاری رسالت کو قبول کرلیا تو ہم بھی تم کو رسول تسلیم کرلیں گے، آپ نے ارشاد فرمایا میں ان کاموں کیلئے رسول نہیں بنایا گیا ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ تم کو خدا کے احکام جو مجھ پر نازل ہوتے ہیں سنادوں، اور اچھی طرح سمجھادوں، میں اپنے اختیار سے خود کچھ نہیں کرسکتا اس قسم کی باتیں سنکر سرداران قریش کافی ناراض اور برہم ہوئے اور ابو طالب کو دھمکیاں دے کر چلے گئے۔

سرداران قریش کے جانے کے بعد ابو طالب نے حضور ﷺ سے کہا کہ بھتیجے! میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور اپنے اندر قریش کے مقابلے کی طاقت نہیں پاتا، تم مجھے ایسی مشقت میں نہ ڈالو جو میری طاقت واستطاعت سے باہر ہوں مناسب یہ ہے کہ تم اپنے دین کا اعلان اور بتوں کی علانیہ برائیاں کرنا چھوڑ دو، دشمن ابو طالب کو بگاڑنے میں کامیاب ہوگئے تھے، اور خوف ہی کی وجہ سے ہی سہی مگر ابو طالب نے اس حد تک دشمنوں سے اتفاق کرلیا تھا کہ اسلام کا اعلان اور بت پرستی کی کھلی مذمت مناسب نہیں ابو طالب اب تک ساتھ دیتے آئے تھے اوان کی وجہ سے حضور کو بہت کچھ ڈھارس تھی، آج ان کی یہ مایوسانہ باتیں سنکر آپ کا دل بھر آیا اور آپ کو شبہ ہوا کہ شاید اب چچا جان بھی میری حمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں۔ حضور نے فرمایا چچا! اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھدیں، تب بھی میں اپنے کام سے باز نہیں رہ سکتا۔ یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور پھر آپ یہ کہکر ابو طالب کے پاس سے چشم پر آب اٹھے اور چلدیئے کہ چچا! میں اپنے کام کو اسوقت تک نہیں چھوڑونگا جب تک کہ خدا کا کام پورا نہ ہوجائے یا یہی کام کرتے ہوئے میں ہلاک نہ ہوجاؤں۔ ابو طالب پر اس وقت کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے آپ کو واپس بلا کر کہا کہ اچھا تم ضرور اپنے کام میں مصروف رہو، جب تک میرے دم میں دم ہے میں تمہاری حمایت

سے باز نہیں رہوں گا اور تم کو کبھی دشمنوں کے سپرد نہ کروں گا۔ (تاریخ اسلام ۱۰۷،۱۰۸)

افسوس ابوطالب نے محض رشتہ کا خیال کر کے یہ بات کہی ان کے سینے میں کبھی وہ آگ نہ بھڑکی جو ان کے بھتیجے حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کا سینے میں بھڑک رہی تھی۔

مسلمانوں کا مکہ سے فرار اور دشمنوں کا تعاقب :

پھر ایک وہ وقت بھی آیا کہ نبی کے ماننے والوں کو اپنے دین وایمان کی حفاظت کے لیے اپنا گھر بار مال و متاع اور اعزاء واقرباء سب چھوڑ کر جلاوطن ہو جانا پڑا۔ پہلی ہجرت میں گیارہ مرد اور پانچ عورتیں اور دوسری ہجرت میں ۸۶ ؍مرد اور سترہ عورتیں تھیں، اس بے سر وسامان قافلہ نے نبی کے اشارے پر حبشہ کے نجاشی بادشاہ کی حکومت میں پناہ لی، کفار قریش کو جب پتہ چلا تو انہوں نے تعاقب کیا اور آخر کار ان کے قاصد بادشاہ کے دربار تک پہنچ گئے، تاکہ بھگوڑے لوگوں کو واپس لیجا سکیں، نجاشی کی فرمائش پر اس بے سروسامان اور بے وطن کاروان کے ترجمان حضرت جعفر طیار نے دربار حکومت میں بادشاہ اور تمام اعیان سلطنت کی موجودگی میں اپنے دین کی حقیقت اور جلاوطن کی مقصدیت پر ایسی موثر تقریر فرمائی کہ پورے دربار پر سناٹا چھا گیا، حضرت جعفر نے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا،

کہ اے بادشاہ ہم جاہل و نادان تھے، بتوں کو پوجتے اور مردار کھاتے تھے طرح طرح کی بے حیائیوں میں مبتلا تھے قطع رحمی کرتے پڑوسیوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے ہم میں جو طاقت والا تھا وہ چاہتا کہ کمزور کو کھا جائے ہم اسی حال میں تھے کہا اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہم ہی میں سے اپنا ایک پیغمبر بھیجا، جس کے حسب ونسب صدق وامانت اور پاک دامن و عفت سے ہم خوب واقف تھے اس نے ہم کو اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اس کو ایک مانیں ایک جانیں ایک سمجھیں صرف اسی کی عبادت وبندگی کریں اور جن بتوں اور پتھروں کی ہم اور ہمارے آباء واجداد پرستش کرتے تھے ان سب کو بالکل چھوڑ دیں اس نے سچائی، امانت، صلہ رحمی اور پڑوسیوں سے حسن سلوک کا حکم دیا خون ریزی حرام باتوں، بے حیائیوں قول ناحق یتیم کا مال کھانے اور کسی پاک دامن پر تہمت لگانے سے منع کیا اور یہ حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں نماز پڑھیں زکوٰۃ دیں روزہ رکھیں اور جان ومال سے خدا کی راہ میں دریغ نہ کریں (اس کے علاوہ اور بھی تعلیمات اسلام کا ذکر کر کے ان

پر اپنے ایمان و عمل کا اظہار کیا) اور پھر کہا اس پر ہماری قوم نے ہمیں طرح طرح سے ستایا بڑی بڑی تکلیفیں پہونچائیں، تاکہ ہم خدائے واحد کی عبادت چھوڑ کر پہلے کی طرح پھر بے حیائیوں میں مبتلا ہو جائیں جب ہم ان کے مظالم سے تنگ آگئے اور اپنے دین پر چلنا اور ایک خدائے واحد کی بندگی کرنا ہمارے لئے دشوار ہو گیا تو ہم نے اپنا وطن چھوڑ دیا اور اس امید پر کہ آپ ظلم نہ کریں گے آپ کی ہمسائیگی کو ترجیح دی۔

نجاشی سے پیغمبر اسلام پر نازل شدہ چند آیات سنانے کی فرمائش کی حضرت جعفر نے سورہ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ بادشاہ اور تمام درباریوں کے آنسو نکل آئے روتے روتے شاہ کی ڈاڑھی تر ہو گئی حضرت جعفر تلاوت ختم فرما چکے تو نجاشی نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ یہ کلام اسی مخزن سے نکلا ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کا کلام نکلا ہے۔ نجاشی نے حضور کی رسالت کی تصدیق کی اس نے کہا مرحبا ہو تم کو اور اس کو بھی جس کے پاس سے تم آئے ہو میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور یقیناً یہ وہی پیغمبر ہے جن کی حضرت عیسیٰ نے بشارت دی ہے، اگر یہ سلطنت کا کام نہ ہوتا تو ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور ان کے جوتوں کو بوسہ دیتا، اور مسلمانوں سے کہدیا کہ جب تک چاہو میری زمین میں رہو اور کھانے کپڑے کے انتظام کا بھی حکم دیا، نجاشی کو قریش کے قاصدوں کی طرف سے نذرانوں کی صورت میں ان بدحال مسلمانوں کی واپسی کے لئے بہت بھاری رشوت پیش کی گئی تھی، مگر نجاشی نے مسلمانوں کو ان کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا اور درباریوں کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر مسلمانوں سے صاف لفظوں میں کہا کہ تم امن سے رہو میں ایک سونے کا پہاڑ لیکر بھی تم کو ستانا پسند نہیں کرتا، اور حکم دیا کہ قریش کے تمام تحائف اور نذرانے واپس کر دئے جائیں، مجھکو ان نذرانوں کی ضرورت نہیں واللہ خدا نے میرا ملک اور میری سلطنت بغیر رشوت کے مجھے دلائی ہے اسلئے میں تم سے رشوت لیکر ان لوگوں کو تمہارے سپرد نہیں کر سکتا۔

حضرت جعفر نے بادشاہ سے کہا کہ ان قاصدوں سے پوچھا جائے کہ کیا ہم غلام تھے جو اپنے آقاؤں سے بھاگ کر آئے ہوں، یا کسی کا خون کرکے آئے ہیں، یا کسی کا مال لیکر آئے ہیں، قاصد نے سچ جواب دیا کہ نہیں ان میں سے کوئی بات نہیں ہے، ان کا جرم یہ ہے کہ یہ ہماری برادری کے لوگ ہیں انہوں نے اپنا آبائی دین چھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر لیا ہے۔

غرض کسی طرح دشمن نجاشی کا دل نہ جیت سکے، اور ان مہاجر مسلمانوں کو کچھ دنوں کے لئے چین کی جگہ مل گئی

(مجمع الزوائد ج۶ ص ۲۷، سیرۃ ابن ہشام ج۱ ص ۱۱۵، عیون الاثر ج۱ ص ۱۱۸، دلائل ابی نعیم ج۱ ص ۸۱)

ابوجہل نے پتھر مار کر زخمی کیا:

۲۸- ایک روز آنحضرت ﷺ کوہ صفا پر یا اس کے دامن میں بیٹھے تھے کہ ابوجہل اس طرف کو آنکلا، اس نے آپ کو دیکھ کر اول تو بہت سخت سست اور ناپسندیدہ الفاظ کہے، آپ نے جب اس کی بیہودہ سرائی کا کوئی جواب نہ دیا تو اس نے ایک پتھر اٹھا کر مارا، جس سے آپ زخمی ہوئے خون بہنے لگا آپ خاموش اپنے گھر چلے آئے یہی واقعہ حضرت حمزہ کے اسلام کا باعث بنا، (تاریخ اسلام ج۱ ص ۱۱۱)

پورے خاندان کا سماجی بائیکاٹ:

۲۹- جب دشمن ہر طرف سے تھک گئے نہ لوگوں کو وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے روک سکے، اور نہ ابوطالب اور شاہ حبشہ کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو سکے، حضرت عمر اور حضرت حمزہ جیسی قد آور شخصیتیں بھی آغوش اسلام میں داخل ہونے لگیں، تو قریش بے چین ہو گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر نبوت کے ساتویں سال کی ابتداء یعنی ماہ محرم میں قریش نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی، مسلمانوں کی روزافزوں جماعت کے خطرات سے قوم کو آگاہ کیا، اور اس خطرہ واندیشہ سے محفوظ رہنے کی تدابیر پر غور کیا گیا، بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب اگرچہ سب کے سب مسلمان نہیں ہوئے ہیں، لیکن وہ محمد ﷺ کی حمایت سے باز نہیں آئے، لہٰذا اول ابوطالب سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ محمد (اپنے بھتیجے) کو ہمارے حوالے کر دیں، اگر وہ انکار کریں تو بنوہاشم اور بنو عبدالمطلب سے شادی بیاہ، میل ملاقات، سلام پیام سب ترک کر دیا جائے اور کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت نہ کی جائے اور کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے پاس نہ پہونچنے دی جائے۔ اور اس بائیکاٹ کو اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک کہ وہ محمد (ﷺ) کو ہمارے سپرد نہ کر دیں۔

چنانچہ اس مقاطعہ کے متعلق ایک عہد نامہ لکھا گیا تمام رؤساء قریش نے اس پر قسمیں کھائیں، اور عہد نامہ پر دستخط کیئے یہ دستخط شدہ عہد نامہ اندرون کعبہ لٹکا دیا گیا اور مقاطعہ شروع ہوگیا، حالات سے مجبور ہو کر ابو طالب تمام بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کو لیکر مکہ کے قریب ایک پہاڑی درے میں جو شعب ابی طالب کے نام سے مشہور ہے جاکر محصور ہوگئے جس قدر مسلمان تھے وہ بھی ان کے ساتھ اسی درے میں چلے گئے بنو ہاشم کا صرف ایک شخص ابو لہب اس قید و نظر بندی سے آزاد رہا وہ کفار قریش کے ساتھ تھا غلہ وغیرہ جو کچھ بنو ہاشم اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ جلد ختم ہوگیا اور ان لوگوں کو کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہونے لگی درے میں جانے کا صرف ایک تنگ راستہ تھا کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

تین برس تک بنو ہاشم اور مکہ کے ان مسلمانوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اور اذیتیں شعب ابی طالب میں برداشت کیں جن کے تصور سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، بھوک سے بچوں کے بلبلانے کی آواز باہر سنائی دینے لگی مسلمانوں نے کیکر کے پتے کھا کر دن کاٹے، سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ میں بھوکا تھا اتفاق سے شب میں میرا پاؤں کسی تر چیز پر پڑا، فوراً زبان پر رکھ کر نگل گیا اب تک معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی، سعد بن ابی وقاص اپنا ایک اور واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شب کو پیشاب کے لئے نکلا، راستہ میں ایک اونٹ کی کھال کا سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ لگا، پانی سے دھو کر اس کو جلایا، اور کوٹ چھان کر اس کا سفوف بنایا اور پانی سے اس کو پی لیا، تین راتیں اسی سہارے پر بسر ہوئیں، نوبت یہاں تک پہونچی کہ جب کوئی تجارتی قافلہ مکہ آتا تو ابو لہب اٹھتا اور یہ اعلان کرتا تھا کہ کوئی تاجر اصحاب محمد کو عام نرخ پر کوئی چیز فروخت نہ کرے بلکہ ان سے بڑھ چڑھ کر قیمت لے، اور اگر کوئی نقصان یا خسارہ ہو تو میں اس کا ذمہ دار ہوں، صحابہ خریدنے کے لئے آتے، مگر نرخ کی گرانی کا یہ عالم دیکھ کر خالی ہاتھ واپس ہو جاتے الغرض ایک طرف اپنی تہی دستی اور دشمنوں کی چیرہ دستی تھی اور دوسری طرف بچوں کا بھوک سے تڑپنا اور بلبلانا سنگدل تو سنگدل تھے مگر کچھ لوگ رحم دل بھی تھے، ہشام بن عمرو نے بن ہاشم کی اس مصیبت کو سب سے پہلے محسوس کیا، وہ زہیر بن امیہ کے پاس گئے، جو عبدالمطلب کے نواسے اور

رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے، اور کہا اے زہیر! کیا تم کو یہ پسند ہے کہ تم جو چاہو کھاؤ اور پہنو اور شادیاں کرو۔ اور تمہارے ماموں ایک ایک دانہ کو ترسیں، خدا کی قسم اگر ابو جہل کے ماموں اور ننیہال کے لوگ اس حال میں ہوتے تو ابو جہل ہرگز ہرگز ایسے عہد نامہ کی پرواہ نہ کرتا، غرض ہشام کی تحریک پر مکہ میں کئی اشخاص جو بنو ہاشم سے قرابت رکھتے تھے بنو ہاشم کو مظلوم سمجھکر اس ظالمانہ عہد نامہ کی تنسیخ کے متعلق چرچا کرنے لگے، انہی ایام میں حضور ﷺ نے ابو طالب سے کہا کہ مجھکو خدا تعالی کی طرف سے خبر دی گئی ہے کہ اس عہد نامہ کی تمام تحریروں کو کیڑوں نے کھالیا ہے اسمیں جہاں جہاں اللہ کا نام ہے وہ بدستور لکھا ہوا ہے، لفظ اللہ کے سوا باقی تمام حروف غائب ہو چکے ہیں، یہ سنکر ابو طالب اپنی گھاٹی سے باہر نکلے اور انہوں نے قریش سے کہا کہ مجھکو محمد (ﷺ) نے خبر دی ہے تم عہد نامہ کو دیکھو، اگر یہ خبر صحیح ہے اور عہد نامہ معدوم ہو چکی ہے تو مقاطعہ ختم ہو جانا چاہئے، چنانچہ اسی وقت قریش خانہ کعبہ میں دوڑے ہوئے آئے اور دیکھا تو دیمک نے تمام حروف چاٹ لئے تھے اور صرف جہاں جہاں اللہ کا نام لکھا تھا وہ محفوظ تھا، یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے اور بالآخر پورے تین سال کے بعد بائیکاٹ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا،

(تاریخ طبری ج ۲ ر ص ۲۲۸ م ر سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۳۰ ر فتح الباری ج ۷ ر ص ۱۴۳)

غم کا سال :

۳۰۔ حضور ﷺ شعب ابی طالب سے نکلے تو نبوت کا دسواں سال شروع ہو چکا تھا قیاس یہ چاہتا تھا کہ اب حضور کے ساتھ قریش کی طرف سے رعایت اور نرمی کا برتاؤ ہوگا، مگر نہیں مسلمانوں کی پریشانیاں اور حضور ﷺ کے مصائب اور بھی بڑھ گئے، اور جلد ہی ایسے حالات پیش آئے کہ اس سال کا نام ہی عام الحزن (غم کا سال) پڑ گیا، حضور کی زندگی میں غم کی کمی نہیں تھی، لیکن اس سال غم انگیز واقعات و حادثات کا جو تسلسل رہا اس کی بناء پر پورا سال ہی سال غم بن گیا، رجب کے مہینے میں پیارے چچا ابو طالب فوت ہوئے، ابو طالب کے فوت ہوتے ہی کفار مکہ یعنی دشمنان دین کی ہمتیں بڑھ گئیں، ابو طالب ہی ایک بااثر اور بنی ہاشم کے ایسے سردار تھے جن کا سب لحاظ کرتے اور ڈرتے تھے،

ان کے مرتے ہی بنی ہاشم کا رعب واثر جو مکہ میں قائم تھا باقی نہ رہا، قریش نے حضور ﷺ کو ستانے اور نقصان پہونچانے کے لئے میدان خالی پاکر آزادانہ اور بے باکانہ مظالم کا سلسلہ تیز کردیا۔

اسی سال حضرت ابو بکر صدیق نے بھی مظالم قریش سے تنگ آکر ہجرت کا ارادہ کرلیا، اور مکہ سے نکل پڑے، راستہ میں چار منزل کے فاصلہ پر برک الغماد کے پاس قبیلہ قریش قارہ کے سردار بن الدغنہ سے ان کی ملاقات ہوگئی جس کے کہنے سننے پر وہ واپس ہوئے۔

ابو طالب کی وفات کے قریب دو ماہ بعد رمضان سنہ ۱۰ نبوی میں حضرت خدیجہ الکبریٰ کا بھی انتقال ہوگیا، حضرت خدیجہ سے آپ کو بڑی محبت تھی وہ تمام مصائب و آلام میں حضور کی رفیق تھیں، سب سے پہلے وہی آپ پر ایمان لائی تھیں، انہوں نے ہمیشہ آپ کی ہمت بندھائی اور مصیبتوں میں آپ کو تسلی دی۔

ابوطالب اور خدیجہ دونوں ایسے رفیق و ہمدرد تھے کہ ان کی وفات سے حضور پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور ساتھ ہی قریش کی ایذا رسانیوں میں اضافہ بھی ہونے لگا۔ ایک دفعہ آپ راستہ میں جارہے تھے کہ کسی شریر نے آپ کے سر پر بہت سا کچڑا اٹھاکر ڈال دیا، جس سے ڈاڑھی و سر کے تمام بال آلودہ اور جسم مبارک کے کپڑے گندے ہوگئے، آپ اسی حالت میں اپنے گھر کے اندر تشریف لائے، آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہرا پانی لیکر اٹھیں وہ آپ کا سر دھلاتی جاتی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی، حضور ﷺ نے فرمایا، بیٹی رو ؤمت خدائے تعالیٰ تمہارے باپ کی خود حفاظت کرے گا۔

ایک مرتبہ آپ خانہ کعبہ میں گئے وہاں بہت سے مشرک بیٹھے ہوئے تھے، ابو جہل نے آپ کو دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں کہا عبد مناف والو! دیکھو تمہارا نبی آگیا، عتبہ بن ربیعہ نے کہا ہمیں کیا انکار ہے، کوئی نبی بن بیٹھے، کوئی فرشتہ بن جائے، حضور ﷺ نے عتبہ کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ تم نے کبھی بھی خدا اور رسول کی حمایت نہ کی، اور اپنی ضد پر اڑا رہا پھر ابو جہل سے کہا کہ تیرے لئے وہ وقت قریب آرہا ہے کہ تو ہنسے گا کم اور روئے گا زیادہ پھر دیگر مشرکین سے فرمایا کہ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ تم جس دین کا انکار کررہے ہو اسی میں داخل ہونا پڑے گا۔

(تاریخ اسلام ج ۱، ص ۱۱۷)
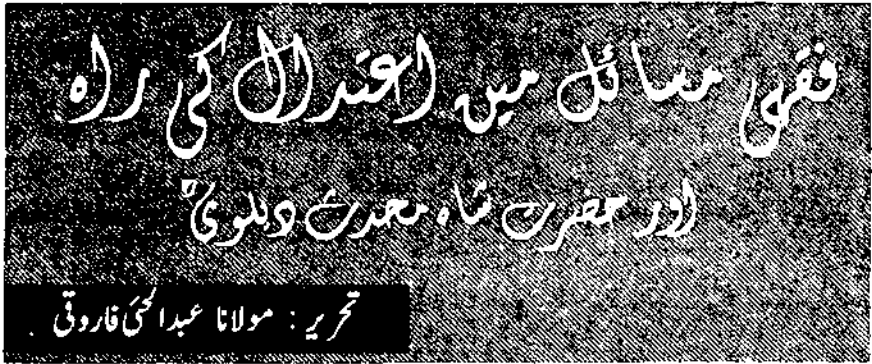
اجتہاد کے بنیادی اصول :

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی حدود ہیں جن میں رہ کر اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں بنیادی اصول یہ ہے (وصاف ترجمۃ الانصاف ص ۶۴)

منصوص احکام اور مابعد الطبعیاتی امور میں اجتہاد کی قطعاً گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ نہ تو یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ خدا کس کام سے خوش ہوگا اور کس سے ناخوش، اور اسی طرح ماورائے طبیعی مسائل میں کوئی سررشتہ ہاتھ نہیں آسکتا کہ جس کی بنیاد پر کوئی رائے قایم کی جاسکے اس میں تو بس رسول اللہ ﷺ کی تقلید کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے البتہ ایسے احکام و معاملات میں جہاں اللہ اور رسول کی کوئی ہدایت نہ ملتی ہو وہاں اجتہاد کی اجازت ہے لیکن یہ اجازت بھی غیر مشروط نہیں ہے۔ مقاصد شریعت کی مجموعی اسپرٹ، اس کا مزاج اور اس کی روح سب کو ملحوظ رکھنا ہوگا تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس طرح کا اجتہاد کرڈالا جائے جو سرے سے شریعت کی روح اور مزاج کے خلاف ہو۔ اسی مفہوم کو شاہ صاحبؒ اسباب اختلاف الصحابہ والتابعین فی الفرع، کے ذیل میں بیان کرتے ہیں :

وان لم يجد فيما حفظه واستنبطه ما يصلح للجواب اجتهدبرائه و عرف العلة اللتى ادار رسول الله ﷺ عليها الحكم فى منصوصاته فطرد الحكم حيث ما وجد ها لايا لوا جهداً فى موافقة غرضه عليه الصلوٰة والسلام

(وصاف ترجمه الانصاف ص ۸)

اور اگر کسی (صحابی) کو اپنی معلومات واستنباط میں کوئی چیز نہ ملتی جس سے وہ مسئلہ کا جواب دے سکتا تو وہ اپنی رائے سے اجتہاد کرتا اور اس علت کو معلوم کرتا جس پر رسول اللہؐ نے اپنے منصوص احکام کی بنیاد رکھی ہے پھر جس مقام پر (اس کو وہی علت نظر آتی) وہاں وہی حکم لگا دیتا۔ ان لوگوں نے اپنے امکان بھر رسولؐ کے مقصد کا لحاظ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔'

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شاہ صاحبؒ وہ کیا شرائط بیان کر رہے ہیں جو کسی شخص میں مجتہد ہونے کے لئے ضروری ہے اگر چہ یہ وہ شرائط ہیں جن کو شاہ صاحبؒ نے تاریخ میں پہلی بار نہیں پیش کیا ہے بلکہ تقریباً ایک ہزار سال سے یہ امت کے نزدیک مسلمہ شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے یہ بحث 'عقد الجید' میں بہت تفصیل سے لکھی ہے جس کا خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے اجتہاد کے لئے پانچ شرطیں متعین کی ہیں۔

شرط اول :

ایک مجتہد کے لئے قرآن اور حدیث کا اسقدر جاننا ضروری ہے جن سے مسائل اور احکامات کے جاننے اور سمجھنے میں اس کو مدد ملے۔ علوم قرآنیہ میں ناسخ و منسوخ، مجمل و مفسر، خاص و عام، محکم و متشابہ، کراہت و تحریم اور اباحت و استحباب اور وجوب وغیرہ کا جاننا ضروری ہے۔

شرط دوم :

علم حدیث کا جاننا، احادیث کی مختلف اقسام مثلاً صحیح اور ضعیف اور مسند و مرسل کی اس کو پوری شناخت ہو اور اسی طرح احادیث کو قرآن پر اور قرآن کو احادیث پر مطابقت

دینے کی صلاحیت ہو تاکہ اگر دونوں میں عدم موافقت ہو تو وہ اس فرق کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کرسکے کیوں کہ قرآن وحدیث میں عدم موافقت نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ احادیث میں ان احادیث کا جاننا بھی ضروری ہے جو احکامات کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

شرط سوم :

ایسے شخص کو عربی زبان سے اچھی واقفیت ہونی چاہئے خاص طور سے ان الفاظ کا جاننا واجب ہے جو قرآن اور حدیث کے احکامی امور میں واقع ہوئے ہیں۔ اس مقصد کیلئے تمام عربی لغات سے واقفیت ضروری نہیں ہے بلکہ لغت دانی میں صرف اتنی ضرور صلاحیت ہونی چاہئے جسکی مدد سے وہ کلام عرب کے اصل مقصد سے واقف ہو جائے تاکہ اختلافی مسائل اور متضاد حالات میں کلام مذکور کی اصل غرض وغایت اس پر بالکل عیاں ہو جائے کیونکہ شریعت اسلامیہ عربی زبان میں وارد ہوئی ہے لہذا جو شخص عربی نہ جانے گا وہ شارع علیہ السلام کے مقصود اصلی پر مطلع نہ ہو سکے گا۔

شرط چہارم :

مجتہد کیلئے علماء سلف کے اقوال سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ انکا اتفاق کس قول پر ہے خاص طور سے صحابہ اور تابعین کے ان اقوال سے واقفیت تو بہت ضروری ہے جنکا تعلق باب الاحکام سے ہے، اسی کے ساتھ اس کی نظر ان فتاوی پر بھی ہونی ضروری ہے جو فقہائے امت نے مختلف مسائل میں دیئے ہیں تاکہ اس کا فیصلہ سلف کے فیصلہ کے خلاف نہ ہو جائے ورنہ اس صورت میں اجماع امت کی مخالفت ہوگی۔

شرط پنجم :

اس کو علم قیاس سے بھی واقف ہونا چاہئے۔ جن امور میں قرآن اور حدیث میں کوئی تصریحی حکم نہ ملتا ہو تو اس صورت میں مجتہد کو اپنے قیاس سے مسئلہ کا حل نکالنا پڑتا ہے۔

اسطرح جب کوئی عالم دین ان پانچ شرطوں پر پورا اترتا ہو تو وہ مجتہد وقت کہلائیگا۔
شاہ صاحبؒ کی رائے ہے کہ اگر کوئی عالم دین ان پانچوں شرطوں میں سے کسی ایک شرط پر پورا نہ اترے تو اس کو دوسرے مجتہد کی تقلید کرنا ضروری ہے، ایسے شخص کو عہدہ قضاء اختیار کرنا یا فتوی دینا بالکل مناسب نہیں ہے۔ (عقد الجید ص ۹/۸)

شاہ صاحبؒ کا فقہی مسلک:

شاہ صاحبؒ کے فقہی مسلک کے بارے میں علماء کی مختلف رائیں رہی ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ آپ حنفی اور مقلد تھے، بعض نے اس کے برعکس اسپر زور دیا ہے کہ آپ علماء محدثین میں سے تھے اور غیر مقلد تھے اور بعض محققین اس طرف بھی گئے ہیں کہ آپ کو شافعی مذہب میں غلو تھا کیونکہ آپکی اکثر تالیفات میں کچھ ایسی عبارات مل جاتی ہیں جن سے ایک سطحی النظر شخص آپ کے بارے میں اسطرح کی رائے قائم کر سکتا ہے لیکن اصل صورت حال جو ہے وہ اپنی جگہ بدستور باقی ہے۔ ان سب طبقوں کے دلائل کو اگر غور اور تعمق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ تمام مکاتب فکر افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔

شاہ صاحبؒ آج کل کی اصطلاح میں نہ تو کٹر حنفی تھے، نہ ہی اصطلاحی طور پر اہل حدیث، طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور نہ ہی وہ شافعیت میں غلو رکھتے تھے بلکہ وہ مسائل مختلفہ میں تطبیق پر عمل پیرا تھے اور ان میں جمع فرماتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کے فقہی فکر کو سمجھنے کے لئے آپ کے اس ماحول کا جائزہ لینا چاہئے جس میں آپ نے علمی پرورش پائی تھی۔ اگر ہم آپ کے گرد و پیش کے ماحول کو دیکھیں اور ان عوامل پر غور و فکر کریں جن کا اثر شاہ صاحبؒ پر پڑا ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ آپ نے ابتداءً جن ہندوستانی علماء و اساتذہ سے استفادہ کیا تھا وہ اتفاقاً سب ہی حنفی المشرب تھے۔ آپ نے شروع میں اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیمؒ (م ۱۱۳۱ھ) سے اکتساب علم کیا جن کے فقہی خیالات کے بارے میں خود شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

مخفی نماند کہ حضرت ایشاں دراکثر امور موافق مذہب حنفی عمل میکروندالا بعض چیز ہائے کہ بحسب حدیث یا وجدان بمذہب دیگر ترجیح می یافتند (انفاس العارفین، شاہ ولی اللہؒ ص ۰۷)

یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ آپ اکثر معاملات میں مذہب حنفی پر عمل فرماتے تھے البتہ بعض مسائل میں کسی حدیث یا پھر اپنے وجدان کے مطابق بعض دوسرے مسالک پر بھی ترجیحاً عمل کرلیا کرتے تھے۔

شاہ عبدالرحیمؒ کے علاوہ آپ نے شیخ محمد افضل سیال کوٹی المعروف بہ حاجی سیال کوٹی ثم دہلویؒ (م ۱۱۴۶ھ) سے علم حدیث حاصل کیا وہ بھی مسلکاً حنفی تھے۔ اس طرح آپ نے بالکلیہ حنفی مسلک کے ماحول میں رہ کر نشوونما پائی اور پھر درسیات کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں حنفی فقہ کو ہی اپنے شاگردوں کو پڑھایا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ جب تک ہندوستان میں رہے اس وقت تک آپ پر حنفی فقہ کا ہی غلبہ رہا۔ جب ۱۱۴۳ھ میں آپ حجاز تشریف لے گئے اور وہاں شیخ ابوطاہر کردیؒ (م ۱۱۴۵ھ) سے شرف تلمذ حاصل ہوا اور پھر امام شافعیؒ کی کتاب الام' کے مطالعہ کا موقع ملا تو اس وقت آپ کے خیالات میں کچھ تبدیلی آئی اور فقہ شافعی کا اثر غالب ہونے لگا، اس کے بعد امام مالکؒ کی 'موطا' کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول ہوئی جس کے نتیجہ میں آپ نے موطا کی دو شرحیں، ایک عربی میں ''مسویٰ'' اور دوسری فارسی میں ''مصفیٰ'' تحریر فرمائیں۔ آپ نے وہاں کے ماحول اور اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ امام احمدؒ کا کوئی قول ایسا نہیں ملے گا جو امام شافعیؒ کی روایت کے مطابق نہ ہو لہذا آپ کی طبیعت پر مذاہب اربعہ کا اثر راسخ ہوگیا جس کے اثر سے آپ نے اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ چاروں مذاہب میں تطبیق و توفیق پیدا ہو جائے چنانچہ آپ نے جامعیت مذاہب کا مسلک اختیار کیا مگر وہ بھی اس نہج پر کہ اس جامعیت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بھی آپ حنفی مسلک پر قائم رہ سکیں۔(۱)

امام شاہ ولی اللہ اور حنفیت، مولانا ابو یوسف نوری ص ۳۶۰ تا ۳۷۰ مشمولہ ماہنامہ الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر، رمضان تا ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔)

اس مقام پر حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک مکتوب کی عبارت بھی پیش کر دینا بہتر ہے جس سے آپ کے مسلک کی وضاحت اچھی طرح ہوتی ہے چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

بقدر امکان جمع می کنم در مذاہب مشہورہ مثلاً صوم وصلوٰۃ ووضوء وغسل وحج بوضع واقع می شود کہ ہمہ اہل مذاہب صحیح دانند وعند تعذر الجمع باقوی مذاہب از روئے دلیل وموافقت صریح حدیث عمل می نمایم۔ وخدائے تعالیٰ ایں قدر علم دادہ است کہ فرق میان ضعیف وقوی کردہ شود، در فتوی بحال مستفتی کار میکنم، مقلد ہر مذہب جواب می گویم، خدائے تعالیٰ بہر مذہبے از مذاہب مشہورہ معرفتے دادہ است الحمد للہ تعالےٰ (۱)

جہاں تک ممکن ہوتا ہے میں جمع کرتا ہوں مذاہب مشہورہ میں، جیسے روزہ، نماز، وضو اور غسل وغیرہ کے وہ مسائل جن کو ہر اہل مذہب صحیح جانتے ہیں، اور اگر اسمیں کوئی دشواری ہوتی ہے تو از روئے دلیل اور حدیث صریح پر عمل کرتا ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا علم عطا کر دیا ہے کہ میں ضعیف وقوی دلائل میں فرق کر سکتا ہوں، فتویٰ دینے میں مستفتی کے حال کے مطابق فتوی دیتا ہوں وہ جس مذہب کا مقلد ہوتا ہے اس کو اسی کے مطابق جواب دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مشہور مذاہب کی معرفت عطا کی ہے جس پر اس کا شکر واحسان ہے۔

اس عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کو اجتہاد مطلق کا درجہ حاصل نہ تھا بلکہ آپ ان محدثین فقہاء امت میں تھے جو مذاہب مختلفہ کے احکام وادلہ کے مطابق بخوبی فیصلہ کر سکتے تھے۔ آپ کی یہی جامعیت مسلک آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔

آپ کے فقہی نظریات میں یہ تبدیلی حجاز پہونچکر ہوئی، یہاں آپ نے استاد کے سمجھنے میں تفقہ پیدا کیا اور اس کے بعد آپ نے اپنا طریقہ یہ متعین کیا کہ صحاح ستہ میں جو احادیث صحیح وارد ہوئے ہیں ان کے مطابق جو عالم فتویٰ دیتا ہے اس کی رائے کو ترجیح دی جائے خواہ وہ شافعی ہو یا حنفی۔ اب وہ اس نظریہ سے متفق نہیں رہے کہ صرف فقہ حنفی ہی سارے مسلمانوں کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کے لئے کافی ہے کیوں کہ عرب ممالک میں عموماً

---

(۱) کلمات طیبات (مجموعہ مکتوبات فارسی)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ص ۲۰۰، مجیب المطابع دہلی۔

شافعی اور مالکی فقہ رائج ہے اور عجمی ممالک میں حنفی فقہ زیادہ قابل قبول رہی ہے اس لئے آپ نے فیصلہ کیا کہ :

ونشأ فی قلبی داعیة من جهة الملأ الاعلیٰ تفصیلها ان مذهبی ابی حنیفة والشافعی هما مشهور ان فی الامة المرحومة وهما اکثر المذاهب تبعاً وتصنیفاً وکان جمهور الفقهاء المحدثین والمفسرین والمتکلمین والصوفیة متمذ هبین بمذاهب الشافعی وجمهور الملوك وعامة الیونان متمذهبین بمذهب ابی حنیفة وان الحق الموفق لعلوم الملأ الاعلیٰ الیوم ان یجعلا کمذهب واحد یعرضان علی الکتب المدونة فی حدیث النبی ﷺ من الفرقین فما کان موافقاً بهما یبقی ومالم یوجد له اصل یسقط (تفہمات الہیہ شاہ ولی اللہ ج ۱ ص ۱۱۲۔۲۱۲۔مطبوعہ مدینہ پریس بجنور)

ملاء اعلیٰ کی طرف سے میرے دل میں ایک داعیہ پیدا کیا گیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب دونوں ہی امت مرحومہ میں بہت مشہور ہیں، ان دونوں مذاہب کے پیرو اور ان کی تصنیفات بھی بہت ہیں اور جمہور فقہاء المحدثین، مفسرین، متکلمین اور صوفیہ حضرات مذہب شافعی کے ماننے والے ہیں اور جمہور ملوک اور عامہ یونان مذہب ابو حنیفہؒ پر متفق ہیں لہذا ملاء اعلیٰ کے علوم کے منشاء کے مطابق حق یہ ہے کہ ان دونوں مذہب کو ایک تصور کیا جائے اور پھر ان دونوں کو حدیث کی مدونہ کتب میں تلاش کیا جائے لہذا اگر وہ اس کے موافق ہوں تو قبول کر لیا جائے اور اگر ان کی اصل کا پتہ نہ چلے تو ترک کر دیا جائے۔

اس طرح آپ کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور فقہی معاملات میں ابتک جو ایک طرح کا جمود تھا اس کا خاتمہ ہوا، مکمل ایک سال حجاز میں رہنے کے بعد جب آپ دہلی واپس تشریف لائے تو آپ نے اپنے اسی مسلک کی توسیع واشاعت کا کام شروع کیا مگر ہندوستان میں شافعی فقہ کی مطلق کوئی گنجائش نہ تھی کیوں کہ جب سے ہندوستان اسلام سے روشناس ہوا یہاں فقہ حنفی ہی برسر اقتدار رہی اور مسلمانان ہند کی غالب اکثریت حنفی فقہ کی ہی پابند رہی۔ اسی لئے ایک مقام پر شاہ صاحبؒ کو یہاں تک لکھنا پڑا کہ :

فاذا کان انسان جاهل فی بلاد الهند وبلاد ماوراء النهر ولیس هناك عالم شافعی ولامالکی ولاحنبلی ولاکتاب من کتب هذه المذاهب وجب علیه ان یقلد لمذهب ابی حنیفة ویحرم علیه ان یخرج من مذهبه لانه حینئذیخلع من عنقه ربقة الشریعة وبقی سدی مهملاً بخلاف ما (۱)وصاف اردو ترجمه الانصاف ص ۷۰۔

جب ایک عامی انسان جو ہندوستان اور ماوراء النہر کے علاقے کا رہنے والا ہو جہاں کوئی شافعی، مالکی اور حنبلی عالم اور ان کی کتب مذہبیہ اس کو میسر نہ ہوں تو اس پر واجب ہے کہ وہ صرف امام ابو حنیفہؒ کی پیروی کرے، اسے ان کے مذہب سے علیحدہ ہونا حرام ہے کیوں کہ ایسی صورت میں وہ شریعت کی رسی اپنی گردن سے اتار کر ایک بیکار محض بنکر رہ جائیگا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے تھے :

"ہم شاہ ولی اللہ کو حنفی اور شافعی ہر دو مذہبوں میں مجتہد منتسب مانتے ہیں، جب وہ اپنے آپ کو مرکز اسلام (حجاز) میں تصور کرتے ہیں، تو فقہ حنفی اور شافعی میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا جائز سمجھتے ہیں اور جب وہ خود کو ہندوستان میں تصور کرتے ہیں تو اپنے والد (شاہ عبدالرحیمؒ) کے طریقہ پر فقط فقہ حنفی کے مجتہد منتسب وامام ہوتے ہیں"

(امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف، مولانا عبیداللہ سندھیؒ ص ۲۴۵/۳ ۲۱۳ مشمولہ ماہنامہ الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر۔)

شاہ صاحبؒ اپنی وسعت علمی، دقت نظر، قوت استدلال ملکۂ استنباط، سلامت فہم، صفائی قلب، پاکیزگی اخلاق، اتباع سنت، جمع بین العلم والعمل اور کمالات ظاہری و باطنی کی نعمتوں سے مالامال ہونے کی وجہ سے اپنے لئے تقلید کو ضروری خیال نہیں کرتے تھے بلکہ فطری طور پر آپ کو تقلید سے کچھ مناسبت بھی نہ تھی چنانچہ فرماتے ہیں :

وجبلتی تابی التقلید وتانف منه راساً

اور میری جبلت وفطرت تقلید سے انکار کرتی ہے اور بالکلیہ اس سے بھڑکتی ہے۔

(۱) فیوض الحرمین مترجم، شاہ ولی اللہ ص ۱۸۸، کراچی سنہ ندارد۔

اس کا سبب بھی خود ہی بتلادیا کہ :

ان الله تعالی جعل فی قلبی وقتاً من اوقات میز انا اعرف به سبب کل اختلاف وقع فی الملة المحمدیة علی صاحبها الصلوٰة والسلام وماهو الحق عند الله وعند رسوله ومکننی من ان اثبت ذلك بالدلائل العقلية والنقلية بحيث لايبقى فيه شبهة ولااشكال ۔ (۲)

اللہ تعالیٰ نے ایک وقت میں میرے قلب میں ایک میزان پیدا کردی جس کی وجہ سے میں ہر اس اخلاف کا سبب پہچان لیتا ہوں جو امت محمدیہ میں واقع ہو اور اس کو بھی پہچان لیتا ہوں جو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک حق ہے، اور خدا نے مجھکو یہ بھی قدرت دی ہے کہ امر حق کو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے اس طرح ثابت کردوں کہ اس میں کوئی شبہ اور اشکال باقی نہ رہے۔

حجۃ اللہ البالغہ جلد اول، شاہ ولی اللہؒ ص ۳۸۴ کراچی)

لیکن آپ پر جہاں خدئے قدوس کے اور بہت سے انعامات تھے وہیں یہ خصوصی کرم بھی تھا کہ جب کسی مسئلہ یا کسی حدیث کے متعلق آپ کو کوئی شبہ یا خلجان پیش آتا تو اس کے بارے میں براہ راست حضرت رسالت مآب ﷺ کی روح مبارک سے استفادہ فرمالیتے تھے لہذا اس سلسلہ میں بھی آپ کو حضرت نبی کریم ﷺ کی روح پاک سے رہنمائی ملتی ہے اور بارگاہ نبوی سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ آپ مذاہب اربعہ کی تقلید کو ترک نہ کریں اور جہاں تک ممکن ہو اس میں تطبیق کی کوشش کریں چنانچہ آپ فرماتے ہیں :

ترجمہ : میں نے اپنی فطرت اور شدید میلان طبع کے خلاف رسول اللہ ﷺ سے تین امور استفادہ کئے جو میرے لئے برہان حق بن گئے، ان میں سے ایک تو اس بات کی وصیت تھی کہ میں اس باب کی طرف سے توجہ ترک کردوں اور دوسری وصیت یہ تھی کہ

میں ان مذاہب اربعہ کا اپنے آپ کو پابند کروں اور ان سے باہر نہ نکلوں اور تا بہ امکان تطبیق و توفیق کروں لیکن یہ ایسی چیز تھی جو میری طبیعت کے خلاف مجھ سے بطور تعبد کے کہی گئی تھی۔ یہاں پر ایک نکتہ اور بھی ہے جس کو میں نے ذکر نہیں کیا ہے۔ الحمد للہ مجھے اس حیالہ اور اس وصیت کا بھید معلوم ہو گیا ہے۔ (فیوض الحرمین مطبوعہ کراچی ص۱۸۶)

شاہ صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ واضح ہو گیا کہ آپ کو تقلید پر مامور کیا گیا ہے اور دائرۂ تقلید سے خارج ہونے کو منع کیا گیا ہے۔ لیکن کسی خاص مذہب کی تقلید کو معین نہیں کیا گیا بلکہ اس کو مذاہب اربعہ کے دائرہ میں ہی منحصر رکھا گیا ہے اس طرح بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ مقلد تھے، مجتہد مطلق نہ تھے۔

ہمارے اس خیال کو اس لئے بھی تقویت پہونچی ہے کہ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں متعدد مقامات پر بڑے شرح وبسط کے ساتھ اپنے ان خیالات کو ظاہر کیا ہے، مثلاً فرماتے ہیں :

ترجمہ : اس مقام کے مناسب یہ ہے کہ ان مسائل پر لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ جن کے افہام صحراؤں میں بہک گئے، قدم لغزش کھا گئے (اور) قلموں نے کج روی اختیار کی ہے، ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ مذاہب اربعہ جو مدون ہو چکے ہیں اور تحریر میں آچکے ہیں تمام امت یا وہ لوگ جو اس امت میں قابل اعتبار ہیں سب ہی اس زمانے میں ان کی تقلید کے جائز اور درست ہونے پر متفق ہیں۔

اس تقلید میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں خاص کر اس زمانہ میں جس میں لوگ نہایت ہی پست ہمت ہو گئے ہیں اور ان کے قلوب خواہش نفسانی سے پر ہو گئے ہیں اور ہر شخص اپنی رائے پر ناز کرنے لگا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ مترجم، جلد اول ص ۳۶۰ / تا ص ۳۶۱)

لہذا اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مقلد ہونے کے بعد آپ مذاہب اربعہ میں سے کس مذہب کو ترجیح دیتے تھے اور کس پر عمل کرتے تھے۔ اس لئے جب ترجیح دینے کا وقت آیا اور آپ کو اس کی جستجو ہوئی تو روح نبوی ﷺ سے آپ کو اس طرح رہنمائی ملی، فرماتے ہیں :

ترجمہ : آنحضرت ﷺ نے مجھے بتایا کہ مذہب حنفی میں ایک ایسا طریقہ ہے جو

دوسرے طریقوں کی بہ نسبت اس سنت مشہورہ کے زیادہ موافق ہے جس کی تدوین وتنقیح امام بخاری اوران کے اصحاب کے زمانے میں ہوئی تھی۔

(فیوض الحرمین مطبوعہ کراچی ص ۱۳۶۔۱۳۷)

فیوض الحرمین کی مندرہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شاہ صاحبؒ مذاہب اربعہ میں فقہ حنفی کو ہی فوقیت اور ترجیح دیتے تھے اور خود حنفیت پر عامل تھے مگر آپ کی حنفیت ایک جامد حنفیت نہ تھی بلکہ ایک گونہ اس میں توسع تھا اور حتی المقدور مذاہب اربعہ میں تطبیق وتوفیق کرتے تھے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ مقلد تھے اور تقلید میں امام ابو حنیفہ کوفیؒ کی فقہ پر عامل تھے آپ کے تلامذہ میں بھی خاص طور سے مولانا شاہؒ محمد عاشق پھلتیؒ (م ۱۱۸۷ھ)، مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹) مولانا شاہ رفیع الدینؒ (م ۱۲۳۳ھ)، مولانا شاہ عبد القادرؒ (م ۱۲۳۰ھ) مولانا شاہ عبد الغنیؒ (م ۱۲۰۳ھ) جیسے حقیقی عزیز اور صاحبزادگان بھی حنفی تھے، پھر شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ (م ۱۲۲۶) جو شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے نواسے تھے وہ اپنے اسلاف کے علوم کے وارث ہوئے جن سے شاہ عبد الغنی مجددیؒ (م ۱۲۹۶ھ)، مولانا مملوک العلی نانوتویؒ (م ۱۲۶۷ھ) اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (م ۱۳۱۷ھ) نے فیض حاصل کیا اور پھر ان حضرات سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۲۹۷ھ) اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) جیسے اصحاب نے اکتساب فیض کیا۔ آگے چل کر ان ہی اصحاب نے دیوبند میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھ کر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فکر اور مسلک کی آبیاری کی۔ اس طرح علماء دیوبند نے حضرت شاہ صاحب کے افکار کی صحیح ترجمانی کا خوب اہتمام کیا اور اس کی اشاعت میں زبردست حصہ لیا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دیوبند کے مکتبہ فکر نے حضرت شاہ صاحبؒ کے افکار سے وابستگی کا جس قدر حق ادا کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے مکتب فکر کو اس کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔

☆☆☆☆☆

از : شیخ محمد عطیہ سالم حفظہ اللہ ترجمہ و تلخیص: مولانا محمد عارف جمیل مبارکپوری

عہد عثمان و علی رضی اللہ عنہما :

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں بذات خود حضرت علیؓ اکثر راتوں کو تراویح کی امامت کرتے تھے، سنن بیہقی میں، حضرت قتادہ، حضرت حسن کا یہ قول نقل کرتے ہیں :

''حضرت عثمان بن عفانؓ کے زمانہ میں حضرت علی نے بیس راتوں کو تراویح کی امامت کی، پھر اپنے گھر میں رک گئے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ اپنی عبادت کے لیے فارغ ہو گئے ہیں۔ پھر ابو حلیمہ معاذ قاری نے امامت کی، وہ قنوت پڑھتے تھے''

بہر کیف اس عہد میں حضرت علی بیس راتوں کو امامت تراویح کرتے تھے۔ اور عشرۂ آخیرہ میں قنوت بھی پڑھا جاتا تھا، اور خود حضرت ابی بن کعبؓ بھی رمضان کے نصف آخیر میں قنوت پڑھتے تھے۔ (رواہ البیہقی)

اس دور میں، رکعات کی تعداد یا ان کی کیفیت اداء کے بارے میں کوئی تبدیلی نہیں ملتی، غالب گمان یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور کا معمول چل رہا تھا، جیسا کہ حضرت علی کے دور میں تعداد رکعات کے بارے میں آرہا ہے۔

دعاء ختم قرآن :

ہاں حضرت عثمانؓ کے دور میں ایک عمل ملتا ہے جو قریب قریب نیا تھا، یعنی دعاء ختم قرآن۔ ابن قدامہ المغنی (۱۷۱/۲) میں لکھتے ہیں : فصل ختم قرآن کے بیان میں۔

فضل بن زیاد نے کہا: میں نے ابو عبد اللہ سے دریافت کیا: میں قرآن کو وتر میں ختم کروں یا تراویح میں؟ انہوں نے فرمایا: وتر میں کرو، تاکہ ہمیں دو دعائیں نصیب ہو جائیں۔ میں نے عرض کیا: اس کی شکل کیا ہے؟ فرمایا: جب تم قرآن ختم کرلو تو رکوع میں جانے سے قبل اپنے ہاتھوں کو اٹھاؤ، اور یہ دعاء کرو، ہم سب لوگ نماز میں ہوں گے، دیر تک کھڑے رہو۔ میں نے عرض کیا: کیا دعاء پڑھوں؟ فرمایا: جو دعاء چاہے کرو۔ فضل بن زیاد کہتے ہیں: میں ان کے حکم کے مطابق عمل کیا، وہ میرے پیچھے کھڑے، اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے دعاء کررہے تھے۔

حنبل نے کہا: میں نے امام احمد کو ختم قرآن کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا: جب تم (قل اعوذ برب الناس) پڑھ کر فارغ ہو جاؤ، تو رکوع سے قبل اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر دعاء کرو، میں نے عرض کیا: اس کا ثبوت کیا ہے؟ امام احمد نے کہا: میں نے اہل مکہ کو یہی کرتے دیکھا، سفیان بن عیینہ، مکہ میں ان کے ساتھ اسی طرح دعاء کرتے تھے، عباس بن عبد العظیم نے کہا: ہم بصرہ اور مکہ میں لوگوں کو اسی طرح کرتے پایا ہے، اہل مدینہ اس سے متعلق کچھ نقل کرتے ہیں، اور یہ حضرت عثمان بن عفانؓ سے نقل کیا گیا ہے۔

خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ بصرہ، اور مدینہ منورہ، ان تینوں شہروں کا عام معمول یہی تھا۔ نیز یہ حضرت عثمان سے پہلے موجود نہ تھا، حضرت عثمان ہی سے اس کا آغاز ہے، اگر ان کا یہ قول صحیح ہے: یہ حضرت عثمان بن عفان سے نقل کیا گیا ہے۔

بہر کیف امام احمد نے ان تینوں شہروں کے عمل سے استدلال کرتے ہوئے، اور اہل مدینہ کے یہاں حضرت عثمان سے منقول روایت پر مطمئن ہو کر اس پر عمل کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو طول قیام کے ساتھ دعاء ختم قرآن کا معمول ہے، وہ مدینہ منورہ میں موجود تھا۔ اس کی تصریح امام احمدؒ کے مسلک کے بیان کے ضمن میں آئے گی۔ انشاءاللہ۔

عباس بن عبد العظیم:

عباس بن عبد العظیم، جن سے مذکورہ بالا قول منسوب ہے کے حالات کا ذکر

تہذیب التہذیب (۵/۱۲۲) میں اس طرح سے ہے:

"عباس بن عبد العظیم بن اسماعیل بن توبہ عنبری، ابو الفضل بصری حافظ ہیں"

مصنف نے ان کے تقریباً بیس مشائخ کا شمار کرنے کے بعد کہا ہے: "ان کی روایت جماعت کے یہاں ہے لیکن بخاری میں تعلیقاً ہے۔ پھر ان کے دس تلامذہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا وغیرہم۔

پھر کہا: ابو حاتم نے کہا: صدوق ہیں نسائی نے کہا "مامون" ہیں اور دوسروں کے ان کے متعلق تعریفی کلمات ذکر کئے ہیں۔ آخیر میں کہا: امام بخاری و نسائی نے کہا "۲۴۶ھ میں وفات پائی"۔

پھر کہا: میں نے کہا (یعنی صاحب التہذیب نے) اور مسلمہ نے کہا وہ بصری ثقہ ہیں التقریب میں انکے متعلق ہے عباس بن عبد العظیم ابن اسماعیل عنبری ابو الفضل بصری ثقہ حافظ، گیارہویں طبقہ کے کبار علماء میں سے ہے ۲۴۶ھ میں وفات پائی۔ (خت، م، عم)

خت سے مراد: بخاری میں تعلیقاً۔ "م" سے مراد، امام مسلم، اور "عم" سے مراد: شیخین کے علاوہ "جماعت" بہر کیف اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل مدینہ سے ان کی نقل، ثقہ حافظ کی نقل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عثمان کے دور میں تراویح سے متعلق نئی چیز خود حضرت علی کا بیس راتوں کو امام تراویح ہونا اور دعاء ختم قرآن کا ہونا ہے۔

عہد حضرت علی رضی اللہ عنہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کے متعلق سنن بیہقی میں ہے کہ انہوں نے مردوں کے لئے ایک امام اور عورتوں کے لئے ایک امام مقرر کردیا، ہاں وتر میں وہ خود امامت کرتے تھے۔ عطاء بن سائب، ابو عبد الرحمن سلمی سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قراء کو بلایا، اور ایک قاری کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائے۔ اور وتر میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ امامت کرتے تھے۔ امام

بیہقی نے کہا : یہ حضرت علی سے دوسرے طریقہ سے مروی ہے۔ اس روایت سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں حضرت علی خود تراویح کی امامت کرتے تھے اور عشرہ اخیرہ مین خود صرف اپنے لئے پڑھتے تھے، امامت نہیں کرتے تھے، لیکن اپنے دور میں صرف وتر میں امامت کرنے لگے۔

حضرت علی کے دور میں عورتوں کے امام عرفجہ ثقفی ہوا کرتے تھے جیسا کہ مروزی میں ہے عرفجہ ثقفی نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے میں تراویح میں عورتوں کا امام تھا۔

حضرت علی کے دور میں تراویح بیس رکعت اور وتر تین رکعت تھی اغلب ظن یہی ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تھا۔ اور ۳۶ رکعت کی بس زیادتی کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں ہوئی۔

خود حضرت علی کے زمانہ میں وتر میں انہوں نے امامت کی، جب کہ حضرت عثمان وعمر رضی اللہ عنہم کے دور میں ایسا نہ تھا۔

حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دوران :

اب تک غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے دور میں تراویح کی تعداد رکعات ۲۳ر رہی ہے جس میں ۳ر رکعت وتر کی ہے۔ جیسا کہ موٴطا مالک میں یزید بن رومان کی روایت ہے کہ انہوں نے کہا۔

لوگ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں ۲۳ر رکعت تراویح پڑھتے تھے۔ یزید کے بارے میں التقریب میں ہے یزید بن رومان مدنی، آل زبیر کے آزاد کردہ غلام ثقہ پانچویں طبقہ سے ۱۳۰ھ میں ان کا انتقال ہے۔ اس سے انکی مراد صرف حضرت عمر کا دور ہے، ورنہ کہتے " اور عثمان وعلی"

لہٰذا معاذ قاری اور صالح مولی التوامہ کی روایات میں جس اضافہ کا ذکر ہے وہ حضرت عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے بعد ہی ہوا اس لئے کہ اس کے بارے میں تحدید

کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ واقعہ حرہ سے قبل ہوا ہاں واقعہ حرہ سے قبل کب ہوا اس کی تعیین نہیں۔

جب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے دور میں ۲۳ رکعت تھی اور حضرت علی کے اپنے دور میں ۲۳ رکعت ہی کی تصریح مل رہی ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ کے دور تک ۲۳ رکعت ہی برقرار رہی ہے۔ اس پر اضافہ حضرت علی کے بعد ہی ہوا ہے، جو حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور اور اس کے بعد قائم رہا۔

حضرت علی کے دور میں ہونے والی زیادتی کی تحدید :

اولاً جیسا کہ گزرا "باجی" کے یہاں نافع مولی ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نافع نے کہا: میں نے لوگوں کو ۳۹ رکعت تراویح پڑھتے ہوئے پایا، جس میں ۳ رکعت وتر تھی یعنی وتر کو چھوڑ کر تراویح ۲۰ رکعت سے ۳۶ رکعت ہو گئی، نافع کا انتقال ~~سے~~ ۱۱۷ھ ہوا ہے۔ یعنی حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے وصال کے صرف ۶ سال بعد۔ اس لئے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا انتقال ۱۰۱ھ میں ہوا ہے۔ نافع کے قول "میں نے لوگوں کو پایا" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معمول خلافت عمر بن عبد العزیز سے قبل چلا آرہا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں، اس تعداد کی تصریح ابان بن عثمان نے بھی کی ہے مروزی میں داؤد بن قیس کا قول ہے: ابان بن عثمان اور عمر بن عبد العزیز کے دور میں، میں نے لوگوں کو مدینہ میں ۳۶ رکعت تراویح اور ۳ رکعت وتر پڑھتے ہوئے پایا، اور بعض روایات میں ہے : ۵ رکعت وتر۔

داؤد بن قیس کی اس روایت اور نافع کی دو میں سے ایک روایت کے پیش نظر یہ واضح ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں تراویح ۳۶ رکعت تھی۔

معاذ قاری کی روایت، اور نافع کی دوسری روایت کے پیش نظر واضح ہے کہ یہ زیادتی حضرت عمر بن عبد العزیز سے قبل ہوئی، اس لئے کہ اس میں ہے: وہ ۴۱ رکعت پڑھتے تھے۔

نافع کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۶ رکعت تراویح، اور ۵ رکعت وتر پڑھتے تھے جسکا مجموعہ ۴۱ رکعت ہے۔ بہر کیف نافع، داؤد بن قیس، اور صالح مولی

التوأمہ ہر ایک روایت ۴۱ر رکعت کے وجود پر متفق ہے۔

جس میں سے پانچ وتر تھی۔ اور یہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور سے قبل ہوا۔ اور انہوں نے اس کو بر قرار رکھا۔ اس کے بعد اسی تعداد کا معمول رہا، جیسا کہ وہب بن کیسان کی روایت آرہی ہے۔

امام شافعیؒ نے کتاب الام (۱/ ۱۴۲) میں فرمایا :

''اور میں نے لوگوں کو مدینہ میں ۳۹ر رکعت پڑھتے ہوئے دیکھا۔ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ بیس رکعت ہے اس لیے کہ یہی حضرت عمر سے مروی ہے، اسی طرح سے اہل مکہ تراویح پڑھتے ہیں اور ۳ر رکعت وتر پڑھتے ہیں۔

عہد ائمہ اربعہ رحمہم اللہ :

اولا : امام دار الہجرت مالکؒ کا عہد :

امام مالکؒ نے حضرت عمر بن عبد العزیز کا زمانہ ۱۸ر سال پایا ہے، کیوں کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا ۱۰۱ھ میں انتقال ہوا امام مالکؒ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے، اس طرح حضرت عمر بن عبد العزیز کی وفات کے وقت امام مالک ۱۸ر سال کے تھے۔ یعنی ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کے وجود کے دوران تراویح کی رکعات کی تعداد ۳۶ر تھی، بلکہ یہی تعداد، اس وقت بھی تھی جب ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔ جیسا کہ وہب بن کیسان کی روایت ہے کہ لوگ آج تک رمضان میں ۳۶ رکعات تراویح، اور ۳ر کعت وتر پڑھتے رہے ہیں۔ وہب کا انتقال ۱۲۷ھ میں ہوا ہے۔

امام مالکؒ نے اس سے بھی واضح طور پر صراحت کی ہے جیسا کہ مروزی کے یہاں ابن ایمن کی روایت ہے کہ امام مالک نے کہا : میرے یہاں پسندیدہ یہ ہے کہ لوگ ۳۸ر کعت تراویح پڑھیں۔ پھر امام و مصلی سلام پھیر کر، ایک رکعت وتر پڑھائے۔ مدینہ میں یہ معمول حرہ سے قبل، سو سال سے کچھ پہلے سے ہے۔

امام مالکؒ کے اس قول : مدینہ میں یہ معمول حرہ سے قبل، سو سال سے کچھ پہلے سے ہے، سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ۳۹ رکعت مع وتر، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے قبل سے ہے۔ اسی کو عمر بن عبد العزیزؒ نے بر قرار رکھا، اور امام مالک نے اسی کو پسندیدہ کہا، اور اختیار کیا۔

اسی وجہ سے امام مالکؒ اس تعداد میں کمی کرنے سے کو ناپسند کرتے تھے، ابن القاسم نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ تذکرہ کرتے ہوئے سنا کہ جعفر بن سلیمان نے ان کے پاس یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ تراویح میں سے کچھ کم کر دیا جائے، تو انہوں نے منع کر دیا۔ ان سے کہا گیا کہ : انہوں نے ناپسند کیا (یعنی ابن القاسم سے دریافت کیا گیا کہ کیا امام مالکؒ نے اس کو ناپسند کیا) تو انہوں نے کہا : ہاں۔

قدیم زمانہ سے لوگ یہی تراویح پڑھتے آئے تھے، ان سے دریافت کیا گیا: تراویح کتنی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا : وتر کے ساتھ ۳۹ رکعات۔ امام مالکؒ کے مسلک کی تفصیل، دوسرے مذاہب کے تذکرہ کے ساتھ ان شاء اللہ آئے گی، یہاں صرف امام مالکؒ کے دور میں مسجد نبوی میں تراویح کا ذکر مقصود تھا۔

امام شافعیؒ نے امام مالکؒ کا زمانہ پایا، اور ان سے علم حاصل کیا ہے، مدینہ منورہ سے متعلق امام شافعی کے یہاں بھی اسی تعداد کا ذکر ملتا ہے۔ زعفرانی نے کہا : امام شافعی نے کہا: میں نے لوگوں کو مدینہ میں ۳۶ رکعت تراویح پڑھتے ہوئے پایا۔

لیکن خود امام شافعی کا مسلک کیا ہے؟ اسکی طرف انہوں نے اس کے معا بعد یہ کہہ کر اشارہ کر دیا : میرے نزدیک بیس رکعات زیادہ پسندیدہ ہے۔ اہل مکہ (بیس رکعات) ہی پڑھتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے نے کہا : اس میں کوئی تنگی نہیں، اور نہ ہی اس کی کوئی حد ہے، کہ یہ نفل ہے۔ اگر قیام لمبا کر کے سجود (رکعات) کم کر دیں تو بہتر ہے یہی میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، اور اگر سجود (رکعات) بڑھادیں تو بھی اچھا ہے۔ مذاہب اربعہ کے تذکرہ میں ان کے مسلک کا ذکر آئے گا۔ خلاصہ یہ کہ تعداد رکعات کے تعلق سے تو کوئی نئی چیز پیش نہیں آئی، ہاں کچھ دوسرے لحاظ سے نئی چیزیں پیش آئی ہیں، مثلاً :

۱- مقدار قرأت کہ ہر رکعت میں دس آیات ہوا کرتی تھیں، جیسا کہ مروزی میں عبدالرحمٰن بن القاسم کی روایت ہے کہ امام مالکؒ سے تراویح کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ قاری کتنی آیتیں پڑھے؟ فرمایا: دس دس آیات، البتہ اگر ہلکی سورتیں ہوں تو بڑھا دے مثلاً صافات، اور طسم، دریافت کیا گیا: پانچ آیات؟ فرمایا: نہیں بلکہ دس آیات۔ اور المدونۃ الکبری (۱/ ۲۲۳) میں ابن وہب نے تصریح کی ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے قراء کو حکم دیا کہ چھتیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھا کریں۔ ہر رکعت میں دس آیات پڑھیں۔

دوسری طرف خود انہی کے دور میں بعض حضرات ایک رات میں پورا قرآن پڑھتے تھے۔ امام مالکؒ نے کہا: عمر بن حسین صاحب فقہ وکمال، اور عابد تھے، ایک شخص نے مجھے بتایا کہ اس نے ان کو رمضان میں ہر روز قرآن شریف شروع کرتے سنا ہے۔ دریافت کیا گیا: گویا وہ ختم کرلیا کرتے تھے؟ فرمایا: ہاں۔ اور وہ رمضان میں عشاء پڑھ کر لوٹ جاتے تھے، جب ۲۳ر کی رات ہوتی تو لوگوں کے ساتھ تراویح پڑھتے، بقیہ راتوں میں ان کے ساتھ تراویح نہیں پڑھتے تھے۔ دریافت کیا گیا: ابوعبداللہ! ایک شخص ہر رات قرآن ختم کرتا ہے؟ فرمایا: یہ تو بہت اچھا ہے۔ کیوں کہ قرآن ہر بھلائی کا امام ہے، یا فرمایا: ہر بھلائی کے آگے ہے۔

۲- ان کے زمانہ میں خاص طریقہ پر قرأت شروع ہوتی تھی یعنی بسم اللہ اور اعوذ باللہ بآواز بلند پڑھتے تھے۔ ابن وہب نے کہا: میں نے امام مالک سے پوچھا: کیا نفل نماز میں اعوذ باللہ پڑھے گا؟ فرمایا: ہاں، رمضان میں ہر سورہ سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے گا، میں نے عرض کیا: بآواز بلند پڑھے گا؟ فرمایا: ہاں میں نے عرض کیا: تراویح میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھیگا فرمایا: ہاں،

ابن وہب کہتے ہیں کہ امام مالک سے دریافت کیا گیا کہ اللہ اکبر کہنے کے بعد، قرأت شروع کرنے سے قبل: اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے گا؟ فرمایا: میرے علم کے مطابق یہ صرف رمضان میں ہے۔ ہمارے قاری حضرات اسی طرح پڑھتے ہیں۔ اور یہ قدیم زمانہ سے آرہا ہے۔

امام مالکؒ کے قول: "اور یہ قدیم زمانہ سے آرہا ہے" کی تائید ابوالزناد کے اس قول سے ہوتی ہے کہ میں نے قاری حضرات کو پایا ہے کہ وہ رمضان میں قرأت شروع کرنے سے قبل: اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم پڑھتے ہیں۔

مروزی نے کہا: ان کا تاحیات یہ معمول رہا ہے کہ رمضان میں تراویح کے لیے اعوذ باللہ پڑھتے تھے، کبھی اس کو ترک نہیں کیا۔ ابوالزناد کا انتقال ۱۳۰ھ میں ہوا یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے انتقال کے بعد۔ اور امام مالک کے انتقال سے قبل روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مقرر کردہ قراء رمضان میں اعوذ باللہ نہیں چھوڑتے تھے، غالباً ابوالزناد کے قول: میں قاری حضرات کو پایا" سے مراد، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے قراء ہیں، اس لیے کہ ان کی اور عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے درمیان صرف ۱۹ر سال ہیں۔

ابوالزناد کے بعد، سعید بن ایاس کے دور تک یہی معمول رہا، سعید کہتے ہیں: میں نے اہل مدینہ کو دیکھا کہ جب وہ سورہ فاتحہ، اور ولا الضالین پڑھ کر رمضان میں فارغ ہوتے تو "ربنا انا نعوذ بک من الشیطان الرجیم" پڑھتے تھے۔

اس مسئلہ کا حکم امام مالک کے نزدیک، جیسا کہ باجی نے شرح موطا میں کہا یہ ہے:

(مسئلہ) المدونہ میں امام مالک سے ابن القاسم کی روایت کے مطابق قاری کے لئے استعاذہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن (العتبیہ) میں اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ترک استعاذہ میرے نزدیک احب ہے باجی نے دونوں روایتوں کی توجیہ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بسملہ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ وہ حرف ہے یعنی قرأت سبع میں ایک روایت اس کے اثبات کی، اور دوسری روایت اس کے اسقاط کی ہے۔ یہ دونوں روایتیں نافعؒ سے ہیں۔ ورش کی روایت ترک بسملہ کی ہے، اور ان سے قالون کی روایت: اثبات کی ہے، قراءت کے بارے میں یہ بیت اسی کے مطابق ہے:

قالون بین السورتین بسملا ورورش عنہ الوجھان نقلاً

(قالون دو سورتوں کے درمیان بسملہ کے قائل ہیں، جب کہ ورش سے دونوں وجوہات منقول ہیں)

نافع، قاری مدینہ ہیں، امام مالک نے انہی سے پڑھا ہے، امام مالک نے اس مسئلہ میں قالون کی قرأت اور ورش سے اثبات بسملہ والی روایت کو ترجیح دیا ہے۔

رمضان کی پہلی رات میں قرأت کا آغاز کہاں سے ہوگا؟ اس کے بارے میں مروزی نے کہا : ابو حازم کہتے ہیں کہ رمضان شروع ہوتا تو پہلی رات میں اہل مدینہ "انافتحنالك فتحاً مبيناً" سے شروع کرتے تھے۔

اہل مدینہ کی تراویح اور اہل مکہ کی تراویح کے مابین موازنہ :

امام مالکؒ کا قول گزر کا ہے کہ وہ ۳۸ رکعت تراویح اور ایک رکعت وتر، کل ۳۹ر رکعت مستحب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح امام شافعیؒ کا کلام آپ کے سامنے آچکا ہے کہ انہوں نے مدینہ میں لوگوں کو ۳۹ر رکعت پڑھتے ہوئے پایا۔ اس سے امام مالک اور شافعی کے زمانہ میں مدینہ میں تراویح کا معمول کیا تھا، معلوم ہوتا ہے۔

تاہم امام شافعی کہہ چکے ہیں کہ میرے نزدیک ۲۰ر رکعت زیادہ پسند ہے۔ انہوں نے کہا : اہل مکہ اتنی ہی پڑھتے ہیں، نیز انہوں نے کہا، کہ یہ نفل ہے، جس کی کوئی آخری حد نہیں۔

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اہل مدینہ ۳۹ر رکعت پڑھتے تھے، جس کو امام مالک مستحب سمجھتے تھے۔ جب کہ اہل مکہ بیس رکعت پڑھتے تھے، اور اسی کو امام شافعی نے اپنے نزدیک احب و پسندیدہ قرار دیا ہے۔

رہا امام شافعی کا یہ قول کہ بیس رکعت میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، اور یہی اہل مکہ کا عمل ہے۔ تو واللہ اعلم ظاہر یہ ہے کہ یہی اصل ہے۔ یعنی خلفائے ثلاثہ عمر، عثمان، اور علیؓ کے دور میں اسی پر عمل تھا، اور صحابہ کا اجماع بھی تھا کہ مسجد میں بیس رکعت پڑھیں، خود حضرت علی نے اتنی ہی تعداد پڑھا یعنی قاری کو حکم دیتے تھے کہ بیس رکعات پڑھائے

اور پھر خود وتر کی نماز پڑھاتے تھے۔

ابو زرعہ نے طرح التثریب (۱/۹۸) میں کہا: بیس رکعت کا راز یہ ہے کہ غیر رمضان میں سنن رواتب دس رکعات ہیں، رمضان میں اس کو دوگنا کر دیا گیا، کیوں کہ وہ محنت و جانفشانی کا وقت ہے۔

بہرکیف یہ عمل خلفائے راشدین کی سنت کے تحت آتا ہے، اہل مکہ اصل پر عمل کرتے تھے، بیس پر اضافہ کرنے کا کوئی سبب نہ تھا۔ گوکہ بقول امام شافعی یہ نفل ہے۔ جس کی کوئی آخری حد نہیں۔

رہا اہل مدینہ کا ۳۶ ر پر عمل تو یہ اصل پر اضافہ ہے، اور یہ نفل ہے تو امام مالک نے اس کو مستحب کیوں کہا؟ پھر اہل مدینہ نے اصل پر اضافہ کیوں کیا؟ حالاں کہ دوسروں کے مقابلہ میں، اہل مدینہ کو اصل (بیس) کا زیادہ پابند ہونا چاہئے تھا؟

اس کا جواب جیسا کہ امام نووی نے شرح المہذب میں، اور دوسرے علمائے نے نقل کیا یہ ہے کہ یہ مسئلہ طاعت وعبارت میں محنت، اور کار خیر میں منافسہ و مقابلہ کے باب سے ہے، اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اہل مکہ ہر ترویحہ کے بعد اٹھ کر ایک طواف کرتے اور طواف کی دو رکعات پڑھ کر دوسرے ترویحہ میں داخل ہوتے تھے۔

یہ معلوم ہے کہ ترویحہ، دو سلام سے چار رکعات کا ہوتا ہے۔ اور ہر چار رکعات پر ترویحہ و آرام ہوتا تھا، اس طرح پوری تراویح میں اہل مکہ کے لیے چار طواف کرنے کا موقعہ ملتا تھا، اہل مدینہ نے اس طواف کی تلافی کرنی چاہی، اور ہر طواف کے مقابلہ میں ایک ترویحہ رکھ لیا۔

امام نووی المجموع میں کہتے ہیں :

”جہاں تک اہل مدینہ کے فعل کا تعلق ہے، جس کا انہوں نے ذکر کیا تو ہمارے اصحاب اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ اہل مکہ ہر دو ترویحہ کے درمیان

ایک طواف کرتے اور طواف کی دو رکعتیں پڑھتے تھے، البتہ پانچویں ترویحہ کے بعد طواف نہیں کرتے تھے، اہل مدینہ نے ان کی برابری کرنی چاہی، اور ہر طواف کی جگہ ۴ر رکعات مقرر کردی، اس طرح سے ۱۶ر رکعات کا اضافہ کردیا، پھر تین رکعت وتر ہے جس کا مجموعہ ۳۹ر رکعات ہے۔ واللہ اعلم"

آٹھویں صدی کے ایک اہم عالم زرکشی اپنی کتاب (اعلام الساجد باحکام المساجد۔ص ۲۶۰) میں لکھتے ہیں : "ماوردی اور ردیانی نے کہا: اس (بیس رکعت سے زیادہ کرنے) کے سبب کے بارے میں تین اقوال ہیں :

اول : اہل مکہ ہر ترویحہ کے بعد ایک طواف (سات چکر) کرتے تھے، البتہ پانچویں ترویحہ کے بعد طواف نہیں کرتے تھے، بلکہ وتر پڑھ لیتے تھے، اس طرح ان کو پانچ ترویحہ، اور چار طوافوں کا موقعہ ملتا تھا، چوں کہ اہل مدینہ ان چار طوفوں کے بارے میں ان کی برابر نہیں کرسکتے تھے، اور پانچ ترویحات دونوں کے یہاں تھے، اس لیے انہوں نے ہر چار طواف کی جگہ چار زائد ترویحات مقرر کرلیے، اس طرح کل ۹ ترویحات ہوگئے، جو ۳۶ر رکعات ہوتی ہیں، اور ان کی تراویح، اہل مکہ کی تراویح اور طواف کے برابر ہوگئی۔

دوم : اس کا سبب یہ ہے کہ عبدالملک بن مروان کے نو لڑکے تھے، ہر ایک مدینہ میں امامت کرنا چاہتا تھا، اس لیے انہوں نے ہر لڑکے کو ایک ترویحہ پڑھانے کی اجازت دے دی۔ لہذا کل ۳۶ر رکعات ہوگئیں۔

سوم : جوار مدینہ کے نو قبائل میں نماز کے بارے میں اختلاف ہوا، تو ہر قبیلہ نے ایک ترویحہ پڑھانے کے لیے اپنا آدمی پیش کیا، تو کل رکعات ۳۶ ہوگئیں۔ اور اول اصح ہے" (انتہی منہ)

بظاہر حقیقی سبب، اول الذکر ہے، اس لیے کہ دوسرے قول سے گوکہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امراء و خلفاء کے یہاں جاہ عزت، مسجد نبوی میں امامت کے لیے ان میں منافسہ و مقابلہ ہوتا تھا، لیکن اس کے بغیر بھی اس کی تکمیل ہوسکتی تھی کہ ہر ایک کی ایک ایک رات باری مقرر کردی جاتی، اور تعداد جوں کی توں باقی رہ جاتی۔

تیسرے قول میں عصبیت کی عکاسی تو ہوتی ہے، مزید براں یہ کہ اس طرح کی چیز صدر اول میں، خصوصاً مسجد کا ذمہ دار امام موجود ہو بہت بعید نظر آتی ہے کہ اس امام کے پیچھے سب عشاء کی نماز پڑھتے رہے ہوں پھر نفل کے لیے نزاع پیدا ہو جائے۔

یہ تعداد اہل مدینہ کے ساتھ خاص تھی :

یہ معمول خاص اہل مدینہ کا تھا یا کار خیر میں مقابلہ کے شوقین دوسرے لوگ بھی اس پر عمل کرتے تھے۔ علماء نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے : اکثر شافعیہ کے نزدیک یہ خاص اہل مدینہ کا معمول تھا، زرکشی شافعی اپنی کتاب اعلام الساجد، مسئلہ (۲۰) خصوصیات مدینہ کے تحت لکھتے ہیں : "ہمارے اصحاب نے کہا : اہل مدینہ کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ اہل مکہ کی برابری کی کوشش، اور ان سے مقابلہ کریں" (انتہی)

ولی الدین عراقی شافعی طرح التثریب (۱/۹۸) میں رقم طراز ہیں :

"ہمارے اصحاب میں سے حلیمی نے اپنی کتاب المنہاج میں کہا: جس نے اہل مکہ کے اتباع میں بیس رکعت تراویح پڑھی، اس نے اچھا کیا، اور جس نے اہل مدینہ کے نقش قدم پر چل کر ۳۶ رکعات پڑھی اس نے بھی اچھا کیا، اس لیے کہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مزید فضیلت کی تحصیل کے لیے اہل مکہ کی اقتداء کریں، مقابلہ بازی نہ تھی جیسا کہ بعض حضرات نے سمجھا ہے۔

مالکیہ کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ تراویح ۲۳ رکعات ہے، یعنی غیر مدینہ منورہ میں۔

المجموع (۲۲/۲۷۲) میں قیام رمضان پر بحث کے ضمن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا یہ قول منقول ہے: "انہوں نے فرمایا: سلف کی ایک جماعت ۴۱ رکعات تراویح پڑھتی تھی جن میں ۳ رکعات وتر ہیں، جب کہ بعض حضرات ۳۶ رکعات تراویح اور ۳ وتر پڑھتے تھے"

ان سب میں گنجائش ہے، ان میں جس طریقہ پر بھی تراویح ادا کرلے، اس نے بہتر کیا۔

لہٰذا اہل مدینہ کے ساتھ تعداد کی خصوصیت کی دلیل صرف یہی ہے کہ ایک زمانہ سے اہل مدینہ کا یہی عمل منقول ہوتا رہا ہے، جو ساتویں صدی ہجری تک آیا، پھر اواخر عہد اشراف اور عہد سعودی سے قبل تک گزر چکا ہے کہ اہل مکہ کے مقابلہ میں اہل مدینہ کے یہاں اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ اہل مکہ ہر دو ترویحہ کے درمیان سات چکر طواف کرتے تھے،

اور دو رکعات سنت طواف پڑھتے تھے، اس لیے اہل مدینہ نے ہر طواف کی جگہ ایک زائد ترویحہ کو رکھا، جس کے نتیجہ میں ان کی تراویح ۳۶ رکعات ہوگئی۔

اس علی الاطلاق تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طواف کا یہ معمول تمام اہل مکہ کا تھا، حالاں کہ حقیقتاً ایسا نہیں، کیوں کہ اہل مکہ مذاہب اربعہ کے الگ الگ چار ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، اور تراویح کے دوران طواف کا یہ معمول صرف شافعیہ کے امام کے یہاں تھا، اس کی بنیاد یہ ہے کہ ابن جبیر ۵۷۹ھ میں مکہ مکرمہ میں تھے، انہوں نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے:

”تراویح میں شافعی امام، دوسرے ائمہ سے زیادہ محنت کرتا ہے کیوں کہ وہ معمول کی تراویح (جو دس سلاموں کے ذریعہ ہے) کو پوری کرتا ہے اور جماعت کے ساتھ طواف شروع کر دیتا ہے، سات چکر پورا کرنے، اور سنت طواف پڑھنے کے بعد دوبارہ دوسرے ترویحہ کو شروع کرتا ہے، فرقعۂ خطبیہ کو بجایا جاتا ہے، اس کی آواز اتنی بلند ہوتی ہے پوری مسجد میں سنائی دیتی ہے، اور یہ دوبارہ نماز کے آغاز کی اطلاع کے درجہ میں ہے۔ دومرتبہ سلام پھیرنے کے بعد پھر طواف کرتے ہیں اور اسی طرح کرتے رہتے ہیں تا آں کہ دس سلام مکمل ہو جائیں اور بیس رکعت تراویح ہو جائے، پھر دو رکعت اور وتر پڑھتے ہیں۔ اور لوٹ جاتے ہیں، اس کے برعکس دوسرے ائمہ معمول کی تراویح میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ یہ معلوم ہے کہ شافعیہ بھی مکہ مکرمہ کے علاوہ کہیں ۲۰ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے۔ واللہ اعلم۔

اب دوسری صدی ختم ہوگئی، اور تدوین و تالیف، اجتہاد و استنباط اور ائمہ اربعہ کا دور شروع ہوگیا، تیسری صدی کے اوائل میں مذاہب ایک دوسرے سے ممتاز اور نمایاں ہونے لگے، آگے ایک مستقل فصل میں ائمہ کے مذاہب کا ذکر آئے گا۔ ہر مذہب کا الگ الگ بیان ہوگا، لیکن یہ سب کچھ بحث کے آخیر میں، تاریخی تسلسل ذکر کرنے کے بعد ہوگا۔ نیز تراویح کی تعداد، اور قرأت، ختم قرآن کے عمل، اور اہل مکہ واہل مدینہ کے ختم قرآن کے مابین موازنہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد تراویح کے مختلف انداز ذکر کر کے اس بحث کو ختم کر دیا جائے۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆
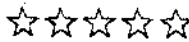
آراء في اعجاز القرآن الكريم

تحریر: الأستاذ محمد عبد المنعم

زمانۂ قدیم سے علماء کرام نے قرآن کریم کے اعجاز کے سلسلے میں تصنیف و تالیف کی اور اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس سلسلے کی مشہور ترین تالیفات درج ذیل ہیں۔

۱- ابو عبید متوفی ۲۰۷ھ کی تصنیف ''اعجاز القرآن'' شاید اس کتاب کی تصنیف کا مقصد بعض ان معتزلہ کو جواب دینا تھا جن کے خیال میں قرآن کریم کی فصاحت بنفسہ کوئی معجزہ نہیں ہے۔

۲- عربی زبان و ادب کے امام جاحظ متوفی ۲۵۵ھ کی تصنیف ''نظم القرآن'' جس میں جاحظ نے قرآن کریم کے اعجاز کے سلسلے میں اپنے فصیح و بلیغ اسلوب میں بہت سارے رموز و اسرار سے پردہ اٹھایا ہے۔

۳- ابو عبد اللہ محمد بن یزید الواسطی متوفی ۳۰۶ھ کی تصنیف ''اعجاز القرآن فی نظمہ و تالیفہ'' جس کی ایک ضخیم شرح ''المعتضد'' کے نام سے عبد القاہر الجرجانی نے لکھی ہے اور مزید ایک اس سے چھوٹی شرح بھی لکھی ہے۔

۴- ابن الاخشید کی تصنیف ''نظم القرآن'' اور اسی طرح ابن ابی داؤد متوفی ۳۱۶ھ نے بھی اس موضوع سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی۔

۵- الرمانی متوفی ۳۸۳ھ کی کتاب ''اعجاز القرآن'' اسی طرح امام الخطابی متوفی ۳۸۸ھ نے اور امام قاضی ابو بکر محمد بن طیب الباقلانی متوفی ۴۰۳ھ نے بھی اس فن پر خامہ فرسائی کی ہے۔

۶- عبد القاہر الجرجانی متوفی ۴۷۱ھ کی تصنیف ''دلائل الاعجاز''

۷- اسی طرح فخر الدین الرازی متوفی ۶۰۶ھ اور ابن ابی الاصبع متوفی ۶۵۴ھ

اور الزملکانی متوفی ۷۲۷ھ اور الرافعی متوفی ۱۹۳۶ء نے اعجاز قرآن کے سلسلے میں کتابیں تصنیف کیں۔

عہد بنوامیہ کے جعد بن درہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی فصاحت کوئی معجزہ نہیں ہے اوران کے بعد مشہور معتزلی عالم ابواسحاق ابراہیم النظام آئے جن کے خیال میں قرآن کریم کے اعجاز کا سبب "الصرفہ" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم اپنے بیان کے اعتبار سے انسانی قوت سے بالاتر نہ ہوتا اگر اللہ تعالیٰ اس کی نظیر پیش کرنا ناممکن قرار نہ دیتا اور انہیں سے ایک دوسری رائے یہ منقول ہے کہ قرآن کریم کا ماضی و مستقبل کی غیب کی خبروں سے پردہ اٹھانا اس کا اعجاز ہے۔

لیکن جاحظ قرآن کریم کے اعجاز کو تسلیم کرتے ہیں اوراس اعجاز کو قرآن کریم کی سحر انگیز بلاغت عمدہ بیانی، حیرت انگیز نظم اوراس کی دلکش فصاحت پر مبنی قرار دیتے ہیں پس بلاشبہ قرآن کریم بلاغت واعجاز کی اعلیٰ بلندیوں پر نظر آتا ہے۔اور قرآن کو جب بطور چیلنج پیش کیا گیا تو زبانیں گنگ ہوگئیں اور اہل قلم اپنی بے بسی پر شکوہ کناں تھے اور قرآن کے مقابلے میں ان پر عجز وبے بسی کی دائمی مہر لگ گئی سرکردہ اہل بلاغت قرآن کی بلاغت کا کھلے دل اعتراف کرتے ہیں۔ الولید ابن المغیرہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کو سن کر یہاں تک کہہ دیا کہ بخدا تم میں کوئی مجھ سے زیادہ شعر، رجز، قصیدہ اور جنوں کے اشعار کا علم نہیں رکھتا اور بخدا اس سلسلے میں جو کچھ بھی ہم کہتے ہیں اس کی اس سے مشابہت نہیں ہے۔ اور بلاشبہ ان کی گفتگو میں ایک مٹھاس اور نکھار ہے۔ اس کا اوپری حصہ پھلدار اور نچلا حصہ سرسبز وشاداب ہے اور بلاشبہ اس کی بلندی مسلم ہے اوراس سے بلند کوئی چیز نہیں۔

اور جاحظ ہی کے نقش قدم پر صاحب "دلائل الاعجاز" عبدالقاہر الجرجانی چلے ہیں جو کہ قرآن کریم کے اعجاز کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اور یہ اعجاز ان کو عربی نظم کی خصوصیات اوراس کی باریکیوں میں نظر آتا ہے اور قرآن کریم کا اعجاز اس کی جدت طرازی جو کہ عظیم خصوصیت میں سے ہے اور فاضلانہ اور فائق ترین اسلوب اور عجیب وغریب خیرہ کن وصفیہ انداز اس کے اعجاز پر دال ہے۔ یہاں تک کہ ساری مخلوق کو عاجز کردیا یہاں تک کہ زبانیں گنگ ہوگئیں اور کوئی امکانی شکل نظر نہیں آئی۔ جیسا کہ عبدالقاہر خود کہتے ہیں: قرآن

کے نظم اور اس کے الفاظ کے سیاق وسباق کی خصوصیات اور قرآن کریم کی آیات کی ابتداء وانتہاء جس نے انہیں خیرہ کرکے رکھ دیا اور الفاظ کے موقع محل اور ان کا استعمال اور ہر مثال اور خبر کے موقع و محل لوگوں کو عاجز اور بے بس بنادیا کہ اس جیسا کلام پیش کرسکیں۔ پس ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں انہوں نے ایک ایک سورۃ ایک ایک جزاور ایک ایک آیت پر غور کیا نتیجۃً پورے قرآن میں ایک جملہ بھی ایسا نظر نہیں آیا جو بے محل ہو۔ بلکہ ایسا منظم اور مرتب نظر آیا کہ عقلیں حیران رہ گئیں اور لوگ اس کے سامنے عاجز اور بے بس نظر آئے۔

قاضی باقلانی نے قرآن کریم کے جملہ اعجاز کو تین حصوں میں تقسیم کرکے شمار کیا ہے:

قرآن کریم کا غیب کے بارے میں خبر دینا جہاں تک انسانی علم کی رسائی ناممکن ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری طور پر امی ہونے کے باوجود قرآن کریم کا گذشتہ قوموں کے بارے میں اطلاع فراہم کرنا: نظم قرآن کریم اور اس کی حیرت انگیز تالیف اور اس کی دلکش بلاغت جہاں خلق خدا عاجز نظر آتی ہے: اور باقلانی نے قرآن کریم کے نظم میں اس کے اعجاز کی صورتوں کی تشریح کی ہے اور قرآن کے چیلنج اور اس کے اعجاز اور اس سے ملحقہ جملہ چیزوں کے بارے میں اپنی مشہور تصنیف ''اعجاز القرآن الکریم'' میں بحث کی ہے۔ اس مشہور کتاب کے بارے میں ابن العربی کا قول ہے کہ اس جیسی تصنیف کی نظیر نہیں ملتی۔

اور قاضی ایاض نے اپنی کتاب ''الشفا'' میں قرآن کریم کے اعجاز کو بیان کیا ہے اور اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) پہلی چیز قرآن کریم کی نزاکت تالیف اس کے الفاظ کا باہمی اتحاد، اس کی فصاحت، اس کے ایجاز کی مختلف شکلیں اور اس کی غیر معمولی بلاغت، اور دوسری چیز اس کا عجیب وغریب نظم اور ایسا انوکھا اسلوب جو کہ عربوں کے کلام اور ان کے نظم ونثر کے اسلوب کے برعکس ہے۔ اور تیسری چیز غیب کا علم فراہم کرنا۔ اور چوتھی چیز گذشتہ صدیوں، ہلاک شدہ قوموں اور ایسی شریعتیں جن کا نام ونشان مٹ گیا ہو ان کے واقعات واخبار سے پردہ اٹھانا۔

علماء کرام نے قرآن کریم کے اعجاز کی جن شکلوں کو بیان کیا ہے ان میں سے بعض یہ

ہیں: جیسے قرآن کریم کے تلاوت کے وقت اس میں نئے پن کا احساس اور قرآن کریم میں علوم و معارف کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر جس کا احاطہ دانشوران اقوام بھی نہیں کر سکے، ماضی و مستقبل کی خبروں پر مشتمل ہونا، اس کے باہم بعض اجزاء کا مشابہ ہونا، اس کے انوع واقسام میں حسن ترتیب واتحاد کا پایا جانا، ایک قصے کو بہت اچھے انداز میں ختم کر کے دوسرے کا آغاز کرنا، اور اسی طرح ایک باب سے دوسرے باب میں منتقل ہونا، اور بعض علماء قرآن کریم کے اعجاز کو اس حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم تناقض سے خالی ہے اور پیچیدہ معانی پر مشتمل نہیں ہے۔ اور بعض علماء کے خیال میں ہر سورت کے ابتداء، درمیان وانتہاء میں اور آیات کے آغاز واختتام میں قرآن کریم جن ظاہری خصوصیات اور اچھوتے جمال کو سمیٹے ہوئے اس کے اعجاز کی بین دلیل ہے۔

سیوطی نے اپنی کتاب ''الاتقان'' (جن کا موضوع اعجاز قرآن ہے) میں علماء کرام کے بعض رایوں پر روشنی ڈالی ہے۔

امام رازی کے خیال میں قرآن کا اعجاز اس کی فصاحت، انوکھے اسلوب اور اس کے جملے عیوب سے بری ہونے میں مضمر ہے اور امام زملکانی اس کے اعجاز کو اس کا مخصوص انداز تالیف قرار دیتے ہیں۔

اور ابن حزم ''منہاج البلغاء'' میں رقم طراز ہیں کہ ''قرآن کریم میں اعجاز کا پہلو یہ ہے کہ پورا قرآن کریم از ابتداء تا انتہاء فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر برابر گامزن رہا ہے اور کہیں بھی ذرہ برابر اس معیار سے نیچے نہیں نظر آتا اور ایسا انداز بیان انسان کی وسعتوں سے پرے ہے''۔

اور امام خطابی کے خیال میں اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز اس کی بلاغت میں مضمر ہے۔ لیکن اس کی تفصیل ان کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے اس سلسلے میں وہ لوگ ذوقی فیصلے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پھر مزید بر آں کہتے ہیں: یہاں تک تمہیں قرآن کریم کے الفاظ سے زیادہ فصیح، سلیس اور شیریں لفظ نہیں ملے گا اور نہ ہی اس سے بہتر منظم کوئی کتاب نظر آئے گی جسن تالیف اور باہم متحد و مشابہ ہونیکے اعتبار سے، اور جہاں تک اس کے معانی کا سوال ہے پس کوئی بھی ذی شعور یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان معانی کو اپنے مفہوم کی ادائیگی میں برتری حاصل ہے اور اس

سے بہتر کوئی تعبیر نہیں اپنائی جاسکتی،
اس کے علاوہ بھی اعجاز قرآن کے سلسلے میں رائیں ہیں جو کہ باہم مختلف ہونے کے باوجود ایک گہرے ٹھاٹھے مارتے سمندر کی ایک ہی لہر سے جڑی ہوئی ہیں اگر چہ یہ سب کی سب قرآن کریم کی شان و شوکت اور اس کے عظیم اعجاز کے رموز و تاثیر اور بلندی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور قدماء نے قرآن کریم کے اعجاز کی تحقیق میں اپنی اپنی گراں مایہ زندگیاں گزار دیں پھر بھی قرآن کریم کے اعجاز کے نقطۂ انتہا کو نہ پہنچ سکے، اور بعد میں آنے والوں نے بھی اس سلسلے میں گفتگو کی اگر چہ کوئی خاص چیز نہیں پیش کر سکے۔ پس بعض نے قرآن کی روحانی اور انوکھی طاقت اس کے نامعلوم تاریخی واقعات پر روشنی ڈالنے کو اور علمی و منطقی اسلوب کو اسکا اعجازی پہلو شمار کیا اور کچھ بعض دوسرے پرانی رایوں کی تشریح و تنقید کرتے ہوئے رد کرتے ہیں۔

قرآن کریم کی بلاغت کے رموز اور اس کے اعجاز کے سمجھنے میں یہ سب کی سب صورتیں علماء کی ثقافت، ان کی عقل ان کی قوت و فکر اور ان کی سوچ پر مبنی ہے۔

اور اب ہم قارئین کی توجہ صرف قرآن کریم کی ادبی فطرت کی طرف مبذول کرائیں گے۔ پس تفہیم و تنقید اور اعجاز کے مسئلے میں حکم کے ذریعہ ہم اس کی ادبی فطرت کا دعویٰ پیش کرتے ہیں۔

محمد ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک کتاب نازل کی گئی جو کہ انسانی قوانین میں دستور اعظم کی حیثیت سے جانی گئی اور ادبی بلاغت کی تاریخ میں ایک عمدہ ترین کتاب کا علم ہوا۔ اور آپ ﷺ نے عربوں کو اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی اور اس سلسلے میں وہ قرآن کریم عربوں پر بطور استدلال پیش کرتے۔ اور وہ صبح و شام ان کو آواز دیتے کہ ایک سورت یا چند آیات اس کے مقابلے میں وہ پیش کریں اگر اس کو جھوٹ مانتے ہیں۔

اور چیلنج کا انداز جتنا تیز تر ہوتا جاتا اتنا ہی وہ لوگ عاجز بے بس اور مضحکہ خیز نظر آتے۔ جب کہ فن بیان میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور خطیبوں، شاعروں اور بلیغوں کی بہتات تھی۔ پھر نسلیں گزر گئیں، اور ادباء، و اہل علم تنقید نگار اہل بلاغت اور مؤلفین حضرات قرآن کریم کے اعجاز کو تسلیم کرتے اور فصاحت و بلاغت اور بیان کی جس منزل پر

قرآن نظر آتا ہے اس کے عشر عشیر تک پہنچنے میں بھی اپنے آپ کو عاجز قرار دیتے ہیں۔
ارو خالص ادبی فطرتیں برابر اس کے گن اور کبریائی کے ترانے گاتی رہتی ہیں اور جھومتی رہتی ہیں جب کبھی بھی کوئی آیت یا سورت ان کے گوشگزار ہوئی۔ اور قرآن کریم اور اس کے علاوہ دیگر ادبی دینی و عقلی کتابوں کے درمیان موازنہ ہمیشہ ناممکن رہا ہے۔

کیوں کہ اس کے اور دیگر کتابوں میں زمین و آسمان کی دوری جیسا فرق ہے پس کیا یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور محمد ﷺ کا انوکھا معجزہ اور انکی رسالت کی تصدیق میں منہ بولتی دلیل نہیں ہے؟ اور بلاشبہ یہ قرآن کریم کا انوکھی بلاغت کا مظہر ہے اور اس کے اعجاز پر بین دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل کردہ کتاب ہے۔

اخیر میں اس بحث کے اختتام سے پہلے قرآن کریم کے اعجاز کے چند درج ذیل واضح رموز کو بیان کروں گا۔

۱- قرآن کریم کی ایسی نادر بلاغت جسکا احاطہ کیا جانا ناممکن ہے کوئی محقق اسکے جملے خوصوصیات پر روشنی ڈالنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اور یہ کافی ہے کہ قرآن بلاغت اور اس کے رازوں کے مظاہر کو واضح کرنیکے لئے بلاغت و تنقید اور اعجاز کے علوم کو وضع کیا گیا۔ پھر اب دسیوں صدیاں گزر گئیں یہ علوم مقصد کے پہلے حصے ہی میں رہے جب کہ قرآن کریم کی بلاغت اس کے استعارات، کنایات و تشبیہات، امثال حکمت، ایجاز اور مجاز کے بارے میں بحث و تحقیق سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

۲- قرآن کریم کی جمال و رعنائی اور اس کی ندرت وجدت اور اسکا قلوب واحساسات وجذبات کو چھو لینا۔

۳- اس کا (قرآن) انسانی زندگی کے جملہ ادوار کی تصویر کشی کرنے کی عظمت اس کے ماضی وحال و مستقبل کی پیکر تراشی کرنے کی عظمت اور انسانی نفوس کیلئے صلح و جنگ کے بارے میں اور لھو ولعب اور سنجیدگی کے بارے میں، امید اور غم کے بارے اور کفر وایمان کے بارے میں قرآن کی عظیم تصویر گری، اور ایسی شریف ومہذب زندگی کی اعلیٰ قدروں کی تصویر کشی کرنا جس پر انسان عمل پیرا ہو اور انسانیت اس مامون ماحول میں زندگی بسر کرے۔

۴- قرآن کریم کی روح کی بلندی اس طور سے کہ نہ وہ قصے کہانی کی کتاب ہے نہ

تفریح طبع کا سامان ہے نہ ادب وحکمت اور فلسفے کی کوئی کتاب ہے اور نہ ہی تاریخ یا اس اجتماعیات کی کوئی کتاب ہے۔ بلکہ زندگی کی ثقافت اور اس کے حقائق میں جو کچھ بھی ہے اس کا لب لباب ہے مزید بر آن یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ یہ روحانی اجتماعی اور مکمل صحیح وسالم انسانی زندگی گزارنے کا کامل ومکمل طریقہ ہے۔ اور یہ کہیں تو کتنا بہتر ہوگا کہ یہ پوری انسانیت کی کتاب ہے۔

۵- عربوں کی زبان وادب اور ان کی زندگی اور مسلمانوں ودنیا والوں کی زندگی میں اس کے ادبی نقش کا جلال۔

۶-زمان ومکان کی لاکھ تبدیلی کے باوجود اسکا علیحالہ باقی رہنا۔ عوم الناس کا اس کے چیلنج کو قبول نہ کرپانا جب کہ اس کا چیلنج برابر ساری انسانیت کے لئے رہا ہے جب کہ دنیا کی تاریخ ایک سے ایک عبقری مفکر ادیب اور بلیغ سے بھری پڑی ہے۔

۷- قرآن کے اسلوب کا سہل پسند اور واضح ہونا اور اسکے اندر فنی جمال، قوت وطاقت اور مٹھاس کا پایا جانا۔

۸- اس کے معانی وحکمت کی بلندی اس کی دعوت کا جلال اس کی دلیلوں کی سچائی، اس کے فکر کی گہرائی وبالیدگی اور تصویر کشی بلندی۔

۹- قرآن کریم کے اعجاز کی آخری دلیل اس کے مقاصد واغراض کی بلندی میں ہے، اس کے پیغام ومقاصد کی عبقریت میں ہے اور ساری انسانیت کو ایک زندگی کی طرف آواز دیتا ہے جس میں امید، سعادت، ونیک بختی کی کرن ہے۔

امن وسلامتی بھلائی وبھائی چارگی کا پیغام ہے، حق وانصاف اور آزادی کا بول بالا ہے اور لوگوں کے درمیان آزادی وبرابری کی آواز اٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا :

﴿ تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیراً ﴾

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆
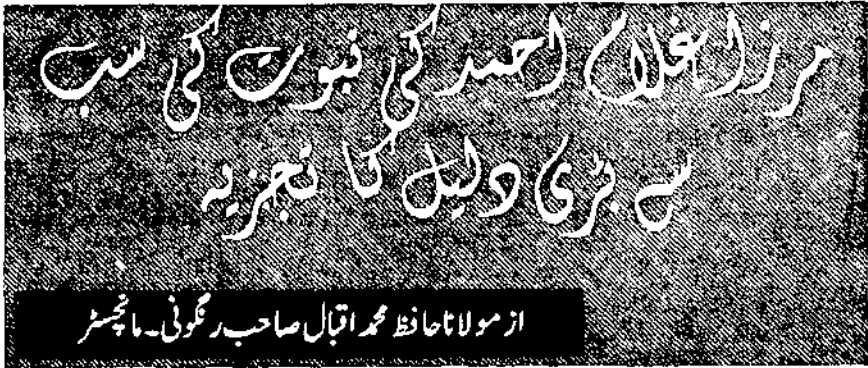
مرزا صاحب حضور کے نقش قدم پر ہے یا مشرکین مکہ کے؟ قادیانی فیصلہ کریں !

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن کریم نے انبیاء گزشتہ کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں اور ان مقدس ترین انسانوں کے ساتھ ان کی قوموں کے مناظرے مباحثے اور معرکہ آرائی کے تذکرے بھی کئے ہیں تاکہ آنحضرت ﷺ کی امت انبیائے گزشتہ کے حالات سے سبق لے اور ان کی قوموں کی نافرمانیوں اور ان کی زبان درازیوں سے اجتناب کرے۔ آنحضرت ﷺ نے جب اعلان نبوت فرمایا تو آپ کے مکذبین اور منکرین نے کہا کہ اگر وہ خدا کے نزدیک مجرم ہوتے اور خدا کے ہاں ان کے لئے کوئی جگہ نہ ہوتی تو وہ اتنے خوشحال کبھی نہ ہوتے۔ ان کی خوشحالی اور دولت کی فراوانی اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے نزدیک وہ مجرم نہیں بلکہ انہیں تقرب الٰہی کی دولت حاصل ہے۔ یہ بات صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہی پیش نہیں آئی بلکہ ہر دور کے مکذبین اور مجرمین نے اپنے زمانہ کے اہل حق کے سامنے یہی بات دہرائی ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَرْيَةٍ مِنْ نَذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (پ ۲۲ سبا ۳۴، ۳۵)

(ترجمہ) اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے

خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس (دین) کے منکر ہیں جسے لے کر تم کو بھیجا گیا ہے اور انہوں نے کہا کہ ہم تو مال واولاد میں (تم سے) زیادہ ہیں اور ہم کو عذاب ہوتا نہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق کے مخالفین کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ چلا آرہا ہے کہ وہ اپنی خوشحالی کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر اہل حق کو ان کی غربت و عسرت کا طعنہ دیتے رہے اور دلیل میں اسی مال و دولت کی فراوانی پیش کرتے رہے ہیں مولانا عبد الماجد دریا آبادی لکھتے ہیں :

خوش حال طبقہ ہر ملک اور ہر دور میں خدائی تعلیمات سے انکار میں آگے رہا ہے وہ اپنے بر سر حق ہونے اور اپنے مسلک کو حق بجانب قرار دینے میں اپنی کثرت اور مرفہ الحالی کو پیش کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ ہمیشہ یوں ہی اقبال مند رہے گا چنانچہ یہاں خوش حال منکرین کا طبقہ اپنے آخرت فراموش مسلک زندگی کے جواز میں اپنی کثرت آبادی اور اپنی دولت کو پیش کر رہا ہے (تفسیر ماجدی ۸۶۷)

حضرات انبیاء کرام کے اخلاق و کردار تو بے مثل رہے ہیں تاریخ میں ایک بھی واقعہ ایسا نہیں ملتا جہاں کسی اہل حق نے اپنے مال و دولت کو اپنے حق ہونے کی دلیل سمجھا ہو یا مخالفین کے سامنے اسے بطور دلیل کے پیش کیا ہو۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ کثرت مال سے اجتناب کیا اور مخالفین کے دعوی کو استدراج قرار دے کر خدائی قہر کا نشان سمجھا۔ قرآن کریم اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں کی کھلی تردید کرتا ہے :

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (پ ۱۰ التوبہ ۵۵)

(ترجمہ) سو ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں اللہ کو تو بس یہ منظور ہے کہ انہی (نعمتوں) کے ذریعہ انہیں دنیا کی زندگی میں عذاب دیتا رہے اور ان کی جان نیں ایسی حالت میں نکالے کہ وہ کافر ہوں۔

سو مال و دولت اور چندے کی کثرت کو حق کا عنوان بتانا کبھی اہل حق کا طریقہ نہیں رہا۔ یہ مکذبین اور مجرمین کرتے رہے ہیں۔ یاد رکھئے دنیوی نعمتوں کیلئے مقبولیت کچھ بھی شرط نہیں ہے۔

مرزاغلام احمد نے جب مامور من اللہ ہونے کا دعوی کیا تو اس نے کہا کہ میرے سچے ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دور دور سے میرے پاس پیسے آرہے ہیں اس کی تصدیق ڈاکخانوں سے کرو جبکہ ہمارے مخالفین بڑی تنگی اور تکلیف میں گذارہ کررہے ہیں۔

مرزاغلام احمد کا یہ بیان اس کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب مدراسی ہر سال مدراس سے قصد کرکے قادیان میں پہنچتے ہیں اور بدل و جان ہمارے سلسلہ امداد کیلئے سرگرم ہیں اگرچہ ان کی خدمات بہت بڑھی ہوئی ہیں اور ضرورت کے وقتوں پر ہزارہا روپیہ کی مدد ان سے پہنچتی ہے لیکن ایک فرض لازم کی طرح ایک سو روپیہ ماہواری اس سلسلہ کی مدد کیلئے انہوں نے مقرر کر رکھا ہے جو بغیر ناغہ ہمیشہ ماہ بماہ پہنچتا ہے۔ ایسا ہی اپنی اپنی طاقت اور استطاعت کے موافق اور دور دور کے دوست بھی ہیں جو ہمیشہ قادیان میں آتے ہیں اور مالی خدمات بجالاتے ہیں۔ اس جز کی دوسری پیشگوئی کی دور دور سے خدا کی مدد آئے اس کی تصدیق ڈاکخانہ کے رجسٹروں سے ہو سکتی ہے کہ کس ضلع دور دراز سے لوگ روپیہ بھیجتے ہیں کیا آج سے بیس سال پہلے کسی کے گمان میں تھا کہ اس قدر دور دراز ملکوں سے روپیہ آئیں گے۔

(تریاق القلوب ص ۱۴۳۔ ر۔خ۔ ج۱۵ ص ۲۷۰)

مرزاغلام احمد کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے نزدیک حق کی نشان دور دور سے پیسے کا آنا اور ماہواری روپیہ کا جمع ہونا ہے۔ اس پر آئی وحی کہ خدا کی مدد دور دور سے آئے گی کا معنی بھی اس کے نزدیک یہی ہے کہ خوب پیسے آئیں گے اور لوگ اسے منی آرڈر بھیجیں گے۔ پھر مرزاغلام احمد نے اپنے مخالفین کے بارے میں لکھا:

دیکھو ہمارے مخالفین مولوی کس قدر تنگی اور تکلیف سے گذارہ کرتے ہیں اور کیسے بعض ان کے اب اپنے منصوبوں کو چھوڑ کر کلبہ رانی کی ذلت اٹھانے کو بھی تیار ہیں مگر اس جگہ آسمانی برکتوں کی بارش ہو رہی ہے (ایضاً ص ۱۴۳)

کیا یہ وہی اعتراض اور طنز نہیں جو ہر دور میں خدا کے باغی اہل حق کو دیتے رہے؟ کیا قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ بات موجود ہے کہ جس کو زیادہ چندہ ملے وہ حق پر ہے؟

کیا تیرہ سو سال میں کسی ایک اہل حق نے یہ کہا کہ جو لوگ تنگی اور تکلیف میں گذارہ کرتے ہیں وہ خدا کی مدد و نصرت سے محروم ہیں اور ان کا سلسلہ حق کا سلسلہ نہیں؟

یہ بات کس سے پوشیدہ ہوگی کہ اسلام کی گاڑی انہی غرباء اور ضعفاء سے چلی ہے اور انہی فقراء نے اسلام کا جھنڈا چہار دانگ عالم میں لہرایا ہے۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ مرزا غلام احمد مامور من اللہ ہونے کا دعوی کرتا ہے اور خدا کے باغیوں کا اعتراض پیش کر کے اسے اپنی صداقت کی نشانی بتاتا ہے۔ مرزا غلام احمد آگے چل کر لکھتا ہے :

اگر تم شک میں ہو اور ان برکات پر جو میرے پر نازل ہوئیں ہیں تمہارا یقین نہیں ہے اور تم اپنے تئیں بہتر اور یا اپنے دین کو سچا سمجھتے ہو تو آؤ اس فیصلہ کیلئے ایسا کرو کہ اپنے مکان پر خدا تعالی سے چاہو کہ کوئی ایسے نشان اور برکات تمہاری عزت ظاہر کرنے کیلئے دکھلاوے جن سے ثابت ہو کہ تمہیں جناب الہی میں مقام قرب ہے اور میں بھی اپنے مکان میں خدا تعالی سے چاہوں گا کہ میری عزت اور فضیلت ظاہر کرنے کیلئے بالمقابل کوئی ایسے برکات اور نشان ظاہر کرے جن سے صریح ثابت ہو کہ مجھے جناب الہی میں مقام قرب حاصل ہے۔ (ایضا ص ۲۷۲)

مرزا غلام احمد کی یہ تحریر بتاتی ہے کہ اس نے دور دور سے چندے آنے کو مقام قرب الہی قرار دیا اور مخالفین سے کہا کہ اگر تمہارے مکان پر چندہ آتا ہے تو تم اپنے تئیں سچے ہوگے۔ چونکہ میرے پاس دور دور سے چندہ آتا ہے اور میرے مکان پر منی آرڈر پہنچتے رہتے ہیں اسلئے مجھے قرب الہی کی دولت حاصل ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آنحضرت ﷺ کی سیرت پڑھنے والے سے یہ بات مخفی نہیں کہ حضورؐ کے اپنے گھر میں کئی دن تک چولھا نہیں جلتا تھا آپ تنگی اور فاقہ میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اگر کبھی آپ کی بیٹی نے کام کاج کیلئے کوئی خادمہ مانگی تو آپ نے انہیں بھی یہ کہدیا کہ اصحاب صفہ ان سے زیادہ محتاج ہیں۔ آپ کے قدموں میں دولت کے ڈھیر رکھے جاتے مگر شام ہوتے ہی یہ مال فقراء میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ کیا حضورؐ آسمانی برکتوں سے محروم تھے؟ (معاذ اللہ) کیا خدا کی مدد و نصرت آپ کے شامل نہ تھی؟ عیش و عشرت کی

زندگی کو خدائی قرب کا نشان سمجھنا اور تنگی و غربت کی زندگی کو خدائی قہر جاننا کافروں اور مشرکوں کا عقیدہ رہا۔ ایمان والوں کا عقیدہ کبھی نہیں رہا۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرزا غلام احمد آنے والے چندے کو قادیان کے غریبوں پر خرچ کرتا تھا اور اپنے گھر والوں کیلئے کچھ بھی نہ رکھتا تھا وہ غلط کہتے ہیں۔ مرزا غلام احمد کے گھر میں زیورات اور مال و دولت کی خاصی رونق تھی۔ قادیان میں مرزا صاحب کی بیگمات اور صاحبزادیوں کے زیورات کا عام چرچا تھا۔ مرزا غلام احمد کے کئی قریبی ساتھیوں نے اس کی شکایت کی ہے اور بتایا ہے کہ مرزا صاحب کے گھر خاصا زیور جمع تھا۔ خود مرزا غلام احمد نے ۲۵ جون ۱۸۹۸ء کو جائداد کے سلسلے میں جو قانونی کاروائی کی تھی اس میں انہوں نے ان زیورات کی فہرست بھی دی جو ان کی بیوی کے پاس موجود تھے۔ لاہور کے پیر بخش پنشنر پوسٹ ماسٹر نے اپنی کتاب تردید نبوت قادیانی (مطبوعہ جنوری ۱۹۲۵ء) میں رجسٹرار کے سامنے دی جانے والی یہ فہرست نقل کی ہے۔ آپ بھی دیکھئے :

مرزا صاحب کے زیورات کی فہرست ذرا سن لو پھر خود انصاف کر لینا۔ کڑے کلاں طلائی قیمتی ۷۵۰ روپیہ۔ کڑے خورد قیمتی ۲۵۰ روپیہ۔ بندے طلائی ۵۰۰ روپیہ۔ کنٹھ کلائی ۲۲۵ روپیہ۔ کڑے کنگن کلائی قیمتی ۲۲۰ روپیہ۔ ڈنڈیاں نسبیاں۔ بالے گھنگھرو والے سب دو عدد کل قیمت ۶۰۰ روپیہ۔ حسیاں خورد طلائی قیمتی ۳۰۰ روپیہ۔ پونچیاں طلائی بڑی ۴ عدد قیمتی ۱۵۰ روپیہ جو جس و مونگے ۴۰ عدد چناں کلاں ۳ عدد طلائی قیمتی ۲۰۰ روپیہ۔ چاند طلائی قیمتی ۵۰ روپیہ۔ بالیاں جڑاؤ سات ہیں ۱۵۰ روپیہ۔ نتھ طلائی قیمتی ۴۰ روپیہ۔ ٹیب جڑاؤ طلائی قیمتی ۷۰ روپیہ۔ میزان قیمت کل تین ہزار پچیس روپیہ ہے۔

(تردید نبوت قادیانی ص ۸۵ مطبوعہ کریمی پریس لاہور جنوری ۱۹۲۵ء بار دوم)

(نوٹ) راقم الحروف کے پاس پیر بخش صاحب کا یہ قیمتی اور نایاب رسالہ موجود ہے۔ یاد رہے کہ زیورات کی یہ قیمت ۱۹۹۸ء کی نہیں بلکہ سو سال پہلے (یعنی ۱۸۹۸ء) کی ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگالیں کہ مرزا صاحب کے گھر میں دولت کی کتنی ریل پیل تھی اور خواہشات نفسانی کے مردہ ہونے کا مدعی کس طرح دولت و زیور میں کھیل رہا تھا اب

لہ مرزا غلام احمد یہ کہیں کہ ہمارے مخالف مولوی اتنے زیورات اور جائداد پیش کیں گے تو
ا سمجھیں گے کہ ان پر بھی آسمانی برکات کا نزول ہوتا ہے ورنہ وہ حق پر نہیں کیونکہ ان کے
س اس قدر زیور نہیں ہیں تو آپ ہی بتائیں کیا مرزا غلام احمد کی یہ بات صحیح ہے قرآن
ریم نے مرزا غلام احمد کو اس چیلنج کا جواب دے دیا ہے اور بتایا ہے کہ چندے کی زیادتی اور
یورات کی بھرمار تقرب الٰہی کی علامت نہیں ہے۔ اللہ کا تقرب انہیں ملتا ہے جو مومن
ہیں اور عمل صالح کی دولت رکھتے ہیں اور دولت کو ہی سب کچھ سمجھنے والے خدا کے عذاب
میں گرفتار ہوں گے۔

وَمَاۤاَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّامَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَاۤءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْاوَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ آمِنُوْنَ وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْۤ آیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (پ ۲۲ س ۳۷۔۳۸)

(ترجمہ) تمہارے مال اور تمہاری اولاد (کوئی بھی) ایسی چیز نہیں جو تم کسی درجہ میں ہمارے مقرب بنادے مگر ہاں جو کوئی ایمان لائے اور نیک عمل کرے سے ایسے لوگوں کیلئے ان کی عمل کا کہیں بڑھا ہوا صلہ ہے اور وہ بالا خانوں میں چین سے بیٹھیں ہونگے۔ اور جو لوگ ہماری آیتوں کے باب میں کوشش کررہے ہیں تو وہی عذاب میں لائے جائیں گے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

فراخی یا تنگی اللہ کے خوش یا ناخوش ہونے کی دلیل نہیں۔ دیکھتے نہیں۔ دنیا میں کتنے بدمعاش شریر دہریئے ملحد مزے اڑاتے ہیں حالانکہ ان کو کوئی بھی اچھا نہیں کہتا اور بہت سے خدا پرست پرہیزگار اور نیک بندے بظاہر فاقے کھینچتے ہیں معلوم ہوا کہ دولت وافلاس یا تنگی و فراخی کسی کے محبوب و مقبول عند اللہ ہونے کی دلیل نہیں۔ یہ معاملات تو دوسری مصالح اور حکمتوں پر مبنی ہیں جن کو اللہ ہی جانتا ہے مگر بہت لوگ اس نکتہ کو نہیں سمجھتے۔

و من الدلیل علی القضاء و حکمہ : بؤس اللبیب و طیب عیش الاحمق

(فوائد القرآن ص ۵۷۶)

اس سے پتہ چلا کہ تونگری خوشحالی اور چندہ کی زیادتی یا فقر وفاقہ اور غربت و عسرت کا تعلق دنیا کی تکوینی اور انتظامی معاملات سے ہے اسے حق و باطل کا عنوان بنانا اہل باطل کا طریقہ ہے۔ اگر کثرت مال قرب الٰہی کا نشان اور غربت و تنگی خدا سے دوری کا عنوان بن جائے تو پھر خدا کے لاکھوں باغی ولیوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں گے اور لاکھوں انبیاء کرام اور اولیاء عظام خدا کے ہاں بے وقعت ہی نہیں بلکہ مجرم بن جائیں گے (معاذاللہ) اگر ہماری یہ بات غلط ہے اور یقیناً غلط ہے تو پھر مرزا غلام احمد کی یہ بات بھی باطل اور مردود ہے کہ اس کے مکان پر تو خوب چندہ آرہا ہے اور اس کے مخالف مولوی تنگی میں زندگی گذار رہے ہیں اسلئے وہ سچا اور مولوی سب کے سب جھوٹے ہیں۔

مرزا غلام احمد کے الہامات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے الہامات بھی اسی مال کے گرد گھومتے ہیں۔ اور وہ اسی کو اپنی سچائی کا نشان بتاتا ہے۔

(۱) مرزا صاحب کو ایک مرتبہ پیسے کی ضرورت تھی۔ اس پر الہام ہوا

دیکھ میں تیری دعاؤں کو کیسے جلد قبول کرتا ہوں تب میں خوش ہوا اور اس جنگل سے قادیان کی طرف واپس آیا اور سیدھا بازار کی طرف رجوع کیا تاکہ قادیان کے سب پوسٹر سے دریافت کروں کہ آج ہمارے نام کچھ روپیہ آیا ہے یا نہیں چنانچہ ڈاک خانہ سے بذریعہ ایک خط اطلاع ہوئی کہ پچاس روپیہ لدھیانہ سے کسی نے روانہ کئے ہیں۔

(تریاق ص۔ ر۔ خ۔ ج ۱۵ ص ۲۹۵)

(۲) ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ حیدر آباد سے نواب اقبال الدولہ صاحب کی طرف سے خط آیا ہے اور اس میں کسی قدر روپیہ دینے کا وعدہ ہے پھر تھوڑے دنوں بعد حیدر آباد سے خط آیا اور سو روپیہ نواب صاحب نے بھیجا　　(ایضاً ص ۲۶۰)

(۳) پھر ایک دفعہ مرزا صاحب کو پیسے کی ضرورت ہوئی۔ اس نے دعا کی خدا تعالیٰ مال بھیج کر ایک نشانی دے اس پر الہام ہوا:

دس دن کے بعد میں موج دکھاتا ہوں دن یو گو ٹو امرتسر ...... دس دن کے بعد روپیہ آئے گا تب تم امرتسر بھی جاؤ گے ...... دس دن تک کچھ نہ آیا گیارھویں دن محمد فضل خان صاحب نے راولپنڈی سے سو روپے بھیجے بیس روپے ایک اور جگہ سے آئے اور پھر برابر روپیہ کا سلسلہ ایسا جاری رہا جسکی امید نہ تھی امرتسر بھی جانا پڑا (ایضاً ص ۲۵۷)

(۴) مرزا صاحب کے ایک مرتبہ الہام ہوا۔ عبد اللہ خان ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ مرزا نے اس وحی کا معنی یہ بتایا کہ۔

آج عبد اللہ خان نام ایک شخص کا ہمارے نام کچھ روپیہ آئے گا.....اتفاقا ان دنوں میں سب پوسٹ ماسٹر قادیان کا ہندو تھا سو وہ ہندو ڈاکخانہ میں گیا اور آپ ہی سب پوسٹ ماسٹر سے دریافت کر کے یہ خبر لایا کہ عبد اللہ خان نام ایک شخص کا اس ڈاک میں خط آیا ہے اور کچھ روپیہ آیا ہے۔ (ایضاً ص ۲۲۹)

(۵) ایک مرتبہ مرزا صاحب پر وحی آئی کہ پچاس روپیہ آنے والے ہیں۔ چنانچہ شیخ بہاء الدین نام مدار المہام ریاست جونا گڈھ نے پچاس روپیہ میرے نام بھیجے (ایضاً ص ۲۵۵)

ہم نے یہ چند واقعات ایک ہی کتاب سے سرسری طور پر نقل کر دئے ہیں اگر آپ مرزا غلام احمد کی ساری کتابوں کو کھنگالیں تو وہاں اسی قسم کے الہامات ملیں گے جس میں پیسے کا ذکر ہو گا کسی کی موت کی پیش گوئی ہو گی۔ طاعون اور زلزلہ کی خبر ہو گی۔ عورتیں ملنے کی خوشخبری ہو گی۔ بچے ملنے کی اطلاع ہو گی۔ قادیانیت کی مالی طور پر ترقی کے دعوے ہونگے اور بس۔

حاصل یہ کہ مرزا غلام احمد نے حق و باطل کا معیار چندہ قرار دیکر منکرین انبیاء اور مشرکین مکہ کی پیروی کی ہے۔ سو وہ اس لائق نہیں کہ اس کو کسی اچھی نظر سے دیکھا جائے۔

﴿ فاعتبروا یا اولی الابصار ﴾

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۹ء

جلد ۸۳ شمارہ ۱۲ فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند	استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپئے

پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/

ہندوستان سے ۶۰/

Tel : 01336-22429

Fax :01336-22768

Tel : 01336-24034 *(EDITER)*

REGD NO.SHN/NP-111/98

فہرست مضامین

☆☆ ختم خریداری کی اطلاع ☆☆

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی۔ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
بنگلہ دیشی حضرات مولانا انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند کی معرفت
مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

قواعد داخلہ

جدید اور قدیم طلبہ کے ترقی تنزل کے ضابطے

جاری کردہ دفتر تعلیمات دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذمہ دارانِ مدارس عربیہ سے درخواست:

حامداً ومصلیاً! حضور ﷺ نے طلبۂ عزیز کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت فرمائی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

ان رجالا یأتونکم من اقطار الارض یتفقهون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بهم خیراً (رواہ الترمذی)

ترجمہ: بیشک بہت سے لوگ زمین کے گوشہ گوشہ سے علم دین میں تفقہ حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس آئیں گے جب وہ آئیں تو تم ان کے بارے میں خیر خواہی کی وصیت قبول کرو۔

اس لیے طلبۂ عزیز کے ساتھ خیر خواہی تمام مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کا فرض اولین ہے، طلبۂ عزیز کے لیے بہتر تعلیم، عمدہ تربیت، اچھا انتظام اور حسب استطاعت راحت رسانی خیر خواہی کے ضمن میں آتی ہے اور الحمد للہ مدارس عربیہ کے ذمہ دار اس وصیت پر عمل پیرا ہیں، ان مدارس میں **دارالعلوم دیوبند** کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کی ترقی علم وفن کی ترقی دین کی ترقی اور مسلمانان عالم کی ترقی ہے۔ ان ہی چیزوں کے پیش نظر ذمہ داران مدارس کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ وہ طلبہ کی استعداد سازی پر سب سے زیادہ توجہ فرمائیں، اور دارالعلوم میں جس جماعت میں داخلہ کا ارادہ ہے وہاں تک قابل اعتماد استعداد کا پیدا ہو جانا دارالعلوم میں حاضری سے پہلے

ضروری سمجھیں اور اسی لئے چند سالوں سے ماہ رجب المرجب ہی میں ضروری اصول و ضوابط کا اعلان کردیا جاتا ہے۔

آپ حضرات سے مخلصانہ درخواست ہے کہ ان چیزوں پر عمل در آمد کے سلسلہ میں خدام دارالعلوم کا تعاون فرمائیں۔

عربی درجات میں جدید داخلے کے قواعد :

(۱) دارالعلوم دیوبند میں عربی درجات کے طلبہ کی تعداد ڈھائی ہزار ہوگی، جن میں دارالافتاء تکمیلات، کتابت، دارالصنائع کے شعبے قدیم طلبہ کے لئے ہیں۔ بقیہ شعبوں میں قدیم طلبہ کے بعد جو عدد باقی بچے گا اس کو جدید طلبہ سے مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ پر کرلیا جائے گا یعنی ہر جماعت کی مقررہ تعداد کو اونچے نمبرات سے شروع کرکے پورا کیا جائے گا۔

(۲) آنے والے جدید طلبہ سب سے پہلے فارم برائے شرکت امتحان داخلہ پُر کریں گے یہ فارم انہیں دفتر تعلیمات سے ۸/ شوال کی شام تک دیا جائے گا واپسی ۹/ شوال کی شام تک ضروری ہوگی۔

(۳) سال اول اور سال دوم کے لئے امتحان داخلہ تقریری ہوگا، تقریری امتحان سے پہلے اردو املاء کا تحریری امتحان ہوگا۔

(۴) سال سوم کے امیدوار جدید طلبہ کا نفحۃ الادب اور ہدایۃ النحو اور نور الایضاح کا تحریری امتحان ہوگا بقیہ تمام کتابوں کا تقریری امتحان لیا جائیگا اور عربی کے سال اول، سال دوم اور سال سوم کا تقریری امتحان ۱۱/ ۱۲/ شوال میں ہوگا۔

(۵) سال چہارم سال پنجم سال ششم سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے امیدواروں کا امتحان داخلہ تحریری ہوگا، امتحان ۱۱/ شوال المکرم سے شروع ہوگا۔

(۶) شعبۂ دینیات دارالعلوم سے فارغ ہوکر آنے والے قدیم طالب علم کا اول عربی میں داخلے کے لئے امتحان نہیں ہوگا۔ اور داخلہ کے خواہشمند جدید طلبہ کے لئے پرائمری درجہ پنجم کے مضامین کی صلاحیت ضروری ہوگی اور فارسی اردو، اردو رسم الخط اور

صرف ونحو کی اصطلاحات کی جانچ ہوگی۔

تمام درجات عربیہ کے لئے پارۂ عم کا صحیح پڑھنا لازم ہوگا۔

سال چہارم، سال پنجم، سال ششم، سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے لئے پچھلے درجات کی تمام کتابوں کا امتحان تحریری ہوگا۔ سال چہارم کیلئے قدوری (از کتاب البیوع تا ختم) ترجمۃ القرآن (سورۂ بقرہ یا سورۂ ق سے آخر تک) شرح تہذیب، نحۃ العرب اور کافیہ یا شرح شذور الذہب یا شرح جامی کا تحریری امتحان ہوگا۔ یہ رعایت صرف امسال کے لئے ہے۔

آئندہ سال ۲۲/۱۴۲۱ھ کیلئے برائے چہارم میں کافیہ یا شرح شذور الذہب کا امتحان ہوگا۔

سال پنجم کے لئے کنز الدقائق مع شرح وقایہ ثانی یا شرح وقایہ اول، دوم، اصول الشاشی، تلخیص المفتاح یا دروس البلاغہ، ترجمۃ القرآن (آل عمران تا سورۂ مریم) یا سورۂ یوسف سے سورۂ ق تک) اور قطبی کا تحریری امتحان ہوگا۔ یہ رعایت صرف امسال کے لئے ہے آئندہ سال ۲۲۔۱۴۲۱ھ کیلئے برائے سال پنجم شرح وقایہ جلد اول و ثانی کا امتحان ہوگا۔

سال ششم کے لئے ہدایہ اول، نورالانوار، مختصر المعانی، سلم العلوم، مقامات حریری، کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال ہفتم کے لئے جلالین، ہدایہ ثانی، حسامی، میبذی، دیوان المتنبی کا تحریری امتحان ہوگا۔ درجہ ہفتم میں داخلے کے لئے قرآن کریم صحیح مخارج سے پڑھنا لازم ہوگا۔ اور دورۂ حدیث کے لئے ہدایہ آخرین مشکوٰۃ شریف، شرح عقائد نسفی، نخبۃ الفکر اور سراجی کا تحریری امتحان ہوگا، نیز پارۂ عم صحیح مخارج کے ساتھ حفظ ہونا ضروری ہوگا اس کا امتحان بروقت لیا جائے گا۔

(نوٹ) اپنی سابقہ تعلیم کی کوئی سند بھی کسی کے پاس ہو تو داخلہ فارم کے ساتھ منسلک کردیں۔

(۷) سال اول ودوم میں نابالغ بیرونی بچوں کا داخلہ نہ ہوگا۔

(۸) جو طالب علم اپنے ساتھ صغیر السن بچوں کو لائے گا اس کا داخلہ ختم کردیا جائیگا۔

(۹) جن امیدواروں کی وضع قطع طالب علمانہ نہ ہوگی مثلاً غیر شرعی بال، ریش تراشیدہ ہونا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہونا یا دارالعلوم کی روایات کے خلاف کوئی بھی وضع ہو انکو شریک امتحان نہ کیا جائیگا اور اس سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

(۱۰) سرحدی صوبوں میں سے آسام و بنگال کے امیدواروں کو تصدیق نامہ وطنیت پیش کرنا ضروری ہوگا۔

تصدیق نامہ وطنیت میں گورنمنٹ اسکول کی ٹی سی یا راشن کارڈ یا شناختی کارڈ برائے ووٹ اور یا ہندوستانی پاسپورٹ کا مصدقہ فوٹو اسٹیٹ کاپی پیش کرنا لازم ہوگا۔ اصل کاپی دیکھنے کے لئے طلب کی جا سکتی ہے اس لئے اصل کاپی بھی ہمراہ لائیں۔

(۱۱) جدید امیدواروں کو لازم ہوگا کہ وہ دارالعلوم آتے وقت تاریخ پیدائش کا سرٹیفک لے کر آئیں یہ سرٹیفک کارپوریشن میونسپل بورڈ ٹاؤن ایریا یا گرام پنچایت کا ہونا ضروری ہے۔

(۱۲) جدید امیدواروں کے لئے سابقہ مدرسہ کا تعلیمی و اخلاقی تصدیق نامہ، اور مارک شیٹ (نمبرات کتب) پیش کرنا ضروری ہوگا۔

(۱۳) نجی تصدیقات یا سماعت وغیرہ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

(۱۴) غیر ملکی امیدوار تعلیمی ویزا لے کر آئیں ٹورسٹ ویزا پر داخلہ نہیں ہو سکے گا فارم برائے شرکت امتحان کے ساتھ پاسپورٹ و ویزا کی فوٹو اسٹیٹ پیش کریں۔

(۱۵) بنگلہ دیشی امیدواران تعلیمی ویزا کے علاوہ حسب ذیل علماء کرام سے تصدیق بھی لے کر آئیں۔

(۱) جناب مولانا قاری عبدالخالق صاحب جامعہ حسینیہ ارض آباد میرپور ڈھاکہ

(۲) مولانا حافظ عبدالکریم صاحب محلّہ چوکی دیگھی سلہٹ، بنگلہ دیش۔

(۱۶) کیرالہ کے امیدواران مندرجہ ذیل علمائے کرام کی تصدیق لے کر آئیں

(۱) مولانا نوح صاحب (۲) مولانا حسین مظاہری (۳) مولانا محمد کویا قاسمی۔ یہ تصدیقات درخواست برائے شرکت امتحان کے ساتھ فوٹو اسٹیٹ کی شکل میں پیش کرنی

ہوگی داخلہ فارم کے اجراء پر اصل تصدیقات پیش کرنا ضروری ہوں گی۔

تنبیہ : طلبہ کو خاص طور پر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ امتحان کی کاپیاں کوڈ نمبر ڈال کر ممتحن کو دی جاتی ہیں اس لئے امیدوار صرف انہیں درجات کا امتحان دیں جن کی وہ تیاری کر چکے ہیں۔ بوقت داخلہ جدید فارم میں جو پتہ لکھا جائے گا اس میں آئندہ کبھی بھی کسی طرح کی ترمیم نہ ہوگی۔

قدیم طلبہ کے لئے :

(۱) تمام قدیم طلبہ کے لئے ۲۰/ شوال تک حاضر ہونا ضروری ہے۔ (۲) جو طلبہ تمام کتابوں میں کامیاب ہوں گے ان کو ترقی دی جائے گی جو طلبہ دو کتابوں میں ناکام ہوں گے ان کا ضمنی امتحان داخلہ امتحان کے ساتھ لیا جائے گا بصورت کامیابی ترقی دی جائے گی ورنہ بلا امداد سال کا اعادہ کر دیا جائیگا اعادۂ سال کی رعایت صرف ایک سال کے لئے ہوگی اور اگر دوسرے سال بھی اعادہ کی نوبت آئی تو داخلہ نہیں ہو سکے گا۔

(۳) عربی سال اول میں مشق تجوید کے اور سال دوم میں جمال القرآن کے نمبرات بسلسلۂ ترقی درجہ اوسط میں شمار ہونگے بقیہ سالوں میں تجوید و کتابت کے نمبرات بسلسلۂ ترقی درجہ اوسط میں شمار نہ ہوں گے۔ البتہ فوائد مکیہ اور صف عربی کے نمبرات ترقی و اجراء امداد کے سلسلہ میں شمار کئے جائیں گے۔

(۴) حسب تجویز مجلس شوریٰ شعبان ۱۴۱۷ھ بقائے امداد کے لئے ۳۳ اوسط لانا ضروری ہوگا۔

(۵) تکمیل ادب میں صرف ان فضلاء کا داخلہ ہو سکے گا جن کا دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اوسط کامیابی ۴۴ ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہوں۔

(۶) امیدواروں کے زیادہ ہونیکی صورت میں نمبرات اور انٹرویو کو وجہ ترجیح بنایا جائے گا۔

(۷) ایک تکمیل کے بعد دوسری تکمیل کے لئے ضروری ہوگا کہ امیدوار نے سابقہ تکمیل میں کم از کم ۴۵ اوسط حاصل کیا ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ رہا ہو

(۸) ایک تکمیل کی درخواست دینے والے دوسری تکمیل کے امیدوار نہ ہوسکیں گے الا یہ کہ انکے درجۂ تکمیل میں تعداد پوری ہونے کے سبب انکا داخلہ نہ ہو سکا ہو

(۹) دارالافتاء کے فضلاء کا کسی شعبہ میں داخلہ نہ ہوگا۔

(۱۰) جس کی کوئی بھی شکایت دارالاقامہ، تعلیمات یا اہتمام میں کسی بھی وقت درج ہوئی ہو اس کو دورۂ حدیث کے بعد کسی بھی شعبہ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۱) کسی بھی شعبہ میں داخلہ لینے والے قدیم فضلاء کو فراغت کے بعد ہی سند فضیلت دی جائے گی۔

(۱۲) کسی بھی تکمیل میں علاوہ افتاء کے داخلہ کی تعداد ۲۰ سے زائد نہ ہوگی اور وہ تعداد مقابلہ کے نمبرات کے ذریعہ پوری کی جائے گی۔

دیگر شعبوں کے بارے میں :

دارالعلوم دیوبند کا بنیادی کام اگرچہ عربی دینیات کی تعلیم ہے، لیکن حضرات اکابر نے مختلف دینی اور دنیوی فوائد اور مصالح کے پیش نظر متعدد شعبے قائم فرمائے، شعبۂ تجوید حفص اردو عربی، شعبۂ خوشنویسی، دارالصنائع وغیرہ، ان شعبوں میں داخلہ کے لیے درج ذیل قوعد پر عمل ہوگا۔

دارالافتاء :

(۱) دارالافتاء میں داخلہ کے امیدواروں کے لیے وقع قطع کی درستگی کی اہمیت سب سے زیادہ ہوگی اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

(۲) دورۂ حدیث سے دارالافتاء کے لیے صرف وہ طلبہ امیدوار ہوں گے جن کا اوسط کامیابی ۴۵ ہوگا۔

(۳) دورۂ حدیث سے دارالافتاء میں داخلے کے امیدوار کے لیے سابقہ تکمیل میں اوسط ۴۶ ر حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

(۴) دارالافتاء میں داخلہ کی تعداد ۲۵ سے زائد نہ ہوگی اور کوشش کی جائے گی کہ

معیار مذکور کو پورا کرنے والے ہر صوبہ کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے۔ لیکن اگر کسی صوبہ سے کوئی امیدوار مندرجہ بالا شرائط کا حامل نہ پایا گیا تو دوسرے صوبوں سے یہ تعداد پوری کرلی جائے گی، ان ۲۵ طلبہ کی امداد جاری ہوسکے گی۔

(۵) دارالافتاء میں ممتاز نمبرات سے کامیاب ہونے والے دو طلبہ کا انتخاب تدریب الافتاء کے لیے کیا جائے گا یہ انتخاب دو سال کے لیے ہوگا۔ اور ان کا وظیفہ ۸۰۰ روپے ماہوار ہوگا۔

شعبۂ دینیات، اردو، فارسی، شعبۂ حفظ قرآن :

(۱) شعبۂ دینیات اردو، فارسی اور شعبۂ حفظ میں مقامی بچوں کو داخلہ دیا جائے گا۔

(۲) دینیات کے درجۂ اطفال شعبہ ناظرہ اور شعبہ حفظ میں مقامی بچوں کا داخلہ ہر وقت ممکن ہوگا۔

(۳) دینیات کے بقیہ درجات میں داخلہ ذی الحجہ کی تعلطیل تک کیا جائے گا اس کے بعد داخلہ نہیں کیا جائے گا۔

شعبۂ تجوید، حفص اردو، عربی :

(۱) حفص اردو میں وہ طلبہ داخل ہوسکیں گے جو حافظ ہوں قرآن کریم ان کو یاد ہو اور وہ اردو کی اچھی استعداد بھی رکھتے ہوں، نیز ان کی عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہو، ان طلبہ میں ۹۰ کی امداد جاری ہوسکے گی۔

(۲) شعبۂ حفص عربی میں ان طلبہ کو داخل کیا جائے گا جنہیں قرآن کریم یاد ہو اور وہ عربی میں شرح جامی یا سال سوم کی تعلیم حاصل کرچکے ہوں ان طلبہ میں دس کی امداد جاری ہوسکے گی۔

(۳) ان طلبہ کی پورے اوقات مدرسہ میں حاضری ضروری ہوگی۔

قرأت سبعہ عشرہ :

(۱) اس درجہ میں داخلہ کے لیے حافظ ہونا ضروری ہے اور یہ کہ وہ عربی کی سال

چہارم تک کی جید استعداد رکھتے ہوں۔

(۳) اس درجہ میں داخل طلبہ کے لیے حفص عربی سے فارغ ہونا ضروری ہے اور ان کی تعداد دس سے زائد نہ ہوگی اور ان دس کی امداد مع وظیفہ خصوصی جاری ہوسکے گی۔

شعبۂ خوشنویسی :

(۱) اس درجہ میں داخل طلبہ کی تعداد تیس ہوگی اور ان کی امداد جاری ہوسکے گی۔

(۲) داخلہ کے امیدوار میں فضلاء دارالعلوم کو ترجیح دی جائے گی۔

(۳) شعبہ میں مکمل داخلہ کے امیدواروں کو امتحان داخلہ دینا ضروری ہوگا اور صرف اس فن کی ضروری صلاحیت رکھنے والوں کو داخل کیا جائے گا۔

(۴) قدیم طلبہ اگر فن کی تکمیل نہیں کرسکے ہیں تو ناظم شعبہ کی تصدیق اور سفارش پر ان کا مزید ایک سال کے لیے غیرامدادی داخلہ کیاجائے گا بشرطیکہ کوئی شکایت نہ ہو۔

(۵) جو طلبہ مکمل امدادی یا غیر امدادی داخلہ لیں گے ان کو اوقات مدرسہ میں بورے چھ گھنٹے درسگاہ میں بیٹھ کر مشق کرنا ضروری ہوگا۔

(۶) جو طلبہ عربی تعلیم کے ساتھ کتابت کی مشق کرچکے ہوں اور ناظم شعبہ ان کی صلاحیت کی تصدیق کریں تو دورۂ حدیث کے بعد مکمل داخلہ اور امداد میں ان کو ترجیح دی جائے گی۔

(۷) تمام طلبہ کے لیے طالب علمانہ وضع اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۸) پہلے نصف سال میں مقررہ تمرینات کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کردیا جائیگا۔

دارالصنائع :

(۱) طالب علمانہ وضع قطع کے بغیر داخلہ نہیں لیا جائیگا۔

(۲) معلم دارالصنائع جن کی صلاحیت کی تصدیق کریں گے ان کو داخل کیا جائے گا۔

(۳) پہلے تین ماہ میں کام کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کردیا جائے گا۔

(۴) اس شعبہ میں دس سے زائد کا داخلہ نہ ہوسکے گا۔ اور ان سب کی صرف امدا طعام جاری ہوسکے گی۔

(۵) اوقات مدرسہ میں پورے وقت حاضر رہ کر کام کرنا ضروری ہوگا۔ ●

عبدیت اور بندگی

قرآن وسیرت اور اقوال سلف کے آئینہ میں

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام نوادہ مبارکپور اعظم گڑھ۔ یوپی

عبدیت اور بندگی اللہ کی عظیم نعمت ہے جو اللہ نے انسانوں کو عطا کی ہے، اللہ تعالیٰ معبود حقیقی ہے اور سارے انسان اس کے بندے ہیں۔ بندہ ہونا عجب شان رکھتا ہے، اسی بندگی اور عبدیت نے انسان کو ساری مخلوقات میں برتر و بالا بنادیا ہے۔ عبدیت اور بندگی میں فروتنی ہے، عاجزی وانکساری ہے، تواضع ہے، خود کو حقیر وذلیل سمجھنا ہے۔ اپنی بے حیثیتی اور بے مائگی کا اقرار واعتراف ہے۔ اپنے کو تہی دست اور کمزور وناتواں ثابت کرنا ہے۔ اپنے فقر ومسکنت کا اظہار ہے۔

اس کے بالمقابل اللہ رب العالمین کو اپنا معبود حقیقی مان کر اس کے سامنے سر طاعت ونیاز خم کردینا ہے، جبین عقیدت جھکادینا ہے، اس کی بے نیازی اور اپنی نیاز مندی واحتیاج کا اعلان کرنا ہے، اس کی برتری وبلندی، عظمت وکبریائی اور اپنی درماندگی وکمزوری کو تسلیم کرنا ہے۔

انسان، معبود حقیقی کی بندگی کرے، یہی اس کی پیدائش کا اصلی مقصد ہے

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۂ ذاریٰت ۵۱/۵۶)

میں نے جنات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ عبدیت اور بندگی کے سب سے اعلیٰ مظہر نماز میں لگ جایئے، اپنے اہل وعیال کو بھی لگادیجیے، رزق کی فکر نہ کیجیے وہ ہمارے ذمہ ہے، ہم آپ سے معاش کے طلبگار نہیں، آپ کا کام صرف یہ ہے کہ اظہار بندگی میں جٹ جائیں۔

وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَانَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (سورۂ طٰہ ۲۰/۱۳۲)

اپنے متعلقین کو نماز کا حکم کرتے رہیے۔ اور خود بھی اس کے پابند رہیے۔ ہم آپ سے معاش کرانا نہیں چاہتے، معاش تو آپ کو ہم دیں گے۔ اور بہتر انجام تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری مکتوباتِ صدی میں لکھتے ہیں:

"اے برادر عزیز! فرزند آدم جو خلاصۂ آفرینش ہے، اس کی سعادت و عزت جانتے ہو کس بات میں ہے؟ بندگی میں ہے اور اس کے در پر سر افگندگی میں۔ بلکہ بندہ بودن اس انسان کے وجود میں لانے کا مقصود ہے............ سنو! جب آدمی بندہ بن جاتا ہے تو اس کو آزادی نصیب ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا ماالحریۃ (حریت یعنی آزادی کیا ہے؟) آپ نے جواب دیا کہ "عبودیت" سائل نے کہا "میرا سوال تو آزادی کے بارے میں تھا"، آپ نے فرمایا "جب تک تم بندہ نہ بن جاؤ گے آزاد نہیں ہو سکتے اور حقیقتِ حال بھی یہی ہے۔ تو جو شخص آزاد نہیں ہوتا، وصل سے دل شاد نہیں ہو سکتا۔ طوقِ عبودیت جس کی گردن میں ہے اسے کیا سمجھتے ہو؟ وہ سردارِ عالم ہے۔ محققوں کا قول ہے کہ اگر خداوندِ ذوالجلال والاکرام کے خزانے میں عبودیت سے بہتر کوئی خلعت ہوتا تو وہ ضرور بالضرور قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کے مقام میں حضرت خواجۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنایا جاتا۔ قطع نظر اس کے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک و بادشاہی عطاء ہو رہی تھی، آپ ہرگز یہ نہ فرماتے لا ارید ان اکون ملکًا نبیًا بل ارید ان اکون عبدًا نبیًا (میں نہیں چاہتا کہ میں بادشاہ نبی بنوں، بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ ایک بندہ اور نبی بنوں) سر عروج ہمت کو عبودیت کی چوکھٹ پر آپ نے رکھ دیا اور بندگی کو دونوں جہاں کی بادشاہی پر ترجیح دی............ .... حضرت خواجہ سہیل تشتری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت آفریدگار جل و علا نے نقطۂ عبودیت سے زیادہ پیاری کوئی چیز پیدا نہ کی............ حاصلِ کلام یہ ہے کہ انسان کی نجات اور ترقی درجات، بندگی کرنے پر موقوف ہے............ برادر عزیز! بندگی عجیب چیز ہے، دیکھو یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ ضعیف قوی کے مقابلہ میں، عاجز کو قادر کے مقابلے میں، فقیر کو غنی کے

مقابلے میں، بندے کو خداوندِ عزوجل کے مقابلہ میں کوئی وسیلہ بندگی اور سر افگندگی کے سوا نہیں، بے نفسی وخاکساری اسی بندگی کی شاخ ہے۔

برادر عزیز! اس کی عزت نے عزتوں کو ذلت کا جامہ پہنادیا ہے، اور اس کی عظمت وجلال نے تمام جلال پر چھوٹے پن کا دھبہ لگادیا ہے، اور اس کے کمال نے کل کمالات پر نقصان کی مہر کردی ہے۔ اور اس کی ہستی نے سب ہستیوں کو نیست بنار کھا ہے اور اس کی الٰہیت نے عالم وعالمیان کو بندگی وسر افگندگی سے آراستہ وپیراستہ کردیا ہے۔

عبدیت مرتبۂ اعزاز ہے :

اللہ تعالیٰ کے سامنے "عبد" ہونے کا اقرار اور عبدیت کا اظہار، اعزاز واکرام کی چیز بن جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ لفظ "عبد" اعزاز واکرام کے مواقع پر استعمال کیا گیا ہے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ط نِعْمَ الْعَبْدُ ط اِنَّهٗ اَوَّابٌ ط

ترجمہ:۔ اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطاء کیا، بہت اچھے بندے تھے، اللہ کی طرف بہت رجوع ہونے والے تھے۔

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْداً لِلّٰهِ وَلَا الْمَلٰئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْن

(سورۂ نساء ۴/۱۷۲)

ترجمہ:۔ مسیح، ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے عار نہیں کریں گے اور نہ مقرب فرشتے۔

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُاللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيّاً (سورۂ مریم ۱۹/۳۰)

ترجمہ:۔ بچہ (حضرت عیسیٰ خود بول اٹھا میں اللہ کا (خاص) بندہ ہوں، اس نے مجھ کو کتاب دی اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِراً نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (سورۂ ص ۳۸/۴۴)

ترجمہ:۔ بیشک ہم نے ان (ایوب) کو صابر پایا، اچھے بندے تھے، بہت رجوع ہوتے تھے۔

فَوَجَدَا عَبْداً مِنْ عِبَادِنَا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْماً

(سورۂ کہف ۱۸/۶۵)

ترجمہ:۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا

جن کو ہم نے خاص رحمت دی تھی اور ہم نے اپنے پاس سے علم سکھایا تھا۔

اِنْ هُوَ اِلاَّ عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلاً لِّبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ (سورۃ ۴۳/۵۹)

ترجمہ:۔ عیسیٰ تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے فضل کیا تھا اور ان کو بنی اسرائیل کے لئے ہم نے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنایا تھا۔

"عبد" کی جمع "عباد" آتی ہے اس کا استعمال بھی اعزاز کی جگہوں پر بکثرت ہوا ہے، مثلاً چند آیات یہ ہیں۔

وَاذْكُرْ عِبَادَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ۔

(سورۃ صٓ ۳۸/۴۵)

ترجمہ:۔ اور ہمارے بندوں، ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کیجئے، جو ہاتھوں والے، اور آنکھوں والے تھے، (یعنی ان میں قوتِ عملیہ بھی تھی اور قوت علمیہ بھی)

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔

ترجمہ:۔ رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جہلا ان سے جہالت کی بات کرتے ہیں تو وہ رفعِ شر کی بات کہتے ہیں۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ط

ترجمہ:۔ ایسے چشمہ سے پئیں گے جس سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے، جسکو وہ خاص بندے جہاں چاہیں گے بہا کر لے جائیں گے۔

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (سورۃ زخرف ۴۳/۶۸)

ترجمہ:۔ اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں، اور نہ تم غمگین ہو گے۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ط (سورۃ زمر ۳۹/۱۷، ۱۸)

ترجمہ:۔ پس آپ میرے اُن بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو اس کلام الٰہی کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں، یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی اور یہی لوگ عقل والے ہیں۔

إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (سورۂ حجر ۱۵/۴۲)

ترجمہ:۔ بیشک میرے مخلص بندوں پر تیرا (ابلیس کا) کوئی زور نہ چلے گا۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ (سورۂ فجر ۸۹/۲۷تا ۳۰)

ترجمہ:۔اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کے جوار رحمت کی طرف چل، اس طرح کہ تو اس سے خوش وہ تجھ سے خوش، پھر تو میرے خاص بندوں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

حضورؐ نے اپنے لئے عبدیت کو منتخب کیا :

عبدیت کی عظمت و بڑائی کی ایک دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے اسی کو پسند فرمایا تھا اور اس پسند میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مشورہ شامل تھا، گویا سب سے جلیل القدر پیغمبر اور سب سے جلیل القدر فرشتہ، دونوں کی نگاہ میں "مقام عبدیت" انتہائی بلند مقام ہے اور اعزاز و اکرام کا خاص مستحق۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

یا عائشة لو شئت لسارت معی جبال الذهب جاء نی ملك وان حجزته لتستوی الكعبة فقال ان ربّك يقرأ عليك السلام ويقول ان شئت نبياً عبداً وان شئت نبياً ملكاً فنظرت الى جبرئيل عليه السلام فاشار اليَّ ان ضع نفسك

(مشكوٰة المصابيح ۲/۵۲۱ باب البعث وبدء الوحی)

ترجمہ:۔ اے عائشہ! اگر میں چاہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلیں، ایک فرشتہ میرے پاس آیا، اس کی کمر کعبہ کے برابر تھی، اس نے کہا آپ کا رب آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو بندہ نبی ہونا پسند کرلیں اور اگر چاہیں تو بادشاہ نبی ہونا پسند کرلیں، میں نے جبرئیل کی طرف دیکھا۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کیا کہ تواضع اختیار کرو۔

عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے۔

فالتفت رسول الله صلی الله علیه وسلم الی جبرئیل کالمستشیر له فاشار جبرئیل بیده ان تواضع فقلت نبیاً عبداً۔

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے مشورہ کی غرض سے جبرئیلؑ کی طرف دیکھا، انہوں نے کہا کہ تواضع اختیار کرو، میں نے کہا میں بندہ نبی ہونا پسند کرتا ہوں۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کا حال یہ ہو گیا تھا کہ

لا یاکل متکئاً یقول اٰکل کما یأکل العبد واجلس کما یجلس العبد (رواہ فی شرح السنة)

ترجمہ:۔ تکیہ لگا کر کھانا نہ کھاتے تھے، فرماتے "میں اس طرح کھانا کھاتا ہوں جیسے غلام کھانا کھاتا ہے اور اس طرح بیٹھتا ہوں جیسے غلام بیٹھتا ہے۔

شارحین کے مطابق اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اختیار دیا گیا تھا کہ آپ ایسی نبوت کو پسند کرلیں جو نبوت اور عبودیت کے درمیان جامع ہو، یا پھر ایسی نبوت کو پسند کرلیں جو نبوت اور ملوکیت کے درمیان جامع ہو۔ عبودیت اور ملوکیت کو ایک دوسرے کے بالمقابل لانے سے یہ ثابت ہوا کہ کمال عبودیت، ملوکیت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔

حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے مشورہ اس لئے مانگا تھا کہ بعض انبیاء کرام کو دونوں صفات دی گئی تھیں اور بسااوقات مرتبۂ کمال اسی کو سمجھا جاتا ہے کہ منصبِ دینی بھی ہو اور دولت و ملوکیت بھی ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے۔

نعم المال الصالح للرجل الصالح۔ اچھا مال اچھے آدمی کے لئے اچھا ہے۔

علاوہ ازیں ملوکیت، شہروں کے فتح کرنے، دعوت و تبلیغ کا وسیع موقع فراہم ہونے، اور بڑی تعداد میں بندگانِ خدا کو خدا سے جوڑنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ملوکیت سے فروتر رہنے اور عاجزی اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ آپ ملوکیت چھوڑ کر مقام عبودیت لے لیجئے کیونکہ بقول ملا علی قاریؒ

فانه فی المآل اعلیٰ وفی المنازل اعلیٰ وفی ذوق الطالبین احلی فان الملك للواحد القهار وقد قال الله تعالیٰ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ای لتظهر عبودیتهم لی واُلوهیتی وربوبیتی لهم کما روی فی الحدیث القدسی کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لِأعرف۔

(مرقات المفاتیح الجزء الحادی عشر ۶/۱۰۱)

یہ انجام کے اعتبار سے اعلیٰ ہے، منازل کے اعتبار سے سب سے قیمتی ہے، طالبین کے ذوق میں سب سے شیریں ہے اس لئے کہ سلطنت و حکومت صرف واحد قہار (اللہ تعالیٰ) کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "میں نے جنات اور انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔ یعنی ان کی عبودیت میرے لئے اور میری الوہیت ان کے لئے ظاہر ہو جائے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ "میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں" لہٰذا میں نے مخلوق کو پیدا کیا کہ پہچانا جاؤں۔

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں۔

وفیه دلیل صریح علی ان الفقیر الصابر افضل من الغنی الشاکر (حوالہ مذکورہ)

ترجمہ:۔ اس میں صریح دلیل ہے کہ فقیر صابر، غنی شاکر سے افضل ہے فقر و عبودیت کو پسند کرنے اور ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ

المورثة للتواضع للّٰه المنتجة لرفعة القدر عند الله لا الملك والغنى الباعث على الطغيان والنسيان الموجب للتكبر والكفر ان المقتضى لوضعه عن نظر الله (حواله مذكوره)

ترجمہ:۔ یہ اللہ کی خاطر تواضع پیدا کرتی ہے، جس سے اللہ کے نزدیک بندہ کا درجہ بلند ہو جاتا ہے بادشاہت اور غناء میں یہ صفت نہیں ہوتی کیونکہ یہ دونوں چیزیں طغیان ونسیان پر ابھارتی ہیں جس کا نتیجہ تکبر اور کفران نعمت ہوتا ہے جس سے بندہ اللہ کی نظر سے گر جاتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ فقر و عبودیت اور ملک و مال و دولت و غناء کا یہ نتیجہ اکثر احوال کے اعتبار سے ہے۔

وهذا باعتبار غالب الاحوال ولذا اختار الله الفقر لاكثر الأنبياء والاولياء والعلماء الصلحاء جعلنا الله منهم وحشرنا معهم (حواله مذكوره)

ترجمہ:۔ یہ غالب احوال کے اعتبار سے ہے، اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اکثر انبیاء، اولیاء، علماء اور صلحاء کے لئے فقر کو ہی پسند کیا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی انھیں میں کا بنائے اور انھیں کے ساتھ حشر فرمائے۔ (جاری)

☆☆☆☆☆

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے حادثاتی لمحے

چوتھی قسط مولانا اختر امام قاسمی

طائف کا سفر :

۳۱- طائف کا سفر تو حد سے زیادہ حادثاتی اور غم انگیز ہے۔

مکہ والوں کا رویہ جب حد سے زیادہ مایوس کن ہو گیا تو حضور نے طائف والوں کو دعوت اسلام دینے کا ارادہ فرمایا، جو مکہ سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر مکہ ہی کی طرح بڑا شہر تھا، وہاں ثقیف کے لوگ آباد تھے اور لات کے پرستار تھے، وہاں لات کا بڑا مندر تھا اور سارا شہر اسی مندر کا پجاری تھا، شوال ۱۰ھ نبوی میں حضرت خدیجہ کی وفات کے ایک ماہ بعد آپ زید بن حارث کو ہمراہ لیکر پیدل طائف پہونچے، وہاں سے قبل راستہ میں اول آپ قبیلہ بنی بکر میں تشریف لے گئے، مگر وہ بھی مکہ والوں سے مختلف نہ نکلے تو قوم قحطان کے پاس گئے مگر وہ بھی قریش ہی کی طرح سنگدل نکلے، تو وہاں سے آپ نے طائف کا رخ کیا، طائف پہونچکر پہلے آپ نے وہاں کے رؤساء اور معززین سے ملنے کا پروگرام بنایا، طائف کے سرداروں میں عبدیالیل بن عمر اور اس کے دونوں بھائی مسعود اور حبیب سب سے زیادہ بااثر اور بنی ثقیف کے رئیس سمجھے جاتے تھے، آپ نے تینوں کو اسلام کی دعوت دی لیکن یہ بڑے مغرور اور متکبر تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر تجھکو خدا اپنا رسول بنایا تو یوں ہی پیدل جوتیاں چٹخاتا پھرتا؟ اور دوسرے نے کہا کیا خدا کو کوئی اور آدمی نہ ملا جو تجھکو رسول بنایا؟ تیسرا بولا میں تجھ سے بات ہی کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ اگر تم واقعی رسول ہو تو تیری بات کا انکار خطرناک ہو سکتا ہے اور اگر جھوٹا ہے تو ایسا شخص سے بات کرنے کے لائق نہیں۔

حضور کو ان تینوں بھائیوں سے مایوسی ہوئی تو آپ نے ان سے کہا کہ اچھا آپ

اپنے ان خیالات کو اپنے ہی تک محدود رکھیں، دوسروں میں اشاعت نہ کریں پھر آپ انکے پاس سے اٹھ کر طائف کے دیگر رؤسا و اشخاص کو دعوت اسلام دینے کے ارادے سے نکلے، لیکن عبدیالیل اور اسکے بھائیوں نے اپنے غلاموں اور شہر کے لڑکوں اور اوباشوں کو حضور ﷺ کے پیچھے لگادیا، آپ جہاں جاتے بدمعاشوں اور اوباشوں اور لونڈوں کا ایک ہجوم آپ کے پیچھے گالیاں دیتا اور ڈھیلے مارتا ہوا جاتا، آپکے وفادار خادم زید بن حارث آپکے ہمراہ تھے وہ آپکو بچانے اور حفاظت کرنے کی کوشش کرتے رہے، پتھروں اور ڈھیلوں کی بارش میں حضور ﷺ اور زید بن حارث دونوں زخمی ہوگئے، آپکے لئے طائف میں ٹھہرنا دشوار ہوگیا، وہاں سے چلے تو طائف کے بازار میں اوباشوں کا ہجوم گالیاں دیتا ہوا اور پتھر برساتا ہوا آپ کے ساتھ ساتھ تھا، یہاں تک کہ آپ طائف سے باہر نکل آئے مگر بدمعاشوں کے ہجوم نے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا، اس پر تشدد ہجوم نے شہر سے باہر تین میل تک آپ کا تعاقب کیا، آپ کی پنڈلیاں پتھروں کی بارش سے لہولہان ہوگئیں اور اس قدر خون بہا کہ جوتیوں میں خون بھر گیا، اسی طرح تمام جسم لہو لہان ہوگیا، آپ فرماتے تھے کہ میں طائف سے تین میل تک بھاگا اور مجھے کچھ ہوش نہ تھا کہ کہاں سے آرہا ہوں اور کدھر جارہا ہوں، طائف سے تین میل کے فاصلے پر مکہ کے ایک رئیس عتبہ بن ربیعہ کا باغ تھا حضور نے اس باغ میں آکر پناہ لی، اور طائف کے اوباشوں کا ہجوم طائف کی طرف واپس ہوا، آپ اس باغ کی دیوار کے سایے میں بیٹھ گئے اور اپنی بے کسی و بے چارگی کی فریاد بارگاہ رب العالمین میں پیش کی۔

اے اللہ! میں تجھ سے اپنی کمزوری، تدبیر کی کمی، اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے عزتی کی شکایت کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا خاص مربی و مددگار ہے، تو مجھے کس کے سپرد کرے گا، کیسی غضب ناک اور ترش رو دشمن کی طرف یا کسی دوست کی طرف جس کو تو میرے معاملات کا مالک بنائے، اگر تو مجھ سے ناراض نہ ہو تو پھر مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے، مگر تیری عافیت او سلامتی میرے لئے باعث صد سہولت ہے، میں پناہ مانگتا ہوں تیری بزرگ ذات کے وسیلے سے جس سے تمام ظلمتیں منور ہوئیں، اور اسی نور سے دینا و آخرت کا کارخانہ چل رہا ہے میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غضب اور ناراضگی مجھ

پر اترے اور اصل مقصود تجھ سے ہی کو سنانا اور راضی کرنا ہے، بندہ میں کسی شر باز رہنے اور کسی خیر کے کرنے کی قدرت نہیں مگر جتنی تیری بارگاہ سے عطا ہو جائے۔

حضور کے دل کی کیفیات کا اندازہ کرنا ممکن نہیں، مکہ کے نفرت بھرے ماحول سے بیزار ہو کر محبت کی تلاش میں آپ مختلف قبائل سے ہوتے ہوئے طائف پہونچے تھے، مگر طائف والوں نے تو نفرت و خدا دشمنی کا وہ ریکارڈ بنایا جو رہتی دنیا تک کے لئے مثال شقاوت کی یادگار بن گیا، حضور کا دل کتنا رویا ہوگا وہ خدا کے سوا کون جانتا ہے،

عتبہ بن ربیعہ اس وقت اس باغ میں موجود تھا اس نے آپ کو دور سے اس حالت میں دیکھا تو عربی شرافت اور مسافر نوازی کے تقاضے سے اپنے غلام عداس کے ایک پلیٹ میں انگور کے خوشے رکھکر آپ کے پاس بھجوائے، یہ غلام نینوا کا باشندہ کا باشندہ عیسائی تھا، آپ نے بسم اللہ پڑھکر انگور کھائے اور اس کو اسلام کی دعوت تبلیغ فرمائی، عداس قلب پر آپکی باتوں اثر ہوا اور اسنے آپ کے ہاتھ کو جھک کر چوما، عتبہ بن ربیعہ دور سے غلام کی اس حرکت کو دیکھا جب واپس گیا، تو عتبہ نے اس کہا کہ اس شخص کی باتوں میں نہ آجانا اس سے بہتر تو تیرا دین ہے۔

کوئی پناہ دینے والا نہیں:

تھوڑی دیر عتبہ کے باغ میں آرام کرنے کے بعد مقام نخلہ ہوتے ہوئے آپ کوہ حرا پر تشریف لائے اور یہاں ٹھہر کر آپنے بعض سرادارن قریش کے نام پیغام بھیجا، مگر کوئی شخص آپ کو اپنی ضمانت اور پناہ دینے کے لئے تیار نہ ہوا، مطعم بن عدی کے پاس جب آپکا پیغام پہونچا تو وہ بھی اگرچہ مشرک اور کافر تھا، مگر عربی شرافت اور قومی حمیت کے جذبہ سے متاثر ہو کر فوراً اٹھا اور حضور ﷺ کے پاس سیدھا کوہ حراء پر پہونچا اور آپ کو اپنے ہمراہ لیکر مکہ آیا مطعم کے بیٹے ننگی تلواریں لیکر خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے، آنحضرت نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اس کے بعد مطعم اور اسکے بیٹوں نے ننگی تلواروں کے سایے میں آپکو گھر تک پہونچایا، قریش نے مطعم سے پوچھا کہ تم کو محمد ﷺ سے کیا واسطہ؟ مطعم نے جواب دیا کہ مجھ کو واسطہ تو کچھ نہیں لیکن میں "محمد کا حمایتی ہوں جب تک وہ میری

حمایت میں ہیں کوئی نظر بھر کر انکو نہیں دیکھ سکتا، مطعم کی یہ ہمت اور حمایت دیکھ کر قریش کچھ خاموش سے ہو کر رہ گئے (فتح الباری) ص ۲۲۵ج ۶، تاریخ اسلام ۱۲۰ج ۱)

مکہ چھوڑنا چاہا وہ بھی منظور نہیں :

ظلم اپنی آخری حد سے بھی پار کر گیا، اور حضور اور آپ کے ماننے والوں کا مکہ میں رہنا دوبھر ہو گیا، تو آپ نے تمام مسلمانون کو مکہ سے مدینہ ہجرت کر جانے کی عام اجازت دے دی مدینہ کے کچھ لوگ مختلف موقع پر آکر مسلمانوں ہو چکے تھے اور وہاں ایک مختصر اسلام نظام قائم ہو چکا تھا، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے مدینہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا، کفار کو یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ مسلمان کسی دوسری جگہ بھی اطمینان سے رہ سکیں، اس لئے انہوں نے ہجرت کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی کیں،

حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ میرے شوہر ابو سلمہ نے ہجرت کا ادارہ کیا، مجھ کو اونٹ پر بٹھایا میری گود میں میرا چھوٹا بچہ سلمہ تھا جب ہم روانہ ہوئے تو میرے قبیلہ کے لوگوں نے ابو سلمہ کو گھیر لیا اور کہا کہ تم جا سکتے ہو لیکن ہماری لڑکی کو نہیں لے جا سکتے، اتنے میں ابو سلمہ کے قبیلے والے بھی آگئے، انہوں نے کہ تم جانا چاہو تو جاؤ لیکن یہ بچہ ہمارے قبیلے کا ہے اسے نہیں لے جا سکتے، چنانچہ بنو عبد الاسد بچہ چھین کر لے گئے اور بنو مغیرہ ام سلمہ کو لے گئے، اور ابو سلمہ مدینہ کی طرف تنہا روانہ ہوئے، ام سلمہ سے خاوند اور بچے دونوں بچھڑ گئے، اور ابو سلمہ کو ہجرت کے لئے بیوی اور بیٹے دونوں کو چھوڑنا پڑا۔

حضرت صہیب رومیؓ جب مکہ سے جانے لگے تو ان کا تمام مال و اسباب مکہ والوں نے چھین لیا اور انکو خالی ہاتھ مدینہ جانا پڑا، حضرت ہشام بن عاص نے ہجرت کا ارادہ کیا، مشرکین کو خبر لگ گئی انہوں نے حضرت ہشام کو پکڑ کر قید کر دیا اور طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں حضرت عباس ہجرت کر کے مدینہ پہونچ گئے تھے ابو جہل ان کے پیچھے مدینہ پہونچا اور دھوکہ سے مکہ لے آیا اور یہاں قید کر دیا،

لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود مسلمان ایک ایک دو دو کر کے مکہ چھوڑتے رہے، یہاں تک کہ مکہ میں صرف حضور اکرمؐ صدیق اکبر اور حضرت علی اور ان کے اہل و عیال

بچ گئے، یا چند نہایت ہی کمزور و ضعیف لوگ ہجرت کی طاقت نہ رکھتے تھے، ان کے سوا تمام مسلمان مکہ چھوڑ چکے تھے، اور مکہ میں بہت سے گھر جن میں مسلمان آباد تھے خالی پڑے ہوئے تھے۔ (تاریخ اسلام ۱۳۰۔۱۳۱)۔

حضورؐ اپنی آنکھوں سے مکہ سے مسلمانوں کے اجڑنے اور ایک اجنبی دیش کی طرف نکل جانے کا منظر دیکھتے رہے خود حضور اپنی ہجرت کے لئے وحی الٰہی کے انتظار میں تھے،

دارالندوہ میں حضور کے خلاف میٹنگ :

ادھر نبی کے ماننے والے مکہ خالی کر رہے تھے دوسری طرف خدا اور رسول کے دشمن مکہ کے سب سے بڑے میٹنگ ہال دارالندوہ میں بیٹھ کر رسالت کی بنیادوں کو اکھاڑنے کی فکر میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے، جس میں تمام مشہور قبائل کے سردار جمع تھے، اور ایک بوڑھا نجدی شیطان اس میٹنگ میں کی صدارت کر رہا تھا، مختلف تجاویز زیر بحث تھیں، ایک نے کہا محمد کو پکڑ کر زنجیروں سے جکڑ دو اور ایک کوٹھری میں بند کر دو کہو ہیں جسمانی اذیت اور بھوک پیاس کی تکلیف سے مر جائے شیخ نجدی نے کہا یہ رائے اچھی نہیں، کیوں کہ اس کے رشتہ دار اور ماننے والے یہ سنکر اس کو چھڑانے کی کوشش کریں گے، اور فساد بڑھ جائے گا، دوسرے شخص نے اپنی رائے دی کہ محمدؐ کو مکہ سے جلاوطن کر دو اور پھر مکہ میں داخل نہ ہونے دو، اس رائے کو بھی شیخ نجدی نے دلیلوں سے رد کر دیا، غرض اسی طرح اس جلسہ میں تھوڑی دیر تک بھانت بھانت کے جانور بولتے رہے اور شیخ نجدی ہر رائے کا غلط اور نامناسب ہونا ثابت کرتا رہا، بالآخر ابو جہل بولا میری رائے یہ ہے کہ ہر قبیلے سے ایک ایک شمشیر زن کا انتخاب کیا جائے، اور تمام لوگ بیک وقت چاروں طرف سے محمد (ﷺ) کو گھیر کر ایک ساتھ وار کریں اس طرح قتل کا عمل انجام پانے سے خون تمام قبائل پر تقسیم ہوگا۔ بنو ہاشم تمام قبائل قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہذا وہ بجائے قصاص کے دیت قبول کریں گے، اور دیت بڑی آسانی سے سب مل کر ادا کر دیں گے، ابو جہل کی اس رائے کو شیخ نجدی نے بہت پسند کیا، اور تمام جلسہ نے باتفاق رائے یہ ریزولیوشن پاس کر دیا، ادھر دارالندوہ میں یہ مشورہ ہو رہا تھا، ادھر کاشانۂ نبوت میں حضرت

جبریل میٹنگ کی ساری رپورٹ دے رہے تھے، ارو خدا کی جانب سے ہجرت کا حکم پہونچا رہے تھے۔

اور بالآخر نبی نے اپنے بستر پر حضرت علی کو چھوڑ کر حضرت ابو بکر کی ہمراہی میں اپنے پیارے وطن کی سرزمین کو ہزاروں جذباتی لگاؤ کے باوجود خدا کے لئے چھوڑدیا، حضورؐ اپنے وطن کی سے کتنے دل شکستہ ہو کر نکلے، اس کا اندازہ حضور کے اس آخری الوداعی جملے سے ہوتا ہے، جو اپنے وطن کی طرف مڑ کر آپ نے ارشاد فرمایا تھا،

مااطیبک من بلد واحبک الیَّ ولولاان قومی اخرجونی ماسکنت غیرک رواہ احمد والترمذی وصحہ،

اے مکہ! تو کتنا پاکیزہ اور محبوب شہر ہے، اگر میری قوم مجھ کو نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کسی سرزمین کو اپنے مسکن نہ بناتا (زرقانی ص ۳۲۸ ج ۱)

پھر غار ثور سے مدینہ تک کا آٹھ روزہ مشکل ترین اور پر خطر سفر، اور ہجرت کی دیگر تفصیلات کتب سیرت میں موجود ہیں، وہ بجائے خود عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں (طبقات ابن سعد ص ۱۵۴ ج ۱، البدایہ والنہایہ ص ۱۸۴ ج ۱، عیون الاثر ص ۱۷۹ ج ۱، الخصائص الکبریٰ ص ۱۷۵ ج ۱، روضۃ الانف ص ۳ ج ۲)

"کون ہے جو اپنا حادثہ حضور کے حادثات کے بالمقابل لائے؟"

اس طرح دیکھئے تو حضور کی زندگی میں حادثات کی کمی نہیں ہے، لوگ ایک دو حادثے ہی میں ٹوٹ اور بکھر کر رہ جاتے ہیں، یہاں ہر قدم پر حادثے ہی حادثے ہیں کیا اس انسانی دنیا میں حضور کے سوا کوئی اور بھی ہستی اتنے حادثات کا شکار ہوئی ہے۔؟

اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں (تھوڑی ترمیم کے ساتھ)

"جتنے بھی مصلحین دین کی فلاح و بہود کا نقشہ لیکر اٹھے کس کی آؤ بھگت گالیوں، رسوائیوں سے، تکفیر و تفسیق سے، ضرب بدر نہیں ہوئی۔ لیکن کیا ان سب کی مصیبتیں اور پیتائیں الگ الگ نہیں، ملا کر اور سب ایک میں شامل کر کے ہی اس ایک انسان کے مقابلے میں لائی جاسکتی ہیں، جو مخلوق کے اولین و آخرین میں سب سے بڑا بنا کر بھیجا گیا تھا، لیکن جس کو دن، دو دن ہفتہ دو ہفتہ، مہینہ دو مہینہ بھی نہیں، سالہا سال تک مسلسل و یک لخت دنیا کے شریروں، اور رذیلوں، سے گندوں اور کمینوں سے، شرابیوں اور جواریوں سے،

لٹیروں اور حرام کاروں سے، پتھروں کے پوجنے والوں اور درختوں کو سجدہ کرنے والوں سے، انسانی سانپوں اور اژدہوں سے، انسان صورت بھیڑیوں اور درندوں سے دب کر اور جھک کر رہنا پڑا، آج شہر کے کسی رئیس، کسی حاکم، کسی چودھری کو کوئی چوھڑ، چمار ذرا گالی دیکر تو دیکھے، یہاں گالیاں کہلوائی گئیں، اسے جو سارے معززین سے معزز تر، سارے وجاہت والوں سے بڑھ کر وجیہ اور سارے شریفوں سے اشرف تھا، ان کی زبانوں سے جو ذلیلوں سے بڑھ کر ذلیل، گندگی میں اپنی آپ نظیر اور رذیلوں میں بھی ازذل تھے، اور جس جسد مبارک کو ادب واحترام کے ساتھ مس کرنا نور کے تنے ہوں فرشتوں کے لئے بھی باعث فخر وشرف تھا، اس کے ساتھ کیسی کیسی گستاخیاں اور دراز دستیاں وہ جہنم کے کندے کرتے رہے جن ہیں آگ میں جلنا اور آگ میں ملنا تھا، جسے آسمان والے نے "محمد ﷺ" بنا کر بھیجا تھا، گندہ دہن زمین مخلوق اس کے ساتھ کس طرح پیش آئی، کیا اسے جی بھر کر چڑھایا نہیں؟ طرح طرح کے آوازے نہیں کیسے؟ ڈھیلے نہیں برسائے؟ ساق مبارک کو لہولہان نہیں کیا؟ کھانا پانی بند نہیں کیا؟ ہر طرف سے گھیر کر ایک غار بند کر کے فاقہ کشی کی نوبت نہیں پیدا کر دی؟ دوستوں اور مخلصوں، جاں نثاروں اور سرفروشوں پر کیا کیا قیامتیں برپا ہو کر نہیں رہیں؟ غرض تکلیف وتعذیب، توہین وتحقیر، آزار جسمانی وروحانی کا کوئی پہلو اٹھ رہا؟ تاریخ کے کس واقعہ سے انکار ہو گا؟ اور پھر اس ذات پاک کے صبر میں ہمت میں، استقامت واستقلال میں کس وقت کس لمحہ، کس آن فرق پڑنے پایا ہے؟ لوگ اپنی تکلیف کو جھیلتے پھرتے ہیں، ہے کوئی جو اس بڑی مثال کے سامنے اپنے کو پیش کر سکے؟ اس پہاڑ کے سامنے اپنے ریت کے گھروندے کو لائے؟ اس بے مثال، مثال کو سامنے رکھ کر ارشاد ہو، کہ کس نے دین کی راہ میں کیا کیا ہے؟ کیا سہا؟ کیا کھویا؟ کیا لٹایا؟ کیا اٹھایا ہے؟

رحمتیں اور بے شمار رحمتیں نازل ہوں اس ذات گرامی پر جس کے وجود نے امت کے غریبوں، اور ضعیفوں، دکھیاروں اور ناچاروں، بیماروں اور سوگواروں، غمزدوں اور ناداروں سب کی تسکین کا سامان ہتی دنیا کے لئے کر دیا۔ (ذکر رسول ﷺ)

یارب صل وسلم دائماً ابداً ۔ علیٰ حبیبك خیر الخلق کلهم

سلام اس پر جس نے دشمنوں پر بھی عطائیں کیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سنکر دعائیں دیں

کچھ عرصہ پہلے خادم الحرمین الشریفین الملک فہد نے بر صغیر کے اردوداں حضرات میں قرآنی پیغام اور اس کی حقیقی روح کو عام کرنے کے لئے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ کا ترجمہ قرآن اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی عام فہم تفسیر لاکھوں کی تعداد میں شائع کی جسے بر صغیر کے مسلمانوں نے بڑی نظر تحسین سے دیکھا۔ اس تفسیر پر پاکستان کی وزارت مذہبی امور نے اعتماد کا اظہار کیا ہے اور اس کی توثیق بھی کی ہے۔ مگر افسوس کہ غیر مقلدوں کو خادم الحرمین الشریفین کی یہ خدمت پسند نہ آئی۔ انہوں نے حکومت سعودیہ میں اختلاف وانتشار پیدا کرنے کے لئے سازشوں کا جال پھیلایا اور غلط اور جھوٹے پروپیگنڈے کی ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔ اور دجل کی راہ سے اپنے عقائد ونظریات پر مشتمل تفسیر شائع کرائی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جہاں تک مولانا محمد جوناگڑھی کی ترجمہ قرآن کے غلط ہونے اور مولوی صلاح الدین یوسف کی تفسیر کے غلط در غلط ہونے کا تعلق ہے ہم اس وقت اس سے بحث نہیں کرتے سعودی علماء ومشائخ کی خدمات میں یہ سارا مواد بھیجا جاچکا ہے اور علماء مسلسل اس کی نشاندہی کررہے ہیں۔ ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ غیر مقلدوں نے سازش کے ذریعہ جس صاحب کا ترجمہ قرآن شائع کراکر خادم الحرمین الشریفین کو دھوکہ دیا ہے اس کے عقائد ونظریات کیا ہیں کیا وہ لائق ہے کہ اس کا ترجمہ قرآن شائع کیا جائے۔ ہمیں یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ جو لوگ ننانوے فیصد مسلمانوں کو مشرک سمجھتے ہیں ان کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے تاکہ پھر کسی کو مسلمانوں کی اکثریت کے جذبات مجروح کرنے کی

ست نہ ہو سکے۔ اسی احساس کے پیش نظر ہمارے فاضل دوست حافظ اقبال رنگونی نے محرم الحرام ۱۴۲۰ھ کو سماحۃ الشیخ معالی الدکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی وزیر الشؤن الاسلامیۃ والاوقاف والدعوۃ والارشاد" کے نام ایک گرامی نامہ لکھا اور انہیں حقیقت حال سے مطلع کیا۔ راقم الحروف نے مناسب سمجھا کہ محترم موصوف کا یہ خط افادہ عام کے لئے شائع کر دیا جائے تاکہ برصغیر کے اردو داں طبقہ کو معلوم ہو کہ غیر مقلدین کے سرغنہ کے عقائد و نظریات کیا ہیں اور وہ کس بے دردی سے مسلمانوں کے اکثریتی طبقہ کو اہل سنت سے خارج کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جو غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ ہم مولانا جونا گڑھی کے ان عقائد سے متفق نہیں وہ جھوٹ کہتے ہیں مولانا جونا گڑھی ان سب کے شیخ ہیں اگر آج کے غیر مقلدین مولانا جونا گڑھی کے ان عقائد و نظریات سے متفق نہیں تو وہ ان سے کھلے عام برات کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ اور کیوں نہیں کہتے کہ وہ مذاہب اربعہ خصوصاً احناف کے بارے میں سخت تعصب رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں غلط پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں۔ آیئے حافظ موصوف کا وہ خط دیکھیں جو انہوں نے سعودی عرب کے ذمہ دار حضرات کی خدمت میں لکھا ہے۔ (فقط۔ ق۔ م۔ ا)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سعودی مملکت خصوصاً خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز حفظہ اللہ کی دینی اور اسلامی خدمات خصوصاً حرمین شریفین کی تعمیر اور پوری دنیا میں قرآنی پیغام کو عام کرنے کی کوشش قابل صد تحسین ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کی ان خدمات کو اپنے حضور میں شرف قبولیت دے اور انہیں دنیا و آخرت میں اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے آمین ثم آمین

لیکن ہمیں گزشتہ دو سال سے یہ دیکھ کر حد درجہ دکھ اور رنج ہوا ہے کہ مجمع کی جانب سے قرآن کریم کا جو اردو ترجمہ مع حواشی کے اردو داں طبقہ میں تقسیم کیا گیا ہے وہ ان لوگوں کا ہے جو بہت کم تعداد میں ہیں اور انہیں ایک جدید فرقہ سمجھا جاتا ہے وہ خلفائے راشدین کے افعال کو کھلے طور پر بدعت کہتے ہیں اور اس کے خلاف ایک محاذ بنائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ ائمہ اربعہ کے پیروؤں کو بھی اچھا نہیں سمجھتے اور امت کے فقہی

اختلافات کو نعمت نہیں نقمت سمجھتے ہیں۔ ان کے دن رات کا مشغلہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مذاہب اربعہ خصوصاً حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے بارے میں غلط پروپیگنڈہ کریں۔ اور کھلے عام یہ کہنے سے نہ شرمائیں کہ جو لوگ مقلدین ہیں وہ کتے اور گھوڑے کی طرح ہیں جن کے گلے میں پٹہ پڑا ہوا ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

جناب والا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوپاک کے ۹۹رفیصد مسلمانوں کو تقلید شرعی کی بناء پر مشرک قرار دیتے ہیں ان کے رسائل واشتہارات اس کے شاہد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اہل سنت والجماعت کو احادیث کا منکر اور حدیث رسول کا مخالف کہہ کر آپس میں اختلاف کی فضا پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد ہندوپاک میں بہت کم ہے یہ عام مسلمانوں کے نمائندے نہیں ہیں اور نہ کبھی اس قابل سمجھے گئے ہیں کہ کہیں مسلمانوں کی نمائندگی کریں۔

جناب والا۔ ہندوپاک کے مسلمانوں کی اکثریت اہل سنت والجماعت کی ہے جو مذہب حنفی کے پیرو ہیں لیکن وہ کسی دوسرے مذہب کی تضلیل وتحقیر نہیں کرتے جب کہ یہ نام کے اہل حدیث (جو ہندوپاک میں غیر مقلد اور لامذہب کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں) جب تک مذاہب اربعہ خصوصاً حنفیت کے خلاف زہر نہیں اگلتے اس وقت تک انکا کاروبار نہیں چلتا اور ان کے بازار تفریق میں رونق نہیں آتی۔ ہم نہیں جانتے کہ سعودی حکومت (جو مسلمانوں میں اتحاد ویک جہتی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہی ہے اور حنبلی المذہب ہونے کے باوجود اس نے کبھی دوسرے مذہب کی تضلیل وتحقیر روا نہیں رکھی) کو کس نے یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ان لوگوں کا ترجمہ شائع کرے جو سرے سے ہی سب کو برا سمجھتے ہیں اور مسلمانوں میں ہمیشہ افتراق وانتشار پیدا کرنا اس کا وطیرہ رہا ہے۔ اس ترجمہ قرآن کی وجہ سے ہندوپاک سے تعلق رکھنے والے لاکھوں حجاج میں حددرجہ تشویش پیدا ہوئی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ایسا لگتا ہے ضرور سعودی حکومت کو دھوکہ دیا گیا ہے اور بعض نادیدہ ہاتھ اس میں ملوث ہیں جو ہندوپاک کے مسلمانوں کو سعودی عرب سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ اور بہت سے حجاج کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ سعودی عرب کے علماء اور سعودی حکومت بھی غیر مقلد ہیں اسی لئے اس نے ان غیر

مقلدوں کا ترجمہ شائع کیا جو مسلمانوں کی اکثریت کو برا سمجھتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ سعودی حکومت کے خلاف گہری سازش ہے۔ یہ طبقہ چاہتا ہے کہ ہندوپاک کے مسلمانوں میں سعودی حکومت کے خلاف زیادہ سے زیادہ نفرت پیدا ہو اور قرآن کریم کے پیغام کی جو عالمی کوشش سعودی حکومت اور خادم الحرمین الشریفین کررہے ہیں وہ اختلافی بن کر رہ جائے اور ہندوپاک کا اردو داں طبقہ قرآنی پیغام سے بایں طور محروم ہو جائے کہ وہ اس ترجمہ قرآن کو مسترد کردے اور یہ لوگ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ سعودی حکومت اس پہلو پر خصوصی توجہ دے اور یہ معلوم کرے کہ کیا یہ طبقہ ہندوپاک کے مسلمانوں کی نمائندگی کے قابل ہے؟ اور کیا ان کے عقائد و نظریات اس لائق ہیں کہ اسے اہل سنت والجماعت مسلمانوں میں پھیلائے جائیں۔؟

سعودی حکومت اگر اس ترجمہ قرآن کو شائع کرنے سے قبل مترجم (مولانا محمد جوناگڑھی) اور محشی (مولانا صلاح الدین یوسف) کے بارے میں برصغیر پاک وہند کے اہل علم سے کچھ بھی معلومات حاصل کرتی تو ہمیں یقین ہے کہ کبھی یہ ترجمہ قرآن شائع نہ کرتی۔

مجمع کی جانب سے طبع کئے گئے قرآن کے مترجم مولانا محمد جوناگڑھی کی زبان اور ان کے قلم سے کون بچا ہے ان کی کوئی کتاب اور ان کا کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو وہ مسلمانوں میں اختلاف کی ایک آگ لگاتے نظر آئیں گے اور آپ کو ان کے الزامات میں سوائے تبرا اور جھوٹ کے کچھ نہیں ملے گا یقین مانئے شاید ہی مترجم کا کوئی رسالہ یا کوئی ایسی کتاب ہو جس میں ہندوپاک کے اکثریتی مسلمانوں پر شیعہ کی طرح تبرا نہ کیا گیا ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ فقہ حنفی صرف قرآن وحدیث کے ہی خلاف نہیں بلکہ تہذیب انسانی کے بھی خلاف ہے؟

کیا سعودی حکومت فقہ حنفی کے بارے میں یہی رائے رکھتی ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ لیکن اس ترجمہ قرآن کی اشاعت سے مسلمانوں کی اکثریت کو اب یہ باور کرایا گیا ہے کہ سعودی حکومت فقہ حنفی کے بارے میں یہی رائے رکھتی ہے اور اس کا امام ابوحنیفہ کے بارے میں یہی موقف ہے جو مترجم نے اپنی متعدد کتابوں میں بیان کیا ہے اور وہ کیا ہے؟

یہی کہ امام ابو حنیفہ احادیث رسول کے سخت خلاف تھے (معاذ اللہ)۔ حتی کہ مترجم نے خطیب بغدادیؒ کی تاریخ کا وہ حصہ (جس میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مثالب منقول ہیں اور جس کی علماء اسلام نے سختی سے تردید کردی ہے کا) باقاعدہ اردو ترجمہ کرکے ہندوستان میں شائع کیا اور اسے تقسیم کیا تاکہ حضرت الامام رحمہ اللہ تعالیٰ کو بری طرح بدنام کیا جائے۔ اور ان کے بارے میں یہ غلط پروپیگنڈہ کیا جائے کہ امام ابو حنیفہ احادیث رسول کے منکر تھے اور انکا مذہب صرف اور صرف رائے وقیاس پر تھا۔ آپ ہی بتائیں کیا یہ کھلا جھوٹ نہیں؟ کیا یہ اختلاف وانتشار پیدا کرنے کی سازش نہیں؟

جس شخص یا گروہ نے آپ کو اس ترجمہ قرآن کی اشاعت کے لئے قائل کیا ہے اس نے آپ کو دھوکہ دیا ہے اگر آپ مترجم کے عقائد ونظریات سے کچھ بھی واقف ہو جائیں تو ہم امید کرتے ہیں کہ آپ کو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ مترجم اس لائق نہیں کہ اس کی باتوں کو ہندوپاک کے مسلمانوں پر مسلط کیا جائے۔ ہم اگلی سطور میں مترجم کے کچھ عقائد ونظریات سے آپ کو متعارف کرائیں گے۔ (انشاء اللہ)

جہاں تک محشی کا تعلق ہے آپ کے علم میں یہ بات پہلے لائی جاچکی ہے کہ محشی کا ایک اور حاشیہ قرآن ریاض ہی سے شائع ہوا ہے جس میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے کھلا مذاق کیا گیا ہے اور حقائق کو بری طرح مسخ کیا گیا ہے اس کی تفصیل باحوالہ عرض کی جاچکی ہے۔ اور یہ بات سچ ہے کہ محشی کا عقیدہ وہی ہے جو اس نے ریاض سے شائع ہونے والے حاشیہ میں بیان کیا ہے اگر اس کا عقیدہ یہ نہ ہوتا تو وہ ضرور اس سے برات کا اظہار کرتا اور اپنی غلطی کا اعلان کرکے اس سے رجوع کرتا محشی کا ریاض والے حاشیہ قرآن سے رجوع نہ کرنا اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ محشی کا عقیدہ وہی ہے۔ سعودی حکومت کی طرف سے طبع شدہ اس ترجمہ قرآن میں یہ تبدیلی محض اس غرض سے لائی گئی ہے کہ سعودی حکومت کو دھوکہ دے کر اس کی اشاعت کرائی جائے اور ایک ہی نام کے دو مختلف حاشیے مسلمانوں میں ایک عنوان پر تقسیم ہو جائیں تاکہ اہل اسلام پھر ایک بار قرآن کے نام پر اختلافات کی دلدل میں پھنس جائیں اور اس کی ساری ذمہ داری سعودی حکومت پر آئے۔ ہمارے نزدیک یہ حکومت کے خلاف ایک سازش ہے نیز اس سے اہل اسلام کے ایک بہت بڑے

طبقے پر زیادتی کا ارتکاب بھی ہے اس لئے ہم آپ سے فوری طور پر اس ترجمہ قرآن کی اشاعت پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ لامذہب لوگوں کے عقائد و نظریات سے اہل سنت والجماعت محفوظ رہیں۔

مترجم قرآن مولانا محمد جوناگڑھی ہیں یہ گجرات (ہند) کے رہنے والے ہیں ان کے بہت سے رسائل ہیں یہ سب محمدیات کہلاتے ہیں (اور یہ خود بھی اپنے آپ کو محمدی کہتے رہے) ان میں آپ کو ایک بھی کتاب ایسی نہیں ملے گی جس میں مذاہب اربعہ خصوصاً احناف پر طعن و تشنیع نہ ہو۔ میرے سامنے اس وقت مترجم کی ایک معروف کتاب سراج محمدی ہے اس کے ۷۶ صفحات ہیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے کچھ مقامات آپ کے سامنے رکھے جائیں تاکہ آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ مترجم تعصب و تبرا میں کس دور تک جاچکا ہے۔ سب سے پہلے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے عقائد و نظریات پر جرح دیکھیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے عقائد و نظریات سے برأت کا کھلا اظہار :

مولانا جوناگڑھی لکھتے ہیں۔

ہم اہلحدیث نہ تو حنفی شافعی نہ مالکی نہ حنبلی نہ وہابی نہ کچھ اور۔ ہمارے نزدیک جیسے حنفی شافعی ویسے ہی وہابی (سراج محمدی ص ۸) یعنی ان کی کتابوں میں جو جرح و تنقید حنفیوں پر ہے وہی شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیروؤں پر بھی ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے اصحاب کو بدعتی بتانے کی جسارت :

موصوف کے نزدیک شیخ محمد بن عبدالوہاب اور اہل بدعت ایک ہی صف کے لوگ ہیں یعنی جیسے اہل بدعت ہیں ویسے ہی شیخ اور ان کے اصحاب ہیں موصوف لکھتے ہیں۔

وہابی اور بدعتی دونوں ہمارے نزدیک یکساں ہیں ہم اہلحدیث محمدی ان دونوں سے بری الذمہ ہیں (ایضاً ص ۹) کیا یہ مذاق نہیں کہ جب انگریزوں کو خوش کرنا ہو تو کھل کر شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے اصحاب سے برأت کا اظہار کردیا جائے اور جب مال حاصل کرنے کی بات آجائے تو اپنے آپ کو شیخ اور ان کے اصحاب کے حلقہ میں باور کرانے لگ

ائیں اور لامذہب سے سلفی بن جائیں اور شیخ سے وابستگی ظاہر کریں۔ یہ منافقت نہیں تو
ر کیا ہے۔ ان کے اکابر کی تحریریں شاہد ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ سے
اُت ظاہر کی ہے اور انہیں بدعتی گروہ میں سے سمجھا ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔

آیئے اب ہم یہ بھی دیکھیں کہ مترجم حضرت امام الائمہ ابوحنیفہ پر کس طرح
تبرا کرتا ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر تبرا:

امام الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا مقام ومرتبہ اہل اسلام پر مخفی نہیں ہے۔
خطیب بغدادیؒ نے تاریخ میں حضرت امام ابوحنیفہ کے مناقب ومحامد بیان کئے ہیں اور آپ
کے مثالب پر بھی کچھ صفحات سیاہ کئے ہیں ہم اس وقت ان الزامات واتہامات سے بحث
نہیں کرتے علماء اسلام نے کھل کر خطیب کا تعاقب کیا ہے اور حضرت امام کی برأت واضح
کردی ہے۔ لیکن محمد جوناگڑھی کے تعصب اور اس کی اسلاف بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہؒ
سے عداوت اور نفرت کا یہ عالم ہے کہ اس نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کو بدنام کرنے کے لئے
خطیب بغدادی کی تاریخ سے حضرت امام ابوحنیفہ کے مثالب پر مشتمل حصے کا اردو ترجمہ
کر کے شائع کیا اور پورے ہندوستان میں حضرت الامام کو بدنام کرنے کے لئے دورے کئے۔
اس کتاب کا نام امام محمدی رکھا اور لوگوں کو بتایا کہ امام ابوحنیفہ تو حدیث کے سخت مخالف تھے
اور دن دھاڑے حدیث کو رد کر دیتے تھے مترجم جوناگڑھی نے خطیب کی نقل کردہ روایتوں
کو سنا سنا کر لوگوں کو حضرت امام سے بدظن کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اس جوناگڑھی نے اپنی کتاب سراج محمدی میں پھر سے خطیب کی نقل کردہ
حکایتوں میں سے گیارہ روایتیں نقل کی ہیں اور آخر میں لکھا ہے۔

میں ان گیارہ حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں اگر جناب بسط وتفصیل سے دیکھنا چاہیں
تو تاریخ خطیب بغدادی کا جزء جس کا میں نے ترجمہ کیا ہے بنام امام محمدی ملاحظہ فرمائیں جس
میں امام کی پوری سوانح کے ساتھ ہی اس قسم کی کل باتیں ہیں کاش آپ یہ نہ کرتے (ایضاً ۴۱)

جس شخص کے دل میں حضرت امام اعظمؒ کے بارے میں یہ غلاظت ہو کہ وہ

واہیات نکاتوں کا اردو ترجمہ کرکے اردو داں طبقہ کو حضرت امام اور ان کے اصحاب کے بارے میں بدگمانی اور بدزبانی پر لے آئے کیا وہ اس لائق ہے کہ اس کو عزت کی نظر سے دیکھا جائے۔ ہمیں حیرانگی ہے کہ سعودی حکمت جو مسلمانوں میں اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے کو کس نے یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ایسے شخص کا ترجمہ قرآن شائع کرے جو ہندوپاک کے مسلمانوں میں ذرہ بھر بھی لائق احترام نہیں اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ وہ مسلمانوں میں اختلاف اور افتراق پیدا کرنے کا خواہاں رہا ہے اور اس نے ہمیشہ مذاہب اربعہ خصوصاً احناف کے بارے میں بہت دریدہ ذہنی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس پر اس کے رسائل گواہ ہیں۔

مذہب احناف کو قرآن وحدیث اور تہذیب انسانی کے خلاف کہنے کی شرارت :

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام اور ائمہ اربعہ کے درمیان بعض فروعی مسائل میں اختلاف رہا ہے اور ان اختلافات کو کبھی کسی نے قرآن وحدیث کا مقابل نہیں جانا۔ اور نہ کبھی اہل علم نے فقہی مسائل کو تہذیب انسانی کے خلاف قرار دے لیکن مترجم محمد جوناگڑھی پوری ڈھٹائی سے فقہی مسائل کو تہذیب انسانی کے خلاف قرار دیتا ہے ا؎ کا یہ عقیدہ مذاہب اربعہ کے بارے میں ہے تاہم اس نے حنفی فقہ کو محض اس لئے سامنے رکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت اسی فقہ کی پیرو ہے۔ مترجم جوناگڑھی کا دلآزار بیان ملاحظہ کریں۔

”ہم کہتے ہیں کہ حنفی مذہب فقہ کی کتابوں میں بہت سے مسائل قرآن وحدیث کے خلاف ہیں بلکہ تہذیب انسانی کے بھی خلاف ہیں (ایضاً ص ۱۲)

آپ ہی بتائیں کیا ایسا آدمی اہل علم کہلانے کے قابل ہے ؟ اور کیا یہ امت میں اختلاف وانتشار پیدا کرنا نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ سعودی عرب کے علماء اس بات کے ہرگز قائل نہیں اور نہ سعودی عرب کی حکومت کا یہ نظریہ ہے لیکن اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ عام مسلمانوں میں سعودی عرب کی حکومت کے بارے میں کہیں کوئی غلط سوچ راہ نہ پکڑ لے اور وہ یہ سمجھیں کہ سعودی حکومت کا بھی یہی نظریہ ہو اس لئے ضروری ہے کہ سعودی

حکومت فوری طور پر اس قسم کے لوگوں سے برأت اظہار کرے تا کہ مسلمانوں میں پیدا ہونے والی بے چینی اور تشویش دور ہو۔

مترجم جونا گڑھی سے کسی نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح قول ہے کہ حنفی مذہب قرآن وحدیث کے خلاف ہے موصوف نے اس کے جواب میں لکھا۔

بیشک صحیح ہے حنفی مذہب قرآن وحدیث کے خلاف ہے (ایضاً ص ۱۱)

حنفیوں کا مذہب شرک وبدعت اور خلاف حدیث کا ایک مجسمہ ہے (ایضاً ص ۱۵)

کیا آپ کا بھی یہی عقیدہ ہے؟ اور کیا آپ ایسے لوگوں کے حامی ہیں جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور مسلمانوں میں انتشار پھیلاتے ہیں؟ یورپ کے مسلمان حیران ہیں کہ سعودی حکومت کس طرح ان لوگوں کے مکر کا شکار ہو گئی ہے یہ سعودی حکومت کو عام مسلمانوں کی نظروں میں گرانے کی کوشش ہے۔ یہ مسلمانوں کی اکثریت کو سعودی عرب سے دور لے جانے کی ایک سازش نہیں تو اور کیا ہے؟

اب احناف کے بارے میں موصوف کا فتویٰ دیکھئے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ اگر کسی کا والد حنفی (مقلد) ہو اور وہ فوت ہو جائے تو کیا وہ یہ دعا نہ پڑھے رب اغفرلی ولوالدی الخ۔ (یعنی کسی مقلد کے لئے دعائے مغفرت جائز ہے؟)

موصوف نے اس کا یہ جواب دیا۔

مشرکین کے لئے دعاء مغفرت ناجائز ہے (ایضاً ص ۱۴)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ موصوف کے نزدیک احناف گروہ مشرکین ہیں ان میں سے کسی کے لئے دعائے مغفرت جائز نہیں ہے اب آپ ہی بتائیں کیا یہ شخص اس لائق ہے کہ اسے مسلمانوں میں پذیرائی کا حق ملے؟ ہرگز نہیں۔

یہ فتویٰ صرف احناف کے بارے میں نہیں سب مقلدین خواہ وہ حنفی ہوں خواہ شافعی۔ حنابلہ ہوں یا موالک سب اس فتویٰ کی زد میں ہیں اور مترجم کے نزدیک ان میں سے کسی ایک کے لئے دعائے مغفرت جائز نہیں کیوں کہ یہ ائمہ اربعہ کے فقہ میں پیرو ہونے کے باعث مشرک ہو گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہند وپاک کے مسلمان حیران ہیں کہ سعودی حکومت جو حنبلی مذہب کے مطابق فیصلے کرتی ہے اور دوسرے سب فقہی مذاہب کا یکساں احترام کرتی ہے اور ان میں سے کسی کے بارے میں کوئی نفرت اور حقارت کے الفاظ تک نہں بولتی اسے کس نے بدنام کرنے کی سازش کی ہے ؟ جو شخص اہل سنت والجماعت کی اکثریت کو مشرک کہنے سے بھی باز نہیں آتا اور علی الاعلان یہ فتویٰ دیتے نہیں شرماتا اس کا ترجمہ قرآن اس لائق ہے کہ اسے سعودی حکومت کی نمائندگی ہرگز نہ دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو کہ مسلمانوں کو کافر اور مشرک کہنے والے سعودی حکومت کی نظر میں کسی عزت کے لائق نہیں ہیں۔

حنفی مذہب پر ایک بہتان :

مترجم جوناگڑھی لکھتا ہے۔

حنفی مذہب میں ہے کہ جس حدیث رسول اللہ کے راوی حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس اور حضرت عقبہ اور حضرت معبد اور مدینہ کی ارد گرد کی بستیوں کے رہنے والے صحابہ ہوں اور وہ حدیث امام ابو حنیفہ کے قیاس کے خلاف ہو تو اس وقت عمل حدیث پر نہ کرنا چاہئے ان حدیثوں پر قیاس مقدم ہے۔ (ایضاً ۶۱)

سعودی عرب میں علماء کرام موجود ہیں آپ ان میں سے کسی سے بھی پوچھئے کہ کیا مترجم جوناگڑھی کی یہ بات صحیح ہے ؟ کیا یہ لوگ حضرت ابو ہریرہ سے مروی کسی حدیث کو قبول نہیں کرتے ؟ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے فتاوی میں اس الزام کی سختی سے تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ جو شخص حضرت امام ابو حنیفہ کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ آپ حدیث صحیح کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دیتے تھے ان کی بات میں کوئی وزن نہیں (دیکھئے فتاوی ج ۲۰ ص ۳۰۴) حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی یہی بات اعلام میں لکھی ہے اور بتایا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ کے ہاں ضعیف حدیث بھی قیاس پر مقدم ہے " **فتقديم الحديث الصحيح وآثار الصحابة على القياس والرای قوله وقول احمد**" (اعلام المو) معروف غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خان قنوجی علامہ ابن حزم کے حوالہ سے لکھتے

ہیں۔"الاجماع علی ان مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث اولی عنده من الرای والقیاس" (دلیل الطالب ص ۸۷)

ان صراحتوں کے باوجود مترجم جوناگڑھی کا مسلمانوں میں مذکورہ پراپیگنڈہ کرنا کیا بہتان عظیم نہیں؟ اور کیا یہ امت میں اختلاف وانتشار پھیلانا نہیں ہے؟ اور کیا یہ اپنے اسلاف پر بداعتمادی پیدا کرنا نہیں ہے؟

جناب والا۔اس فرقہ غیر مقلد کا اصل مقصد عوام الناس کو اپنے اسلاف کرام سے بدگمان کرنا ہے اور ان سے اعتماد اٹھادینا ہے۔ یہ لوگ بظاہر ائمہ اربعہ کی فقہی آراء کا انکار کرتے ہیں اور حدیث پر چلنے کے مدعی ہیں لیکن حقیقت میں یہ لوگ نہ صرف ائمہ اربعہ کے خلاف ہیں بلکہ صحابہ کرام بھی ان کی زبان وقلم سے محفوظ نہیں ہیں۔ اور ان کے نزدیک خلفائے راشدین کے افعال جنہیں لسان نبوت نے سنت قرار دیا ہے بھی بدعت ہیں۔ ہمارے سامنے اس کی کئی مثالیں موجود ہیں سردست مترجم جوناگڑھی کا یہ بیان دیکھیں جو اس نے حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں صحابہ کے اتفاق سے جاری ہونے والے ایک فعل کی تردید میں دیا اور اسے صریح بدعت کہا۔

مسجد نبوی میں دی جانے والی جمعہ کی پہلی اذان بدعت ہے :

کون نہیں جانتا کہ جمعہ کے دن ایک اذان کا اضافہ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں ہوا اور سب صحابہ کرام نے اس سے پورا پورا اتفاق کیا کسی ایک کا اختلاف اس میں موجود نہیں۔ خود حضرت عثمان خلیفہ راشد ہیں اور حضور ﷺ نے ان کے عمل کو سنت کہا اور اس کی پیروی کو لازم قرار دیا اس پر مزید یہ کہ حضرات صحابہ کا اجماع ہوا۔ مگر جوناگڑھی کھل کر اسے بدعت کہتا ہے اور حضرت عثمان غنیؓ کو بدعتی کہنے کے لئے حنفی حضرات کو آڑ بنادیتا ہے اس نے لکھا۔

موجودہ وقت میں حنفی حضرات یہ کرتے ہیں کہ امام کے سامنے مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اذان کہتے ہیں یہ صریح بدعت ہے (ایضاً ۷ ۳)

برصغیر پاک وہند میں اہل بدعت کا ایک فرقہ بریلویوں کے نام سے موسوم ہے

اس فرقے کے بانی مولانا احمد رضا خان نے ہندوستان میں جمعہ کی اس اذان کے خلاف آواز اٹھائی اور اسے بدعت عثمانی کہا۔ ہندوستان میں مولانا احمد رضا خانؒ اور مولانا جوناگڑھی دونوں مل کر چلے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عمل صرف حنفی ہی کرتے ہیں کیا حرمین میں یہ عمل نہیں ہو رہا ہے؟ اگر یہ صحابہ کی بدعت ہے تو کیا شوافع اور موالک اور حنابلہ اس صریح بدعت کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں۔ حرمین میں دی جانی والی اذان کو صریح بدعت کہنے والے کیا خود بدعتی نہیں ہیں اور کیا ایسے آدمی کا ترجمہ قرآن طبع کرنا سعودی حکومت کو بدنام کرنے کی کوشش نہیں ہے؟ ہم نے یہاں مترجم جوناگڑھی کی صرف ایک کتاب کے یہ اقتباسات پیش کئے ہیں اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مترجم جوناگڑھی کی دوسری تالیفات ور سائل میں اور کس قدر اختلافی مواد ہوگا اور اختلافی مسائل میں اس نے کونسی زبان استعمال کی ہوگی۔ راقم الحروف کے پاس مولانا جوناگڑھی کے دیگر رسائل بھی موجود ہیں اور ان سب رسائل میں اسی قسم کی بلکہ اس سے بھی سخت زبان استعمال کی گئی ہے۔

راقم الحروف آپ کے علم میں یہ بات بھی لانا چاہتا ہے کہ علماء عظام نے اس ترجمہ پر بھی عالمانہ گرفت کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ترجمہ کئی پہلو سے قابل رد ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس ترجمہ قرآن کی اشاعت سے سعودی عرب کی حکومت کی نیک نامی کو خاصا نقصان پہنچا ہے اور اکثر حضرات کو اس پر افسوس کرتے پایا ہے کہ ایک جدید فرقہ کے عقائد و نظریات کو سعودی حکومت نے آخر کس کے مشورہ سے ہندوپاک کے مسلمانوں میں پھیلایا ہے؟

ہم آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب خادم الحرمین الشریفین کی جانب سے مولانا محمود حسن صاحبؒ کا ترجمہ قرآن شائع ہوا تو اس کے مقدمہ میں بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ ترجمہ پاکستان کی وزارت مذہبی امور کی طرف سے معتمد و مستند ہے۔ ارو ہندوستان کے معروف عالم فضیلۃ الشیخ مولانا ابوالحسن علی الندوی حفظہ اللہ کی توثیق لی تھی۔ کاش کہ مولانا محمد جوناگڑھی کے بارے میں موصوف کے والد مرحوم شیخ عبدالحی

الحسنی کا تبصرہ ملاحظہ فرمالیتے جو انہوں نے مولانا جونا گڑھی کے بارے میں شیخ محمد بن یوسف السورتی سے نقل کیا ہے اور اسی پر مولانا جونا گڑھی کا تذکرہ ختم کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ لم یکن فی العلم بمرتبة عالیة بل کان قلیل العلم بالحدیث وغیرہ ولم یکن عارفاً بالاصول والعربیة (نزهة الخواطر ج ۸ ص ۳۹۷)

اب آپ ہی غور فرمالیں کہ اس غیر معیاری ترجمہ اور غلط حاشیہ سے سعودی حکومت کو عالم اسلام کی طرف سے کیا نیک نامی مل سکے گی؟

ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری ان گزارشات کو بغور ملاحظہ کیا جائے گا اور ایک جدید فرقہ کے عقائد و نظریات کو مسلمانوں کی اکثریت پر لاگو نہیں کیا جائے گا۔

والسلام۔ محمد اقبال عفااللہ عنہ

(نوٹ) مذکورہ گزارشات صرف ایک فرد کی آواز نہیں برطانی بھر کے علمائے حق کی متفق علیہ آواز ہے بوقت ضرورت ان علماء کرام کی تصدیق و توثیق بھی ارسال کی جاسکتی ہے۔

آخری قسط
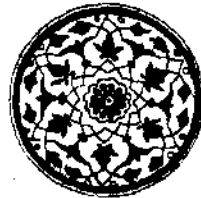
از: شیخ عطیہ سالم حفظہ اللہ۔ ترجمہ و تلخیص مولانا محمد عارف جمیل مبارکپوری

تیسری صدی:

آیئے اب تیسری صدی میں تراویح کا جائزہ لیں

دوسری صدی کے گزرنے پر تراویح ۳۶ر رکعت، اور وتر تین رکعت تھی، جسکا مجموعہ ۳۹ر رکعات ہے بعض حضرات ۴۱ر رکعات کے قائل تھے، جیسا کہ گزرا۔

تیسری صدی کے آغاز کے ساتھ تصور یہی تھا کہ تراویح مع وتر ۳۹ر رکعات ہوگی، لیکن امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ (تیسری صدی کا آواخر) نے لکھا ہے کہ تراویح مع وتر ۴۱ر رکعات ہوگئی تھی۔ امام ترمذی کہتے ہیں: "تراویح کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات وتر کے ساتھ ۴۱ر رکعات کہتے ہیں۔ اہل مدینہ کا یہی قول ہے، اور ان کے یہاں مدینہ میں اسی پر عمل ہے"

اس واقعہ کو نقل کرتے وقت خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی معمول باقی رہا یا موجود تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تیسری صدی میں تراویح بڑھ کر ۴۱ر کعات ہوگئی یعنی سابقہ ایک قول پر عمل تھا؟ یا وہ حضرات ۳۶ر کعات کو تراویح تصور کرتے تھے، جس میں ۵ر کعات کا اضافہ کردیا تو مجموعہ ۴۱ر کعات ہوگیا؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام مالک رحمہما اللہ کے عہد میں تعداد رکعات پر کلام کے ضمن میں اس مسئلہ پر بحث ہوچکی ہے۔ بہرحال ۳۶ رکعات تو قطعی طور پر موجود تھیں باقی ۳۹ر کعات پوری کی جاتی تھی یا ۴۱ر کعات۔

چوتھی پانچویں چھٹی صدی ہجری :

اس پورے وقفہ میں تراویح ۳۶ رکعات کے بجائے ۲۰ رکعات رہی ہے۔ اس لیے کہ مشرق وسطی کے پورے علاقہ بلکہ مصر و حجاز اور عراق میں عبیدیوں اور عباسیوں کے اختلافات کے سبب زبردست خلفشار رہا ہے۔ عبیدیوں کی حکومت مصر میں چوتھی صدی کے نصف (۳۵۹ھ) میں شروع ہوئی، اور تقریباً دوسو سال تک منبر حجاز، عراق میں عباسی حکومت اور مصر میں عبیدی حکومت کے درمیان ڈانواڈول رہا، یہاں تک کہ چھٹی صدی کے نصف ۵۶۷ھ میں آخری عبیدی خلیفہ نے زمام امور سنبھالی۔

حجاز پر فاطمیوں کے کنٹرول کے بعد حالات یکسر بدل گئے خصوصاً امن وامان، سنت کے لحاظ، اور بدعتوں کے ظہور کے اعتبار سے۔ اور کیوں کہ فاطمی حکمراں، اس وقت کے اہل مدینہ کے مذہب پر نہ تھے۔

ابن جبیر ۵۸۰ھ میں مدینہ منورہ پہونچے ہیں، انہوں نے اپنے سفر نامہ (ص ۱۷۹) میں اس وقت پھیلی ہوئی بدعات وخرافات کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے، جس کا حاصل یہ ہے:

بروز جمعہ ۷ محرم ۵۸۰ھ کو ہم نے وہاں وہ بدعات دیکھیں کہ اسلام پکار اٹھا : ہائے اللہ! مسلمانوں کا بچا۔ ہوا یہ کہ خطیب جمعہ کے لیے پہونچا، منبر نبوی پر چڑھ گیا، کہا جاتا ہے کہ اس کا مذہب کوئی پسندیدہ نہ تھا، وہ مسجد نبوی میں فرض نماز کے پابند امام شیخ امام عجمی، کا مخالف تھا۔ یہ پنجگانہ نمازوں کے امام صاحب ان میں خیر و تقوی تھا، اس عالی مقام جگہ میں امامت کے لائق رہی تھے۔

بہر کیف جب موذنوں نے ازان دی تو یہ خطیب کھڑا ہوگیا، یہ شیعی تھا، آتے وقت اس کے آگے آگے دو کالے جھنڈے تھے۔ جن کو منبر کے دونوں طرف گاڑ دیا گیا، وہ خطیب دونوں کے درمیان کھڑے ہوا، پہلے خطبہ کے بعد بیٹھ گیا، اور معمول کے خلاف بہت جلد اٹھنے کے بجائے، بیٹھا رہا حالاں کہ دوسرے خطبہ کے لیے امام کے کھڑے

ہونے کو جلد بازی کی مثال کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ پھر شرکش" خادموں کا ایک مجمع صفوں کو چیرتے، اور گردنوں کو پھاندتے ہوئے آگے بڑھا، اور اس بے توفیق امام کے لیے عجمیوں اور حاضرین سے بھیک مانگنے لگا، کوئی قیمتی کپڑا دے رہا ہے، تو ریشم کی لمبی چٹ پھاڑ کر دے رہا ہے جس کو دینے کے لیے ہی لایا تھا، اور کوئی اپنا عمامہ اتار کر اس کے پاس پھینک رہا ہے۔

عورتیں اپنے پازیب نکال کر دے رہی ہیں، اس کے علاوہ نا قابل بیان منظر سامنے تھا، اور خطیب منبر پر بیٹھے، لالچ بھری نگاہ سے ان بھکاریوں کو دیکھ رہا تھا، یہاں تک کہ وقت نکلنے لگا اور نماز جانے لگی، اور دین دار لوگ چیخ اٹھے اور اس کے سامنے اس حرام مال کا ایک ڈھیر لگ گیا۔

جب وہ خوش ہو گیا تو کھڑے ہو کر خطبہ پورا کیا، نماز پڑھائی، اہل علم دین کا رونا روتے ہوئے اور دنیا میں کامیابی سے مایوس ہو کر لوٹے اور یہ سمجھ گئے کہ علامات قیامت ظاہر ہو گئی ہیں بہ اختصار اس تصویر سے یقین ہو جاتا ہے کہ مسجد نبوی کے عام امور میں کس قدر تبدیلی رونما ہو گئی ہو گی۔

اس کی تائید ابن فرحون کی ایک قلمی تصنیف سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے مسجد نبوی کے بارے میں لکھا ہے اہل سنت کا نہ کوئی خطیب تھا، نہ امام نہ قاضی۔

پھر لکھا:

بظاہر ایسا مصر و حجاز پر عبیدیوں کی حکومت آنے کے بعد سے ہوا ہے کیونکہ ساتویں صدی کے نصف ۶۶۲ھ تک خطبہ میں انہیں کا نام لیا جاتا تھا، پھر عباسیوں نے حجاز پر قبضہ کر لیا، اور خطبہ میں انکا نام لیا جانے لگا، اس وقت سے آج تک یہی ہے، یعنی مؤلف کے دور تک۔

آگے لکھا ہے:

۶۸۲ھ میں آل سنان سے منصب خطابت چھین لیا گیا تھا۔

اس کی تائید، مکہ مکرمہ میں آنے والے علمی زوال سے ہوتی ہے جیسا کہ سید سباعی نے تاریخ مکہ (۱/۱۶۵) میں عہد عباسی دوم میں مکہ مکرمہ کی علمی حیثیت پر کلام کرتے ہوئے کہا ہے۔

"اور جلدی ہی مکہ کے بڑے بڑے علماء دوسرے شہروں میں چلے گئے اور علمی سرگرمی ماند پڑ گئی، اور چوتھی صدی ہجری آتے آتے، ملک میں علمی کمزوری کی نشانیاں واضح طور پر نظر آنے لگیں۔

اس دور میں عالمی اسلام میں شدید ذہنی اختلاف رونما ہوگئے، خوارج سرگرمی سے تبلیغ کر رہے تھے۔ معتزلہ اور خوارج کے اقوال عام تھے اور مختلف شیعی مذاہب پھیل چکے تھے۔

آگے لکھتے ہیں:

"دوسرے مذاہب کے برخلاف شیعیت کو مختلف اوقات میں، مکہ مدینہ اور حجاز کے بعض شہروں میں حامی مل گئے تھے۔

مکہ مدینہ میں اپنے شیعہ حامیوں کے وجود کی تائید تاریخ مکہ میں سید سباعی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے۔

"اور جلد ہی اشراف مکہ نے، فاطمیوں سے تعلقات بنانے کے بعد، آذان میں "**حی علی خیر العمل**" کا اضافہ کر دیا جو فاطمیوں کی تقلید تھی۔ یہ چوتھی صدی ہجری (۳۵۸ھ) کا واقعہ ہے۔

موصوف نے تصریح کی ہے کہ مکہ و مدینہ میں علمی حالت کمزور پڑ گئی تھی، اشراف مکہ شیعیت کے حامی تھے اس وقت کی سیاست یہی تھی، کیوں کہ عباسیوں کا دارالخلافہ بغداد تھا، اور فاطمیوں کا دارالخلافہ مصر تھا، اور یہ دونوں ہی حجاز سے دور تھے حرمین کی حیثیت کے پیش نظر دونوں حکومتیں منبر حرمین پر قبضہ کرنا چاہتی تھی، تاکہ دوسرے علاقہ میں انکی تائید ہو سکے کیوں کہ حرمین پر جسکا کنٹرول ہوتا تھا اسی کو خلافت کا حق دار تصور کیا جاتا تھا اور اس کا فائدہ اٹھا کر مکہ کے حکمراں دونوں حکومتوں کے عطایا لوٹ رہے تھے اور یہی سلسلہ جاری رہا۔

آگے لکھا ہے:

"مکہ و مدینہ میں علمی کمزوری چوتھی، پانچویں صدی اور چھٹی صدی ہجری مین مکمل طور پر برقرار رہی۔

علمی کمزوری کی سید سباعی کی بیان کردہ نوعیت اور نماز جمعہ سے متعلق ابن جبیر کا بیان کردہ واقعہ ان دونوں کے پیش نظر یہ بات قطعی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ اس وقت (یعنی حجاز پر) فاطمی حکومت کے دور میں تراویح میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور آئی ہوگی۔ فاطمی حکومت عالم اسلام میں ۵۶۷ھ تک رہی ہے اور آخری عبیدی خلیفہ عاضد کی موت پر ختم ہوئی۔ لیکن تبدیلی کس نوعیت کی تھی آیا حکمراں طبقہ کے مذہب شیعت کو اختیار کرلیا گیا تھا یا امام شافعی کے مذہب کو یہاں منتقل کردیا گیا تھا جو مکہ میں رائج تھا؟

یاد رہے کہ تراویح کے بارے میں شیعوں کا مذہب جیسا کہ ان کے ائمہ مثلاً حلی لکھتے ہیں یہ ہے۔

"ماہ رمضان کی نفل نماز" اشہر روایت کے مطابق نوافل راتبہ کے علاوہ پورے مہینہ میں ایک ہزار رکعت مستحب ہیں ہر رات بیس رکعت پڑھے گا آٹھ رکعات بعد مغرب اور بارہ رکعات بعد عشاء اظہر یہی ہے اور عشرہ آخیر میں ہر رات کو سابقہ ترتیب کے ساتھ تیس رکعات پڑھے گا اور تین طاق راتوں میں مقررہ رکعات کے علاوہ ہر رات میں سو رکعات پڑھے گا اس سلسلہ میں شیعہ کے یہاں تفصیل ہے جسے دیکھنا ہو حلی کی کتاب الشریعۃ ج ۱ ص ۶۵ کا مطالعہ کرے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تراویح کے بارے میں تبدیلی امام شافعی کے مسلک کی شکل میں ہوئی، کیوں کہ ابو زرعہ اپنے والد کے متعلق روایت کرتے ہیں۔

"جب میرے والد مسجد نبوی میں امام ہوئے تو اس کو (تراویح کے) سابقہ طریقہ کے مطابق ۳۶ رکعات کردیا البتہ وہ شروع رات میں بیس رکعات، (جیسا کہ معمول وعادت تھی) اور نصف شب کے بعد ۱۶ رکعات پڑھتے تھے، تاکہ اختلاف سے بچ سکیں۔

انکے قول "شروع رات میں بیس رکعات اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے امام شافعی کے مسلک کو اختیار کیا تھا کیوں کہ اس کے بعد کہا" تاکہ اختلاف سے بچ سکیں" اور انکے قول "جیسا کہ معمول وعادت تھی" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قبل اسی تعداد کا معمول تھا ابو زرعہ آٹھویں صدی کے شافعی المسلک ایک بڑے عالم ہیں۔

فاطمی دور میں مکہ ومدینہ میں امام شافعی کا مسلک بھی معمول بہ تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابن جبیر نے چھٹی صدی ہجری میں (جب کہ مکہ میں فاطمی حکومت تھی) رمضان میں ختم تراویح کی نوعیت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے جسکا حاصل یہ ہے۔

"رمضان کا چاند ۲۹ دسمبر کو دوشنبہ کی رات نظر آیا اہل مکہ نے یکشنبہ سے روزہ رکھا تھا انکا دعوی تھا کہ رؤیت ہے یہ دعوی ثابت نہیں تھا لیکن امیر مکہ نے فرمان جاری کردیا اور یک شنبہ کی رات کو روزہ کا اعلان ہو گیا کیوں کہ یہ خود اس کے اور اس کے علوی شیعہ اور حامیوں کے مذہب کے مطابق تھا۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک یوم شک کا روزہ فرض ہے جیسا کہ لکھا گیا ہے۔

آگے لکھا ہے:

"تراویح کے لیے الگ الگ امام آگئے شافعیہ کی جماعت سب سے بڑی تھی انہوں نے مسجد کے ایک گوشہ میں اپنے امام کو کھڑا کر دیا اس طرح حنابلہ، حنفیہ وزیدیہ وغیرہ نے کیا۔

انہوں نے لکھا ہے کہ سارے اہل مکہ صرف بیس رکعات تراویح پڑھتے تھے انہوں نے کہا

"شافعی امام تراویح میں سب سے زیادہ محنت کرتا ہے کیوں کہ معمول کی تراویح (دس سلام) مکمل کر کے وہ باجماعت طواف شروع کرتا ہے"

آگے ابن جبیر نے ان کے طواف اور واپسی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"دس سلام سے فراغت تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، وہ بیس رکعات پوری کرکے پھر دو رکعت مزید وتر پڑھتے ہیں جب کہ دوسرے ائمہ کے معمول کی تراویح پر زیادتی نہیں کرتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور (یعنی عبیدی حکومت کے دور) میں تراویح ہمیشہ امام شافعی کے مذہب کے مطابق بیس رکعات ہی رہی یہاں تک کہ امام ابوزرعہ نے اس کو دوبارہ زندہ کردیا، وہاں ادائیگی کی شکل کچھ مختلف تھی اس کا ذکر آٹھویں صدی" کے ضمن میں آئیگا۔ ان شاء اللہ۔

آٹھویں صدی :

اس صدی میں تراویح ۳۶ رکعات ہو گئی، البتہ ادائیگی کا انداز مختلف تھا حافظ ولی الدین ابو زرعہ عراقی کے والد امام زین الدین ابوالفضل کی کتاب طرح التثریب فی شرح التقریب سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔ ابو زرعہ کی ولادت ۷۲۵ھ میں اور وفات ۸۱۸ھ میں ہوئی یعنی ان دونوں حضرات نے اوائل آٹھویں صدی اور اوائل نویں صدی کا درمیانی زمانہ پایا ہے۔

ابو زرعہ نے یہ حدیث: رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں ایک رات مسجد میں نماز پڑھی تو کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے پڑھ لیا......... الحدیث۔ نقل کر کے، حدیث کی تشریح اور متعلقہ فقہی مسائل کو ذکر کر دیا پھر تراویح کی تعداد رکعات اس کے بارے میں اختلاف بیس سے زیادہ پڑھنے کے بارے میں بحث اور یہ کہ یہ اہل مدینہ کا طریقہ ہے یہ سب ذکر کرنے کے بعد یہ لکھا ہے اور یہی مقصود بالذکر ہے۔

"جب میرے والد رحمت اللہ علیہ مسجد نبوی کے امام ہوئے تو انہوں نے اس کے قدیم کو زندہ کیا، البتہ اکثر لوگوں کے معمول کی رعایت رکھی۔ چنانچہ وہ ابتدائی رات میں بیس رکعات پڑھتے جیسا کہ معمول تھا پھر رات کے آخری حصہ میں مسجد میں ۱۶ رکعات مزید پڑھتے تھے اس طرح رمضان میں باجماعت دو ختم کر لیا کرتے تھے اہل مدینہ کا معمول ان کے بعد یہی رہا اور ابتک یہی ہے۔ (شرح التثریب ۱؍۹۸)

ان کے قول: جب میرے والد رحمہ اللہ مسجد نبوی کے امام ہوئے تو انھوں اس کے قدیم طریقہ کو زندہ کیا" سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے والد سے پہلے تراویح میں کوئی تبدیلی ہوئی تھی۔

" چنانچہ وہ ابتدائی رات میں بیس رکعات پڑھتے تھے جیسا کہ معمول تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک انکے یہاں عام معمول و عادت بیس رکعات پڑھنے ہی کی تھی۔

"اہل مدینہ کا معمول ان کے بعد یہی رہا" یعنی بیس رکعات شروع رات میں اور ۱۶ رکعات آخیر رات میں جن کا مجموعہ ۳۶ رکعات ہے۔

"اور اب تک یہی ہے" سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کتاب (امام ابوالفضل کے لڑکے) کے زمانہ تک یہی رہا ہے لیکن انکے بعد کیا ہوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صاحب کتاب کی

وفات نویں صدی کے اوائل ۸۱۸ھ میں ہوئی ہے۔

نویں صدی :

ابوزرعہ کی سابقہ عبارت کے پیش نظر تراویح کا یہی معمول ۳۶ رکعات سابقہ تفصیل کے ساتھ رہا یعنی شروع رات میں ۲۰ رکعات اور آخیر شب میں ۱۶ رکعات اور یہ معمول نویں صدی کے اواخر میں اور دسویں صدی کے اوائل تک برقرار رہا ہے جیسا کہ سمہودی کی اگلی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

دسویں صدی :

دسویں صدی کے آغاز میں مسجد نبوی میں ۳۶ رکعات تراویح ہوتی تھی امام سمہودی اپنی کتاب "وفاء الوفاء باخبار دارالمصطفے" ار ۸۴ مسالہ (۸۰) مدینہ منورہ کی خصوصیات کے تحت رقم طراز ہیں۔

"مسئلہ ۸۰ : اہل مدینہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ۳۶ رکعات تراویح پڑھتے ہیں جیسا شافعیہ کے یہاں مشہور قول ہے رافعی اور نووی نے کہا: امام شافعی نے کہا میں نے اہل مدینہ کو ۳۹ رکعات تراویح پڑھتے ہوئے دیکھا جن میں تین رکعات وتر ہے ہمارے اصحاب نے کہا:

اہل مدینہ کے علاوہ کس کے لیے ایسا نہیں کرنا ہے کیوں کہ مدینہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت گاہ ہے اور آپ کی قبر اطہر یہیں ہے یہ شرف کسی اور کو حاصل نہیں۔

سمہودی کا انتقال ۹۱۱ھ میں ہوا خود شافعی المذہب تھے بعد ازاں انکے لڑکے مسجد نبوی میں شافعیہ کے امام مقرر ہوئے۔ موصوف اسی کتاب کے ص ۸۵ پر لکھتے ہیں :

"تراویح کی یہ تعداد اب تک مدینہ منورہ میں باقی ہے، البتہ بیس رکعات عشاء کے بعد، اور ۱۶ رکعات آخیر رات میں ادا کرتے ہیں"

اس سے صراحتاً اس تعداد اور طریقہ کا علم ہوتا ہے، جس کو امام ابوزرعہ رحمہ اللہ نے دوبارہ زندہ کیا تھا۔

تنبیہ:

ماسبق میں آچکا ہے کہ امام شافعیؒ نے تعداد تراویح ۳۹ رکعات ذکر کی ہے جن میں تین رکعات وتر ہے، لیکن نماز وتر کا طریقہ کیا ہوگا اس کی تفصیل نہیں کی۔ امام شافعی کے یہاں مشہور یہ ہے کہ تین رکعات الگ الگ ہیں، لیکن سید سمہودی وتر کی کیفیت میں کس تبدیلی کا ذکر کرتے ہیں، چنانچہ ان کی سابقہ عبارت کے بعد یہ موجود ہے: "وتر کے مسئلہ میں ان میں کچھ خلل ہوا جن پر ہم کتاب "مصابیح القیام فی شہر الصیام" میں تنبیہ کر چکے ہیں میں نے اس کی ایک صورت نکالی تھی، جس سے وہ خلل دور ہو گیا انہوں نے ایک زمانہ تک اس پر عمل کیا، پھر بعض حضرات نے ذاتی جذبات و مفادات سے مغلوب ہو کر سابقہ حالت پر لوٹا دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر کے مسئلے میں کوئی خلل تھا، اور اس پر انہوں نے تنبیہ کی تھی، لیکن یہ خلل اور یہ تنبیہ کیا تھی؟ معلوم نہیں۔ جب کہ یہ طے ہے کہ وتر میں اختلاف محض طریقہ ادائیگی میں ہے کہ تین رکعات کو ایک ساتھ پڑھا جائے یا الگ الگ، احناف وتر کو مغرب کی طرح تین رکعات ایک ساتھ پڑھتے ہیں، جب کہ جمہور دو پر سلام پھیر کر ایک رکعات الگ سے پڑھتے ہیں۔

اسی طرح قنوت کے تعلق سے یہ اختلاف ہے کہ حنابلہ اور احناف وتر میں قنوت پڑھتے ہیں، ہاں حنابلہ جہراً، اور حنفیہ سراً پڑھتے ہیں۔ شافعیہ و مالکیہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھتے ہیں، البتہ شافعیہ رکوع کے بعد، اور مالکیہ رکوع سے پہلے پڑھنے کے قائل ہیں۔

شاید یہ خلل، تعداد ائمہ، اور وتر کی متعدد صورتوں کے سبب تھا، جیسا کہ اس کی تشریح "چودہویں صدی" پر بحث کے وقت آئے گی، رہاں وتر سے متعلق شیخ سلیمان عمری کے رسالہ، اور اس وقت کے علماء مسجد نبوی کی رسالہ پر آراء ذکر کی جائیں گی۔

گیارہویں صدی:

غالباً گمان یہ ہے کہ تراویح کے تعلق سے اس صدی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اس لیے کہ سمہودی متوفی ۹۱۱ھ کے کلام سے معلوم ہو چکا ہے کہ تراویح ۳۶ رکعات،

.روتر تین رکعات کل ۳۹ رکعات تھیں۔ جن کو ابوزرعہؒ کے طریقہ پر ادا کیا جاتا تھا۔

پھر شیخ عبدالغنی نابلسی کے بارہویں صدی ہجری کے سفر نامہ مدینہ منورہ سے یہی
علوم ہوتا ہے کہ تراویح ۳۹ رکعات ہی تھی، جس سے یقین ہوتا ہے کہ ان کے دور تک
ی معمول رہا ہے، جس کو انہوں نے مشاہدہ سے بالتفصیل لکھا ہے جیساکہ آگے آرہا ہے۔

رہویں صدی :

بارہویں صدی میں تراویح کے متعلق وہی معمول جاری رہا، جو دسویں صدی میں
ما یعنی بیس رکعات شروع رات میں اور سولہ رکعات آخیر رات میں، اور اس سولہ رکعات
."ستہ عشریہ" کہتے تھے۔ جیساکہ شیخ نابلسی کے سفر نامہ مدینہ منورہ میں موجود ہے، جس
.ماہنامہ "العرب" نے ص ۴۳۰ جلد ا۔ شمارہ نمبر ۵۔ ذوالقعدہ ۱۳۸۶ھ میں شیخ نابلسی
کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

"موصوف کہتے ہیں: ہم شیخ سید علی سمہودی کے یہاں نماز پڑھتے تھے، ان کے
.کے امام ہوتے تھے، وہ اس وقت کے ائمہ شافعیہ میں سے ایک تھے"

موصوف نے مزید کہا : اہل مدینہ کے یہاں معمول ہے کہ تراویح سے فراغت
کے بعد حرم سے نکل جاتے ہیں، اور اس کے دروازے مقفل کردیے جاتے ہیں، جب کچھ
ات (تقریباً تین یا چار گھنٹے) گزر جاتی ہے تو بہت سے حضرات واپس آتے ہیں، حرم کے
روازے کھول دیے جاتے ہیں، قندیلیں روشن کردی جاتی ہیں، اور سولہ رکعات باجماعت
اکرتے ہیں، جس کو وہ "ستہ عشریہ" کہتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تراویح کا معمول وہی تھا، جو دسویں صدی
، سمہودی کے عہد میں تھا، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، ہاں آخیر رات کی ۱۶ رکعات کو وہ لوگ
تہ عشریہ" اس کی تعداد کے لحاظ سے کہتے تھے،

اس سے اس بات کا یقینی ثبوت ہوتا ہے کہ دسویں صدی کے بعد بھی تراویح کا وہی
.ل باقی رہا، جو دسویں صدی میں تھا۔ یعنی ۳۶ رکعات وتر کے ساتھ ۳۹ رکعات، جن

میں سے ۲۰ رکعات شروع رات میں اور ۱۶ رکعات آخر شب میں ادا کی جاتی تھیں۔

البتہ ایک نئی چیز موجود تھی یا وہ پہلے ہی سے چلی آرہی تھی، وہ یہ کہ فرائض کے ائمہ کی تعداد میں تراویح کے ائمہ بھی متعدد تھے، اس وقت صرف دو مذاہب حنفیہ وشافعیہ کے ائمہ موجود تھے، اور مذہب مالکی کے ساتھ ائمہ ثلاثہ کے چند خطباء تھے۔ ماہنامہ العرب جلد اشارہ ۴ شوال ۱۳۸۶ھ ص ۳۴۴ میں حوالہ سفر نامہ شیخ نابلسی نے یہ لکھا ہے:

"حرم شریف میں کل پندرہ ائمہ تھے، کچھ حنفی اور کچھ شافعی، اور اکیس خطیب تھے، جن میں سے ۱۲ حنفی، ۸ شافعی، اور ایک مالکی خطیب تھا۔

ائمہ باری باری نماز پڑھاتے تھے، روزانہ ایک حنفی امام، اور ایک شافعی امام پڑھاتے تھے ظہر سے شروع کرتے اور نماز فجر پر ختم کرتے تھے، پہلے شافعی امام نماز پڑھاتا، پھر حنفی امام پڑھاتا تھا۔ البتہ مغرب میں پہلے حنفی امام پڑھاتا تھا، کیوں کہ اس کے نزدیک مغرب میں تاخیر مکروہ ہے۔

حنفی امام ایک دن محراب نبوی (جو روضہ شریف میں ہے) میں پڑھاتا، اور اس دن شافعی امام، اس محراب میں پڑھاتا تھا، جو منبر کے پیچھے ہے، جس کو سلطان سلیمان علیہ الرحمہ والرضوان کا محراب کہتے ہیں۔ دوسرے دن شافعی امام اس جگہ پڑھاتا، اور حنفی امام اس کی جگہ پر پڑھاتا تھا۔ یہ ائمہ اپنے اپنے وقت تراویح میں اپنی جماعت والوں کو پڑھاتے تھے، البتہ ختم قرآن کی رات میں صرف شافعی امام ہوتا، سب لوگ ایک ساتھ عشاء و تراویح ایک ہی امام (جو شافعی ہوتا تھا) کے پیچھے پڑھتے تھے، اور اس دن شافعی امام کو ہی آگے بڑھایا جاتا تھا، فرائض پہلے وہی پڑھاتا، اور تراویح بھی پہلے وہی ختم کرتا تھا، جس کے لیے ایک بڑا مجمع اور جشن ہوتا۔ جو کچھ اس طرح سے ہوتا تھا۔

بارہویں صدی میں مدینہ منورہ میں ختم قرآن کا انداز:

نابلسی نے اپنے سفر نامہ میں، تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر اپنی شرکت کا حال لکھا ہے وہ روضہ شریف میں علماءِ شافعیہ کے ساتھ موجود تھے، اور خود ساری چیزوں کا مشاہدہ کیا ہے۔

ماہنامہ العرب جلد ا شمارہ ۹ / ربیع الاول ۱۳۸۷ھ نے بحوالہ سفر نامہ نابلسی نے لکھا ہے :

"نابلسی نے کہا: لوگ ہر رمضان میں تراویح میں ایک ختم کرتے ہیں۔ یہ ختم ۲۷ ویں شب میں ہوتا ہے، اور حنفیہ ۲۹ ویں رمضان کی رات کو ختم کرتے ہیں" اور نابلسی حنفی المذہب تھے۔ آگے لکھا ہے:

"ہم روضہ شریف میں بیٹھ گئے، علماء، اعیان اور اکابر حسب طبقات ودرجات آگئے، ہر ایک کے لیے اس کے درجہ کے مطابق جائے نماز بچھی ہوئی تھی، حنفیہ کے مفتی، شافعیہ کے مفتی، قاضی مدینہ، شیخ حرم، خدام حجرہ مطہر، خطباء وائمہ سب لوگ آگئے، امیر حجاز شریف سعد بن زید اپنی اولاد، اور فوج کے ساتھ مکہ کی طرف چلے گئے تھے" (یعنی وہ سفر کی وجہ سے حاضر نہ ہوسکے، غالباً اس سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کے موقع پر وہ حاضر ہوتے تھے) آگے لکھا ہے: "تمام موذن آگئے، اقامت کہی، امام نے تمام لوگوں کو عشاء پڑھائی" یعنی ان تمام لوگوں نے عام دنوں کے برخلاف ایک امام کے پیچھے عشاء کی نماز ادا کی، جو اس بات کی تمہید تھی کہ تمام لوگ تراویح بھی ایک ہی امام کے پیچھے پڑھیں گے۔

چنانچہ انہوں نے آگے کہا: "امامت کی باری نوجوان فاضل جامع کمالات سید عمر بن سید سمہودی شافعی کی تھی" یعنی شافعیہ میں سے بھی چند امام تھے، جو باری باری شافعیہ کو نماز پڑھاتے تھے، یہی حال احناف کے یہاں بھی تھا، ان کے بھی چند امام تھے جو باری باری امامت کرتے تھے، جیسا کہ تعدادِ ائمہ کے بیان میں بتایا جاچکا ہے۔

آگے نابلسی نے کہا (اور یہی یہاں مقصود بالذکر بھی ہے) "پھر انہوں نے لوگوں کو تراویح پڑھائی، اور اس سے فارغ ہوگئے" یعنی اس رات شافعی امام سید عمر بن سید سمہودی شافعی نے تمام لوگوں کو تراویح پڑھائی"

آگے ختمِ قرآن کے اہتمام کا ذکر کرتے ہوئے نابلسی نے کہا:

"پھر موذن روضۂ شریف میں جمع ہوگئے، اور قصائد پڑھے، جن میں نعت، ذکر،

روضہ شریف، حجرہ مطہرہ، خشوع خضوع، رونیکی فضیلت کا ذکر تھا، وداع رمضان میر قصائد پڑھے گئے، جن کو سن کر لوگ چیخ اٹھے، زبردست ہیبت، جاہ جلال اور خشوع و خضوع کا ماحول تھا۔

بہت سی شمعیں روشن کی گئی تھیں، اور ان کو روضہ شریف میں لائن سے رکھ دیا گیا تھا۔ متعدد قندیلیں روشن تھیں، منبر اور عود کی خوش بو اٹھ رہی تھی۔ گلاب کا پانی، بارش کی طرح چھڑکا جارہا تھا، حاضرین کی ہر جماعت کے سامنے ایک طشت میں پھول، چمیلی خوشبودار کلیاں، قسم قسم کے ریحان رکھے تھے۔ اور آخر میں فراغت کے بعد شیخ حرم نے امام کو سونے چاندی کی بنی ہوئی اعلی خلعت عطا کی، امام صاحب محراب نبوی میں تشریف فرما تھے لوگ اٹھ کر ان کو ختم قرآن کی مبارک باد دینے لگے، اور ہزار راتوں سے افضل اس شب قدر میں ہمیں پورا پورا ثواب ملا، ہم زیارت نبوی سے مشرف ہوئے۔

آگے نابلسی نے ایک یمنی مجذوب کا ذکر کیا کہ وہ صحن حرم نبوی کے ایک کنویں کا پانی مشک میں لے کر گھومتا ہوا کہتا تھا: شفا ہے، شفاء ہے، لوگوں سے اس کی اجرت نہیں لیتا تھا

پھر نابلسی نے اس جشن کے اختتام پزیر ہونے، اور قندیلوں اور شمعوں کو گل کرنے کا ذکر کیا۔ اس موقع پر یہ بتا دینا چاہئے کہ ختم قرآن کا یہ اہتمام مکہ مکرمہ میں صدیوں سے چلا آرہا تھا، چنانچہ ابن جبیر نے اس جشن کا ذکر کیا، اور اپنے سفر نامہ میں اس سے کہیں زیادہ بڑا جشن بتایا ہے، اس کا ذکر اس بحث کے آخیر میں آئے گا، انشاءاللہ تعالیٰ۔

اسی طرح یہ جشن واہتمام اخیر ترکی دور میں مختلف انداز سے رائج تھا، اس کا ذکر انشا اللہ چودھویں صدی ہجری، آخیر عہد اتراک واشراف پر بحث میں آئے گا۔

مستبعد نہیں کہ ختم قرآن کی یہ شکل بہت پہلے سے چلی آرہی ہو، بارہویں صدی کی ایجاد نہ ہو، خصوصا جب کہ اس ختم قرآن کے لیے شافعیہ کو آگے بڑھایا جاتا ہے جو بہت پرانے زمانہ سے امامت کے مستحق سمجھے جاتے رہے ہیں۔ حتی کہ ترکی دور میں بھی، حالاں کہ ترکی، حنفی مذہب کے حامی تھے، شاید یہ فاطمی دور کی یاد ہے، واللہ اعلم۔

تیرہویں صدی (آخیر ترکی عہد)

تیرہویں صدی میں تراویح اپنی سابقہ حالات پر قائم تھی۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی، کیوں کہ یہ پورا علاقہ مکہ ومدینہ، براہ راست اشراف کے ماتحت تھا، گوکہ خلافت عثمانیہ کے تابع تھا۔ بتایا جاچکاہے کہ حجاز پہلے ہی سے اشراف کے ماتحت تھا، گوکہ عباسی حکومت اور فاطمی حکومت کے درمیان ڈانواڈول رہاہے۔ یہاں تک کہ عثمانی خلافت قائم ہوئی، جس کے پہلے خلیفہ سلطان سلیم مصر میں ۹۲۲ھ خلیفہ بنے، اور ۹۲۳ھ میں مکہ مکرمہ کے منبر پر ان کے امام کا خطبہ پڑھا گیا، حجاز عثمانی خلافت کے تابع ہوکر، اشراف ہی کے کنٹرول میں رہا، پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی، اوراس کے خاتمہ کے ساتھ خلافت بھی ختم ہوگئی، مدینہ منورہ کے آخری ترکی قائد فخری بادشاہ تھے، جو ترکی حفاظتی دستہ کے سپہ سالار تھے، اور انہوں نے ۱۳۳۷ھ میں مدینہ منورہ کو سپرد کردیا۔

مکہ مکرمہ میں اشراف کے آخری امیر: شریف حسین، اور مدینہ منورہ میں شریف علی تھے۔ ۱۳۴۵ھ میں بلاد عربیہ میں شریف حسین کی بادشاہت کا اعلان ہوابہر کیف اس دور میں بھی مدینہ منورہ میں اشراف ہی کا براہ راست کنٹرول تھا، خواہ ترکی دور کا آغاز ہو یا آواخر۔ اس لیے تیرہویں صدی ہجری میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

چودہویں صدی:

چودہویں صدی کے آغاز میں مسجد نبوی میں تراویح کا سابقہ معمول برقرار رہا ہے، چودہویں صدی کے نصف تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

بظاہر تعداد رکعات یا طریقہ ادائیگی کسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، وہی ۳۶ رکعات تراویح تین رکعات وتر تھی۔ بیس رکعات شروع رات میں پڑھی جاتی تھی، سولہ رکعت آخیر شب میں، اوراس کو "ستہ عشریہ" کہا جاتا تھا، جیساکہ نابلسی نے بارہویں صدی کے تعلق سے ذکر کیا تھا۔

ہاں چودہویں صدی کے آغاز میں ایک نئی چیز یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ ائمہ مذاہب

اربعہ کے علاوہ اور بہت سے ائمہ اور متعدد جماعتیں ہوتی تھیں، جو کہ کم و بیش ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن مستقل یا سرکاری طور پر صرف چھ ائمہ تھے۔

۱- حاکم اور اس کے حاشیہ برداروں کا امام۔

۲- قاضی اس کے کاتبین، اور اس کے معاونین کا امام۔

۳- اغوات (آغاؤں) اور ان کے ساتھ پڑھنے والوں کا امام۔

۴- مفتی صاحب کا امام۔

۵- سپہ سالار کا امام۔

۶- عورتوں کے امام۔

۷- گھروں کے ائمہ۔

بعض اعلیٰ گھرانے، ایک خاص امام کے پیچھے، اپنے افراد خانہ کے لیے تراویح کا انتظام کرتے تھے۔ یہ ائمہ تراویح کی نماز، امام راتب کی نماز کے دوران ہی پڑھاتے تھے۔ یعنی دوسرے ائمہ مذاہب کے ساتھ ساتھ۔ البتہ ان کے یہاں قرأت کچھ مختلف ہوتی تھی، وہ بعض آیتیں پڑھتے یا صرف چھوٹی سورتیں۔ کیوں کہ وہ کاروباری ہوتے تھے، فرض نمازوں کے مقرر ائمہ کے پیچھے پڑھنے کے لیے وہ انتظار نہیں کرسکتے تھے، لیکن دوسرے ائمہ مذاہب، عام لوگوں کے لیے تراویح پڑھاتے تھے، اور دو ختم کرتے تھے، ایک ختم ابتدائی رات والی تراویح میں، اور دوسرا ختم آخری شب والی نماز میں جس کو وہ "ستہ عشریہ" کہتے تھے۔

ان ائمہ کے لیے مخصوص جگہیں تھیں: اغوات کا امام، اپنے مخصوص چبوترہ پر اور محراب تہجد میں (جو اس وقت حجرہ کے پیچھے اور حجرہ و چبوترہ کے درمیان ہے۔ یہی چبوترہ، اغوات کا چبوترہ کہلاتا ہے اور یہی اصحاب صفہ کی جگہ تھی اس وقت حجرہ کے پیچھے اور صفہ کی جگہ تھی) پڑھاتے تھے۔

عورتوں کا امام کا ان کو قفص میں تراویح پڑھاتا تھا۔ قفص: لکڑی کا ایک حزین جال تھا، جس کی وجہ سے نگاہ اندر نہیں جاتی تھی، یہ جال باب نساء کی طرف سے مشرقی حصہ میں تھا، اور اس وقت کی مسجد کے پیچھے حصہ میں باب مجیدی تک شمال میں اور چوڑائی میں پورے

رقی حصہ میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ جال تقریباً تین میٹر اونچا تھا، بچوں اور عورتوں، اور
ورت اغوات کے علاوہ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔
یہ قفص، حالیہ جدید توسیع سے قبل ختم کر دیا گیا ہے۔
روضہ شریف کے شیخ کا امام، ابتدائی کنکری والے حصہ میں کھڑا ہوتا تھا، جو مسجد
پیچھے سے متصل، باب رحمت اور باب نساء کے درمیان واقع ہے۔
سید سعید باشا شامل نے مجھے یہ تعجب خیز واقعہ سنایا ہے کہ شیخ روضہ کا امام پورے
ینہ ہر رات تراویح میں ایک قرآن ختم کرتا تھا، ان کا کہنا تھا کہ وہ اس قدر تیزی سے پڑھتا
کانپ اٹھتا تھا، اور خود کو فراموش کر بیٹھتا تھا، اور بسا اوقات ایک ہی رکعت میں ایک پارہ
ھ لیتا تھا۔
میں نے صدر قراء مسجد نبوی شیخ حسن شاعر سے سنا ہے کہ ایک شخص رمضان میں
ت بھر میں تراویح میں پورا قرآن پڑھتا، لیکن وہ ایسا صرف ایک بار کرتا تھا تاکہ اچھی طرح
ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس قدر تیزی سے پڑھتا تھا کہ آیتوں کے شروع یا آخیر کے علاوہ
سنائی نہیں دیتا تھا، ظاہر ہے کہ ایسا محض حفظ کو مضبوط کرنے کے لیے ہے، غور و فکر
اتھ اس طرح نہیں پڑھا جاسکتا۔

حرم کی نماز:

موجودہ شیخ حرم شیخ سید أحمد رفاعی سے میں نے سنا ہے کہ اتراک واشراف کے
میں شیخ حرم بسا اوقات تراویح جاڑے میں اپنے چبوترہ پر پڑھتا تھا، شیخ حرم کا چبوترہ
تا تھا جو باب جبریل سے داخل ہونے پر دائیں طرف، باب جبریل اور اغوات کے چبوترہ
رمیان ہے، اور اب تک موجود ہے۔ جس پر تین صف لگ سکتی ہے، ہر ہر صف میں
آدمیوں کی گنجائش ہے تقریباً نصف میٹر اونچا ہے، وہاں شیخ حرم اور ان کے متعلقین کا
ص امام نماز پڑھاتا تھا۔ شیخ حرم وہاں جاڑے میں تراویح پڑھتے تھے، جب کہ گرمی میں
کنکری والے حصہ میں پڑھتے تھے، ان کنکری والے حصہ میں تراویح پڑھنے کا معمول

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے نابلسی نے لکھا ہے کہ ایک رات ہم تراویح پڑھ رہے تھے، بارش آگئی تو ہم اندر چلے گئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گرمی میں کنکری والے حصہ میں، اور جاڑے میں اندر پڑھتے تھے، اور یہ خصوصی عمل تھا، کیوں کہ پنجگانہ اماموں کی نماز خاص خاص محرابوں میں ہوتی تھی، اور وہیں وہ تراویح پڑھتے تھے۔ جیسا کہ اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

عہد سعودی میں بھی بعض امراء مدینہ اسی کنکری والے حصہ میں گرمی میں تراویح پڑھتے تھے، جس کا ذکر آئے گا انشاء اللہ۔ ان چھ ائمہ کے علاوہ، اعلیٰ گھرانوں کے امام ہوتے تھے، کسی گھرانے کے بڑے بوڑھے، یہاں تک کہ بچے سب جمع ہو جاتے اور ان کا مخصوص امام مسجد نبوی کے خاص حصہ میں پورے رمضان، تراویح ختم ہونے تک تراویح پڑھاتا تھا۔

نئے طرح کی ایک انوکھی عارضی امامت :

پورا قرآن حفظ کرنے والے بچوں کی امامت۔ جب کوئی بچہ سال کے کسی حصہ میں حفظ قرآن مکمل کرلیتا تو رمضان آنے کا انتظار کرتا تھا، رمضان آنے پر وہ اپنے استاذ، والد، اپنے ساتھیوں اور کچھ دوست، اقارب کے ساتھ مسجد نبوی میں آتا، اور وہ بچہ پورے مہینہ بھر میں یا اس سے کم میں تراویح میں پورا قرآن سناتا تھا۔ حاضرین اور اس کے استاذ اس کے پیچھے نماز میں قرآن سنتے رہتے۔ یہ ایک طرح سے حفظ قرآن کا امتحان اور سند ہوا کرتی تھی۔ جب بچہ تراویح میں پورا قرآن سنالیتا تو اس کے والد کی طرف اپنی وسعت کے مطابق جشن ختم قرآن ہوتا تھا۔ بسا اوقات بچہ کا والد اس جشن میں بہت کچھ خرچ کر دیتا تھا۔ کہ ختم قرآن کی خوشی ہوتی تھی، بچے کے استاذ اور حاضرین کو کھانے اور حلوے کے علاوہ جوڑے اور قیمتی ہدیے عطاء کر دیتا تھا۔ پھر بچہ کو ایک جوڑا زیب تن کیا جاتا۔ اس کے سر پر عمامہ باندھا جاتا تھا جو اس بات کی علامت تھی کہ اس نے حفظ قرآن مکمل کر کے مسجد نبوی میں تراویح میں سنا چکا ہے، شیخ سید جعفر فقیہ نے مجھے اس سے متعلق بڑی دلچسپ بات سنائی ہے، خصوصاً ان کے والد کی طرف سے اپنے ایک لڑکے کے جشن ختم قرآن سے متعلق۔ اس طرح میں نے محترم شیخ محمد سعید دفتر دار سے اس کے کئی انداز کا ذکر سنا ہے۔ مکاتیب میں

بچوں کو قرآن حفظ کرانے کے لیے یہ جشن بڑا حوصلہ افزا ثابت ہوا ہے، مدرسین قرأت وکتابت اور تحفیظ قرآن کی نگرانی میں خود مسجد نبوی میں کئی مکاتب قائم تھے، اہل مدینہ کے بچوں کی تعلیم میں بھی مکاتب بنیاد تصور کیے جاتے تھے، اس کے بعد بچہ، دروس حرم میں شریک ہوتا یا بعد میں مدارس کا رخ کرتا تھا۔

اپنے ساتھیوں اور استاذ والد کو تراویح میں قرآن سنانے کا بچوں کا یہ معمول برقرار تھا اور اب بھی محدود دائرہ میں باقی ہے، اس میں کم لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔

یہ لوگ اپنی نماز امام کی نماز کے بعد شروع کرتے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ دن بدن ختم ہو رہا ہے اکاد کا دکھائی دیتا ہے یہ مکاتب بھی منسوخ کر دیے گئے، مسجد نبوی کے آس پاس کچھ یادگار مکاتب باقی ہیں، لیکن وہ بچوں کے مزاج کی رعایت نہ کرسکنے کے سبب، تعلیم و تحفیظ کے فریضہ کی انجام دہی نہیں کرپاتے۔

پھر خود بچوں کے والدین بھی اس طرح کے مکاتب میں وقت گزاری ناپسند کرتے ہیں، اور فوراً بچوں کو مدارس میں داخل کر دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں بچوں پر مضامین کا اس قدر بوجھ پڑ جاتا ہے کہ حفظ قرآن سے قاصر رہتے ہیں۔ ہاں کچھ والدین اس پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ یا اس خلاء کو پر کرنے کے لیے۔ وزارت تعلیم کی طرف سے قائم کردہ مدارس تحفیظ قرآن میں کچھ بچے داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اہل خیر کے تعاون سے اس مقصد کی تکمیل کے لیے جمعیات قائم ہیں جن میں بہت سے شہری و دیہاتی بچے داخلہ لیتے ہیں۔

مکاتب کا ذکر ضمناً آگیا تھا لہٰذا اب ابتدائی عہد سعودی میں تراویح کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

سعودی عہد:

تمہید:

کسی اچھوتے موضوع پر قلم اٹھانا مضمون نگار کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ہر چند کہ مضمون نگار کو اس میں پیش قدمی کا شرف مل جاتا ہے، لیکن اس کے مضمون میں تجربہ اور

تنقید کی گنجائش رہتی ہے' اس لیے کہ اگر کتابی شکل میں مضامین موجود ہوں تو ان کو منتخب کرکے مرتب کردیا جائے' لیکن جس موضوع پر کتابیں نہ ہوں' وہ موضوع اچھوتا ہو' اور مضمون نگار کے زمانے سے وابستہ نہ ہو تو اس کے لیے اس پر قلم اٹھانا حد درجہ مشکل ہوتا ہے' نہ اس کے پاس مصادر و مآخذ ہوتے ہیں' اور نہ اپنے مشاہد سے کچھ استفادہ کی گنجائش رہتی ہے' بلکہ عام بات چیت سے مضمون نکالنا ہوتا ہے' اور اگر زمانہ قدیم کی بات ہو تو مزید دشواری سامنے آتی ہے' کیوں کہ لوگ بھول جاتے ہیں' جس کے سبب طرح طرح کے اقوال' اور مختلف اختلافات دیکھنے میں آئیں گے۔ اور مضمون نگار کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد سے متعلق مضمون کو اخذ کرے۔

دار العلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دار العلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندورنی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی محبین ومخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ وروغن کرانے کے خرچ سے بچنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دے کر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دار العلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جنکی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اس لیے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عند اللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب وآلام سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کے لیے: "دار العلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 30076

———— اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لیے: (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند 247554